گھر کے ہر فرد کے لئے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

مارچ 2018

نگرانِ اعلیٰ

معراج رسول

افسر سلطانہ، اسماء قادری و عطیہ ہدایت اللہ کے خوب صورت افسانے

مصنفہ غزالہ رشید کی بزم میں خوشگوار آمد

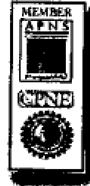
پاکیزہ
کراچی

ران اعلیٰ : معراج رسول

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیرہ : نزہت اصغر

معاون : آمنہ حماد



رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن منیجر

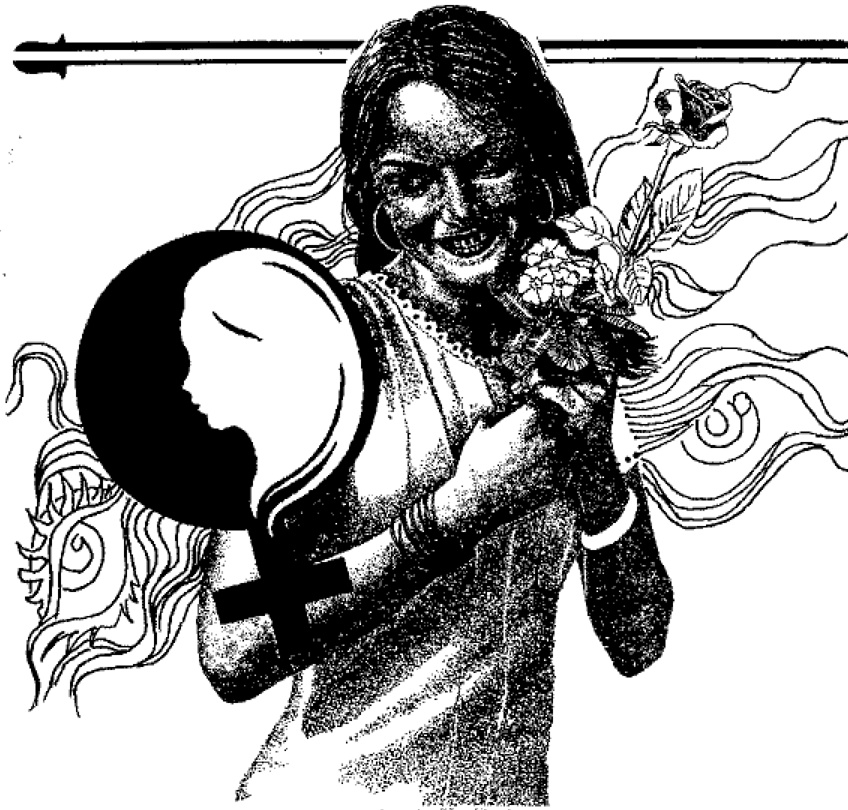
سید منیر حسین

0333-3285269

قیمت فی پرچا (پاکستان) 70 روپے
قیمت فی پرچا (سعودی عرب) 12 ریال یا مساوی متحدہ عرب امارات
زرسالانہ (اندرونِ ملک) 900 روپے...... جلد 45 ...... شمارہ 12 ...... مارچ 2018ء

فوٹو گرافی: کاشف (لاہور)

سرورق ماڈل: فریحہ



پبلشر وپروپرائٹر: ذیشان رسول ۔ مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Office: 63-C, Phase-II (Ext), D.H.A. Commercial Area, main Korangi Road Karachi.
Postal Address: Box No. 662, G.P.O. , Karachi-74200
Phone: (021)35895313-35802552 , E-mail address: jdpgroup@hotmail.com

مجھے کچھ کہنا ہے......!

قارئین کرام......

السلام علیکم!

دعا ہے کہ موسم بہار کی رنگینیاں، تازگی اور لطافتیں آپ سب کا نصیب بنی رہیں اور ہمارے ملک پاکستان میں موسم بہار ہمیشہ اپنے جوبن پر رہے۔ یہی مارچ 1940ء کا مہینہ تھا کہ جب برصغیر کے مسلمانوں کو ایک علیحدہ مملکت کے قیام کی خوش خبری نصیب ہوئی تھی جسے ٹھیک سات سال بعد قائداعظم محمد علی جناح اور ان کے دلیر ساتھیوں نے عملی جامہ پہنایا۔ اب اس پیارے چمن کی بہاریں ہم اہلِ وطن کے دم سے ہی ہیں۔

قارئین ماہِ مارچ کی 8 تاریخ کو عالمی یوم خواتین بھی منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر ہمیں شاعرِ مشرق علامہ اقبال کے ایک مشہور شعر کا مصرعہ یاد آرہا ہے.....

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

جہاں بہار کے خوب صورت و معطر موسم کا ذکر ہو وہاں خواتین کے رنگین آنچل اور سبک و لطیف احساسات کا ذکر نہ ہو تو یہ زیادتی ہوگی...... ہاں زیادتی تو شاید آج ہر عمر اور طبقے کی خواتین کے ساتھ ہو رہی ہے...... کہیں زبانی کلامی تو کہیں دست درازی اور کچھ نہیں تو مختلف انداز سے ان کی صلاحیتوں اور قابلیت پر قدغن لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ حالانکہ انسانی زندگی کی تمام بہاریں انہی کے دم سے ہیں چاہے وہ کسی بھی رشتے کے روپ میں ہوں۔ بیٹی رحمت اور گھر کی رونق کی صورت، بہن...... بھائی کی شرافت اور ماں کی امین، بیوی اپنے شوہر کی عزت و آبرو کی امانت دار اور اس کے دل اور گھر کے لیے متاعِ راحت اور عورت بحیثیت ماں ہو تو اس کی قدر و منزلت اور بلندیِ درجات سے کون انکار کر سکتا ہے۔

عورت ہر رشتے میں بلاشبہ قابلِ احترام، معتبر اور وسیلۂ راحت جاں ہے مگر جب یہی عورت کسی ظلم و زیادتی کا شکار ہوتی ہے تو بہاریں صرف اسی کی زندگی سے نہیں روٹھتیں بلکہ اس سے وابستہ تمام رشتے خزاں رسیدہ ہو جاتے ہیں، بہرحال یہ تو ایک طویل بحث ہے ہم تو بس اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ صنفِ نازک ہو یا صنفِ قوی، زندگی کی رونقیں، بہاریں اور عالم میں تابناکیاں انہی دو اصناف کے دم سے ہیں اور دونوں کے ہی حقوق و فرائض متعین ہیں۔ مزاج اور ماحول میں خزاں ان حدود کو پاٹنے سے چھا جاتی ہے اور کوئی بھی جان بوجھ کر اپنی زندگی کو خزاں کے حوالے نہیں کرتا۔ سو بہاروں کے موسم میں گلگوں بہاروں سے ہی سیراب ہوا جاتا ہے۔ سیرابی سے ہمیں یاد آیا اس ماہ پانی (آب، ماء) کا بھی عالمی دن منایا جاتا ہے۔

خدا کرے یہ پانی جو ہر مخلوق کے لیے لازم اور تخلیق کا جزوِ اول ہے، جائز طور پر سب کی ہی دسترس میں رہے۔ آمین!

مدیرہ

نزہت اصغر

دین کی باتیں

اور ہر راستے پر (اس طرح) نہ بیٹھا کرو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر ایمان لایا ہو تم اسے دھمکاؤ، اور اسے اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکو۔ اور اس میں کجی تلاش کرو۔ اور یاد کرو جب تم تھوڑے تھے پھر اس نے تمہیں زیادہ کر دیا۔ اور غور کرو کہ فساد کرنے والوں کا انجام کیسا ہوا۔ (۸۶) اور اگر تم میں سے ایک گروہ اس (حکم) پر جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں ایمان لے آیا۔ اور ایک گروہ ایمان نہ لایا تو صبر کرو، تا آنکہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ فرما دے۔ اور وہ سب سے بہتر فیصلے کرنے والا ہے۔ (۸۷) اس کی قوم میں سے ان سرداروں نے جو بڑائی چاہتے تھے کہا۔ اے شعیب! ہم تمہیں اور ان لوگوں کو جو تمہارے ساتھ ایمان لا چکے، ضرور اپنی بستی سے نکال دیں گے۔ یا ضرور تم ہماری ملت میں پلٹ آؤ۔ حضرت شعیبؑ نے فرمایا اگرچہ ہم (پلٹ آنے سے) نفرت ہی کرتے ہوں۔ (۸۸) اگر ہم تمہاری ملت میں لوٹ آئیں، بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں نجات دے دی۔ (تب) تو یقیناً ہم نے اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھا۔ اور ہم سے نہیں ہوگا کہ ہم اس (تمہاری ملت) میں لوٹ آئیں۔ سوائے اس کے کہ ہمارا پروردگار ہی چاہتا ہو۔ ہمارے پروردگار کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ ہم نے اللہ تعالیٰ پر ہی بھروسا کیا ہوا ہے۔ اے ہمارے پروردگار تو ہمارے درمیان اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے۔ اور تو سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔ (۸۹) اور اس کی قوم میں سے جو سردار کافر ہو گئے انہوں نے کہا، اگر تم نے شعیب کی پیروی کی تو یقیناً تم اس صورت میں نقصان اٹھانے والے ہو جاؤ گے۔ (۹۰) پس انہیں زلزلہ نے آ پکڑا۔ تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے رہ گئے۔ (۹۱) وہ لوگ جنہوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا (وہ ایسے برباد ہوئے) گویا کہ وہ اس میں کبھی آباد ہی نہ ہوئے تھے۔ وہ لوگ جنہوں نے شعیبؑ کو جھٹلایا، وہی نقصان اٹھانے والے ہو گئے۔ (۹۲) پس شعیب نے ان سے منہ پھیر لیا اور کہا اے میری قوم! یقیناً میں نے تمہیں اپنے پروردگار کے پیغام پہنچا دیے، اور تمہیں نصیحت کر دی پھر میں انکار کرنے والی قوم پر کس طرح افسوس کروں۔ (۹۳) اور ہم نے کسی بستی میں کوئی نبی نہیں بھیجا۔ مگر یہ کہ (جب اس کی تکذیب کی گئی تو) ہم نے اس کے رہنے والوں کو سختی اور تکلیف میں گرفتار کر لیا، تا کہ وہ عاجزی کریں۔ (۹۴) پھر ہم نے تکلیف کی جگہ کو بھلائی سے بدلا، یہاں تک کہ وہ بڑھ گئے اور کہنے لگے کہ یقیناً ہمارے باپ دادوں کو (بھی اسی طرح) تکلیف اور خوشی پیش آ چکی ہے۔ پس ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا اور انہیں خبر (تک) نہ ہوئی۔ (۹۵)

(سورۂ اعراف ۷، پارہ ۸۔ آیات ۸۶ تا ۹۵)

دین کی باتیں

آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا اَبْطَحِیُّ ؕ

افضل الانبیا، سید المرسلین، ختمی مرتبت، حبیب پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی اسمائے مبارکہ میں سے ایک نام ..... **سیدنا ابطحی** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ہے جس کے معنی و مفہوم ابطح والے، مکہ والے کے ہیں۔

تفصیل مفہوم: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اسم گرامی اسی مناسبت سے ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاندانِ قریش سے تعلق رکھتے تھے، جو وادیِ بطحا میں رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا کو سید الاباطح اور سید الابطح بھی کہا جاتا ہے۔

القرآن: ترجمہ: کہہ دو کہ مجھ کو یہی حکم ہوا ہے کہ اس شہر مکہ کے مالک کی عبادت کروں جس نے اس کو محترم اور مقامِ ادب بنایا اور ہر چیز اس کی ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ (آیت ۹۱، سورہ نمل)

الحدیث: آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ منورہ ہجرت فرمانے لگے تو اپنے دولت خانے سے نکل کر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر تشریف لے گئے۔ راستے میں بازار حزورہ میں جو بعد میں مسجد حرام میں شامل کر لیا گیا۔ ٹھہر کر یوں خطاب فرمایا۔

"بطحائے مکہ، تو پاکیزہ شہر ہے اور میرے نزدیک کتنا عزیز ہے اگر میری قوم مجھے تجھ سے نہ نکالتی تو میں تیرے سوا کسی اور جگہ سکونت پزیر نہ ہوتا۔"

الرائے: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اغراض و مقاصد کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی تھی جب مکہ خود بخود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تحویل میں آجائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا کارنامہ بھی یہی ہے کہ سات سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد آخرکار مکہ اسلامی ریاست میں ضم ہو ہی گیا۔ شکست خوردہ و غضب ناک دشمن کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنی خوشی سے اہل مکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہو گئے اور دو سال بعد محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال پر جب اسلام کو بحرانی دور سے گزرنا پڑا تو اس وقت سارے عرب میں اس کی فوقیت کو قائم رکھنے کے لیے انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

(پروفیسر گب۔ محمد زم)

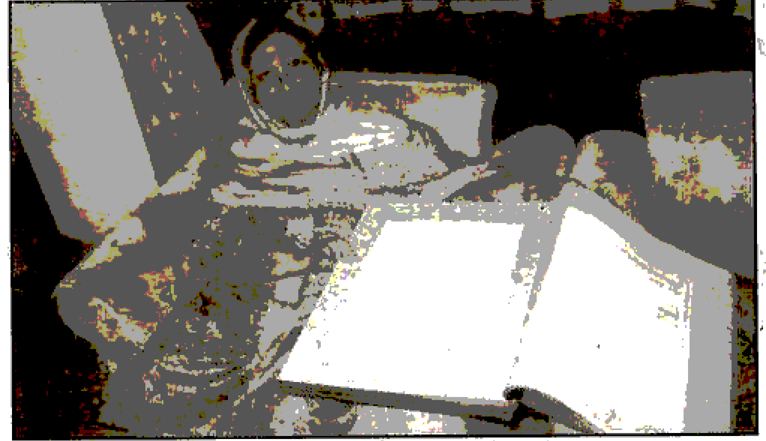
الفضائل: 1۔ ۲۰۳ مرتبہ اس اسم پاک کا ورد کرنے والا اپنے حلقۂ احباب میں امتیازی حیثیت حاصل کرتا ہے۔ نیز ہر جگہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

2۔ جو باوضو حالت میں روزانہ ایک سو مرتبہ اس اسم پاک کا ورد کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے مخصوص عزت و مرتبہ عنایت کرے گا۔

قیصرہ حیات کی کتاب انوار اسماء النبی ﷺ سے اقتباس

اللہ اور اس کا نور





قرآن پاک سے عشق کی پُرنور داستان ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے قلم سے

باب چہاردہم

سورۂ انعام 6:

123۔ ''ان سے کہو کہ آؤ میں تم کو بتاؤں کہ تمہارے رب نے جو تم (باتیں) پر حرام کی ہیں، وہ یہ ہیں۔''

''اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کرو۔
ماں، باپ کے ساتھ احسان کیا کرو۔
اولاد کو افلاس کے سبب قتل نہ کیا کرو۔
بے حیائی کے نزدیک بھی مت جاؤ خواہ ظاہر ہو یا چھپی ہوئی۔
جس کا خون کرنا اللہ نے حرام کیا ہے اس کو قتل نہ کرو۔'' (151)

124۔ ''اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ جایا کرو مگر احسن طریقہ سے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائے۔ اور ناپ تول پوری، پوری کرو، انصاف کے ساتھ۔ اور جب تم بات کیا کرو تو انصاف رکھو گو وہ رشتے دار ہی ہو۔ اور اللہ سے جو عہد کیا اس کو پورا کیا کرو، یہ سب احکام تاکیدی ہیں تاکہ تم یاد رکھو۔'' (152)

125۔ ''اور یہ قرآن ایک کتاب ہے جس کو ہم نے برکت والی بنا کر نازل کیا ہے، سو اس کا اتباع کرو اور ڈرو تاکہ تم پر رحمت ہو۔'' (155)

126۔ ''جو نیک کام کریں ان کو دس گنا ثواب ملے گا، اور جو برا کام کرے گا اس کو اس کے برابر سزا ملے گی، اور ان پر ظلم نہ ہوگا۔'' (160)

127۔ ''آپ کہہ دیں کہ بلاشبہ میری نماز میری ساری عبادات، میرا جینا، میرا مرنا، یہ سب اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے۔'' (162)

سورۂ اعراف 7:

128۔ ''اور اس روز (یعنی قیامت کے دن)

اعمال کا وزن بھی ہوگا پھر جس کا پلّہ بھاری ہوگا وہ کامیاب و بامراد ہوگا۔'' (8)

129۔ ''اور جس کا پلہ ہلکا ہوگا یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنا نقصان کیا اس لیے کہ یہ ہماری آیات کی حق تلفی کیا کرتے تھے۔'' (9)

130۔ ''اے آدم کی اولاد! ہم نے تمہارے لیے اتارا ہے، لباس جو تمہارے پردہ دار، بدن کو ڈھانکتا ہے اور زینت کی چیز ہے اور تقویٰ کا لباس یہ اس سے بڑھ کر ہے، یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ یہ اللہ کو یاد رکھیں۔'' (26)

131۔ ''اے اولادِ آدم! تم اپنا لباس پہن لیا کرو، جب بھی تم مسجد جایا کرو اور خوب کھاؤ اور پیو۔'' (31)

132۔ ''آپ فرما دیجیے کہ البتہ میرے رب نے فحش باتوں کو صرف حرام کیا ہے ان میں اعلانیہ ہیں وہ بھی اور پوشیدہ وہ بھی اور ہر گناہ اور ناحق ظلم کرنے کو، اللہ کے ساتھ شرک کرنے کو۔'' (33)

133۔ ''تم اپنے رب ہی سے دعا کیا کرو، اچھی طرح گڑگڑا کر اور آہستہ آہستہ، وہ واقعی حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (55)

134۔ ''اور دنیا میں شر و فساد نہ پھیلایا کرو۔'' (56)

135۔ ''اور تم سڑکوں پر مت بیٹھا کرو اس غرض سے کہ تم مومنین کو دھمکیاں دیا کرو اور اللہ کی راہ سے ان کو روکا کرو اور اس میں کجی تلاش کرو۔'' (86)

136۔ ''تم ناپ تول پوری، پوری کیا کرو، زمین میں فساد مت پھیلایا کرو۔'' (85)

137۔ ''اور اچھے، اچھے نام اللہ ہی کے ہیں، سو تم اللہ کو ان ہی ناموں سے یاد کیا کرو۔'' (180)

138۔ ''یہ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ کب آئے گی، آپ فرما دیجیے کہ اس کا علم تو میرے رب ہی کو ہے۔'' (187)

139۔ ''اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے تو اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔'' (200)

140۔ ''اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو کان لگا کر سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحمتیں کی جائیں۔'' (204)

141۔ ''اور اپنے رب کو یاد کیا کرو اپنے دل میں عاجزی سے، ڈرتے ہوئے، زور کی آواز کے بجائے کم آواز سے صبح، شام اور غافلوں میں نہ رہنا۔'' (205)

سورۂ انفال 8:

142۔ ''بس مومنین تو ایسے ہوتے ہیں جب اللہ کا ذکر آتا ہے تو ان کے دل ہل جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو وہ آیات ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں اور وہ اللہ پر پورا بھروسا کرتے ہیں۔'' (2)

143۔ جو نماز کی پابندی کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (3)
بس یہی سچے مومن ہیں ان کے لیے اللہ کے ہاں بڑے درجات اور مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے۔ (4)

144۔ ''مومنو! جب میدانِ جنگ میں تمہارا مقابلہ کافروں سے ہو تو ان سے پیٹھ نہ موڑنا۔'' (15)

145۔ ''مومنو! اللہ کا کہا مانو اور اس کے رسول کا کہا مانو۔'' (20)

''مومنو! خدا اور رسول کا حکم قبول کرو جبکہ رسول خدا تمہیں ایسے کام کے لیے بلاتے ہیں جو تم کو زندگی (جاوداں) بخشتا ہے، اور جان رکھو کہ خدا آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ تم سب اس کے روبرو جمع کیے جاؤ گے۔'' (24)

146۔ مومنو! تم اللہ اور رسول کے حقوق میں خلل نہ ڈالو اور اپنی امانت میں بھی خلل نہ ڈالو۔'' (27)

147۔ ''تمہارے مال اور اولاد ایک امتحان کی چیز ہے۔'' (28)

148۔ ''مومنو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تم کو فیصلے کی قوت دے گا اور تم سے تمہارے گناہ دور

فرمادے گا اور تم کو بخش دے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔"(29)

149۔"مومنو! جب تم کو کسی جماعت سے مقابلہ پڑ جائے تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔"(25)

سورۃ توبہ 9۔

150۔"ہجرت کرنے والوں اور جہاد کرنے والوں کے لیے بشارت۔"(20)

151۔"اے ایمان والو! اپنے باپوں کو، اپنے بھائیوں کو رفیق نہ بنانا اگر وہ کفر کو ایمان کے مقابلے میں عزیز رکھیں۔"(23)

152۔"اے مومنو! یہود کے اکثر علماء اور مشائخ لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر رہے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو ایک بڑے درد ناک عذاب کی خبر سنا دیجیے۔"(34)

153۔"مومنو! تم کو کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو تو تم زمین پر گرے پڑتے ہو۔"(38)

154۔"جان و مال سے جہاد کرنے کا حکم۔"(41)

155۔"صدقات تو حق ہے غریبوں کا، محتاجوں کا، کارکنانِ صدقات کا، جن کی دلجوئی منظور ہے، غلاموں کی گردن چھڑانے میں، قرض داروں کے قرضے میں، جہاد میں، مسافر میں۔"(60)

156۔"منافقوں کے لیے وعید کی آیات (70 تک)

157۔"مومن مرد، مومن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔"(ان کے لیے مراعات)(71،72)

158۔"اے نبیؐ کفار، اور منافقین سے جہاد کیجیے۔"(آیات 73 سے 98 تک منافقین کا بیان) پوری سورۃ میں منافقین کے لیے وعیدیں آئی ہیں۔

159۔"نبی اور ایمان والوں کی یہ شان نہیں کہ وہ مشرکین کے لیے بخشش کی دعا کریں گو کہ وہ رشتے دار ہی ہوں جبکہ ان کو معلوم ہو جائے کہ دوزخی ہیں۔"(113)

160۔"مومنو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہا کرو۔"(119)

161۔"مومنو! ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس رہتے ہیں، ان کو تمہارے اندر سختی پانی چاہیے اور یقین جانو اللہ کی مدد پرہیز گاروں کے لیے ہے۔"(123)

162۔"تم ہی میں سے تمہارے پاس ایک رسول پہنچے ہیں جن کو تمہاری تکلیف بڑی گراں گزرتی ہے جو تمہارے نفع اور بھلائی کی بڑی خواہش رکھتے ہیں اور مومنین پر بڑی شفقت اور مہربانی رکھتے ہیں۔"(128)

سورۃ یونس 10:

163۔"وہ اللہ ہی ہے جس نے آفتاب کو چمکتا ہوا بنایا اور چاند کو نورانی بنایا اور اس کی چال کے لیے منزلیں مقرر کیں، تاکہ تم برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کر لیا کرو، اللہ نے یہ چیزیں بیکار پیدا نہیں کیں۔"(5)

165۔"بلاشبہ اللہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ ہیں جو اپنے ہی اوپر ظلم ڈھاتے ہیں۔"(24)

165۔"وہ ہی جان ڈالتا ہے، وہ ہی جان نکالتا ہے اور تم سب کو اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"(56)

166۔"اے لوگو! تمہارے پاس رب کی طرف سے جو چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں برے کاموں کی وجہ سے روگ پیدا ہو جاتے ہیں ان کے لیے شفا ہے اور ہدایت ہے اور مومنوں کے لیے رحمت ہے۔"(52)

167۔"خبردار سن لو! بلاشبہ جو اللہ کے دوست ہیں، ان کو نہ تو کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔"(62)

168۔فرعون کی لاش کو دریا سے نکال لینے اور عبرت بنانے کی بات۔"(92)

سورۃ ھود 11:

169۔"زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو۔"(6)

170۔"آسمان زمین کو چھ دن میں بنایا۔(7)

171۔"جو شخص دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتا ہے تو ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور ان کے لیے دنیا میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔"(15)

172۔"یہی ہیں جن کے لیے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں۔"(16)

173۔"بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور اپنے رب کے سامنے عاجزی کی، یہی جنتی ہیں، ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔"(23)

174۔"اور دن کے دونوں سروں (یعنی صبح و شام) اور رات کے کچھ حصوں میں نماز پڑھا کرو، بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے، نصیحت ماننے والوں کے لیے۔"(114)

سورۃ یوسف 12:

175۔"حضرت یوسفؑ کا خواب، باپ نے کہا بیٹا! اپنے خواب کا ذکر اپنے بھائیوں سے نہ کرنا نہیں تو وہ تمہارے حق میں کوئی فریب کریں گے۔"

176۔"بے شک یوسف اور اس کے بھائیوں کے قصے میں دریافت کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔"(7)

سورۃ رعد 13:

177۔"اللہ وہی ہے جس نے بغیر ستونوں کے آسمانوں کو اونچا کھڑا کر دیا.....سورج اور چاند کو گردش پر لگا دیا۔(2)

178۔"وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا، پہاڑ دریا پیدا کیے، ہر قسم کے میوے، رات کو دن سے چھپاتا ہے، اس میں فکر کرنے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔"(3)

179۔"اللہ ہی جانتا ہے کہ کس عورت کے پیٹ میں کیا ہے۔"(11)

180۔"ہر شخص کے لیے فرشتے ہیں جو بدلتے رہتے ہیں کچھ اس کے آگے اور کچھ پیچھے کہ وہ اللہ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔"(11)

181۔"اچھے لوگوں کی پہچان۔" اللہ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں سخت عذاب کا خوف رکھتے ہیں۔(21)

صبر کرتے ہیں، نمازوں کی پابندی کرتے ہیں، رزق کو چپکے سے اور ظاہری بھی خرچ کرتے ہیں، بدسلوکی کو حسنِ سلوک سے ٹال دیتے ہیں۔(22)

182۔"اللہ جس کا رزق چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔"(26)

183۔"اللہ جس کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جسے چاہے قائم رکھتا ہے اور اللہ کے پاس اصل کتاب ہے۔"(39)

سورۃ ابراھیم 14:

184۔"کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے پاک کلمہ کی کیسی مثال دی ہے کہ وہ مشابہ ہے پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب مضبوط ہے اور شاخیں بلند ہوتی ہیں آسمان کی طرف۔"(24)

سورۃ حجر 15:

185۔"یقیناً ہم ہی نے اس قرآن کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"(9)

186۔"اور ہم نے آپ کو سات آیات عطا کیں جو بار، بار پڑھی جاتی ہیں۔"(سورۃ فاتحہ) اور عظمت والا قرآن عطا کیا۔"(87)

187۔"اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو یہاں تک کہ تم کو موت آجائے۔"(99)

(جاری ہے)

......یہ کہاں بچیں کہ دل ہے

رفعت سراج

بنی اسرائیل کا سونے کا بچھڑا آج ڈالر، پونڈ، یورو، درہم و دینار کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

دل جذبات کا استعارہ ہے مگر اب وہ دل کہاں . . .

سونے کے بچھڑے میں دل بھی سونے کا ہے . . .

دل کو رویا جاتا ہے، جگر کو پیٹا جاتا ہے . . .

کبھی ناقدروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے، یاریاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

الزام تراشیوں کا ایک طوفان بدتمیزی برپا ہو جاتا ہے۔

دل سے دل کو راہ بھی ہوتی ہے . . .

آج کا انسان یہ راہ سٹیلائٹ کے ذریعے search کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دل اور سونے کا بچھڑا . . .

عبادات، معاملات . . .

جنت گم گشتہ کے بے دخل باسیوں کی ازلی کہانی . . .

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا، غم روزگار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

قسط 20

زارا کسی جیت یا فتح کا یقین لے کر گھر میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ منتشر خیالات کا عکس اس کی چال سے مترشح تھا...... یوں جیسے بھیڑ میں راستہ بنا، بنا کر چلا جاتا ہے...... چال میں یکسانیت نہیں ہوتی...... آہستہ، آہستہ رک، رک کر......

''زارا......'' وہ اپنے خیال میں گم بیڈ روم کی طرف جا رہی تھی کہ تاجور کی آواز نے چونکا دیا۔

اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا۔

تاجور گھر کے بے تکلف سادہ سے لباس میں ملبوس تھیں۔ کھلی ڈھلی نائٹی جو نفیس و دبیز کپڑے سے تیار کی گئی تھی۔ بلیک زمین پر بڑے، بڑے سورج مکھی کے پھولوں کی عجب بہار تھی۔ پوری اور خوب کھلی، کھلی آستینیں، کیچر میں سمٹے ہوئے بال...... نظروں میں شدت و تپش...... زارا کی نگاہیں ماں کی نگاہوں سے ٹکرائیں اور اس نے پریشان

کُن پیغام وصول کیا......نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ خیریت نہیں ہے۔

''السلام علیکم اماں......'' اس نے گویا جان بچا کر نکلنا چاہا۔

''وعلیکم السلام......ہوگئی تمہاری combined study؟'' تاجور نے کڑے تیور کے ساتھ پوچھا۔

زارا نے فوراً نگاہ چرائی......دل بڑے زور سے دھڑکا......حلق ایک دم خشک ہوگیا......کیونکہ تاجور کے انداز، لب و لہجہ صاف بتا رہے تھے کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔

''وہ......اماں......بات یہ ہے کہ نشا کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی تھی اور......'' اس سے پیشتر کہ وہ جملہ مکمل کرتی تاجور نے اس کا جھوٹ سننے سے انکار کر دیا اور فوراً قطع کلامی کی۔

''اور وہ اپنی ماما کے ساتھ شاپنگ پر چلی گئی......شاپنگ کرنے سے اکثر لڑکیوں کی طبیعت ٹھیک ہو جاتی ہے ناں......!'' ان کے جملے میں واضح طنز تھا۔

''میرے روم میں آؤ......مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔'' تاجور نے تحکمانہ کہا اور دروازہ کھول کر اپنے بیڈ روم میں داخل ہوگئیں۔

زارا کے تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے......ٹانگوں میں لرزش ہونے لگی۔ جس طرح اکثر اس کا شیطانی ذہن مشین کی طرح چل پڑتا تھا اس وقت مفلوج محسوس ہو رہا تھا۔ راہِ نجات نظر نہیں آ رہی تھی......جھوٹ پکڑے جانے کا یقین تمام صلاحیتوں کو خفتہ کر رہا تھا۔

حکم عدولی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا......مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق وہ آہستہ قدموں سے چلتی ان کے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔

تاجور اس کے انتظار میں بے قراری سے ٹہل رہی تھیں......جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئی......ایک نگاہِ غلط اس پر ڈالی۔

''مجھے کوئی فضول بات نہیں سننی......صاف اور سیدھی بات کرو......کہاں گئی تھیں؟'' انہوں نے اب ڈپٹ کر سوال کیا تھا......آواز خاصی بلند تھی۔

''وہ اماں......''

''مجھے کچھ اور سننا ہی نہیں......یہ بتاؤ اس وقت کہاں سے آ رہی ہو؟'' تاجور نے اب بہت زور سے ڈانٹتے ہوئے سوال کیا۔

زارا نے ان کی اتنی اونچی آواز کبھی نہیں سنی تھی......آج تاجور بہت بدلی، بدلی نظر آ رہی تھیں۔

آنکھوں کے تاثرات سے لگتا تھا کہ اپنے کسی ایمپلائی سے بات کر رہی ہوں، اپنائیت یا کسی رشتے کا احساس دور، دور تک محسوس نہیں ہوتا تھا۔ رویّے ردِعمل کی بنیاد بنتے ہیں......الفاظ کا انتخاب کرنے کا راستہ بتاتے ہیں۔

وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر پائی......کیونکہ اندھیرے میں تھی۔

''وہ اماں......میں پرنس کے گھر ان کی دادی سے ملنے گئی تھی۔'' اس کے منہ سے الفاظ یوں پھسلے جیسے پانی اپنا راستہ بناتا ہے۔

تاجور کا اشتعال و غضب یوں ٹھنڈا ہوا جیسے بھڑکتے الاؤ پر ایک دم بادل ٹوٹ کر برس پڑے ہوں۔ حیرت سے پتھر بنی چند ثانیے زارا کو گھورتی رہیں......زارا میں نگاہ ملانے کا یارانہ نہیں تھا......بس نظریں جھکائے دبیز rug کو پاؤں کے انگوٹھے سے مسلنے لگی۔

''پرنس کی دادی......؟'' وہ ہکا بکا زارا کی صورت تک رہی تھیں۔



''جی اماں......وہ مجھے بہت اچھی لگیں......بہت فرینڈلی اور لوونگ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جب بھی وقت ملے میرے پاس آ جایا کرو......''

زارا، ماں کی بدلتی کیفیت کو محسوس کر کے اب خاصی خود اعتمادی سے بات کرنے لگی تھی۔

تاجور نے بے یقینی کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور سوچ میں پڑ گئی تھیں۔ زارا کے لیے ان کی یک دم خاموشی بہت اذیت ناک تھی......اسے اندازہ نہیں تھا کہ اب تاجور اس سے کیا سوال کریں گی......کہ پہلے سے کوئی مناسب جواب تیار کر لیتی۔

''تم ماں سے جھوٹ بول کر منہ اٹھا کر اس گھر میں چلی گئیں......تمہیں اندازہ نہیں اب اُن لوگوں کے ساتھ ہمارا کیا رشتہ ہے......؟ وہ عام لوگ نہیں ہیں......اگر انہوں نے تکلفاً کہہ بھی دیا تھا تو تمہیں اتنی آفت کیوں آ گئی تھی کہ صبح ہوتے ہی وہاں جانے کا سوچ لیا......پھر مجھ سے چھپاتے، جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟'' تاجور اب چلتی ہوئی عین اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی تھیں۔

''وہ......اماں مجھے ڈر لگ رہا تھا۔'' اس نے خوفزدہ نظر آنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور بھرپور اداکاری کی۔

''اور......ڈر کیوں لگ رہا تھا؟'' تاجور کے لہجے میں نرمی نہ سہی مگر سرد مہری ضرور تھی۔ غیظ و غضب کا زور

ٹوٹ چکا تھا۔

''کہ آپ مجھے اجازت نہیں دیں گی...... پرنس کی گرینڈ مام میں عجیب سی مسٹری ہے...... جو مجھے اٹریکٹ کرتی ہے...... مجھے ان کی باتیں بہت مزے کی لگتی ہیں...... میں ان کی کمپنی بہت انجوائے کرتی ہوں۔'' زارا نے اس موجودہ لمحے کے عذاب سے جان چھڑانے کے لیے فوراً تاجور کے لہجے کی نرمی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔

''شٹ اپ......'' تاجور نے آہستہ سے ''شٹ اپ......'' کہا تھا کیونکہ اب وہ ذہنی طور پر بکھری ہوئی تھیں...... ان کے اپنے اندازے وقیاس اور زارا کی بیان بازی و وضاحتیں...... ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ زارا ڈر کر یک دم خاموش ہو گئی۔

''اب میں تمہارے مزید ایڈونچر برداشت نہیں کر سکتی...... کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ اور جو ایک مرتبہ جھوٹ بولے اس کا ہمیشہ اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔''

"I am sorry" زارا نے کسی متوقع خوفناک سزا کے خیال سے خوفزدہ ہو کر فوراً معذرت کرنے میں عافیت جانی......

''جو غلطیاں زیادہ کرتا ہے اس کی حیا ختم ہو جاتی ہے اور جس کی حیا ختم ہو جائے وہ جو مرضی کر سکتا ہے۔ تم مجھ سے اتنا زیادہ سوری کر چکی ہو کہ اب جو تم پر اعتبار کرے اس سے بڑا جاہل کوئی نہیں۔''

اس سے پیشتر کہ تاجور، زارا کی معذرت سے زیر ہوتیں انہوں نے اپنی فیصلہ کن طبیعت کو مغلوب ہونے سے بچا لیا اور انتہائی دوٹوک لہجہ اپنا لیا...... کیونکہ زارا کا گزشتہ ریکارڈ ذہن میں روشنی کی رفتار سے گھوم گیا تھا۔

سفینہ کی سسرال کا معاملہ تھا اس کو ہلکا نہیں لیا جا سکتا تھا، یہ بیوقوف لڑکی جس کو ہمیشہ بے سوچے سمجھے بات کرنے کی عادت ہے ان انٹیلیکچوئل لوگوں سے جب ''بے مغز'' باتیں کرے گی تو خاندان کا کیا تاثر کیا جائے گا۔

تاجور نے تو زارا کی ساری چالاکیاں اپنے پاؤں تلے دفن کر دی تھیں...... نہ سچ بول کر بات بنی نہ معذرت سے دل پگھلا...... وہ ششدر سی کھڑی اب تاجور کی صورت تک رہی تھی۔

''تمہاری زندگی کا کوئی goal (مقصد) ہے...... نہ تم کوئی شاندار کیریئر اپنا سکتی ہو، تم جیسی لڑکیوں کو صرف شادی ہی پروٹیکٹ کرتی ہے۔ شوہر، عورت کا سوشل اسٹیٹس ہوتا ہے مگر تم جیسی لڑکیوں کو ایک مضبوط شوہر کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں ڈانٹ پھٹکار کرتے، کرتے تھک مری ہوں...... میرے پاس بزنس کے اتنے ایشوز ہوتے ہیں کہ تمہاری ہر وقت کی چوکیداری نہیں کر سکتی۔ بس میں سفینہ سے پہلے تمہاری شادی کر دوں گی۔''

تاجور بولتے، بولتے تھک گئیں...... خود کو ہلکا کرنے کے لیے بہت ضروری تھا کہ جو طے کر چکی ہیں اس کا اظہار آج ہی کی تاریخ میں زارا پر کر دیں۔

''شادی......؟ اتنا بڑا فیصلہ...... وہ بھی کھڑے، کھڑے۔'' زارا کے کانوں میں طوفانی ہواؤں کی شوں، شوں ہو رہی تھی۔

''کس سے کریں گی میری شادی...... مجھ سے تو آج تک کوئی پروپوزل ڈسکس ہی نہیں کیا گیا۔ میں کسی قبیلے کی کشمالے یا زرینہ ہوں......؟ جسے اِس قبیلے سے اُس قبیلے میں شادی کا نام دے کر ٹرانسفر کر دیا جائے؟'' اس کی فطری خودسری عود کر آئی...... اس نے باغیانہ جذبات کا اظہار کرنے کی نیت کی اور اب ڈھٹائی سے اُن کی طرف دیکھا تھا۔

''تم جا سکتی ہو......'' تاجور نے جو کہنا چاہا کہہ دیا تھا...... اب مزید کچھ کہنے کے لیے انہیں مناسب وقفہ درکار تھا۔

''اماں...... ایک منٹ...... میری بات سنیں...... میرے ایک سوال کا جواب تو دے دیں۔''

جب بات فیصلہ کن مرحلے تک آ ہی گئی تھی تو مصلحتیں اپنی موت آپ مرنے لگی تھیں۔

''شٹ اپ...... میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں ہوں...... now you can go'' تاجور کا انداز حتمی تھا۔

''اماں میں نے آپ سے سوری بولا ہے ناں......'' زارا نے کچھ اور بھی کہنا چاہا مگر تاجور نے اسے روک دیا۔

''اتنا تم کھانا نہیں کھاتیں جتنا سوری بولتی ہو...... اسی لیے ڈھیٹ بنتی جا رہی ہو۔ اگر اب میں نے تمہاری غلطیاں اگنور کیں تو تم کسی اچھے انسان کا گھر آباد نہیں کر سکو گی......'' تاجور نے اب بہت آہستہ آواز میں کہا۔

''اماں......!''

''زارا...... آپ اس وقت یہاں سے چلی جائیں۔'' تاجور نے بازو پھیلا کر ہاتھ سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

زارا کو فوری اندازہ ہو گیا کہ اب واقعی اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے، تاجور کے تاثرات میں کوئی رعایت نہیں جھلک رہی تھی۔ وہ سر ڈال کر باہر کی طرف چلی......

تاجور گرنے کے انداز میں اپنی آرام دہ سیٹ پر بیٹھ گئیں اور جھولنے لگیں۔ ذہن سے غبار اتر چکا تھا......

یوں جیسے سات دن کی جھڑی کے بعد نکلنے والا سورج نیا لگتا ہے اور چمکیلی دھوپ سے زمین دور تک روشن دکھائی دیتی ہے۔

☆☆☆

پرنس، زارا کے جانے کے بعد خاصی دیر الجھا رہا...... مدت بعد ذہن یکسو نہیں تھا ایک وقت میں مختلف راستوں پر دوڑ رہا تھا...... وہ ایسی بے کلی و بے قراری کا عادی نہیں تھا...... اسے اپنی ذات، اپنے نفس پر مکمل کنٹرول رہتا تھا...... مگر...... آج وہ زندگی کی نئی جہت سے آشنا ہو رہا تھا۔

اسی لیے دانا لوگ کہہ گئے کہ ''مہد سے لحد تک علم حاصل کرو۔'' علم بے کنار سمندر ہے...... جو جانتا ہے، جاننا چاہتا ہے...... وہ آخری سانس تک سیراب نہیں ہوتا۔

''وہ پہلے صندل کا حالِ زار ملاحظہ کرے...... یا لیڈی صوفیہ کو اس حادثے سے باخبر کرے......؟''

اصل سوال یہ تھا...... جس کے جواب تک رسائی نہیں ہو پا رہی تھی...... تاہم یہ امید تو اس کو ڈھارس دے رہی تھی کہ بوڑھی دادی کے پاس سے ہی اس مسئلے کا حل نکلے گا...... کیونکہ وہ مصلحتوں و احتیاط کی زنجیروں سے آزاد ہو چکی تھیں...... جو بھی حل آتا تھا وہ بچوں کی سی بے ساختگی سے ہی آتا تھا...... کہ بچے غیر سیاسی ہوتے ہیں...... اپنے خیالات پر کنٹرول نہیں رکھتے...... عین فطرت پر ہوتے ہیں...... جو دل میں ہوتا ہے، زبان پر آ جاتا ہے۔

جس طرح دریا فطری انداز میں بہتا ہے...... سورج اپنے وقت پر طلوع ہوتا ہے...... بیج اپنے وقت پر اپنی موجودگی کا اظہار کرتا ہے...... اسی طرح فطرت بچوں کو...... force کرتی ہے...... وہ اپنے ارادے کے پابند نہیں ہوتے۔

اور بوڑھا انسان بھی پلٹ کر اپنی ابتدائی فطرت پر آ جاتا ہے...... لیڈی صوفیہ جاننے کے بعد جو کچھ بے ساختہ بولیں گی...... وہ عین فطرت وحق ہو گا...... ان لمحات میں بوڑھی دادی کا وجود اللہ کی رحمت کا ٹھنڈا سایہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے صندل کے پاس جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور لیڈی صوفیہ کے سامنے آنے کا انتظار کرنے لگا...... اور انتظار کی یہ گھڑیاں اسٹوڈیو میں گزارنے کا ارادہ کر کے باہر کی طرف آہستہ خرامی سے بڑھنے لگا۔

☆☆☆

صندل گیسٹ روم کا جائزہ لینے کے بعد تھک کر لیدر کی جدید ڈیزائن کردہ سیٹ پر بیٹھ گئی...... جو دیکھنے میں ساحل پر کھڑی چھوٹی سی کشتی کے مماثل تھی...... سر اور پاؤں کی طرف سے فرش سے اونچی...... وہ گرنے کے انداز میں بیٹھی تھی...... سیٹ خود بخود جھولنے لگی تھی...... جھولا ملتے ہی ذہن کو عجیب طرح کا سکون محسوس ہوا۔

وہ قربانیاں دینے والی، برداشت کرنے کی خوگر تھی...... جس ظالم کے نکاح میں تھی دل و جان سے اس کی وفادار تھی...... وہ اس کے بچے کا باپ تھا...... معاشرے میں اس کے بیٹے کی عزت کی ضمانت......

پرنس کسی بھی عورت کو متوجہ کرنے کی خصوصیات سے مالا مال تھا مگر صندل کی اس کے لیے قبولیت و پسندیدگی ایسی ہی تھی جیسے صحرا کی رات میں چاند کی روشنی...... وہ اسے خدا کی جانب سے ''فرستادہ'' سمجھ رہی تھی۔ اس لیے کہ ایک قطرۂ خلوص کے انتظار میں وہ ایک عمر طے کر چکی تھی...... اس کی زندگی میں نہ خلوص کی حلاوت سے آشنائی تھی نہ سچی محبت کا مان و اعتماد......

اسے بس یہ پتا تھا کہ اس نے ایک مرد کی تمام خواہشات کا احترام کرنا ہے۔ ''انکار'' کو اپنی زندگی سے نکال پھینکنا ہے...... اور اس کے بعد ہی اسے زندہ رہنے کی اجازت ملے گی......

وہ مضطرب تھی کہ کب پرنس اس کی اس مصیبت کا کوئی حل لے کر اس کے سامنے آئے گا...... کب وہ اپنے بیٹے کو سینے سے لگا کر جی بھر کر پیار کرے گی۔

کھانے کی ٹرالی اس کے سامنے تھی، خوب صورت برتنوں میں نعمتیں سجی تھیں مگر اس نے تھوڑی سی فروٹ چاٹ، گرین سلاد اور ایک گلاس فریش جوس کے علاوہ کچھ نہ لیا تھا...... وہ بھی اس وجہ سے کہ اس نے صبح ناشتا نہیں کیا تھا...... اسے پاؤں جما کر کھڑے ہونے کے لیے توانائی چاہیے تھی، وہ اپنے بیٹے کے لیے زندہ رہنا چاہتی تھی...... ذہن مسلسل ثوبان کی طرف لگا ہوا تھا...... معاً اس کے کانوں میں پرنس کی آواز گونجی۔

''بہت اچھا موقع ملا ہے، آپ اللہ سے رابطہ کیجیے......'' اسے خیال آیا کہ آج اس نے فجر کی نماز پڑھی نہ ظہر کی...... اسی رابطے نے تو اس کو گھٹن اور خودکشی سے بچایا تھا...... اسے تو تنہائی میں اللہ سے باتیں کرنے کی عادت پڑ چکی تھی...... مگر آج کیا ہوا......؟ وہ کب سے اس کمرے میں سکتے کی کیفیت میں بیٹھی ہے۔

وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی اور واش روم کی طرف وضو کرنے کی نیت سے بڑھ گئی۔

☆☆☆

لیڈی صوفیہ تیار ہو کر انجیلا کے ساتھ بیڈ روم سے باہر آئیں تو شام کی چائے پر لیڈی صوفیہ کے انتظار میں بیٹھا ہوا پرنس ایک مخصوص مہک محسوس کر کے چونک پڑا...... اور مستعد و چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔

اس وقت وہ بہت نرم و دبیز آرام دہ قمیص شلوار میں ملبوس تھا۔ سیاہ رنگ کا شلوار قمیص وہ خال، خال ہی استعمال کرتا تھا...... شام کی چائے پر تو وہ کبھی سیاہ رنگ کا لباس نہیں پہنتا تھا، آج کی یہ تبدیلی بڑی نئی، نئی اور چونکا دینے والی تھی۔

لیڈی صوفیہ نے ڈائننگ میں داخل ہوتے ہی پرنس کو بہت ناقدانہ انداز میں دیکھا تھا۔

پرنس کھڑے ہو کر مؤدبانہ سر کو خم دے کر تعظیم بجا لایا۔ لیڈی صوفیہ نے اس کے سر پر آہستگی سے ہاتھ رکھا اور مسکرائیں۔

''ماشاءاللہ......!'' کہہ کر وہ مرکزی چیئر پر براجمان ہو گئیں۔

''بس ایک دم ہی سے بہت زیادہ تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔ بیڈ پر لیٹتے ہی گہری نیند سو گئی۔ زارا کو خدا حافظ

بھی نہ کہہ سکی...... مگر میں اسے فون کر کے معذرت ضرور کروں گی، ویری کیوٹ۔'' وہ زارا کا تصور کرتے ہوئے مسکرائیں۔ پرنس کا ذہن صندل میں الجھا ہوا تھا۔ وہ زارا کے موضوع پر کوئی جواب دے کر اس گفتگو کو آگے بڑھانے کے موڈ میں ہرگز بھی نہیں تھا۔ چائے کے برتن اور ہلکے پھلکے اسنیکس ٹیبل پر سجے ہوئے تھے۔ لیڈی صوفیہ کے بیٹھتے ہی چائے بھی آ گئی۔ انجیلا چائے بنانے لگی۔

لیڈی صوفیہ کو پرنس کی خاموشی نے چونکا دیا۔

''میں تم سے زارا کی بات کر رہی ہوں...... تم نوٹس ہی نہیں لے رہے؟'' ان کے لہجے میں تفکر کی آمیزش تھی۔

''جی...... ایکچوئیلی...... میں زارا کو بتا چکا تھا کہ گرینڈ مام ذرا سا بھی ریسٹ لیس ہو جائیں تو طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔''

''اوکے......'' پرنس کی بات سن کر لیڈی صوفیہ قدرے مطمئن نظر آئیں۔ پرنس نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

''میم...... آپ کچھ لیں گی؟'' انجیلا اسنیکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں، ایک کیک پیس ضرور لوں گی۔'' لیڈی صوفیہ نے پرنس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

انجیلا نے گولڈن کناروں کی سفید پلیٹ میں کیک پیس رکھ انہیں پیش کیا۔

پرنس چائے کے چھوٹے، چھوٹے گھونٹ لے رہا تھا نظر میں گہری سوچ کا تاثر تھا۔

''زارا کو اس وقت ہمارے ساتھ ہونا چاہیے تھا...... اس کی کمپنی انجوائے کرنے کا بیسٹ ٹائم...... ٹی ٹائم ہے...... بہت ذہین اور ایکٹو ہے۔''

لیڈی صوفیہ کے اعصاب پر ابھی تک زارا سوار تھی...... پرنس کو زارا کا نام و ذکر بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔

ایک افتاد سر پر آپڑی ہو تو ذہن اسی طرف یکسو ہو جاتا ہے۔ جیسے پیالہ لبالب بھر گیا ہو...... مزید کی گنجائش نہ ہو......

''سفینہ...... زارا سے بہت مختلف ہے...... وہ خاموش بھی ہو تو اس کی کمپنی اچھی لگتی ہے...... زارا کا بات کرنا بہت ضروری ہے۔'' لیڈی صوفیہ اب دونوں بہنوں کا تقابلی جائزہ لینے لگیں۔ سفینہ کے نام پر پرنس کے ذہن میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا وہ یک دم کسی خیال سے باہر آ گیا...... اور لیڈی صوفیہ کی طرف دیکھنے لگا...... مگر خاموش رہا۔

انجیلا ٹشو پیپر لیڈی صوفیہ کی طرف بڑھا رہی تھی۔

''انجیلا...... آپ جا سکتی ہیں...... آپ کی ضرورت ہوئی تو آپ کو کال کر لیں گے...... پلیز۔''

انجیلا نے روبوٹ کی طرح سر کو خم دیا اور ایڑیوں پر گھوم گئی۔

لیڈی صوفیہ نے اب تعجب سے پرنس کی طرف دیکھا......

''میں کچھ اسپیشل آپ سے شیئر کرنا چاہتا ہوں...... مجبوری ہے گرینڈ ما م...... آپ سے شیئر کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنی کہ سانس لینی۔'' پرنس، لیڈی صوفیہ کے متوقع ردِعمل کے باعث بہت محتاط انداز میں بات کر رہا تھا۔

''کیا میں برداشت کر سکوں گی......؟ کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے، میرا خیال ہے تم زارا کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہو......؟ کیونکہ آج تم نے اس کے ساتھ کافی وقت گزارہ ہے...... اس کے ساتھ لنچ کیا ہے۔'' اعصابی کمزوری کے باعث وہ بے صبری سے اندازوں میں کھیلنے لگیں۔

''ناٹ ایٹ آل گرینڈ ما م......'' پرنس نے بھی جواب دینے میں دیر نہیں کی۔

''پھر......؟'' اب لیڈی صوفیہ نے نہایت تعجب سے دیکھا تھا۔

''گرینڈ ما م...... ایک انسان کی پرا پر ہیلپ کرنی ہے۔ اللہ ہمیں ایک انسان کی زندگی بچانے کا موقع دے رہا ہے...... may be اس نیکی کے بعد ہماری روح بہت خوب صورت ہو جائے۔ چھوٹی بڑی بے پروائیوں، کوتاہیوں کے داغ دھبے ہماری روح سے صاف ہو جائیں...... اور ہمیں وہ خوشی ملے جو آخری سانس تک ہمارے ساتھ رہے۔'' پرنس، دادی کا مزاج آشنا ہونے کے باعث بہت احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کر رہا تھا۔ بولتے ہوئے اس کی نگاہ میز کی سطح پر مرکوز تھی۔ لیڈی صوفیہ نے کپ میں بچی ہوئی چائے کی طرف دیکھا...... کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر رک گئیں...... اور پرنس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگیں۔

☆☆☆

ماہین ٹینس کھیلنے باہر جا چکی تھی...... سفینہ کو بہت زیادہ تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی، وہ کچھ دیر گہری نیند سونا چاہتی تھی...... پردے برابر کر کے وہ بیڈ پر دراز ہو گئی اور اپنا سیل فون اٹھا کر عادتاً ایک نظر ڈالی، یہ بھی چیک کر رہی تھی کہ جس دوران اس کا فون آف تھا کسی نے اسے ٹرائی تو نہیں کیا...... جیسے دل کو یقینِ واثق تھا کہ پرنس کی کوئی مس کال ہو گی...... کیونکہ ساحل کی آمد نے سارے رومان کا ستیاناس کر دیا تھا...... بات ادھوری رہ گئی تھی اور اسے پرنس سے رابطہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہاسٹل پہنچنے کے بعد ماہین سر پر سوار تھی۔

''کتنی خوب صورت باتیں کر رہا تھا پرنس......'' وہ پرنس کے خیال میں کھو کر مسکرائی۔

''میں نے تو کبھی آئیڈیل بھی نہیں بنایا...... کبھی فیوچر بھی پلان نہیں کیا...... ایک دم سے زندگی اتنی خوب صورت ہو جائے گی میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا۔'' دل میں ایک میٹھا، میٹھا سا درد اٹھنے لگا...... اس درد کی ریشمی سی لہروں میں بہت لطف تھا...... چہار سو گلابی رنگ برسنے لگا۔ اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔

چاہے جانے کے اندھے یقین سے نسوانیت مکمل ہوتی ہے۔ عشوے اور غمزے تخلیق ہوتے ہیں...... روٹی،

روزی، بیوپار کی فکروں سے آزاد عورت ہی مکمل نسوانیت کی ترجمان ہوتی ہے۔ موٹی، موٹی کتابیں پس منظر میں چلی گئیں...... اور وہ میٹھی نیند سو گئی یوں جیسے کوئی نشے کی حالت میں سو جائے۔

☆☆☆

''یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کسی نے مونا لیزا کی پینٹنگ پر سیاہی چھینک دی ہو، ہم اس مظلوم لڑکی کو شیلٹر کریں گے۔'' خلافِ توقع لیڈی صوفیہ نے بہت مضبوط اعصابی کا مظاہرہ کر ڈالا تھا۔ شاید جذبۂ انسانیت میں طاقت ہی اتنی ہوتی ہے کہ کمزور انسان کی رگ، رگ میں توانائی بھر دیتا ہے۔

انہوں نے بہت توجہ سے سارا ماجرا سنا تھا...... اور پرنس نے دادی کے مزاج کے مطابق بہت ناپ تول کر الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ لیڈی صوفیہ کے مثبت ردِعمل نے پرنس کے تنے ہوئے اعصاب فوراً ڈھیلے کر دیے تھے۔

اسے اپنی نیک نیتی کی وجہ سے اپنے اللہ پر پورا یقین تھا کہ یہ اعصابی جنگ بس بہت تھوڑی دیر کے لیے ہے۔

''میں نے جو کاٹیج انجیلا کو گفٹ کیا تھا ابھی انجیلا کو اس کی ضرورت نہیں...... اس لڑکی کو وہاں پہنچا دینا چاہیے......'' وہ سوچتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ لیڈی صوفیہ کی بات سن کر پرنس تذبذب کا شکار ہو گیا۔

''sorry to say گرینڈ ما م یہ حل نہیں ہے۔'' پرنس کی بات سن کر لیڈی صوفیہ کی پیشانی کی عمودی لکیریں گہری ہو گئیں۔

''اسی حل کے لیے ہی تو اس کا شفٹ ہونا ضروری ہے...... وہ وحشی ہم دونوں کو تھکا دے گا۔ تمہیں معلوم ہے میں اب اسٹریس لینے کے قابل نہیں ہوں، نہ ہی کسی سے فضول بات کرنے کا اسٹیمنا ہے مجھ میں۔'' لیڈی صوفیہ نے بلا روک ٹوک بالکل صاف، صاف بات کی۔

''اس کا ایک بیٹا بھی ہے گرینڈ ما م...... وہ معصوم بچہ اس وحشی کی کسٹڈی میں نہیں دیا جا سکتا۔''

''میں زوار حسین سے بات کرتی ہوں...... اسے اریسٹ ہونا چاہیے۔ otherwise اس نے مرڈر کرنے کا لائسنس تو لیا ہوا ہے...... ہم عزت دار لوگ ہیں...... اس درندے کو اپنی عزت کا تماشا بنانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ اس سے پہلے کہ اس کے ہاتھ ہماری عزت کی طرف بڑھیں ہم اس کو اس کی جگہ پر بٹھا دیں گے۔''

لیڈی صوفیہ مارے جذبات کے کانپنے لگیں۔

''مجھے ابھی...... اسی وقت زوار حسین سے بات کرنی ہے...... رات سے پہلے، پہلے اس کرمنل کو اریسٹ ہو جانا چاہیے۔ انجیلا کو بلاؤ' مائی گاڈ...... ظلم کی کوئی انتہا ہے...... جب نوجوان صوفیہ، شوہر کے بغیر زندہ رہ سکتی ہے تو صندل کیوں نہیں رہ سکتی۔''

پرنس کی سوچ منتشر تھی وہ اس تجویز پر فیصلہ کُن ردِعمل کی طرف نہیں آیا تھا...... مگر بات تو لیڈی صوفیہ کی ہی ماننا تھی...... اس نے ٹیبل پر رکھی گھنٹی کا بٹن دبایا...... اور انجیلا حاضر ہو گئی......

☆☆☆

تاجور نے کافی غور و خوص کے بعد ساحل سے ملاقات کا بہانہ ڈھونڈ ہی لیا...... ان کے ایک بزنس پارٹنر کی فائل نامکمل حالت میں ٹیبل پر پڑی تھی۔ ایک ضروری ای میل جنریٹ نہ ہونے سے آڈٹ میں دردِ سر بنی ہوئی تھی...... کیونکہ غلطی ان کے آفس کی تھی اس لیے پارٹنر کو حقیقت بتانے میں تامل تھا۔

سیکنڈ لاسٹ ای میل کی روشنی میں معاملہ سلجھانے کی کوششیں جاری تھیں، ان کے ذہن میں آج سے پہلے بھی ساحل کا نام آیا تھا کہ وہ اس سے شیئر کریں تو ممکن ہے وہ کوئی آسان حل سمجھا دے...... آفس پہنچتے ہی وہ اتنی مصروف

ہو جاتی تھیں کہ لنچ وقت پر نہیں کر پاتی تھیں۔

یہ ایک پرائیویٹ اینڈ کانفیڈینشل معاملہ تھا ہر کسی سے شیئر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

وہ یہ جان چکی تھیں کہ ساحل اپنی موجودہ پوزیشن پر بہت خوش اور مطمئن ہے، وہ جاب بدلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا...... سیلری میں ایک صفر کا اضافہ معمولی ترقی نہیں ہوتی...... ایسی جاب برقرار رکھنے کے لیے انسان بیس گھنٹے کام کرنے کے لیے بھی ذہن بنا لیتا ہے۔ اور اب تو وہ ساحل کو اپنا فیملی ممبر بنانے کا سوچنے لگی تھیں...... اعتبار ہر تعلق کی بنیاد بنتا ہے۔

وہ ساحل کا خاندانی پس منظر، خاندان کے افراد کے بارے میں ابتدائی معلومات لینا چاہتی تھیں۔

یہاں تک تو ان کو پتا تھا کہ اس کے والد نہیں ہیں...... اس کی درخواست پر باپ کے نام کے ساتھ late (مرحوم) لکھا ہوا تھا۔

کافی سوچ بچار کے بعد انہوں نے ساحل کا نمبر ڈائل کیا...... مگر کال وصول نہیں کی گئی...... انہوں نے دوسری مرتبہ کوشش کرنے کے بعد یہ سوچ کر سیل رکھ دیا کہ اب وہ خود مسڈ کال دیکھ کر رابطہ کرے گا مگر صبر نہیں ہو رہا تھا...... مگر صبر کرنا تھا...... پہاڑ کی چوٹی سر کرنا ہو تو قدم آہستہ رکھنا پڑتے ہیں۔

☆☆☆

صندل، لیڈی صوفیہ کو سامنے پا کر حواس باختہ انداز میں اپنی جگہ سے کھڑی ہو چکی تھی جو اسے پلکیں جھپکائے بغیر ایک ٹک گھور رہی تھیں۔ اس نے بدقت تمام سلام کیا...... اور طاقتور شخصیت کے سامنے گویا اس کی گھگی بندھ گئی تھی۔

اتنی شاندار، بارعب، خود اعتماد بوڑھی عورت جو انتہائی قیمتی ساڑی اور اصلی زیورات پہننے کے بعد سارے ماحول پر حاوی محسوس ہو رہی تھی...... صندل اس مقناطیسیت سے حواس باختہ نہیں خوفزدہ و وحشت زدہ نظر آ رہی تھی۔

''موت اپنے وقت سے پہلے نہیں آتی...... موت کا خوف موت نہیں ہوتا...... تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں...... میں اسے آج ہی اریسٹ کرا دوں گی۔ تم اکیلی نہیں ہو...... ایسٹ (مشرق) میں بے شمار مرد حق مہر کو عورت کی کل قیمت سمجھتے ہیں...... اور اسے مویشی کی طرح استعمال کرتے ہیں۔''

لیڈی صوفیہ نے غیر ضروری تکلفات نظر انداز کر کے دوٹوک بات کی جیسے ہلکے بادلوں کو روند کر بھری دوپہر کا سورج اپنی موجودگی کا اظہار کرتا ہے۔

''ار...... ریسٹ......'' صندل کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''تمہیں ستی ساوتری بننے کی ضرورت نہیں...... میرا شوہر مجھے بیوی کے بجائے محبوبہ سمجھتا تھا...... مجھ سے جدا ہو گیا اور میں آج تک زندہ ہوں...... جس تعلق میں رحم و محبت نہ ہو اسے ختم ہو جانا چاہیے...... اللہ نے اجازت دی ہے...... اس لیے کہ زندگی اہم ہے...... موت تک اپنی جان کی حفاظت کرنا فرض ہے۔ اب تم مطمئن ہو جاؤ...... میں اس ظالم کو نہیں چھوڑوں گی۔ جس کو لوگوں کی جان اور عزت کی پروا نہیں ہو اسے سرعام پھانسی کی سزا ہونی چاہیے۔ میں ظالم کے لیے اتنی ہی سخت ہوں جتنا سخت ظالم، کمزوروں پر ہوتا ہے۔ تم میری سختی کو اس کی سختی کے ساتھ ملٹی پلائی کر سکتی ہو...... میری طرف سے اجازت ہے۔''

اسے بولنے کا یارا نہ تھا...... لیڈی صوفیہ کو اس کے بولنے سے کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔

اپنی سی کہہ کر انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چھڑی کو زور سے فرش پر مارا...... انہوں نے شاہانہ انداز میں اسے اجازت دی تھی...... صندل جیسی احساسِ کمتری کی شکار عورت تو ویسے ہی تھر تھر کانپ رہی تھی...... اس کے لیے تو یہی

غنیمت تھا کہ اسے بات کرنے پر مجبور نہ کیا جائے......

''I am blessed میری وجہ سے ایک سسکتی ہوئی روح کو آزادی ملنے والی ہے۔'' لیڈی صوفیہ کے لہجے میں افتخار تھا۔

''کوئی میری قیمتی شے چرا لے میں اسے معاف کر سکتی ہوں...... لیکن اپنی عزت کے دشمن کو کبھی معاف نہیں کر سکتی...... اب تم ریلیکس کرو...... جلد گڈ نیوز سنو گی۔''

وہ واپسی کے لیے پلٹ گئیں...... صندل نے رکی ہوئی سانس پھیپھڑوں سے آزاد کی...... اور لیڈی صوفیہ کی پشت کی طرف دیکھنے لگی۔ لیڈی صوفیہ اچانک پلٹیں جیسے کوئی ضروری بات یاد آ گئی ہو۔

صندل سہم گئی۔

''میرا بیٹا کسی کو ایک جڑ دے تو اسے دن میں تارے نظر آ جائیں مگر ہمارے ہاں طاقت کے استعمال سے گریز کیا جاتا ہے...... یہ تو جانوروں کا ہتھیار ہے۔''

ان کے قدموں کی آہٹ اور چھڑی کی ٹک، ٹک سن کر اوٹ میں کھڑی انجیلا سامنے آ گئی اور لیڈی صوفیہ کا بازو کسی سوغات کی طرح اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

لیڈی صوفیہ کے باہر جاتے ہی صندل دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئی......

''سلمان اریسٹ ہو گا...... پھر کبھی آزاد بھی تو ہو گا...... اور اس کی آزادی کا مطلب میری موت ہو گا...... میں پرنس کی دادی سے سوال جواب کرنے کی ہمت نہیں رکھتی...... مگر پرنس سے ضرور بات کر سکتی ہوں۔ صحت مند شیر سے زیادہ زخمی شیر خطرناک ہوتا ہے۔ مجھے اپنی تو پروا نہیں...... میری سوچ تو ثوبان سے شروع ہو کر ثوبان پر ختم ہوتی ہے۔ کتنا رو رہا ہو گا وہ۔'' دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

پورے چالیس منٹ ترپن سیکنڈ بات کی تھی آپا نے...... انیس منٹ کم تھے بلکہ انیس منٹ سات سیکنڈ...... فون بند کر کے خیال آیا ہو گا کہ گھنٹا تو ہوا نہیں پہلے ہی بند کر دیا...... پھر پیکج کا فائدہ ہی کیا ہوا......؟ وہ باتھ گاؤن لپیٹے...... باتھ گاؤن کی ٹوپی سے سر رگڑتا...... پیچ و تاب کھاتا سیل فون اٹھانے کے لیے آگے بڑھا۔

تین نیک شریف پابند صوم و صلوٰۃ لڑکیوں کے رشتے بتائے تھے آپا نے۔ جن میں سے ایک اسکول ٹیچر، ایک گیارہ جماعت پاس ٹائی فائیڈ کے باعث بارھویں کا امتحان نہیں دے سکی تھی بقول آپا کے، اتنی حسین ہے کہ پانی پیے تو گلے سے نظر آتا ہے ہاتھ لگائے سے میلی ہو۔

''ایسی بیوی کا کیا فائدہ جو ہاتھ لگائے سے میلی ہو جائے...... فضول میں صابن، شاور جیل کا خرچہ......''

وہ آپا سے بات کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا...... کتنا بھی غصہ ہو وہ آپا سے بدتمیزی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ماں کے بجائے تھیں...... ماں کے مرنے کے بعد کوئی تہ والے پراٹھے بنا کر کھلاتا ہے...... مگر آپا نے کھلائے تھے...... بلکہ نوالے بنا، بنا کر منہ میں ٹھونسے تھے۔

اس نے مسڈ کال کا آپشن کھولا...... واش روم میں نہانے کے دوران سیل فون پر لگا تار رنگ ہو تو بندے پر ویسے ہی عجلت طاری ہو جاتی ہے۔

''تاجور میم......'' سارا غصہ بخارات بن کر اڑ گیا۔

''دو مرتبہ ٹرائی کیا......؟''

''ضرور کوئی خاص بات ہو گی...... ورنہ ان کا تو ایک مرتبہ کال کرنا بھی بہت ہے۔'' وہ تاجور کو ڈائل کرتے

ہوئے فکر مندی سے سوچ رہا تھا۔
دوسری گھنٹی پر ہی رابطہ قائم ہو گیا تھا۔
''ہیلو......'' تاجور کی نفیس و واضح آواز سماعت سے ٹکرائی۔
''السلام علیکم میم......'' اس نے اعتماد سے سلام کیا۔
''وعلیکم السلام...... ساحل آپ اس وقت بزی تو نہیں ہیں؟'' تاجور بہت مہذبانہ انداز میں جاننا چاہ رہی تھیں۔
''نو میم...... حکم کیجیے......'' وہ کسی ضرورت مند کی طرح عاجزی سے گویا ہوا۔
''اصولاً تو آپ کی چھٹی ہے آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہیے...... مگر بزنس میں چھٹی کا لگا بندھا اصول چلتا نہیں ہے...... بعض اوقات ایکسٹرا کام کرنے کی نوبت آجاتی ہے۔''
''آپ حکم کیجیے میم......'' تاجور کی بات سے پہلے کی پیش بندی نے اسے خاصا متفکر کر دیا تھا...... آج سے پہلے ان کی یہ ''ٹون'' بھی نہیں تھی۔
''مخدوم انٹر پرائزز کی فائل پر تھوڑا سا کام کرنا ہے کیونکہ مجھے لگتا ہے کل وہ مجھ سے اس سلسلے میں ضرور رابطہ کریں گے...... ہو سکتا ہے ٹائم لے کر آفس ہی آجائیں...... کچھ issues کلیئر نہیں ہو رہے...... میں چاہتی ہوں آپ مجھے ہیلپ آؤٹ کریں...... اب یہ مزید pending میں نہ جائے۔''
''اوہ......!'' سفینہ کا چہرہ بادلوں کی اوٹ سے چاند کی طرح جھانکا۔
اس وقت luck زبردست فیور کر رہی ہے۔ ممنونِ احسان کرنے کا ایک اور راستہ......
''آپ مجھے بتایئے آفس پہنچنا ہے یا گھر......؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ انداز ایسا تھا گویا پوچھ رہا ہو کہ سر کے بل آؤں...... یا ہوا میں اڑتا ہوا۔
''آپ گھر آجائیں...... فی الحال سوفٹ ویئر پر کام کرتے ہیں کل اس کی hard copy نکال کر فائل میں لگا دیجیے گا۔''
''اوکے میم......'' وہ ہوا کے دوش پر پرواز کرنے لگا۔
''لڑکی پراوڈ ہو تو اس کی ماں پر توجہ دینی چاہیے۔'' مارے خوشی کے دل بلیوں اچھلنے لگا۔
''آپ کب تک آسکیں گے؟'' تاجور پوچھ رہی تھیں۔
''میں ایک گھنٹے کے اندر پہنچ جاؤں گا......'' اس نے سامنے پڑی اپنی رسٹ واچ اٹھا کر ٹائم دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
''گڈ...... میں آپ کا wait کر رہی ہوں۔ ٹیک کیئر......'' یہ کہہ کر تاجور نے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔
وہ کھڑا ہو کر ایک پاؤں پر رقص کے انداز میں گھوم گیا...... نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر دو تین بار چٹکی بجائی...... اور گنگنانے لگا۔

''قسمت کا لکھا ٹل سکتا ہے
دریا الٹا چل سکتا ہے
جم سکتی ہے سورج کی کرن
پانی میں دیا جل سکتا ہے
پر تجھ کو بھلانا مشکل ہے
یوں کھو گئے تیرے پیار میں ہم''

وہ وارڈ روب کھول کر لباس کا انتخاب کر رہا تھا...... گنگناہٹ تو اس بے ساختگی کا استعارہ بھی جو بیج سے کونپل پھوٹنے کے عمل میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

☆☆☆

''آپ کو اس کے خلاف F.I.R تو کٹوانا ہوگی...... یہ پہلا step ہوتا ہے......'' پرنس، لیڈی صوفیہ کے حتمی فیصلے کے بعد صندل سے بات کرنے چلا آیا تھا۔ اور کمرے، کمرے سر جھکائے بات کر رہا تھا۔
''لیکن یہ تو extreme ہے۔'' صندل بری طرح خوفزدہ ہوگئی۔
''ایکسٹریم وہ ہے جو آپ کے ساتھ ہوتا آرہا ہے...... اسے آپ کی کمزوری کی وجہ سے بہت اطمینان ہے کہ وہ جو مرضی کرلے آپ کچھ نہیں کرسکتیں۔'' پرنس نے برجستہ جواب دیا تھا...... صندل ایک دم لاجواب سی ہو کر خاموش ہوگئی۔
''آپ کو یقیناً ثوبان کی فکر ہے جو فی الحال باپ کی کسٹڈی میں ہے...... اور آپ کو یہ سوچ کر مطمئن ہو جانا چاہیے کہ سلمان کے اریسٹ ہوتے ہی ثوبان آپ کے پاس آجائے گا......'' پرنس نے گویا صندل کے دل کے نازک ترین مقام پر انگلی رکھ دی۔
''ثوبان کے لیے تو میں سب کچھ کرسکتی ہوں...... اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔''
''تو پھر آپ کو پولیس اسٹیشن جانا ہوگا...... کیونکہ...... F.I.R پولیس اسٹیشن جائے بغیر نہیں کٹ سکتی......'' پرنس نے آہستہ سے کہا تھا۔
''آپ کیا میرے ساتھ ہوں گے؟'' صندل نے ہچکچاتے ہوئے سوال کیا۔
''نہیں...... یہ آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہوگا......'' پرنس نے محتاط انداز میں جواب دیا...... اس سے زیادہ وہ بات نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ صندل اس سے غیر ضروری توقعات وابستہ نہ کرنے لگے...... جب بات ہمدردی سے آگے بڑھتی ہے تو خطرناک ہو جاتی ہے۔ امیدیں و توقعات کے ریشمی جال کا ٹانا ممکن ہو جاتا ہے۔
''میں اکیلے کیسے پولیس اسٹیشن جاسکتی ہوں؟'' صندل نے پریشان ہو کر پرنس کی طرف دیکھا۔
''اصولاً تو آپ کو یہ اسٹیپ پہلے لے لینا چاہیے تھا...... آپ نے ظلم سہنے پر رضامندی ظاہر کی تو ظلم کا سلسلہ چل پڑا...... بہر حال یہ تو آپ کو کرنا ہے۔ اب بھی اگر آپ نے ہمت نہیں کی تو اس کے بعد شاید ہم بھی آپ کا ساتھ نہ دے سکیں...... پھر آپ کو تمام فیصلے تنہا ہی کرنے ہوں گے۔'' پرنس کی بات سن کر تو صندل جیسے کسی خواب سے باہر آگئی...... اس نے گھبرا کر پرنس کی طرف دیکھا تھا۔
''بس اتنی دیر کا ساتھ......؟''
اس نے شاید کچھ زیادہ ہی توقعات وابستہ کرلی تھیں۔
''ان لوگوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تو وہ ثوبان سے کیسے ملے گی؟'' اب ایک طرح کی گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔
اس نے پرنس کی طرف دیکھا جو فرش پر نگاہ جمائے کسی فیصلے کا منتظر تھا۔
''F.I.R میں کیا لکھوانا ہوگا......؟'' اس کی آواز کسی کنوئیں کی گہرائی سے نکلی تھی۔
''جو سچ ہے وہی لکھوانا ہے...... کہ آپ شوہر کی ذاتی جیل میں ہیں...... آپ کے تمام بنیادی حقوق متاثر ہیں...... آپ پر قاتلانہ حملے ہوتے ہیں...... ایف، آئی، آر کے بعد جو سپورٹ آپ کو چاہیے وہ ہم ضرور دیں گے...... یہاں تک کہ وہ شخص خود کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائے یا آپ کو اس سے خلع مل جائے......'' پرنس نے اب اپنی رسٹ واچ پر وقت دیکھتے ہوئے بہت ہی دھیمی آواز میں کہا۔

''خلع......؟'' صندل نے گھبرا کر پرنس کی طرف دیکھا۔
''جی......آپ کے شوہر کو شاید آپ کی ضرورت نہیں...... بیٹے کی بھی ضرورت نہیں مگر آپ کو بیٹے کی اور بیٹے کو آپ کی ضرورت ہے۔''
پرنس نے اب غیر ارادی طور پر صندل کی طرف دیکھا تھا۔
''اگر وہ اریسٹ ہوگیا تو پہلے سے زیادہ خطرناک ہوجائے گا۔'' صندل کو جو اندیشے ستا رہے تھے...... برملا اظہار کردیا تھا۔ پرنس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری تھی۔
''جرائم پیشہ لوگ بہت بزدل ہوتے ہیں...... ان کی تمام تر طاقت کا انحصار arms (اسلحے) پر ہوتا ہے......وہ اپنے armed ہونے پر بھروسا کرتے ہیں جب گرفت میں آتے ہیں تو ان سے زیادہ بزدل کوئی نہیں ہوتا۔'' پرنس نے بہت وثوق و اعتماد سے صندل کو اعتماد دلانے کی کوشش کی تھی۔ پرنس کی بات میں بہت اثر تھا...... یوں جیسے کہ صندل کو نجات کا یقین مل گیا۔
''پولیس اسٹیشن جانا تو خود بہت بڑی آفت ہے...... میں کیسے اکیلی......''
''آپ میرے ڈرائیور کے ساتھ جائیں گی...... وہاں آپ کو ایس ایس پی زوار حسین جوائن کریں گے...... اور آپ کو ہر طرح کی مدد فراہم کریں گے۔'' پرنس نے اب پھر اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھا...... کہ وہ ساتھ، ساتھ اندازوں میں کھیل رہا تھا...... کہ ایس ایس پی زوار حسین متعلقہ پولیس اسٹیشن پہنچ گئے ہوں گے یا پہنچنے والے ہوں گے۔
زوار حسین، لیڈی صوفیہ کے احسان مندوں میں سے ایک تھے۔ لیڈی صوفیہ ایک Orphan house (یتیم خانہ) کی سرپرستی کرتی تھیں۔ وہاں پرورش پانے والے باصلاحیت بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مہیا کیے جاتے تھے۔ زوار حسین بھی اسی یتیم خانے سے نکل کر سول سروس کا امتحان دے کر اس اعلیٰ عہدے تک پہنچے تھے اور آج بھی لیڈی صوفیہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے تھے...... لیڈی صوفیہ کی بات ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔
''اوکے......ٹھیک ہے۔'' صندل نے تھکے، تھکے اعصاب کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا اور آمادگی ظاہر کی۔
''آپ تیار رہیں......تھوڑی دیر بعد آپ کو سرونٹ گاڑی تک لے جائے گا......'' یہ کہہ کر پرنس نے کمرے سے باہر جانے کے لیے قدم بڑھائے۔
''آپ بھی ساتھ چلتے تو......'' صندل کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا تھا۔ پرنس نے پلٹ کر صندل کی طرف نہیں دیکھا۔
''میں اور میری گرینڈ مام آپ کے لیے آسانی چاہتے ہیں۔'' یہ کہہ کر پرنس نے رک کر صندل کی کسی اگلی بات کا انتظار نہیں کیا......اور پُروقار انداز میں پشت پر ہاتھ باندھے کمرے سے باہر نکل گیا......اور......صندل اس کے جملے پر غور کرتی رہ گئی۔
کمرے میں دیواریں کھڑکیاں بن گئیں...... جن کے پٹ کھلے ہوئے تھے۔ نرم ہوائیں اسے چھو رہی تھیں...... سسکتی ہوئی زندگی کی طرف راحتیں ہاتھ پھیلائے گلے ملنے کو آگے بڑھ رہی تھیں۔
گھر کے پچھلے حصے میں رہ، رہ کر ٹیس اٹھتی تھی...... دس سال میں جانے کتنی بار سر پھٹ چکا تھا...... کبھی دیوار سے ٹکرا کر کبھی بیڈ کے کبھی دروازے سے...... اعصابی نظام ٹیسیں سہہ، سہہ کر تباہ ہوچکا تھا...... اب تو ذرا سا غور و خوص کرنے پر بھی سر چکرانے لگتا تھا لیکن موجودہ لمحے میں ایک احساس بالکل نیا تھا...... جو راہ نجات کی سمت سے دوڑتا

ہوا آرہا تھا۔

☆☆☆

''میں اس روز آپ کے گھر گئی تھی......مگر گھر میں آپ کے علاوہ کوئی نظر نہیں آیا......آپ کی فیملی آپ کے ساتھ نہیں ہوتی......؟''
بظاہر تاجور لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ تھیں مگر ساری توجہ اس وقت ساحل کی طرف تھی جو کچھ دیر قبل ہی ان کے گھر پہنچا تھا اور اس وقت لاؤنج میں ان کے قریب کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔
تاجور نے آف وہائٹ شلوار سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا جس پر سیاہ موتیوں کا نازک سا کام تھا......آف وہائٹ دوپٹے کے کنارے پر نازک سی کروشیا کی بیل عجیب بہار دے رہی تھی۔ شلوار قمیص وہ گھر میں پہنتی تھیں، گھر سے باہر ہمیشہ ساڑی پہنتی تھیں۔ میک اپ سے عاری چہرہ، ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک تک نہیں تھی۔ بال ہمیشہ سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھ کر رکھتی تھیں۔
شریف، نیک مزاج، سادہ عورت بہت طاقتور اثر چھوڑتی ہے۔ برے سے برا انسان بھی ایسی عورت کا احترام کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور پھر وہ تو ساحل کی باس تھیں......وہ دولت جو ساحل کے خوابوں میں تھی وہ حقیقت میں ان کے پاس تھی۔
سیکڑوں لوگوں کا روزگار ان کی محنت و بھاگ دوڑ کے ساتھ وابستہ تھا۔ ساحل تو ویسے ہی ان کے رعب تلے دبا جاتا تھا۔ مگر اس وقت وہ بری طرح پریشان ہوگیا تھا۔ ایک گھبراہٹ سی طاری ہونے لگی۔ یہ اچانک میم کو اس کی فیملی کا دھیان کیوں آگیا...... کہیں وہ کسی شک و شبہے میں مبتلا تو نہیں ہوگئیں...... اتنی شاندار نوکری اسے خطرے میں نظر آنے لگی۔
''شاید...... ''سنگل پرسن......'' کو اتنی اہم جاب دینے کے بعد وہ سوچ رہی ہوں کہ غلطی ہوگئی...... کہیں مجھ سے بہتر کسی بندے نے تو اپروچ نہیں کرلیا...... چھٹی کے دن گھر بلا کر آرام سے فارغ کرنا چاہتی ہوں۔ جسے میٹھی چھری سے حلال کرنا کہتے ہیں۔'' احساسِ کمتری اندیشے بہت دلاتی ہے، مارے پریشانی کے وہ بھول گیا کہ کیا کام کرنے جا رہا تھا۔
''جی......میم......میرے پیرنٹس نہیں ہیں......اور میں ان میریڈ ہوں......میری بڑی بہن شادی شدہ ہیں، ان کے چار بچے ہیں...... بڑی بیٹی میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔ اس سے چھوٹے تین بیٹے ابھی اسکول میں ہیں...... دو سگے چچا ہیں...... تین خالائیں ہیں...... کچھ رشتے دار لاہور میں کچھ اسلام آباد میں رہتے ہیں......ایک ماما جو نیشنل بینک میں ہیں' وہ آزاد کشمیر میں رہتے ہیں...... میں جاب کی وجہ سے کراچی میں اکیلا رہتا ہوں......اور......''
''ارے......بس......بس۔'' تاجور بے ساختہ مسکرا پڑیں......''میں نے تو آپ سے بہت مختصر سوال کیا تھا۔''
تاجور کی مسکراہٹ سے ساحل کو بڑی تقویت پہنچی...... یوں لگا جیسے خطرہ ٹل گیا ہو۔
''آپ کے بہنوئی کہاں جاب کرتے ہیں......؟'' تاجور نے اب بہت توجہ سے ساحل کی طرف دیکھا تھا۔ ساحل کی پروفائل سے بھی خاندان کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔
''جی وہ گورنمنٹ جاب کرتے ہیں......فوڈ ڈپارٹمنٹ میں ہیں۔'' وہ اس سوال کے بعد پھر پریشانی میں مبتلا ہوگیا۔ یہ پہچان بین بہت معنی خیز لگ رہی تھی......آخر آج سے پہلے تاجور نے اس کے فیملی بیک گراؤنڈ میں اتنی دلچسپی کیوں نہیں لی......؟ احساسِ کمتری کی شدت نے وسوسوں کا ہنگام برپا کردیا......

''ہوں......'' تاجور کو قدرے تسلی ہوئی کہ بیک گراؤنڈ میں پڑھے لکھے لوگ موجود ہیں۔
''کہیں وہ اسے پروموٹ کرنے کے بعد پچھتا تو نہیں رہیں؟ ان کے خیال میں miss selection تو نہیں ہو گیا؟'' ساحل کو اپنی پڑ گئی تھی۔
تاجور بھول نہیں پائی تھیں...... اس نے جو شاعرانہ جسارت کی تھی ان کے حساب سے نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں تھی۔
یہ الگ بات کہ اس وقت وہ طرح دے گئی تھیں...... اشارے میں دیے جانے والے پیغام کو سنجیدگی سے موضوع بنا کر لا حاصل بحث کرنے کا مطلب تو ایسے ہی تھا جیسے ہوا میں اڑتے تیر کو پکڑنے کی کوشش کی جائے۔
مگر اس مشکل گھڑی میں اس وقت کی گئی جسارت باعث تقویت بن رہی تھی۔
اس وقت صرف اور صرف زارا ہی سامنے تھی...... اس کا مطلب ہے کہ وہ زارا میں دلچسپی لیتا ہے۔
اگرچہ اس وقت زارا کے ردِعمل نے انہیں مطمئن کر دیا تھا کہ زارا کی طرف سے ایسی کوئی بات نہیں جو پریشانی کا باعث بنتی۔
''آپ ماشاء اللہ اس وقت اس قابل ہیں کہ شادی پلان کر سکیں' آپ کی سسٹر نے اس سلسلے میں کوئی کوشش نہیں کی؟'' تاجور کے سوال نے ایک دھماکا کیا تھا۔
ساحل حیران پریشان دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔
دو جمع دو سے آگے بات نہ کرنے والی محتاط، ریزروسی باس اس وقت پرسنل ہو رہی تھی...... یہ حیرت انگیز و ناقابلِ یقین حقیقت تھی۔
تاجور اس کی کیفیت کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھیں اس لیے براہ راست دیکھنے سے گریز کر رہی تھیں اور بہت سکون سے اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھیں۔
''جی...... وہ...... آپا تو روز ہی بات کرتی ہیں...... مگر میں ابھی ان کی باتوں کو سیریس نہیں لیتا......'' ساحل نے بدقت تمام مناسب جواب دے دیا۔
''کیوں...... شادی کی مناسب عمر یہی ہوتی ہے پھر اس شہر میں آپ اکیلے رہتے ہیں...... انسان فیملی لائف کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔'' نوکر چائے لے کر آ گیا تھا اور ٹرالی تاجور کے سامنے لا کھڑی کر دی تھی۔ اور چائے تیار کرنے کے لیے حکم کا انتظار کرنے لگا۔
''میں چائے بنا لوں گی...... آپ جائیے اپنا کام کیجیے......'' تاجور نے نوکر کو رخصت کر دیا۔
ساحل کے حلق میں پھندے لگ رہے تھے...... تاجور کھل کر ذاتیات پر بات چیت کر رہی تھیں اور ساحل ابھی تک سمجھ نہ پایا تھا کہ وہ کام بھلا کر اسے کیوں موضوع بنا رہی ہیں۔
''جی...... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں...... مگر...... میں شادی سے پہلے آنے والوں کے لیے کچھ تیاری کرنا چاہتا ہوں......'' ساحل کو بہر حال جواب تو دینا تھا...... آہستہ سے گویا ہوا...... گویا پھونک، پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔
''کیسی تیاریاں......؟'' تاجور کو آج ہر بات سے دلچسپی تھی۔
''میم...... شادی سے پہلے ایک مناسب اور کمفرٹ ایبل گھر تو بہت ضروری ہے۔ باقی محنت کر کے بندہ... دال روٹی تو کما ہی لیتا ہے۔ میں شادی گھر کے آرام کے لیے کرنا چاہوں گا...... مجھے اس بات سے بالکل بھی دلچسپی نہیں کہ میری بیوی جاب کر کے مجھے financially سپورٹ کرے...... جتنا کر سکتا ہوں خود کرنا چاہتا ہوں۔ یہی نیچرل لائف ہے۔ سارا دن گھر، گھر والوں سے خالی رہے...... شام کو دونوں تھک کر گھر واپس آئیں...... اور

آنے والی نئی صبح کی ٹینشن کے ساتھ سو جائیں۔'' ساحل کے مشینی ذہن نے آناً فاناً کام کرنا شروع کر دیا۔
باس اتنی مہربان ہو رہی تھی اور وہ احمقوں کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ باس کو متاثر کرنے کا اس سے بہتر موقع کوئی مل سکتا ہے بھلا؟ اس نے اپنی کوتاہی پر خود کو ملامت کی۔
تاجور نے بڑی خوشگوار حیرت کے ساتھ ساحل کی طرف دیکھا تھا۔ اس کلاس کے نوجوان تو ''ورکنگ وومن'' یا ''کیریئر وومن'' سے شادی کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں کہ دونوں کی کمائی سے کوالٹی آف لائف حاصل کرنے کے واضح و روشن امکانات ہوتے ہیں...... وہ بہت باشعور و حساس اور خوفِ خدا رکھنے والی خاتون تھیں...... طبقۂ اشرافیہ سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ غربت و تنگ دستی کی تکلیف محسوس کر سکتی تھیں۔
سب سے کم تنخواہ پانے والے ورکر کا وہ خود بجٹ بنا کر تنخواہ کا معیار طے کرتی تھیں۔ بجلی، گیس کا بل، بچوں کی پڑھائی کے اخراجات، روزانہ کا کھانا پینا...... میڈیکل اور کنوینس کی سہولت نچلے درجے کے ورکرز کو لازمی دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت اعتماد اور سختی سے کام کے مطلوبہ معیار کا تقاضا کرتی تھیں...... جو انہیں ملتا بھی تھا...... ان کے ملازمین روتے بسورتے مالکن کی غیبت کرتے نظر نہیں آتے تھے۔ سیتا اپنے حالات کا رونا روتے ہوئے اپنے نااہل شوہر کے خلاف بولتی تو نظر آتی تھی مگر تاجور کے کسی ظلم کا کبھی ذکر نہیں کیا تھا۔
''اگر آپ کو کسی اپر کلاس لڑکی کی طرف سے شادی کی آفر ہو تو اس پر آپ کا ردِعمل کیا ہو سکتا ہے؟'' ایک چٹائی پر تاجور نے دونوں ہاتھوں کا زور لگا کر بالآخر اونچائی سے لڑھکا دیا۔
تاجور جیسی باوقار، عزتِ نفس کو زندگی سے زیادہ اہمیت دینے والی عورت کے لیے یہ بات کرنا آسان نہیں تھا...... مگر زارا نے جو اندیشے پیدا کر دیے تھے وہ عزتِ نفس کے خطرے میں گھرے ہونے کی نشان دہی کر رہے تھے۔
وہ اپنے ہم رتبہ خاندان کے ہاتھوں بے عزت ہونے کے لیے تیار نہیں تھیں...... جس کے امکانات روز بروز واضح ہو رہے تھے۔
ساحل کی حالت غیر ہو رہی تھی...... سفینہ کا صبیح و پُرنور چہرہ بار، بار یوں طلوع ہو رہا تھا جیسے اڑتے بادلوں کی اوٹ سے گاہے بہ گاہے چاند جھلکتا ہے۔ اس کے خیال میں سفینہ بڑی تھی اور تاجور پہلے بڑی کی شادی کرنے کی ہی خواہش مند ہو سکتی تھیں۔
''برائن ٹریسی......'' ٹھیک ہی لکھتا ہے۔ جیسے خیالات...... ویسی ہی زندگی......'' اس لمحے اس نے دل و جان سے برائن ٹریسی کو خراجِ تحسین پیش کیا اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔
وہ اتنا زیرک اور چوکس تھا کہ ادھوری بات کو مکمل کرنے کی بھرپور صلاحیت سے مالا مال تھا۔
اس کا خواب تھا کوئی رئیس اس کو اپنی بہن، بیٹی کے لیے پسند کر لے کیونکہ اس کے پاس خوب صورت چہرہ، دلکش قد و قامت اور اعلیٰ درجے کا دماغ ہے، اس نکتے پر اسے اتنا اعتماد تھا کہ وہ لکھ کر دے سکتا تھا کہ اربوں انسانوں کے دماغ کا جو معیاری وزن سائنس تول چکی ہے اس کے مقابلے میں اس کے دماغ کا وزن اعشاریہ کچھ زیادہ ہی ہو گا۔ اور اعلیٰ خواہشات کا تو اتنا بوجھ ہے کہ عام دماغ تو اتنا بوجھ ہی برداشت نہیں کر سکتا۔
غریب آدمی کو روزنی سوجھے تو پھر بھی بیچارے کا بیچارہ' معاشرے میں اس کی قیمتی رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی...... دولت مند کو گاہے بہ گاہے ہری، ہری سوجھے تو جدھر مرضی سبزہ اگا لے۔
''اصل میں زارا کے کافی پروپوزلز آ رہے ہیں...... اس کی کسی کیریئر میں بھی دلچسپی نہیں...... تو پھر جوان بچی کو گھر نہیں بٹھانا چاہیے...... مگر مسئلہ یہ ہے کہ جو پروپوزل آ رہے ہیں وہ زیادہ تر اسی کی ایج گروپ کے

ہیں۔ اور میں چاہتی ہوں اس کی شادی کسی میچور نوجوان سے ہو...... جس کو زندگی کے ups and downs کا حقیقی شعور ہو۔ جس میں صبر و برداشت ہو...... جو شادی کو بہت سنجیدگی اور ذمے داری سے نبھانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور ہماری کلاس کے ینگ لڑکے بہت نازک مزاج اور بے پروا ہوتے ہیں۔"

تاجور نے "کلاس" کا ذکر ساحل کو جتانے کے لیے استعمال نہیں کیا تھا روانی میں کہہ گئی تھیں جیسے کوئی ڈھیروں سبزی خریدنے کے بعد دھنیے، پودینے کی بات کرنے لگے۔

ساحل کا دل بہت اونچائی سے اچھل کر کسی پاتال میں جا پڑا تھا۔ اس نے اپنے تاثرات چھپانے کی نیت سے سر کچھ زیادہ ہی جھکا لیا تھا۔ ساری زندگی کا سوال تھا۔

اور سامنے زارا تھی...... آخر سفینہ کو کس کے لیے سنبھال رہی ہیں؟ اس کی حالت یوں تھی گویا اس کے میرٹ پر ڈاکا پڑا ہو......

"سفینہ کا رشتہ طے ہو چکا ہے مگر ابھی اس کی اسٹڈیز مکمل نہیں ہوئیں...... ورنہ میں دونوں کی شادی ساتھ ہی کر دیتی۔" تاجور کیونکہ ساحل کو ہر لحاظ سے قبول کر چکی تھیں لہٰذا اب ان کا انداز گفتگو فطری طور پر اپنائیت بھرا ہوتا جا رہا تھا...... اپنی دُھن میں بات آگے بڑھاتے ہوئے سفینہ کے انگیجڈ ہونے کی "بدخبری" بھی سنا دی۔

"اوہ...... یہ سانحہ کب ہوا......؟" سوال کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ تاجور کو یک دم ساحل کی گہری خاموشی کھلنے لگی...... وہ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

ساحل کے مستعد دماغ نے فوراً تاجور کی نگاہوں کا احساس دلایا تو اس نے جلدی سے خود کو مرتب کرنا شروع کر دیا...... پہلے مرحلے میں کھنکھار کر گلا صاف کیا...... دوسرے مرحلے میں ذرا سا مسکرایا، تیسرے مرحلے میں تاجور کی طرف دیکھنے کی ہمت کی......

"عام طور پر ہماری سوسائٹی میں اس طرح کی پریکٹس نہیں ہے...... شادی کا پیغام لڑکے کی طرف سے ہی دیا جاتا ہے...... مگر ہمارے مذہب میں ایسی کوئی پابندی نہیں...... اگر آپ کی طرف سے انکار ہو جائے تو میں اسے انا کا مسئلہ نہیں بناؤں گی...... میرے نزدیک یہ زندگی کے معمولات ہیں...... جن لوگوں سے ہم میل جول رکھتے ہیں ان سے بہت سی باتیں کرتے ہیں...... اسی طرح سے یہ بھی ایک بات ہے۔ آپ کو رائٹ ہے کہ آپ قبول کریں یا انکار کر دیں......" تاجور اس کی خواہش جان کر انجان بن گئی تھیں اس وقت حالات کچھ اور تھے اس کی خواہش کا برا منا کر بھی اظہار نہیں کیا تھا...... مگر اب یادداشت کے ایک گوشے میں جھانکنے کے بعد بہت اعتماد سے بات کر رہی تھیں اس یقین کے ساتھ کہ وہ ساحل کی خواہش کو اپنے الفاظ دے کر اس کی ہمت بندھا رہی ہوں۔

"میں اس لائق تو نہیں ہوں...... یہ تو میرے لیے بہت بڑا آنر ہے...... میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ......"

"جو ہم سوچتے ہیں وہ بہت کم ہوتا ہے...... زیادہ تر تو وہ سامنے آتا ہے جو ہماری سوچ میں نہیں ہوتا۔" تاجور نے اندازہ کر لیا کہ ساحل مکمل بات نہیں کر پائے گا تو خود ہی جملہ مکمل کر دیا۔

"آپ سوچ لیں...... اپنی بہن سے تسلی سے مشورہ کر لیں...... ہو سکتا ہے کہ آپ سوچیں کہ میں آپ کا انتخاب کیوں کر رہی ہوں سمپل سی بات ہے...... محنتی بندے کو سب پسند کرتے ہیں۔" تاجور اس سے مخاطب تھیں۔

گھڑیاں تو من چاہی تھیں...... مگر "من چاہا" گم ہو چکا تھا۔

چند منٹ پہلے جو شادیِ مرگ کی کیفیت طاری ہوئی تھی وہ اب صرف مرگ کی کیفیت سے بدل رہی تھی۔

"ہرنی چوہدری کے باغ میں...... مری بھیڑ خواجہ کے در پر......" افسوس ناک کیفیت میں سب سے پہلا خیال یہی آیا...... مگر صورتِ حال کا مقابلہ تو کرنا تھا۔

وہ سنبھلنے کی غرض سے مسکرایا...... اور بڑی خاکساری سے سر جھکا کر گویا ہوا۔

"میم...... میرے لیے یہ سب بہت un expected ہے...... مجھے سوچنے کا وقت چاہیے۔"

تاجور نے الجھن بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کم ظرف نہیں ہے، خوشی پر کنٹرول کرنا جانتا ہے۔" اب انہوں نے خود کو مطمئن کرنے کی راہ نکال لی۔

"جی...... آف کورس...... آپ ہر اینگل سے غور کیجیے۔ پروپوزل غور کرنے کے لیے ہوتا ہے......" تاجور اب باوقار انداز میں مسکرائیں...... بلکہ انہیں تو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی کی خواہش کا احترام کر کے ثواب دارین حاصل کر رہی ہوں...... انہیں ساحل کے جواب سے روحانی مسرت ہوئی کہ جیسا انہوں نے سمجھا تھا وہ خود کو ثابت کر رہا تھا۔

ایک عزت دار گھرانے کی خوب صورت لڑکی کا پروپوزل پا کر آپے سے باہر ہوتا دکھائی نہیں دیا۔

چائے کا کپ ساحل نے اٹھایا ضرور تھا مگر دو، تین گھونٹ سے زیادہ پی نہ سکا تھا۔

تاجور کی شخصیت کا رعب کیا کم تھا اس پر مستزاد وہ اس کی اوقات سے بڑھ کر نوازنے جا رہی تھیں۔

چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی جبکہ تاجور اپنی چائے کے آخری گھونٹ لے رہی تھیں۔

اس نے چائے کا کپ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"اب مجھے اجازت......؟" اس نے فائل پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر بڑی عاجزی سے اجازت چاہی...... گویا فائل تو بلاوے کا بہانہ تھی۔

"آپ کے لیے گرم چائے منگواتی ہوں......" تاجور نے ساحل کا بھرا کپ ایک نظر دیکھ کر گھنٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نو میم...... تھینک یو...... بس اب اجازت چاہوں گا۔"

"اوکے......" تاجور نے اصرار نہیں کیا۔

ساحل نے پیشانی کو انگلیوں سے چھو کر الوداعی سلام کیا۔ اور بہت محتاط انداز میں قدم رکھتا باہر کی طرف چلا۔

"پانی خطرے کے نشان تک آ چکا ہے، سر سے اونچا نہیں ہونا چاہیے۔ زارا کے لیے ساحل سے زیادہ مناسب لڑکا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔" وہ اب مختلف خیالات سے نبرد آزما ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

سفینہ کی گہری نیند جانے کس سوچ سے ٹوٹی تھی۔ شاید وہی سوچ کہ پرنس نے اسے دوبارہ کال کیوں نہیں کی۔ وہ انتظار کی کیفیت میں سوئی تھی اور اسی کیفیت میں بیدار ہوئی تھی۔ ماہین جانے کب آ کر سو گئی تھی۔ سفینہ کی طرف کروٹ لیے ہوئے تھی۔ تکیے کے نیچے سے سیل فون نکالا...... دھڑکتے دل سے چیک کرنا شروع کیا...... کوئی مسڈ کال نہ تھی۔ میسج کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ پرنس سیل فون استعمال ہی نہیں کرتا تھا۔ عجیب سی پژمردگی اعصاب پر طاری ہو گئی۔ جیسے دل ٹوٹنے کی کیفیت ہوتی ہے۔

"پرنس کو فون کرنا چاہیے تھا...... مجھے پتا ہے وہ بہت سچے اور ایماندار ہیں...... مجھے اگنور نہیں کر سکتے۔ انہیں [illegible] کے ساتھ، ساتھ ہونا چاہیے۔ کتنے گھنٹے گزر گئے، میں ہرٹ ہو رہی ہوں...... میں ادھوری پینٹنگ نہیں ہوں کہ جب ان کا موڈ بنے گا تو مکمل کر لیں گے۔ وہ آرٹسٹ ہیں...... کیا وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں ان کی کال کا انتظار کر رہی ہوں۔ میں تو آپریٹر کے through کبھی بات نہیں کروں گی۔ آرٹ ہے کیا؟ انسانی جذبات و احساسات کو اپنے مخصوص ہنر کی زبان میں بیان کرنا۔" وہ اپنے آپ سے لڑنے لگی۔ چاہے جانے کا مان ٹوٹ رہا تھا۔

''کیا مجھ سے بھی زیادہ ضروری کام کوئی ہو سکتا ہے؟''

☆☆☆

صندل ایف آئی آر کٹوا کر واپس پرنس ہاؤس آ چکی تھی...... اور اس وقت پہلے سے زیادہ خود اعتماد نظر آ رہی تھی۔ باقاعدہ پروٹوکول میں پولیس اسٹیشن گئی تھی باوردی اسمارٹ شوفر...... دو گن مین جو دوسری کار میں سوار تھے جو اس کی گاڑی کے عقب میں دوڑ رہی تھی۔

پولیس اسٹیشن میں اتنی عزت افزائی ہوئی کہ اسے یقین نہیں آیا کہ یہ پاکستان کا پولیس اسٹیشن ہے۔

سب کچھ اتنا اچھا ہوتا دکھائی دیا تو اس کی رگ، رگ میں توانائی بھر گئی...... اسے یقین ہو چلا کہ بس اس کا بیٹا اس کے جگر کا ٹکڑا کسی بھی لمحے اس کے سینے سے آن لگے گا۔

ساری خود اعتمادی اس طاقتور جذبے کی مرہونِ منت تھی۔ یوں محسوس ہونے لگا گویا اندھیرے چھٹ گئے۔ آزمائشیں ختم ہو گئیں۔

کمرے میں آتے ہی خادمہ اس کی خاطر تواضع کرنے حاضر ہو گئی۔ اس نے عرصے بعد طبیعت سے کھانا کھایا، فریش جوس انجوائے کیا۔

خوف ختم ہو گئے اور یہ احساس کہ آج اس نے سلمان سے سالوں کا بدلہ لے لیا، روح میں ایک الوہی سی ٹھنڈک اتار رہا تھا۔ اسے سلمان کی گرفتاری کی خبر کا اتنا انتظار نہیں تھا جتنا ثوبان کی آمد کا انتظار تھا۔

''کس قدر آنسو بہائے ہوں گے میرے معصوم بچے نے۔'' ثوبان کے خیال سے آنکھیں آبدیدہ ہونے لگیں۔ ''بہت گھبرا رہا ہوگا...... میرا بیٹا۔ میرا بیٹا نماز پڑھ کر ماں کے لیے دعائیں مانگتا تھا ناں، اللہ نے اس کی دعائیں قبول کر لیں۔''

ثوبان کا تصور جم گیا اور آنکھوں سے خاموش آنسو بہنے لگے۔

☆☆☆

کمہار کے آوے میں
کچھ مٹی کے کھلونے پڑے تھے
اس نے جلدی، جلدی کھلونے نکالے
کہ کچھ گاہک آن سر پر کھڑے تھے
گڑیا، چڑیا، بلی، بندر، گھوڑا، ہاتھی
تھال، پرات، صراحی کچھ گھڑے تھے
سارے کھلونے آوے سے نکالے
گڑیا آوے میں پڑی رہ گئی
وہ تاپ لگی کہ جل کر خاک ہی ہو گئی

ساحل کا قلم تیز رفتاری سے چلتے، چلتے یکلخت رک گیا...... اس نے چند سیکنڈ سانس کھینچ کر سینے میں روکی پھر اسی قوت سے خارج بھی کر دی۔

دولت کا انبار...... جلی ہوئی گڑیا کے ساتھ......؟

وہ سوچ رہا تھا۔

(جاری ہے)

قربتوں کو فاصلوں میں بدلتی محبت کی کہانی

یہ کہانی بنیادی طور پر نشاء کے گرد گھومتی ہے۔ نشاء کی والدہ کے انتقال کے بعد اس کے والد نے دوسری شادی کر لی اور اپنی نئی بیوی کے ساتھ نشاء کو لے کر بیرون ملک جانے لگے تو نہایت شفیق تائی اور تایا نے مناسب سمجھا کہ سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بجائے بھتیجی کو اپنے پاس رکھ کر پیار سے اس کی پرورش کریں۔ نشاء کے خود پسند اور لاپرواہ باپ اور سوتیلی ماں نے تائی کی یہ پیشکش فوراً قبول کر لی۔ تائی اور تایا کے دو بیٹے احسن اور محسن ہیں جو نشاء سے بڑے ہیں۔ تینوں بچپن کے ساتھی ہیں ایک دن چھت پر کھیل کے دوران نشاء کی گڑیا واپس دلوانے کے لیے احسن محسن سے چھینا جھپٹی کرتا ہے اور اسکے دھکے سے محسن چھت سے گر کر معذور ہو جاتا ہے۔ اب اسکی زندگی وہیل چیئر کی محتاج ہے۔ تینوں جوان ہوتے ہیں۔ نشاء اپنی سادگی، معصومیت اور پیاری عادتوں کی وجہ سے گھر بھر کی چہیتی ہے۔ وہ محسن کا بے حد خیال رکھتی ہے۔ سایہ بن کر ساتھ رہتی ہے۔ محسن اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی، اچھے مستقبل کی امید اور اپنے وجود کا لازمی حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ وہ یک طرفہ طور پر نشاء سے محبت کرتا ہے مگر کبھی کھل کر اظہار نہیں کرتا اور تنہائی میں اپنے دل کی کیفیت کاغذوں پر منتقل کرتا رہتا ہے۔ نشاء محسن کو اپنا بہترین دوست سمجھتی ہے۔ احسن اور نشاء ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں مگر گھریلو ماحول کی وجہ سے بے حد محتاط ہیں۔ محسن اس بات سے بے خبر ہے جبکہ صرف تائی اس بارے میں جانتی ہیں۔ اس موقع پر کہانی میں ایک نئے کردار سمیر کا اضافہ ہوتا ہے جو نشاء کا ماموں زاد ہے مگر دونوں ایک دوسرے کے صورت آشنا بھی نہیں۔ نشاء کے ننھیال والوں کے اس کے والد سے شدید اختلافات تھے جو ترک تعلق کا سبب بنے۔ نشاء کے نانا نے مرتے ہوئے اُس کے ماموں کو نصیحت کی کہ اُن کی نواسی کو ڈھونڈ کر جائیداد میں اُس کا حصہ اُس کے حوالے کیا جائے۔ یہی خواہش نشاء کے ماموں کو کراچی لے آتی ہے۔ اُن کی بیوی اور بیٹا سمیر نشاء تک ورثہ پہنچانے کے سخت مخالف ہیں۔ سمیر کی نشاء سے پہلی ملاقات ایک ناخوشگوار حادثے کی صورت میں ہوتی ہے جہاں نشاء سمیر کی بدتمیزی اور اکڑ پر اس کی بُری طرح بے عزتی کر دیتی ہے۔ سرکش سمیر اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیتا ہے اور نشاء کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کا تہیہ کر کے سازشوں کے جال بننے لگتا ہے۔ کہانی میں اُس وقت اہم موڑ آتا ہے جب احسن اتفاقاً اپنے والدین کی گفتگو سن لیتا ہے جس میں اُس کے والد جلال احمد اپنی بیوی عطیہ سے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں کہ نشاء کی شادی محسن سے ہوگی کیونکہ احسن کے لیے لڑکیوں کی کمی نہیں صرف نشاء ہی محسن کی بچپن کی ساتھی ہے، اُسے اچھی طرح سمجھتی ہے اور اس کا بے حد خیال رکھتی ہے۔ اس موقع پر بیوی کے احتجاج کو وہ بالکل خاطر میں نہیں لاتے۔ احسن جو خود کو محسن کی معذوری کا ذمہ دار سمجھتا ہے، یہ جاننے کے بعد کہ محسن بھی نشاء سے محبت کرتا ہے اور اُسے اپنی دُلہن بنانے کا خواب دیکھ رہا ہے احسن پیچھے ہٹ جاتا ہے وہ بھائی کی خاطر قربانی دینے کا فیصلہ کرتا ہے اور محض نشاء کو بدگمان کرنے کے لیے بیرون ملک سے آئی ہوئی اُس کی سوتیلی بہن تانیہ کی طرف مائل ہونے لگتا ہے جو پہلی نظر میں احسن پر مر مٹی ہے۔ اچانک نشاء کے ذہن و دل پر دو بجلیاں گرتی ہیں۔ احسن کی بے وفائی، بے رُخی اور پھر یہ خبر کہ اُسے محسن کے پلے باندھنے کے منصوبے بن رہے ہیں۔ یہ صورتحال نشاء کے دل پر طوفان برپا کر دیتی ہے اور پھر شبنم کی طرح نرم و لطیف نشاء شعلہ بن جاتی ہے اور یہیں سے کہانی ایک سنسنی خیز اختتام کی طرف بڑھتی ہے۔

نشاء کے نصیب میں کون لکھا ہے۔۔۔ احسن، محسن یا سمیر؟

#TvOnePK

Monday 8:00pm



وعدہ رہا

عطیہ ہدایت اللہ

''بھئی عائشہ شکر بہت کم ڈالنا بلکہ ڈالو ہی مت۔ حسب ضرورت ہر کوئی اوپر سے چھڑک لے گا۔'' کا پیاں چیک کرتی مسز ارشد نے کونے کی میز پر تندہی سے فروٹ چاٹ الٹتی پلٹتی مسز عائشہ عاشر سے کہا۔

''اوں ہوں، پھیکی چاٹ کون کھائے گا مسز ارشد، آپ ٹینشن مت لیں، مجھے معلوم ہے آپ شوگر پیشنٹ ہیں۔ میں آپ کے لیے علیحدہ پلیٹ میں نکال کر کینڈرل ملا دوں گی۔'' مسز عائشہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔



باہر کی ایک مشہور و معروف یونیورسٹی سے ملحق یہ پرائیویٹ یونیورسٹی شہر سے باہر بہت بڑے رقبے پر پھیلی شاندار بلڈنگ اور ان گنت طالب علموں پر مشتمل تھی۔ آج اسٹاف روم میں اکنامکس کی ٹیچر عائشہ نے سب کو فروٹ چاٹ کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس وقت وہ فری تھی۔ بڑی سی ڈش اور رنگ برنگے فروٹ اس کے سامنے رکھے تھے۔ ڈسپوزبلز پلیٹ میں حاضر اسٹاف میں چاٹ تقسیم کر کے بقایا ڈھک کر پلٹی ہی تھی کہ خالہ ثریا کے ساتھ ایک مرنجان مرنج، سانولے رنگ اور بڑی، بڑی براؤن آنکھوں والی ایک خاتون اندر آئیں۔

''میڈم عائشہ، پرنسپل سر جی نے ان میڈم کو آپ کے پاس بھیجا ہے اور فارغ وقت میں آفس آنے کا بھی کہا ہے۔'' فروٹ چاٹ کا ایک پیالہ اپنے اور نووارد کے سامنے رکھ کر عائشہ نے نرمی سے پوچھا۔

''مس کیا میں آپ کا نام اور یہاں آنے کا مقصد پوچھ سکتی ہوں؟'' باقی اساتذہ بھی اُدھر ہی متوجہ ہو گئے تھے۔

''میرا نام تمثیلہ ہے، میں نے اکنامکس میں ایم فل کیا ہوا ہے، پرنسپل صاحب نے مجھے آج سے اپائنٹ کیا ہے اکنامکس ڈیپارٹمنٹ کے لیے۔''

''خوش آمدید، خوش آمدید اچھا ہوا اب ہم کلاسز شیئر کریں گے۔ میرے اوپر بہت لوڈ تھا، ریگولر بھی بہت سے بچے آرٹس میں اکنامکس پڑھ رہے ہیں۔ اور پرائیویٹ ٹیوشنز کے لیے بھی تاکید کر رہے ہیں۔ میں نے ہی پرنسپل سے دوسرے استاد کے لیے ریکوئسٹ کی تھی۔'' اگلے پیریڈ میں عائشہ، تمثیلہ کو لے کر پرنسپل صاحب کے آفس پہنچیں۔

''سر آپ نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اس کے لیے میں آپ کی بہت مشکور ہوں۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے یہ مسز تمثیلہ ندیم بہت قابل ٹیچر ہیں، کب سے ہم انہیں اِدھر لانے کے چکر میں تھے۔ آپ ان سے سلیبس ڈسکس کر لیں۔ امتحان نزدیک آ رہے ہیں، رزلٹ بالکل خراب نہیں آنا چاہیے۔'' تمثیلہ اور عائشہ بہت جلد ایک دوسرے کے قریب آ گئیں۔ تمثیلہ زیادہ وقت خاموش اور سوچوں میں گم رہتی۔ مگر عائشہ کی باتیں اور خوشگوار موڈ کبھی، کبھی اسے مسکرانے پر مجبور کر دیتے۔

''تمثیلہ بھئی کسی دن چلو... ناں میرے گھر......ہم اتنی اچھی سہیلیاں ہیں تو ایک دوسرے کے گھروں کی بھی واقفیت ہونی چاہیے۔''

''آؤں......گی......کسی دن......لیکن میری بوڑھی ساس گھر میں اکیلی ہوتی ہیں، دونوں بچے اسکول سے جلدی آ جاتے ہیں، اس لیے میں بھی جلدی بھاگتی ہوں۔''

''اور تمہارے میاں کس وقت آفس سے آتے ہیں؟''

''وہ، وہ بہت دیر کر کے آتے ہیں۔'' تمثیلہ کی آواز گلے میں پھنسنے لگی اس لیے اسے پانی کے چند گھونٹ پینے پڑے۔

''ارے کوئی بات نہیں، تم سے پتا سمجھ کر کسی دن بچوں سے ملنے آؤں گی۔ دوستی میں ادلے بدلے کا کیا کام۔'' عائشہ نے خوش دلی سے جواب دیا۔ تمثیلہ کو جلد ہی وہیں کالج میں ٹیوشنز مل گئیں۔ پھر وہ دیر سے گھر جانے لگی۔ اور عائشہ یونیورسٹی کی بس میں گھر چلی جاتی۔

اس دن مس تمثیلہ نے چھٹی کی تھی۔ عاشر صاحب دفتر کے بعد ماں کو میڈیکل سینٹر لے گئے تھے۔ اور یونیورسٹی بس بھی شومئیِ قسمت ورکشاپ سے کچھ دیر بعد آنی تھی۔ اس لیے عائشہ نے انتظار کرنے کے بجائے ٹیکسی سے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ چھٹی کا وقت تھا۔ سڑک پر ایک دھکم پیل کا منظر تھا۔ آخر کار ایک ٹیکسی مل ہی گئی۔ اس کے نزدیک ہی یونیورسٹی کی ایک لڑکی اپنے روٹ کی بس کی انتظار میں کھڑی تھی۔ اور حسبِ معمول کچھ آوارہ لڑکے اس کے قریب

کھڑے زور، زور سے ہنستے ہوئے اور بے ہودہ باتیں کر رہے تھے۔

''آپ کہاں جائیں گی بیٹا؟'' مس عائشہ نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''میم مجھے کینٹ تک جانا ہے، آپ کو زحمت ہوگی میں کھڑی ہوں یہاں پر ابھی بس آ جائے گی۔''

''مجھے بھی اسی طرف جانا ہے، چلو میرے ساتھ۔'' عائشہ نے لڑکوں کو گھورتے ہوئے اس کے لیے دروازہ کھولا تو وہ بیٹھ گئی۔

عائشہ کے گھر سے ایک اسٹاپ پہلے اس کا گھر تھا۔

''میم پہلے تمثیلہ میم اور میں ساتھ، ساتھ جاتے تو مجھے ذرا بھی ڈر نہیں لگتا تھا اب وہ دیر تک ٹیوشنز لیتی ہیں تو میں اکیلی ہو گئی ہوں۔'' اس اسٹوڈنٹ نے کچھ افسردگی سے کہا۔

''اچھا کیا میم کا گھر اِدھر ہی کہیں ہے۔'' عائشہ نے جلدی سے پوچھا۔

''سڑک کے اس پار تیسری گلی 5N میں۔'' لڑکی نے پتا بتایا پھر میم کا شکریہ ادا کر کے گھر کی راہ لی جبکہ عائشہ نے ارادہ کر لیا کہ تمثیلہ کا پوچھ ہی لیا جائے۔ ندیم صاحب کے گھر کا پوچھتے ہوئے وہ ایک پرانے آنگن کچے چھوٹے سے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ دروازہ ادھ بھڑا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی میں سے آنگن کے سامنے کا حصہ نظر آ رہا تھا۔

''اللہ کا واسطہ ندیم اب یہ ٹی وی تو مت لے جاؤ، میں نے قسطوں پر کتنی مشکلوں سے خریدا ہے۔ بچے اسے پا کر کتنے خوش ہیں۔'' تمثیلہ، شوہر کا دامن پکڑے ملتجی لہجے میں بول رہی تھی۔ اس کے ماتھے اور ہونٹوں سے خون رس رہا تھا۔

''ہٹ جاؤ میرے سامنے سے صبح اور دوپہر کی مار بھول گئیں کیا......اماں، اسے کہہ دو میرے راستے سے ہٹ جائے ورنہ سر کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ اور اس حرام کے پلوں کو بھی سمجھا دینا زیادہ ریں، ریں نہ کریں، میرا دماغ گھوم رہا ہے، چلو رقم نکالو۔ پھر چھوڑ جاؤں گا ٹی وی۔'' ندیم صاحب ہذیانی انداز میں بولے۔

''ندیم تم نے واشنگ مشین بھی بیچ کھائی۔ میری سلائی مشین، فریج اور اب اسے بھی اپنے نشوں کی نذر کر دو گے۔ تنخواہ بھی چھین لیتے ہو زیور بھی کھا گئے، اللہ کا خوف کرو ندیم، تم نے تو ہمیں جیتے جی مار ڈالا۔'' تمثیلہ وہیں زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ دو چھوٹے بچے دادی اسے لگے کھڑے ماں کو دیکھ کر سسکنے لگے۔

''تم ہو ناں گھر چلانے والی......اب تو ٹیوشنز کے پیسوں سے بھی بٹوا بھرا رہتا ہوگا۔'' ندیم صاحب نے ٹی وی کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور بیوی کی مزاحمت پر اسے زور کا دھکا دیا۔ پلنگ کے بازو پر وہ اوندھی گر گئی۔ بوڑھی ساس نے دوڑ کر اسے تھامنے کی کوشش کی۔

''امی کو مار دیں گے دادی......امی کو ابو مار دیں گے۔'' بچے بھی چلّانے لگے۔ ندیم صاحب تار اور ٹی وی سنبھالتے باہر کو لپکنے لگے تو عائشہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بے اختیار اندر تمثیلہ کی طرف دوڑی۔

''اب یہ کون منہ اٹھائے گھر میں گھسی چلی آ رہی ہے۔'' عائشہ نے سنی ان سنی کر دی۔ تمثیلہ اس پلنگ کے پائنتی بازو پکڑے پھوٹ، پھوٹ کر روئے جا رہی تھی۔ عائشہ نے نرمی سے اسے اٹھانے کی کوشش کی اس کی آواز سن کر وہ آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر بت بنی تکا کی پھر یک دم عائشہ کے گلے لگ گئی۔

''یہ، یہ ہیں میرے گھر کے حالات، دیکھ لیا......''

''اچھا چلو اوپر بیٹھو، اماں جی آپ کوئی زخم صاف کرنے کی دوا اور روئی لے آئیں۔'' تمثیلہ کے زخموں کو نرمی سے صاف کر کے اس نے دوا لگائی۔ اماں نے دوپٹے سے بہتے آنسو صاف کیے اور ان کے لیے چائے بنا لائیں۔ بچوں کو پیار کرتے تمثیلہ کے آنسو خشک کرتے کافی دیر ہونے لگی تھی۔

''تمثیلہ مجھے تمہاری تکالیف کا اندازہ ہوگیا ہے، ہمت نہ ہارنا، میں عاشر سے بات کروں گی۔ سچا دوست وہ ہے جو مشکل میں کام آئے، بس ہمت نہ ہارنا، جاب یا ٹیوشنز مت چھوڑنا۔'' عائشہ اسے تسلی دے کر گھر کی جانب چل دی تھی۔

☆☆☆

''عاشر، ابا جی! ہمیں مس تمثیلہ کی مدد کرنی چاہیے۔ میں نے جو خوفناک مناظر اس گھر میں دیکھے... میں بھلا نہیں سکتی۔'' عائشہ نے گلوگیر آواز میں سسر اور شوہر سے بات کی۔ انہوں نے سوچنے کا وقت مانگا اور زخمی پرندے کی طرح ڈولتی تمثیلہ یونیورسٹی آتی رہی۔ اس دن شام کو اپنے چھوٹے سے سرسبز لان میں عائشہ اور عاشر چائے کی چسکیوں کے ساتھ دنیا جہان کی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک عائشہ کا موبائل بج اٹھا۔ کان سے لگایا تو کچھ بچوں اور بڑوں کی ہذیانی چیخوں کی آوازیں تھیں۔

''عائشہ، عائشہ ندیم مجھے اور بچوں کو مار ڈالے گا، اس نے پستول لوڈ کیا ہوا ہے، میں پکڑنے کی کوشش کر رہی ہوں۔'' تمثیلہ چیخ رہی تھی۔

''عاشر چلو ہمیں تمثیلہ کے گھر جانا ہے، وہ اسے مار ڈالے گا۔'' عائشہ گاڑی کی طرف بھاگی اور جب وہاں پہنچے تو ہمسایوں نے پولیس بلوالی تھی جو ندیم کو دھکیل کر موبائل میں ڈال رہے تھے۔ اندر گھر کا حال دیکھنے کے قابل نہ تھا۔

''عائشہ وہ پہلے ہی نشوں کی وجہ سے لاغر ہو چکا تھا۔ اب پولیس اسے تھانے میں بہت مارے گی۔ ہائے اس کی جان ہی نکل جائے گی۔'' تمثیلہ فریاد کے انداز میں بولی۔

''ہائے بیچاری بیوی اس عالم میں بھی شوہر کی جان کا خیال......'' عائشہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گئی۔

''میں عاشر سے مشورہ کرتی ہوں، تم پلیز بچوں کو سنبھالو، دیکھو ان کی رنگت بیچارے تھر، تھر کانپ رہے ہیں۔''

''عاشر ایسے مریضوں کی جگہ حوالات یا مینٹل اسپتال نہیں ہوتی، اب تو شہر میں بڑے اچھے سرکاری اور پرائیویٹ rehabilitation سینٹر کھل چکے ہیں، ندیم صاحب کو وہاں ایڈمٹ کروانا چاہیے۔ تم پلیز صلاح لو اپنے کسی دوست ڈاکٹر سے۔'' عائشہ نے منت بھرے انداز میں شوہر سے بات کی۔

''پر یہ بہت رسکی کام ہے ندیم صاحب کے ہم دشمن بن جائیں گے۔''

''نہیں، نہیں عاشر اس کے معصوم بچے اور ادھ موئی مظلوم بیوی اور بڈھی ماں ہے۔'' ہمدرد عائشہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''اچھا میں کچھ کرتا ہوں۔'' اور پھر راتوں رات سینٹر کی گاڑی میں سے تین ہٹے کٹے آدمی اترے۔ ندیم کو پکڑ کر انجکشن لگایا اور اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے۔

''عائشہ تم پیسوں کی فکر نہ کرو، میں نے تھوڑا زیور بچا کر رکھا ہے اسے کل بیچ کر سینٹر کو ادائیگی کردوں گی۔'' تمثیلہ کا حوصلہ ان کی مدد کا سہارا پا کر بڑھ گیا تھا۔

ڈاکٹرز نے کچھ عرصہ تمثیلہ کو سینٹر میں شوہر سے ملنے پر پابندی لگادی تھی۔ لیکن اماں کچھ اچھا سا پکوان بنا کر تمثیلہ کی منت کرتیں کہ وہ سینٹر دے آئے، بھلے سے اور بھی لوگ ساتھ کھائیں۔ تمثیلہ نے حوصلہ قائم رکھا......لیکن اماں دن رات روتی رہتیں جب بھی رات کو تمثیلہ کی آنکھ کھلتی اماں سجدے میں یا دامن پھیلائے اللہ کے سامنے آہ و زاری میں مشغول رہتیں۔ ان بچوں کو کیا معلوم، ماں، باپ چاہے جس عمر کے ہوں بچوں کی بے راہ روی پر کتنے دکھی اور خون کے آنسو روتے ہیں' اس دن عائشہ، اس کا شوہر اور تمثیلہ اکٹھے ڈاکٹرز سے ملنے چلے گئے۔

''چلیں بی بی آج میں ذرا کی ذرا آپ کو شوہر سے ملا دیتی ہوں۔ پر اس کے سامنے روئیں مت، اسے اپنے کیے پر طعنہ نہ ماریں اور کوئی رقم وغیرہ بھی نہیں دینا۔'' ندیم کو ایڈمٹ ہوئے دو مہینے ہو چکے تھے۔ اس کے پچکے زرد گالوں پر تھوڑی سی رونق آ گئی تھی۔ اور وہ نارمل باتیں کر رہا تھا۔

''تمثیلہ میں تمہارا اور تمہاری دوست اور ان کے خاندان کا بے حد شکر گزار ہوں جو تم لوگ مجھے یہاں لے آئے۔ یہاں دوائیں، دینی لیکچرز اور سائیکالوجسٹ کی تھراپی کے ساتھ میرا علاج ہو رہا ہے۔ اب تک شاید میں زندگی کی بازی ہار جاتا۔'' ندیم نے گلوگیر آواز میں بیوی سے بات کی۔

''ڈاکٹر صاحب ہیروئن پاؤڈر، چرس حشیش وغیرہ کا تو ہم سنتے چلے آرہے ہیں لیکن ندیم تو کچھ ہٹ کر نشہ کرتے تھے آخر اب یہ کیا بلا ہماری قوم پر نازل ہوگئی ہے۔'' عاشر نے سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر فرمان سے پوچھا۔

''عاشر بھائی ہماری اس بدقسمت قوم پر بہت سی کٹھنائیوں کے ساتھ، ساتھ ایک اور مصیبت نے بھی امتحان میں ڈال دیا ہے، ڈرگز اسمگلرز نے لوگوں کے درمیان ایک نیا نشہ متعارف کروادیا ہے۔ یہ مہنگا تو ہے ہی لیکن ہیروئن اور کوکین وغیرہ سے بھی کئی گنا زیادہ خطرناک اور جان لیوا ہے۔ سپر طاقتیں اپنے دشمنوں کو لڑنے کے لیے یہ نشہ فراہم کرتی ہیں۔ جسے Ice (آئس) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اسے استعمال کرنے سے ان میں وقتی طور پر توانائی اور جوش و خروش پیدا ہوتا ہے لیکن یہ انسانوں کے لیے دیمک لگنے سے بھی زیادہ خطرناک ہے، زندگی گزارنے کے سارے نارمل طریقوں کو مریض بھول جاتا ہے۔ آئس استعمال کرنے والوں کو خیالی باتیں سراپا حقیقت بن کر دکھائی دینے لگتی ہیں۔ یہ اپنے بیوی، بچوں گھر والوں کو مرنے مارنے اور قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ انہیں سارے اپنے لوگ دشمن لگتے ہیں۔ انہیں یہ نشہ اگر نہ ملے تو ادھ پاگل ہو جاتے ہیں' نفسیات تو تباہ ہو ہی جاتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ جسمانی اعضا جگر، گردے اور پھیپھڑے بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ دماغی

سنجیدہ سنجیدہ

رشتے بدلتے ہیں وقت کے ہاتھوں، مجبوریوں کے ہاتھوں یا پھر مصلحت کے تحت مگر یہ تبدیلی بدلتے موسموں کی طرح بڑی گراں گزرتی ہے کیونکہ تبدیلی... تبدیلی ہی ہوتی ہے خواہ وہ وقت کی ہو، موسم کی ہو یا پھر راستوں کی، اپنے پیچھے آثار ضرور چھوڑ جاتی ہے مگر فرق صرف اتنا ہے کہ موسمی تبدیلی جسم پر اثر انداز ہوتی ہے اور عارضی ہوتی ہے لیکن رشتوں کی تبدیلی روح اور جسم دونوں پر اثر انداز ہوتی ہے اور پائیدار اتنی کہ تا دمِ مرگ ساتھ نبھاتی ہے۔

از: صائمہ سید، کراچی

بند کتاب

ہمیں زندگی کے سفر میں
ایسی کتاب تھمائی گئی
جس کی زبان اور نصاب سے
ہم بالکل ناواقف تھے

☆☆☆

عنوان

کیا تم بھی محبت کا کوئی عنوان چاہو گے؟
کیا تم بھی محبت کا کوئی انجام چاہو گے؟
پتا ہے کہ محبت کے تقاضے نہ نبھائے ہیں؟
وفا کے نام کا کتبہ بھی نہ تم نے لکھایا ہے؟
تو کیا اب بھی؟
محبت کا کوئی عنوان چاہو گے؟
تو کیا اب بھی؟
محبت کا کوئی انجام چاہو گے؟

کلام: افتخار شوق، میاں چنوں

صلاحیتیں کم ہوتے، ہوتے زیرو ہو جاتی ہیں۔“ ڈاکٹر اس مہلک نشے کے نقصانات بتا رہے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب، ندیم کی اچھی باعزت نوکری بھی چلی گئی۔ گھر کی ہر قیمتی چیز چلی گئی۔ بچے دھکے کھاتے اور میں مار کھا، کھا کر ادھ موئی ہو گئی ہوں۔“ تمثیلہ نے اپنے بہتے آنسوؤں کو رومال سے رگڑ کر صاف کیا۔

”بی بی آپ فکر نہ کریں، موت کے سوا ہر چیز کا علاج ہے۔ ہمارے اس سینٹر میں صرف کمانے کو ہی سب کچھ نہیں سمجھا جاتا، ہم اپنی پوری توانائی خرچ کر کے ایسے لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔“ دھیمے لہجے والے ڈاکٹر فرمان نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں انہیں تسلی دی۔

”ہمارا بہت پیارا گھرانا تھا۔ ندیم اور میں مل کر زندگی کی گاڑی چلاتے، بچے اچھے اسکولوں میں پڑھتے، اماں اپنے بیٹے پر ناز کرتی تھیں۔ پھر کسی ظالم نے انہیں یہ منحوس آئس کا نشہ لگا دیا۔ ساری خوشیاں ہوا میں اُڑ گئیں۔ اس دنیا کی عارضی زندگی میں دولت پانے کے لیے یہ ڈرگز اسمگلر کس طرح ماں، باپ کی... بددعائیں اور بیوی، بچوں کی آہوں، سسکیوں کا سودا خریدتے ہیں، کیا کسی کے کچلتے وجود پر کھڑے قہقہے لگانے والے خوش رہ سکتے ہیں؟ آپ ماہر نفسیات اور دوسرے ڈاکٹر ایسے لوگوں کا علاج تو کرتے ہیں آخر ان کے ڈیٹا اکٹھے کر کے حکومت پر زور کیوں نہیں دیتے کہ اس لعنت کو ختم کیا جائے۔ ان آدم خور درندوں کی بیخ کنی کے لیے اقدامات اٹھائے جائیں۔ کیا ہمارے بچوں، بڑوں کی لاشوں پر کھڑے ہو کر حرام کھانے والے اسی طرح نوٹ گن گن کر اپنی تجوریاں بھرتے رہیں گے۔“ تمثیلہ نے جو اپنے بھڑکتے جذبات پر بند باندھ رکھا تھا۔ مٹی کا ڈھیر ثابت ہوا جو ایک ہی ریلے میں ٹوٹ گیا۔

”تمثیلہ میری سہیلی...... اگر یہاں جان لیوا درندے بستے ہیں تو ڈاکٹر فرمان اور ان جیسے کئی نیک لوگ بھی تو ہیں جو دن رات ہماری مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔“ مس عائشہ نے تمثیلہ کی پیٹھ تھپتھپا کر نرمی سے کہا۔ اور تین ماہ بعد وہ دن بھی آ گیا کہ جب تمثیلہ اپنے شوہر کا سامان سنبھالے گھر جانے کو تیار تھی۔

”دیکھیں مسز ندیم پھر جیسے دنیا میں بہت سی بیماریاں انسان کو گھیرے رہتی ہیں یہ نشے اور ایڈکشن بھی ایک بیماری ہے۔ اب یہ صحت مند ہو کر جا رہے ہیں لیکن ان کی رپورٹس مجھے مہینے کے مہینے ملنی چاہئیں۔ آپ ان کی خوراک کا خاص خیال رکھیں گی۔ انہیں کسی قسم کا طعنہ یا برے گزشتہ کاموں کا احساس نہیں دلائیں گی۔ ان پر شک کر کے ہر وقت کی پوچھ گچھ بھی نہیں کریں گی۔ کیونکہ نوے فی صد مریض بیوی، بچوں کے طعنوں سے چڑ کر دوبارہ اسی راہ پر چل پڑتے ہیں۔“

”عائشہ میرے خیال میں اللہ تعالیٰ کسی بھی آزمائش میں ڈال کر اپنے لوگوں کو سرزنش اور دعوت فکر دیتا ہے۔ میں اب ڈرگز کے against ایک گروپ بناؤں گی۔ ہم اسکول و کالجوں میں جائیں گے۔ اپنی یونیورسٹی میں مہم چلائیں گے۔ ویڈیو بنائیں گے، لٹریچر بھی بانٹیں گے اور اپنی نئی جنریشن کو آئس، ہیروئن، چرس حشیش اور حتیٰ کہ سگریٹ کے مضر اور تباہ کن اثرات کے بارے میں بتائیں گے۔“

”میری بہن، میں اس کام میں مکمل تمہاری شراکت دار بنوں گی، ہم کل ہی سے ابتدا کریں گے۔“ عائشہ نے تمثیلہ کا سوکھا سانولا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

”تمثیلہ تم نے مجھے چھوڑ جانے کے بجائے میرا ساتھ دیا۔ مجھے حوصلہ دیا، میں بھی تمہاری اس مہم میں تمہارا ساتھ دوں گا...... اور ہرگز اب کبھی تباہی کے اس راستے پر نہیں جاؤں گا۔ یہ میرا تم سے یہ وعدہ رہا۔“ ندیم نے تمثیلہ کی بڑی، بڑی آنکھوں میں آئے آنسو اپنے ہاتھ سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ جس پر تمثیلہ مسکرا دی۔



دلِ بے خبر

دانیہ آفرین

میں اپنی آنکھوں میں جب اس کے خواب سوچتی ہوں
تو خوشبوؤں سے مہکتے گلاب سوچتی ہوں
یہ میری طاقتِ پرواز کا ہنر ہے کہ
میں حروف لکھتی ہوں
لیکن کتاب سوچتی ہوں

دلکش آواز میں آنکھیں بند کیے وہ لفظوں کے موتی سامعین کے گوش گزار کر رہی تھی۔ ”جی! تو سامعین اس نظم سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ آج ہمارے شو کا

موضوع کیا ہے۔" دھیمے لہجے میں بولتے ہوئے وہ کچھ دیر رکی، جملوں کے بیچ وقفہ اور موسیقی کی دھن آج کے جدید ایف ایم کا ٹرینڈ تھا۔

"خواب" وہ نعمت ہیں جو زندگی میں آکسیجن کا کام کرتے ہیں۔ اگر خواب نہ ہوں تو ہم مرنے سے پہلے مر جائیں۔ ہمیں زندگی کی طرف کھینچنے والے یہ خواب ہی ہوتے ہیں۔ اکثر ہمارے خوابوں میں یکسانیت ہوتی ہے۔ ہم سب خوابوں کی دنیا میں خود کو بہت آگے بہت بلندی پہ دیکھتے ہیں۔ آج کا موضوع بھی خواب ہے۔ پیارے سامعین آپ کے خوابوں کی کیا نوعیت ہے؟ اور آپ ان خوابوں کو حقیقت میں بدلنے کے لیے کن کوششوں میں سرگرم ہیں؟ اور کیا آپ کو اپنے خواب کی تعبیر مل جائے گی؟ آج ہم اس پر گفتگو کریں گے کالز اور میسجز کے ذریعے آپ اپنے اس پیارے شو میں شرکت کر سکتے ہیں۔"

اس کے بعد اس نے اپنا ایف ایم کا رٹا رٹایا نمبر بتایا اور کمرشل ایڈ شامل کر لیے۔ اسے ڈھیروں ڈھیر کالز اور پیغامات موصول ہو رہے تھے۔ آج کا شو ہمیشہ کی طرح ہٹ جا رہا تھا۔ اسٹیشن منیجر گلاس ونڈو کے پیچھے سے تھمز اپ کے اشارے سے اسے داد دے رہے تھے جسے وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ وصول کر رہی تھی۔ اور پھر ایک اور کامیاب شو کے بعد وہ گھر لوٹ گئی تھی۔

☆☆☆

دیواروں پر سے اکھڑتی سفیدی، کمرے کے وسط میں بچھا گدا، اس پر شکن آلود چادر، اس کے اوپر بکھری کتابیں اور ذرا فاصلے پر رکھے صبح کے ناشتے کے برتن...... کمرے پر ایک مایوسانہ نظر ڈال کر اس نے ایک لمبی سانس خارج کی اور کمرے کی واحد کھڑکی کے پٹ وا کر دیئے تازہ ہوا کا گزر کمرے میں ہوا تو حبس تھوڑا کم ہو گیا۔ اسکارف اتار کر اس نے کھونٹی پر لٹکایا، ہینڈ بیگ اور فائل گدے پر پھینکیں اور برتن اٹھا کر کمرے کے اگلی طرف آ گئی جسے وقتی طور پر کچن کی شکل دی گئی تھی، پرانی طرز کا تل، گیس کا چولھا کچھ ضروری برتن اور مسالوں کے چند پیکٹ، یہ تھا کچن کا کل سامان۔ میرال نے برتن دھو کر کپڑے سے خشک کیے اور پھر اپنے لیے چائے بنانے لگی۔ کمرے کو سمیٹ کر اس نے گدے کی چادر درست کی، کتابیں سلیقے سے رکھیں۔ اپنی چھوٹی سی الماری سے لان کا پرانا ملگجا سا ایک سوٹ نکال لیا جس کے رنگ گھس، گھس کے ہلکے پڑ چکے تھے۔ اور چائے کے ساتھ بن کباب کھانے لگی جو آتے ہوئے اس نے بابو بھائی کے ٹھیلے سے لیا تھا۔ کپ اور پلیٹ دھو کر آئی اور گدے پر دراز ہو گئی۔ تھکن سے چور جسم کو سکون کا احساس ہوا تو نیند کی دیوی اس پر مہربان ہو گئی۔ دنیا کے بکھیڑوں سے غافل چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی وہ اس کانٹوں بھری زندگی کی فکر سے آزاد ہو گئی۔ یہ تھی مشہور و معروف آر۔جے، میرال شاہ کی زندگی جو لاکھوں لوگوں کے دلوں پر راج کرتی تھی، جس کی دلکش آواز کے لوگ دلدادہ تھے ایف۔ ایم کی دنیا کی "یوتھ آئی۔ کون" اکثر ہمیں جو نظر آ رہا ہوتا ہے حقیقت اس سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ کیوں ٹھیک کہا ناں!

☆☆☆

سورج کی نرم گرم کرنیں کھڑکی سے ہوتی ہوئی کمرے کو روشن کر رہی تھیں۔ کپڑے استری کرنے کے ساتھ، ساتھ وہ تلاوتِ کلام پاک سن رہی تھی۔ سورۂ رحمان تنے ہوئے اعصاب اور اضطراب دل کو سکون بخش رہی تھی۔ نماز کے بعد وہ خود بھی روزانہ قرآن پاک کی تلاوت کرتی تھی۔ اکثر کام کرتے وقت لیپ ٹاپ پر تلاوت لگا لیا کرتی تھی۔ تنہائی میں رب سے بہتر کوئی ساتھی نہیں ہو سکتا۔ بریڈ اور چائے کا ناشتا کر کے وہ کلپ فائل میں اسائنمنٹ کے پیجز ترتیب سے لگانے لگی۔

"دھڑ دھڑ"... دروازہ بجنے کی آواز پر وہ چونکی تھی کلپ فائل کو نیچے رکھ کر وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔

"ایسا کیا کام کر رہی تھیں جو اتنی دیر سے دروازہ کھولا؟" جہاں آرا نے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ جبکہ دوسری دستک پر اس نے دروازہ کھول دیا تھا پر یہاں کوئی

بھی بات کہنا یا صفائی دینا بیکار تھا۔

"سوری پھپھو۔" میرال نے آہستہ سے کہا۔

"ہونہہ سوری! میرے پاس ٹائم نہیں ہے، آج دس تاریخ ہو گئی ہے جلدی پیسے نکال۔" جہاں آرا نے سخت تیور لیے اسے گھورا۔

"وہ پھپھو کل ملے گی سیلری۔" میرال نے پست آواز میں کہا۔

"اسے کل کیوں ملے گی؟ مجھے تو آج ہی چاہیے۔ سو خرچے ہوتے ہیں گھر کے...... تو نے عیاشی میں تو نہیں اڑا دیے کہیں۔" جہاں آرا نے اپنی ظالم نظریں اس پر جماتے ہوئے کہا۔

"نہیں پھپھو مجھے واقعی پیسے نہیں ملے ہیں۔" میرال نے گھبرا کر جواب دیا۔

"مجھے نہیں پتا، مجھے آج ہی چاہئیں پیسے اگر آج پیسے نہ ہوں تو گھر مت آنا۔" سفاکی سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئیں۔ میرال دروازے کے وسط میں کھڑی اپنی روٹھی قسمت کے بارے میں سوچنے لگی، دل پر لگے زخموں کی تکلیف سے آنسو رواں ہو کر انہی زخموں کو ہی گیلا کرنے لگے، ٹیسیں بڑھتی گئیں آنکھوں کے آگے دکھوں کی دھند چھا گئی۔

☆☆☆

ماربل کے ٹھنڈے فرش پر سے گزر کر راہداری عبور کر کے وہ لاؤنج میں آ گئی، سوگواروں کے گرد لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ میت پہ نظر پڑتے ہی آنسو اس کے رخسار پہ آ گرے۔ کوٹ پینٹ پہنے زمین پر اکڑ کے چلتا امیر اور ٹوٹی جوتی کو فرش پر گھسیٹتا غریب دونوں اس وقت ایک ہی ساتھ زمین پر ہوتے ہیں، دونوں کا ٹھکانا ایک ہی ہوتا ہے، لحد میں شاید فرق ہو۔ وہ بھی بعد میں مگر حسابِ زندگی لینے والے ملک الموت ایک ہی ہوتے ہیں، تنہائی، اندھیرا اور رینگنے والے کیڑے مکوڑے سب ایک سے ہوتے ہیں۔

انہی سوچوں میں غلطاں وہ ایک کونے میں جا بیٹھی۔ ولا سے تسلیاں دینے سے کیا اسے قرار آ سکتا ہے جس نے اپنا قیمتی رشتہ کھویا ہو؟ یہ سوال اکثر اس کے ذہن میں گھومتا۔ میت کو لے جاتے ہوئے شور برپا ہوا جو آہستہ آہستہ سسکیوں میں بدل گیا۔ لاؤنج کا وسط خالی تھا جہاں کچھ دیر پہلے زندگی سے ناتا توڑنے والے کا جسدِ خاکی رکھا تھا۔ آج ایک امیر، غریبوں کی صف میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کا یہاں ہونا یا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا اس لیے وہ خاموشی سے شکستہ قدم لیے اپنے کوارٹر کی طرف آ گئی۔ قسمت بھی عجیب کھیل کھیلتی ہے صبح پھپھو نے اس سے اس کا آخری ٹھکانا چھیننے کی بات کی تھی قدرت نے دوپہر میں ان سے ان کا سہاگ چھین لیا تھا۔ پورا گھر سوگ میں ڈوبا ہوا تھا، ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ اداسی کا موسم میرال کے لیے شناسا تھا۔ اس کی راتوں میں ویرانی کا ساتھ ہوتا۔ چڑھتا سورج دکھوں کی پٹاری کھول دیتا۔ انہی روز و شب کے درمیان اس نے اپنی زندگی کے بائیس برس گزار دیے تھے۔

☆☆☆

"میرال تم ٹھیک تو ہو؟" سارہ نے فکرمندی سے پوچھا۔ جب سے میرال کالج آئی تھی کھوئی، کھوئی سی تھی۔

"ہاں ٹھیک ہوں۔" میرال نے اپنی نظریں اس کی طرف سے پھیر کر جواب دیا، وہ نہیں چاہتی تھی اس کی ذات کا بھرم ٹوٹے۔

"میرال تمہاری آنکھوں کو دیکھ کر لگتا ہے ان میں دکھوں کا ایک جہاں آباد ہے۔" سارہ نے بغور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں سارہ بس مما، پاپا کو بہت مس کرتی ہوں۔" اس نے آنسوؤں کو پلکوں سے ڈھلکنے سے روکنے کی کوشش کی۔

"میرال ایک بات یاد رکھو زندگی کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتی، کچھ دولت کے حصول کے لیے خوار ہوتے ہیں کچھ دولت پا کر خوار ہوتے ہیں۔" سارہ نے اس کا ہاتھ تھام کر ملائمت سے سمجھایا۔

"کچھ لوگ رشتوں سے مفلس ہوتے ہیں سارہ

انہیں دولت کے حصول سے کوئی سروکار نہیں ہوتا انہیں بس اپنوں کے ساتھ کی اور اپنائیت کی ضرورت ہوتی ہے۔“ اس نے دل میں سوچا۔

”کیا سوچ رہی ہو؟“ سارہ نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلایا۔

”کچھ نہیں، چلو لیکچر کا ٹائم ہوگیا ہے“۔

دوسروں سے اپنی مشکلات ڈسکس کرکے انسان اکثر اپنا بھرم کھودیتا ہے ہر سامع حالِ دل کے لیے نہیں ہوتا۔

☆☆☆

”میرال یہ رہی آپ کی پے منٹ مگر آپ کو اب ہماری بات ماننی ہوگی۔“ اسٹیشن منیجر نے لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”سر میں آپ کو اپنی مجبوری بتا چکی ہوں۔“ اس نے فیاض صاحب کو بے بسی سے دیکھا۔

”میرال یہ آپ پہ ڈیپنڈ کرتا ہے ہمیں رات 12 سے 2 کی شفٹ میں آپ کا شو شفٹ کرنا ہے اگر آپ راضی نہیں تو ہم آپ کی جگہ کسی اور کو اپائنٹ کر لیتے ہیں۔“ فیاض صاحب نے اپنا آخری حربہ آزمایا۔

میرال نے چونک کر انہیں دیکھا۔ فیاض صاحب کی صورت میں ایک اور امتحان اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”سر پلیز میری مجبوری......“

”میرال آپ نے بہت من مانی کرلی۔ ہمیں اپنے شو کی ریٹنگ دیکھنی ہے، آپ کا جو بھی فیصلہ ہو آج کے شو کے بعد بتا دیجیے گا تاکہ آگے کے لیے ہم نیا آر جے اپائنٹ کریں۔“ اٹل انداز میں کہتے وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گئے تھے۔

میرال نے تین گھنٹے کا شو عجیب کش مکش میں کیا تھا‘ اکثر لسنرز اس کے لیے فکر مند تھے کئیوں نے تو کال کر کے اس کی خیریت پوچھی تھی۔ بے بسی سے اس نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف دیکھا پانچ منٹ بعد شو ختم ہونا تھا۔

آنکھیں بند کرکے اس نے چند لمحے سوچا اور ایک لمبی سانس لے کر شو کو سائن آف کرکے اسٹیشن منیجر کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔

اپنی ایک شرط کے ساتھ اس نے فیاض صاحب کی بات مان لی تھی۔

بغیر تیراکی کے اصول جانے اس نے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی......زندگی کے بے ہنگم دریا میں اس نے بے لگام موجوں سے نپٹنے کے ساتھ، ساتھ خود کو ڈوبنے سے بھی بچانا تھا۔

☆☆☆

بارش کی آواز سن کر چائے کا کپ تھامے وہ ہاسٹل کے روم کی کھڑکی سے برستی بوندوں کو دیکھ رہی تھی۔ زندگی دشوار راہوں میں بھی جینے کا سبب ڈھونڈ لیتی ہے۔ میرال بھی جی رہی تھی۔ اپنے بابا کا گھر چھوڑ کر۔ جہاں اس کے حسین بچپن کے مما، بابا کے ساتھ یادگار لمحات گزرے تھے۔ اس گھر کے آنگن میں بابا کی محبت کے کئی پودے تھے۔ وہاں کی ہوائیں مما کے پیار سے رچی بسی تھیں۔ وہاں کے درودیوار میں مما، بابا کی خوشبو بسی تھی۔ آنگن میں لگے یادوں کے پھول اس کے جینے کا جواز تھے۔

”انا، مما، بابا اب تک نہیں آئے میں اسکول سے بھی آگئی۔“ اس نے اپنی توتلی زبان میں انا سے فکرمندی سے پوچھا۔

”گڑیا آپ فکر نہ کرو بس آتے ہی ہوں گے مما، بابا۔“ انا نے تین سال کی ڈری سہمی مانو کو خود سے لپٹا لیا، مما، بابا اسے اسکول ڈراپ کر کے گھر کا کچھ ضروری سامان لینے گئے تھے۔ مگر اس کے اسکول سے لوٹنے کے دو گھنٹے بعد تک بھی واپس نہیں آئے تھے۔ آنکھوں میں آنسو لیے اس نے اپنے چھوٹے، چھوٹے ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے اپنے مما، بابا کو جلدی گھر بھیجنے کے لیے بہت دعائیں کی تھیں۔ سہ پہر چار بجے گیٹ بجا تھا۔ مانو کے ساتھ ساتھ انا بھی خوشی سے دروازے کی طرف لپکی تھیں۔ نور بابا نے دروازہ کھولا تھا تو سامنے ایمبولینس میں مما، بابا کے بجائے سفید کپڑے میں لپٹے جامد وجود لوٹے تھے۔ ننھی مانو نے آگے بڑھ کر مما، بابا کو اٹھانا چاہا تو انا نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ وہ حیرانی سے انا اور نور بابا کو آنسو بہاتے دیکھنے لگی۔ دونوں شہر میں ہونے والی

دہشت گردی کا نشانہ بن کے اسے بے آسرا چھوڑ گئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں گھر میں رشتے داروں اور عزیز واقارب کا تانتا بندھ گیا تھا۔ آہوں اور سسکیوں کے ساتھ اس کے مما، بابا ہمیشہ کے لیے اس سے دور لحد میں جا سوئے۔ ایک ہفتے تک رشتے داروں کی آمد جاری رہی۔ آہستہ، آہستہ سب ہمدردی کے دو بول، بول کے رخصت ہوگے۔ صرف پھپھو تھیں جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اب تک قیام کیے ہوئے تھیں۔ اس سب کے دوران وہ انا سے چپکی رہی تھی۔ وقت گزرتا گیا وہ اپنے روم سے انا کے کوارٹر میں شفٹ ہوگئی۔ گھر کا ہولڈ پھپھو کے ہاتھ میں آگیا۔ یوں وہ ایک مالکن سے نوکرانی کا درجہ پاگئی۔ لبوں پر نمکین پانی کے احساس سے وہ ماضی کی تلخ یادوں سے لوٹی تھی۔ کچھ دیر وہ بارش کے قطروں کو بلبلے کی صورت میں زمین سے مدغم ہوتے دیکھنے لگی۔

سوچوں میں غلطاں وہ بیڈ پر آبیٹھی اور لیپ ٹاپ آن کرکے آج کے شو کی تیاری کرنے لگی۔

اسے ہاسٹل شفٹ ہوئے ایک ماہ ہوگیا تھا۔ گھر میں رہتے ہوئے وہ رات 12 سے 2 کا شو ہرگز نہیں کر سکتی تھی اس لیے اس نے فیاض صاحب سے اپنی سیلری بڑھانے کی شرط رکھی تاکہ ہاسٹل کا خرچہ اٹھا سکے۔ میرال کی یہ شرط بخوشی مان لی گئی تھی۔ میرال ان کے لیے ہائی ریٹنگ کی سونے کا انڈا دینے والی مرغی ثابت ہوئی تھی۔ فیاض صاحب میرال کی مجبوری سے بخوبی فائدہ اٹھانا جانتے تھے۔ ایک اور کامیاب مڈنائٹ شو کر کے وہ اڑھائی بجے ہاسٹل لوٹی تھی۔

مسز منور (وارڈن) سے فیاض صاحب نے اس کے لیے خاص اجازت لی ہوئی تھی۔ ایف ایم کی گاڑی اسے پک اینڈ ڈراپ کرتی۔ خوش قسمتی سے ہاسٹل بھی قریب تھا۔ سب چیزوں کے باوجود وہ مڈنائٹ شو انتہائی مجبوری میں بے دلی سے کر رہی تھی۔ اکثر وہ سوچتی اگر مما، بابا زندہ ہوتے تو وہ یوں در، در کی ٹھوکریں نہ کھا رہی ہوتی۔

انا اور نور بابا بھی تو اسے تنہا چھوڑ گئے تھے۔ انا جب تک زندہ رہیں اسے چلچلاتی دھوپ سے بچائے رکھا۔ نور بابا نے اسے کبھی ذریعۂ معاش کی فکر نہ ہونے دی۔ مگر یہ دونوں بھی مما، بابا کے بعد اسے تنہا چھوڑ گئے۔ اس طوفانی رات میں ایک بار پھر وہ بے آسرا ہوگئی تھی۔ انا کی محبت کی چھاؤں اور نور بابا کی شفقت کی چادر اس کے سر سے اٹھ گئی تھی۔

”پھپھو پلیز مجھے اپنے ساتھ رکھ لیں۔“ اس نے ان دونوں کے چلے جانے کے بعد اپنی پھپھو سے کہا تھا مگر پھپھو نے اسے نفرت سے دھتکار کے دروازہ بند کرلیا تھا۔

بارش میں وہ گھر کے باہر سفیدے کے نیچے ٹھٹھرتی رہی تھی۔

”اے لڑکی اندر آؤ۔“ اگلی صبح اسے پھوپا کی کڑک دار آواز سنائی دی تھی۔ ممنون آنکھوں سے پھوپا کو دیکھتے ہوئے وہ بہ مشکل اٹھ کر اندر آئی تھی۔ سردی سے اس کا جسم اکڑ گیا تھا درد کی لہر اسے مزید نڈھال کر رہی تھی۔

”دیکھو لڑکی اگر تمہیں یہاں رہنا ہے تو تمہیں ایگری منٹ پر سائن کرنا ہوگا۔“ پھوپا نے بغیر لگی لپٹی کے اسے واضح کیا۔ ”یہ رہا ایگری منٹ یہاں سائن کر دو۔“ پھوپا نے فائل اس کے آگے کی۔

ایگری منٹ پڑھ کے وہ پلکیں جھپکانا بھول گئی۔ ایگری منٹ کے مطابق وہ اپنی کل متاع سے دستبردار ہو رہی تھی۔ ایگری منٹ کی آخری شق پڑھ کے وہ سن دماغ لیے فائل کو دیکھتی رہی۔

”اگر تم اس ایگری منٹ پہ سائن کروگی تو ہی کوارٹر میں تمہیں جگہ ملے گی۔“ ظہور احمد سفا کی سے کہتے اسے گھور رہے تھے۔ زندگی بعض دفعہ انسان سے ناقابلِ یقین فیصلہ کروا دیتی ہے۔ اس نے بھی ایک ایسا ہی فیصلہ کیا اور فقط اپنے سائن سے اپنی حیاتِ کل سے دستبردار ہوگئی۔ جہاں آرا اور ظہور احمد کی سفا کی دیکھ کر نور بابا اور انا اسے اپنے گھر لے گئے تھے مگر قدرت اسے واپس اس جہنم میں لے آئی تھی۔ جہاں سانس لینی محال اور جینا دشوار تھا۔ پچھلے پانچ سال سے وہ اس جہنم نما چھوٹے سے

کوارٹر میں رہ رہی تھی۔ پھوپا کا طنزیہ لہجہ، پھپھو کے سفاک رویّے نے اس کی روح کو زخمی کر دیا تھا۔ ماضی کی تلخ یادوں کو سوچتے، سوچتے ہمیشہ کی طرح زندگی سے شکوہ کرتی آج بھی اپنا تکیہ بھگو کے وہ سو گئی۔

☆☆☆

''مسز منور آپ کے تعاون کا شکریہ، میں آپ کی بہت ممنون ہوں۔'' ناشتے کی ٹیبل پر سلام کرنے کے بعد اس نے ان کا ہاتھ تھام کے کہا۔

''تم اچھی لڑکی ہو پھر فیاض صاحب نے گارنٹی لی تھی تو میں کیونکر منع کرتی، ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے چلو جلدی سے ناشتا کرو، نہ تمہیں اپنے کھانا کا ہوش ہوتا ہے نہ سونے کا۔'' مسز منور نے پیار سے ڈپٹا، ہاسٹل کی سب لڑکیاں اپنے' اپنے کالج، یونی، جاب پر جا چکی تھیں۔ میرال لیٹ نائٹ شو کی وجہ سے صبح تھوڑا لیٹ اٹھتی تھی۔ مسز منور بھی اس کے ساتھ ناشتا کرتی تھیں۔ میرال کو اُن میں انا کی جھلک نظر آتی تھی اس لیے وہ ان کا دل سے احترام کرتی تھی۔

☆☆☆

''میرال میڈم یہ آپ کے لیے آیا ہے۔'' چوکیدار نے ایک مقامی کوریئر کمپنی کا باکس اسے تھمایا۔

''شکریہ گلفام بابا۔'' مسکرا کر جواب دیتے وہ اسٹوڈیو روم کی طرف بڑھ گئی۔

پارسل پر بھیجنے والے کا نام موجود نہ تھا۔ میرال کچھ حیران ہوئی تھی۔ ایسا ہوتا تو نہیں شو کے دوران وقفے میں اس نے پارسل کھول کے دیکھا تو اس میں اس کی شاعری کا مجموعہ تھا۔ حیرت سے اس نے کتاب دیکھی تھی۔ شہر کے معروف پبلشنگ ہاؤس نے اس کی شاعری کا مجموعہ چھاپا تھا۔ مگر کس کے کہنے پر؟

میرال نے کبھی اپنی شاعری کے مجموعے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن وہ ہاسٹل پہنچی تھی۔ صبح اس نے پبلشنگ ہاؤس کال کی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا مجموعہ ایک صاحب نے پبلشنگ ہاؤس میں دیا تھا۔ پبلشر بھی اس کے نام سے لاعلم تھے یا بتانا نہیں چاہ رہے تھے۔ خاصا حیران کن واقعہ تھا۔ میرال کافی دنوں تک اس کے بارے میں سوچتی رہی۔

☆☆☆

''واہ میرال تم تو خاصی مشہور ہوتی جا رہی ہو تمہارے بلاگ پر تمہارے سب شو اپ لوڈ ہیں جلد تم عاصم بشیر، ریحان اسدی کی صف میں شامل ہو جاؤ گی۔'' سارہ نے توصیفی انداز میں کہا میرال اپنے بلاگ کا سن کر حیران ہو گئی تھی۔ اس نے تو فیس بک پر اپنا پیج بھی نہیں بنایا تھا، نہ ہی ٹوئیٹر پر وہ ایکٹیو تھی۔ ایف ایم کے پیج سے ہی وہ سوشل میڈیا پر فینز سے کانٹیکٹ میں تھی پھر یہ بلاگ......؟

''فیاض صاحب چینل کی طرف سے میرا بلاگ بنایا گیا ہے۔'' شو کے لیے اسٹیشن پر آتے ہی وہ فیاض صاحب کے روم آئی تھی۔

''نہیں میرال، ہم نے آپ کا کوئی بلاگ نہیں بنایا ہے، ہو سکتا ہے آپ کے کسی فین نے بنایا ہو۔'' بہت بے پروائی سے کہتے وہ کام میں بزی ہو گئے۔ میرال کو پریشانی نے آن گھیرا تھا۔

ایسا کون سا پرستار تھا جو اسے پروموٹ بھی کر رہا تھا اور اپنا نام بھی صیغۂ راز میں رکھا ہوا تھا۔ زندگی انہی حیران و پریشان روز و شب میں آگے بڑھتی گئی۔ بالآخر اس کا ایم اے کمپلیٹ ہو گیا۔ کانووکیشن میں اس نے نم آنکھوں سے اپنی ڈگری تھامی تھی۔ اس لمحے مما، بابا، نور بابا اور انا اسے شدت سے یاد آئے تھے۔ مسز منور نے اس کے اعزاز میں ہاسٹل کی سب لڑکیوں کو شاندار ڈنر کرایا تھا۔ میرال انہیں ممنون نگاہوں سے دیکھتی رہی تھی۔ ایک یادگار دن گزار کے جب وہ واپس اپنے کمرے میں لوٹی تو ایک خوب صورت بُکے اور گفٹ کمرے میں اس کا منتظر تھا۔

''واؤ کتنا پیارا ہے۔'' بُکے کو دیکھ کے بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا۔ خوب صورت ریپنگ میں پیک ہوا وہ گفٹ جب اس نے کھولا تو حیرت سے پلکیں جھپکنا بھول گئی۔ سرخ مخمل کے خوب صورت باکس میں ڈائمنڈ

اور پلاٹینم رنگ موجود تھی۔ ساتھ ایک چھوٹی سی چٹ بھی تھی۔ میرال نے دھڑکتے دل سے چٹ کھولی۔

''کامیابی مبارک ہو جی اور آپ کو جلد ہی آپ کے سب سوالوں کا جواب جلد مل جائے گا۔ آپ کا اپنا۔'' چٹ پہ لکھے الفاظ نے اس کی دھڑکن مزید تیز کر دی تھی۔

''کیا ہوا میرال ابھی تک سوئی نہیں ہو؟'' مسز منور اس کے روم کی جلتی لائٹ دیکھ کر دستک دے کر اندر آئی تھیں۔

''وہ یہ دیکھ رہی تھی۔'' اس نے بُکے کی طرف اشارہ کیا رنگ اور چٹ وہ پہلے ہی تکیے کے نیچے چھپا چکی تھی۔

''بہت خوب صورت ہے ماشاءاللہ تمہارے پرستار تو بڑھتے جا رہے ہیں۔'' مسز منور نے توصیفی انداز میں کہا۔

''چلو شاباش جلدی سو جاؤ۔'' پیار سے کہتے ہوئے وہ چلی گئی تھیں۔ میرال نے چٹ اور رنگ الماری میں چھپا کر رکھی اور لائٹ بند کر کے سونے کے لیے لیٹ گئی۔ مگر آج نیند آنکھوں اس کی کوسوں دور تھی۔ آنکھیں بند کرتی تو وہ خوب صورت رنگ آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیتی۔ آنکھیں کھولتی تو چٹ پہ اپنائیت اور محبت سے لکھے الفاظ بے چین کر دیتے۔

''کیا کوئی مجھ سے بھی محبت کر سکتا ہے؟ کیا میں کسی کے لیے اتنی اہم ہو سکتی ہوں؟ کبھی مجھے بھی اپنوں کا ساتھ میسر ہو گا؟'' خود سے سوال کرتے، کرتے وہ نیند کی وادی میں چلی گئی۔

''میرال تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' دوپہر بارہ بجے کے قریب ہاسٹل انچارج کی بات پر اسے ایسا لگا جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔

''مجھ سے کون ملنے آیا ہے؟''

''پتا نہیں خود آ کر نیچے دیکھ لو۔'' عجلت میں کہتے وہ واپس مڑ گئیں۔ میرال تیز، تیز دھڑکتے دل کے ساتھ مسز منور کے آفس کی طرف آ گئی۔ کچھ لمحے ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر رکھے کشمکش میں رہنے کے بعد اس نے خود کو جھٹکا۔

''کیا ہو گیا ہے مجھے' پاگل ہو گئی ہوں۔'' خود کو ملامت کرتے دستک دے کر روم میں داخل ہو گئی۔

''آؤ میرال بیٹھو، یہ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں۔'' مسز منور نے خوش دلی سے اپنے سامنے والی کرسی پر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا میرال نے غور سے دیکھا آفس میں سامنے دیوار سے لگے صوفوں پر مسز منور کے علاوہ ایک لڑکا اور لڑکی موجود تھے۔

''میرال یہ شیزا ہیں اور یہ احمر' ان دونوں کا تعلق ایک فلاحی ادارے سے ہے یہ لوگ آج کل ایک اسپتال کے پراجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔'' مسز منور نے خوش دلی سے ان دونوں کا تعارف کروایا۔

''میرال جی کل اسپتال کا افتتاح ہے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے اسپتال کا افتتاح آپ کریں۔'' لڑکے نے مؤدب انداز میں کہا۔

''میں!'' میرال خاصی حیران ہوئی تھی۔

''جی میم آپ؟''

لڑکے نے مسکرا کر کہا۔

''مگر میں اتنی بڑی شخصیت تو نہیں۔''

''میم آپ کی آمد ہمارے لیے اعزاز کی بات ہے۔'' آنکھوں میں التجا لیے لڑکے نے کہا۔

''میرال تمہیں ان کا انویٹیشن ضرور قبول کرنا چاہیے، نیکی کے کام میں بڑی، چھوٹی شخصیت کچھ نہیں ہوتی۔'' مسز منور نے شیزا اور احمر کا ساتھ دیا تھا۔ میرال مسز منور کی بات بھلا کیسے ٹال سکتی تھی۔ ناچار اس نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ شیزا اور احمر نے مسز منور کو ممنون نظروں سے دیکھا۔

''چلیں بھئی اب کچھ کھا لیتے ہیں، لنچ ریڈی ہے۔'' شیزہ اور احمر کے لاکھ منع کرنے کے باوجود مسز منور انہیں ڈائننگ ہال لے آئیں جہاں ایک پُرتکلف لنچ ان لوگوں کا منتظر تھا۔ میرال، مسز منور کو ان کے اسی دوستانہ اور پُرشفقت رویّے کی وجہ سے پسند کرتی تھی۔ خوشگوار

ماحول میں لنچ کیا گیا۔ ڈائننگ ہال میں بیٹھے لوگ لکڑکے لذیز کھانوں کے ساتھ، ساتھ احمر کے چٹکلوں سے بھی محظوظ ہوتے رہے۔

☆☆☆

"ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو۔" مسز منور نے اسے سراہا۔ میرال نے آج انہی کے کہنے پر ہلکا پھلکا میک اپ کیا تھا' وائٹ شفون کی فراک پہنے پنک کلر کا دوپٹا لیے کانوں میں نفیس آویزے پہنے بڑی، بڑی آنکھوں میں کاجل ڈالے تیکھے لبوں پر لائٹ سی لپ اسٹک لگائے وہ ہلکی پھلکی تیاری میں بھی کسی اپسرا سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ مسز منور کی دعاؤں کے ساتھ وہ بتائے گئے پتے پر پہنچ گئی۔ لوگوں کا ایک ہجوم چیف گیسٹ کی آمد کا منتظر تھا' میرال پر نظر پڑتے ہی احمر اور شیزا لبوں پر مسکراہٹ سجائے اس کی طرف بڑھے۔ شیزا نے اس سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ احمر نے مسکراہٹ کے ساتھ اسے بکے پیش کرکے اس کی آمد پر شکریہ ادا کیا۔

"آئیں میم سب انتظار کررہے ہیں۔" شیزا اس کا ہاتھ تھام کر اسپتال کے گیٹ کی طرف لے گئی اسپتال کی تختی دیکھ کر میرال کو لگا تھا وہ سانس لینا بھول گئی ہے۔

"مسٹر عفان اینڈ مسز عفان ٹرسٹ اسپتال" بورڈ پر لکھے ان ناموں پر نظر پڑتے ہی میرال کے قدم تھم گئے تھے۔

"میم آئیں سب ویٹ کررہے ہیں۔" شیزا اسے کھینچتے ہوئے اسپتال کی انٹرنس پر لے آئی۔ جہاں سرخ ربن لگا تھا شیزا نے اسے قینچی تھمائی میرال نے ماؤف دماغ سے تالیوں کی گونج میں ربن کاٹ کے اپنے ماں، باپ کے نام پر بنائے گئے اسپتال کا افتتاح کردیا۔

فلیش لائٹس آن ہوئیں میڈیا نے اپنی کوریج اسٹارٹ کی کئی رپورٹرز میرال کی طرف بڑھے تھے۔ احمر رپورٹرز کو میرال کی طرف بڑھنے سے باز رکھتا رہا۔ شیزا اسے لوگوں کے ہجوم سے نکال کے ایک پُرسکون روم میں لے آئی۔

"شیزا" اٹکتے لفظوں سے اس نے پکارا۔

"میم پلیز آپ ریلکس ہو جائیں، پانی پئیں، آپ کو آپ کے سب سوالوں کا جواب مل جائے گا۔" پانی کا گلاس پکڑا کر شیزا نے اسے نارمل کرنا چاہا۔

"کب تک کھیل کھیلتے رہو گے تم لوگ میرے ساتھ۔" میرال ہذیانی انداز میں چیخی۔

"میم پلیز ریلکس ہو جائیں۔" شیزا نے بے بسی سے کہا۔ "شیزا تم باہر جاؤ۔" دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تھا۔

میرال نے دیکھا بلیک پینٹ کوٹ میں نفیس انداز میں بال بنائے وہ شخص اسے ہی دیکھ رہا تھا، ذہانت سے چمکتی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، کھڑی ناک اور بائیں گال پر موجود تل تمام تر مردانہ وجاہت لیے اس شخص نے میرال کو سوولٹ کا جھٹکا دیا تھا۔

"آپ......" بے یقینی سے دیکھتے ہوئے وہ اس کی طرف بڑھی۔

"ہاں مانو' میں آ گیا ہوں' تمہیں اس دوزخ سے لینے مجھے معاف کردو میری غیر موجودگی میں تمہیں اتنا کچھ سہنا پڑا۔" آنسو اس کا بھرم توڑ کے پلکوں سے ڈھلک کر رخساروں کو چھونے لگے۔

"نہیں جانِ رانبیل نہیں، بہت بہا لیے تم نے اپنے قیمتی آنسو، یہ اتنے بے مول نہیں۔" رانبیل نے اسے خود سے لگا لیا عرصے بعد کسی اپنے کا کندھا پا کر میرال اپنے ضبط پر قابو کھو بیٹھی۔

"مانو اب آ گیا ہوں ناں میں۔" اس کے ریشمی بالوں پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

"کہاں تھے آپ اتنے سالوں سے؟" اس سے الگ ہو کر میرال نے خفگی سے پوچھا۔ میرال کے اس پُرشکوہ انداز پر رانبیل مسکرا دیا۔

"سب بتاتا ہوں آرام سے اِدھر بیٹھو۔" رانبیل اسے صوفے تک لے آیا۔ آرام سے بٹھا کر پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"مانو ہمارا نکاح محض ایک ایگری منٹ تھا' میں بھی اس عمر میں بے پروا تھا مجھے اس وقت تک تم میں کوئی

دلچسپی نہیں تھی، امی، ابو نے کہا تم سے نکاح کرلوں، میں نے کرلیا۔ اس کے دو ماہ بعد ہی میں تمہارے بابا کے پیسوں سے کینیڈا اسٹڈی کے لیے چلا گیا تمہارے بابا یعنی میرے ماموں کے پیسوں پر عیاشی کرکے میں بہت بے چین تھا، بے چینی کی وجہ سے میں راتوں کو سو نہیں پاتا کسی کام میں میرا دل نہیں لگتا تھا، میں کینیڈا میں ہی ایک بزرگ کے پاس گیا اپنی پریشانی بتائی جانتی ہو انہوں نے کیا کہا۔"

اس نے رک کرکے میرال سے پوچھا۔ میرال نے نفی میں سر ہلایا۔

"انہوں نے کہا تم اپنی بیوی کو یوں بے آسرا چھوڑ آئے ہو اس لیے بے چین ہو۔ میں ان کی بات پر حیران ہوا پھر ان کے پاس میں وقتاً فوقتاً جاتا رہا وہ مجھے میاں بیوی کے خوب صورت تعلق کے بارے میں بتاتے۔ انہی دنوں امی، ابو مجھ سے اصرار کرنے لگے کہ میں تمہارے ڈیورس پیپر بھجوا دوں۔ میں نے بزرگ صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے مجھے کہا کہ بغیر کسی معقول وجہ کے صرف ماں کے کہنے پر بیوی کو چھوڑ دینا جائز نہیں جبکہ بیوی میں کوئی عیب بھی نہ ہو تو سے طلاق کا پروانہ تھمانا ناانصافی بلکہ گناہ ہے۔ میں نے امی ابو کو تمہیں ڈیورس دینے سے منع کیا تو وہ مجھ سے ناراض ہو گئے اور مجھ سے رابطہ ختم کردیا۔ ان دنوں میں پاکستان آنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ زندگی سرکتی گئی اور تم میرے دل میں اپنے نقش خاموشی سے گہرے کرتی چلی گئیں۔ ابو کے انتقال کی اطلاع مجھے بہت لیٹ دی گئی جب میں پاکستان آیا تب تک تم گھر چھوڑ گئی تھیں۔ تمہیں بہت ٹریس کرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میری مانو تو آر جے میرال کے نام سے جانی جاتی ہے۔ تب سے میں تمہیں فالو کرتا رہا، تمہیں یہ سرپرائز میں پہلے دیتا مگر حالات کچھ ناخوشگوار ہو گئے تھے۔" کہتے، کہتے وہ رکا۔ میرال جو بہت غور سے اسے سن رہی تھی اس کے چپ ہو جانے پر چونکی۔

"اچھا تو وہ میری شاعری اور تحفہ یہ سب آپ کا کرشمہ تھا مگر......رانبیل آپ مجھے اب چھوڑ کے تو نہیں جائیں گے ناں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں مانو اب ہم دونوں ہمیشہ ساتھ رہیں گے، میں کوشش کروں گا کہ تمہارے سب دکھوں کا مداوا کر سکوں تمہیں محبت اور سچے جذبات سے گندھا ایک آشیانہ دے سکوں۔" اس کا ہاتھ تھام کر وہ جذباتیت سے کہہ رہا تھا میرال نے دیکھا رانبیل کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت کا ایک جہان آباد تھا۔

"رانبیل مگر پھپو؟"

"امی اپنا انجام پا چکی ہیں۔" دکھ سے اس نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"دو ماہ پہلے گھر میں شارٹ سرکٹ ہو گیا تھا امی اور ہما (بہن) نے آگ کی لپیٹ میں اپنے گناہوں کی سزا پالی۔" رانبیل کو اپنی آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ ماں چاہے جیسی بھی ہو ماں تو ماں ہوتی ہے۔ میرال بھی افسردہ ہو گئی تھی۔ پھپو نے اس کے ساتھ بہت برا کیا تھا مگر اس نے انہیں کبھی بددعا نہ دی تھی۔

"مانو تم امی، ابو کو پلیز میرے لیے معاف کر دو۔" رانبیل نے اس کا ہاتھ تھام کر التجائیہ کہا۔

"رانبیل میں پھپو اور پھوپا کو اللہ کی خاطر اور آپ کی خاطر معاف کرتی ہوں۔" میرال نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بھیگے لہجے میں کہا۔

"شکریہ مانو!" رانبیل نے اسے ممنون نظروں سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان چھا گیا......

بے شک عفو و درگزر کرنے والے اللہ کو پسند ہیں۔ میرال نے اپنا سر رانبیل کے کندھے پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ دشوار گزرگاہوں سے گزرتے، گزرتے اس کی روح تک زخمی ہو گئی تھی۔ مگر اب رانبیل نے اپنی محبت کی پھوار سے میرال کے سب زخموں کو دھو ڈالا۔ سکون اس کے روم، روم میں اتر گیا۔



ناولٹ

چوتھا حصہ

محبت لفظ ہے لیکن.......

”ماں باپ کے سامنے بہت سوچ سمجھ کے بولا کرو کیونکہ کبھی ان کے سامنے بولا گیا کوئی بھی برا یا اچھا کلام ہماری پوری قسمت پہ حاوی ہو جاتا ہے۔“

خوب صورت جذبوں کی باریکیاں بیان کرتی حیا بخاری کی ایک دل نشیں تحریر

”یہ سوال تو مجھے تم سے پوچھنا چاہیے۔“ لالہ کے لہجے میں خود بخود تلخی اُمڈ آئی تھی۔ نمرہ نا سمجھی سے البتہ ان سب کو دیکھے جارہی تھی۔ لالہ کی آنکھوں میں یکلخت لودیتی شناسائی سے وہ اتنا تو سمجھ گئی تھی کہ وہ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ لیکن اس وقت کی سچویشن اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ تبھی وہ لالہ کے پیچھے خاموشی سے کھڑی تھی۔

”ایکسکیوزمی میم...... آپ پلیز آگے کوئی سیٹ

دیکھ لیں۔" ویٹران کو یوں کھڑا دیکھ کر کچھ اور سمجھا تھا۔ تبھی فوراً پیشہ ورانہ لہجے میں کہتا ان کا جھگڑا نمٹانے چلا آیا تھا۔

"نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے، ہم چاروں ساتھ ہیں۔" لالہ نے سمجھداری سے فی الحال اس کو تو سر سے ٹالا۔ وہ سر ہلاتا تیزی سے مڑ گیا تھا۔

"اٹھو، چلو میرے ساتھ۔" لالہ نے آگے بڑھ کر اقرا کا ہاتھ پکڑا۔

"میں خود چلی جاؤں گی۔" وہ پیچھے ہوئی۔

"یہ ہے کون اقرا؟" آغا کو غصہ آنے لگا۔

"اس کے آس پاس اگر دوبارہ نظر آئے ناں تو بتاؤں گی کہ میں اس کی کون ہوں۔" جھٹکے سے کھینچ کر اس کو اٹھاتی لالہ نے ساتھ آغا کو بھی وارن کیا تھا۔

"چلو اب......" اسے اپنے آگے کرتے ہوئے لالہ نے دھکا سا دیا۔ اب کی بار اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ خاموشی سے آگے چلنے لگی تھی۔ نمرہ بھی اُن کے پیچھے تھی۔ آغا ساکت سا کھڑا رہا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ ٹیکسی لے کر گھر جا رہے تھے، نمرہ سارا راستہ خاموش رہی تھی۔ اور اسی عادت کی وجہ سے وہ لالہ کو عزیز تھی۔ وہ خواہ مخواہ کسی کی بات میں مداخلت نہیں کرتی تھی۔ معاملات کی نزاکت کو وہ فوری بھانپ لیتی تھی۔ لالہ نے پہلے نمرہ کو گھر چھوڑا۔ پھر اقرا کو لیے گھر کے قریب ہی پارک میں آ گئی تھی۔ اقرا نے ابھی تک اس سے دوبارہ کوئی بات کرنے کی ہمت نہیں کی تھی۔ البتہ اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ کس قدر گھبرائی ہوئی ہے اور اس کے ذہن میں کوئی جھوٹ گھڑنے کے لیے کس قدر سوچ بچار جاری ہے۔

ٹھنڈی نرم گھاس پر بیٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے حمزہ کو کال ملائی جو اس نے دوسری ہی بیل پر پک کر لی تھی۔

"ہیلو حمزہ...... اقرا میرے ساتھ ہے، تم اور پھپھو پریشان مت ہونا۔" اس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ تیز لہجے میں بولی تھی۔ وہ حیران ہوا۔

"لیکن وہ تو......؟"

"ہاں...... پھر بتاؤں گی، ابھی مجھے شاپنگ کرنی ہے، بائے......" وہ جانتی تھی اقرا نے کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑا ہوگا گھر پر...... تبھی وہ زیادہ بات نہیں کر سکتی تھی حمزہ سے۔

فون بند کر کے اب اس کی نظریں۔ اقرا پر جمی تھیں۔ جو گھاس پر نظریں گاڑے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی تھی۔ مطلب اس کے سدھرنے کے چانسز تھے۔ وہ اسے سنبھال سکتی تھی۔

"اقرا کون تھا وہ لڑکا......" اس نے براہِ راست ہی بات کرنے کا سوچا۔ گہری نظریں اقرا کے گھبرائے چہرے پر جمی تھیں۔

"مجھ سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔" کافی دیر اس کے بولنے کا انتظار کرنے کے بعد اس نے خود ہی دوبارہ بات شروع کی۔

"اگر اس لڑکے کو اچھی طرح جانتی ہو تو سب مجھے سچ، سچ بتا دو...... میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ یہ ساری بات اور آج کا یہ واقعہ تمہارے اور میرے درمیان رہے گا۔" اس کی بات پر اقرا نے پہلی بار نظریں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ لالہ نے صاف محسوس کیا تھا کہ اس کی بات پر اقرا کی آنکھوں میں چمک سی ابھری تھی۔

"امی آپ کو اور ممانی کو اتنا ہرٹ کرتی ہیں...... آپ پھر بھی اس بات کو چھپا لیں گی، سچ میں......؟"

اس کی بات سن کر لالہ نے ایک لمبی سانس کھینچی، اس سے صاف ظاہر تھا کہ... اقرا صرف آج کے واقعے سے ہی نہیں گھبرائی تھی بلکہ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اسے کسی اور نے نہیں بلکہ لالہ نے دیکھا تھا جو پھپھو کے نامناسب رویّے کی وجہ سے ان کی ساری فیملی سے دور ہوتی گئی تھی۔ اقرا کو یقیناً اس سے یہ خوف تھا کہ وہ اس کی ماں سے بدلہ لینے کے لیے اس موقع کا بخوبی فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ تبھی وہ شاید زیادہ خوفزدہ بھی لگ رہی تھی۔

"میں تمہاری ماں کی طرح تو ہرگز نہیں ہوں کہ سگے رشتوں کے دامن پر کیچڑ اچھالوں۔ تم کھل کے بات کر سکتی ہو مجھ سے۔" نہ جانے کیوں خود بہ خود اس کے لہجے میں تلخی سی گھل گئی تھی۔ اقرا کا سر مزید جھک گیا تھا۔

"اس کا نام دانیال ہے، آغا کے نام سے جانتے ہیں سب۔" گھاس پہ شہادت کی انگلی پھیرتی وہ دھیمے لہجے میں بتانے لگی۔

"تم ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہو؟" لالہ اہم بات کی طرف براہِ راست آتے ہوئے بولی۔

"دو سال سے...... آغا ہماری گلی میں ہی رہتا ہے۔ ایک دو گھر چھوڑ کر۔" اس نے بتایا۔ لہجے میں سچائی تھی۔

"میں اور وہ ایک دوسرے کو بے حد چاہتے ہیں، آغا اچھا لڑکا ہے، سب لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں، اچھا پڑھا لکھا ہے، بس ابھی بیروزگار ہے۔" اس نے سب کچھ تفصیل سے بتایا۔

"پھپھو جانتی ہیں یہ سب۔" لالہ کی گہری نظریں اقرا کے چہرے پر جمی تھیں۔

"جی...... اس کی فیملی کو اچھی طرح جانتی ہیں لیکن ہمارے بارے میں نہیں۔" اس نے ہاتھ روکتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے جھاڑ کر صاف کیا تھا۔

"ہاں، وہ تو پتا ہے مجھے......" لالہ نے سر ہلایا۔ "خیر...... میں یہ نہیں کہتی کہ آغا برا لڑکا ہے۔" وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ اقرا کی نظریں اب اسے دیکھ رہی تھیں۔

"لیکن وہ تمہارے لیے ہے تو نامحرم...... اور میں نہیں چاہتی کہ تمہارا مان تمہارا یقین کبھی ٹوٹے۔ اس لیے اب تم آغا سے کبھی یوں اکیلے ملنے نہیں جاؤ گی۔" اس نے دوٹوک فیصلہ سنایا۔

"لیکن......" اقرا بری طرح مچلی...... لالہ نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے کچھ بھی بولنے سے روک دیا۔

"تم ابھی نا سمجھ ہو اقرا...... پھر جس طرح پھپھو دوسروں کی بیٹیوں پر کیچڑ اچھالتی پھرتی ہیں، میں نہیں چاہتی کہ کسی کی آہ تمہارے دامن سے آ لپٹے۔ اسی لیے تمہیں میری اتنی سی بات تو ماننی پڑے گی۔" اس کے لہجے میں سختی در آئی۔ اقرا انگلیاں مروڑنے لگی۔

"رہی بات آغا کی...... تو تم جانتی ہو حمزہ مجھ سے کس قدر فرینک ہے، میں کوشش کروں گی کوئی مناسب موقع دیکھتے ہی اس کے متعلق حمزہ کی رائے جان سکوں۔" اقرا کا نرم و ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے اس نے اسے جیسے حفاظت کا احساس دلایا تھا۔ اقرا کے مضطرب چہرے پر مطمئن سی مسکراہٹ چمکی تھی۔

"سچ میں...... آپ بات کریں گی بھیا سے...... میرے اور آغا کے لیے؟" پُرامید نظروں سے خود کو گھورتی اقرا نہ جانے کیوں اس سمے اسے بے حد بدتمیز اور آوارہ سی لگی تھی۔

"کہہ دیا ناں...... لیکن اب تم اس سے کہیں بھی... کبھی بھی نہیں ملو گی۔" سخت لہجے میں کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اقرا نے بھی اس کی تقلید کی۔

"اور یہ بات بھی یاد رہے اقرا......" ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے اچانک ہی اسے مخاطب کیا تھا۔ اقرا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

"اگر حمزہ، آغا کی شخصیت سے ذرا بھی مطمئن نہ ہوا تو تمہیں اس راہ سے پلٹنا ہوگا...... ورنہ میری امی کا حال تو تمہارے سامنے ہی ہے۔" تلخ لہجے میں کہتی وہ ٹیکسی میں سوار ہوئی تھی۔ اقرا کو البتہ اپنی جگہ سے ہلنے میں وقت لگا تھا۔

☆☆☆

شام بہت اداس تھی...... سورج جاتے، جاتے لہو رنگ بکھیرنے پر تلا ہوا تھا۔ شہر سے دور نہر کے کنارے بے حد سکون تھا۔ پھر بھی ہر سو اضطراب پر پھیلانے میں کامیاب ہوتا جا رہا تھا۔ ہر طرف نارنجی شعاعیں آج کچھ زیادہ ہی شوخ ہو کر سرخ سی دہکنے لگی تھیں۔ گہرے سبز فراک پر سفید رنگ کا بڑا سا دوپٹا لیے، جامن کے پیڑ کی موٹی جڑ پر بیٹھی زمزمہ اس وقت بالکل اسی اداس منظر کا حصہ لگ رہی تھی۔ قریب ہی دو تین پکی اینٹوں کی سیٹ بنائے ضیا ننھے، ننھے کنکر اٹھائے نہ جانے کیوں بار، بار نہر کے ساکت پانی میں ہلچل مچا دیتا۔

"اس دن کے بعد میں کبھی اس شخص پر اعتبار نہ کر سکی...... اور ضد میں آ کر میں ہر وقت بننے سنورنے

لگی۔ گھر کی چار دیواری سے باہر جھانکنے لگی...... کوئی تیسرا راستہ ڈھونڈنے لگی...... وہ مجھے چھوڑ سکتا ہے، میں اس سے بھی پہلے اسے چھوڑ سکتی ہوں۔ تھی نہ بے وقوف عورت......" وہ تلخی سے مسکرائی۔ ضیا نے پتھر نیچے گیلی مٹی پر اچھال دیے اور مورتی بنی زمزمہ کو دیکھنے لگا جو اس لہو رنگ شام میں بے حد زخمی، زخمی سی لگ رہی تھی۔ بے حد بکھری ہوئی۔

"دل کے راستے اتنے کچے کیوں ہوتے ہیں ضیا ایک بار کوئی پھسل جائے...... دل سے ہی نکل جاتا ہے۔" اس نے اچانک ہی ضیا کو مخاطب کیا...... ضیا خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔

"لیکن وہ تو نہیں پھسلا تھا۔ پھسل تو میں گئی۔ اس کا اعتبار نہ کر کے خود کو بھی اعتبار کے قابل نہیں رکھ سکی۔" وہ دور آسمان پر چھاتے اندھیرے کو دیکھنے لگی۔ جو دھیرے، دھیرے اس کے وجود کے ساتھ ساری کائنات پر چھانے لگا تھا۔

"انہی دنوں مجھے اکبر ملا...... وہ سوات سے تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے والے ہوٹل میں کام کرتا تھا...... مجھے دیکھتے ہی میرا دیوانہ ہو گیا۔" وہ ہنسی تھی۔ اور ضیا کو یوں ہنستے وہ گویا ماتم کرتی محسوس ہوئی تھی۔

"پہلے پہل اس نے پتھر میں لپٹے خط میرے لیے ٹیرس پر پھینکے...... میں نہ جانے کیوں نہ گھبرائی۔ نہ غصہ ہوئی، وہیں کھڑے، کھڑے بڑی ادا سے پڑھتی، مسکراتی تم نے سنا ہے ضیا...... ایک مرتبہ کسی نے کہا تھا کہ ہر عورت میں طوائف ہوتی ہے اور ہر طوائف میں ایک عورت...... موقع ملتے ہی باہر آجاتی ہے۔ بس میرے اندر کی بھی طوائف جاگ اٹھی تھی۔ بے جا غصے اور اندازوں کی وجہ سے...... اکبر نے ایک قدم آگے بڑھایا...... میں نے دس...... اور پھر ہم دونوں کو ایک دوسرے کے سوا کچھ اور دکھائی نہیں دیتا تھا۔ فیصلے کی گھڑی آئی...... اور پھر اکبر کی باتوں میں آکر میں چار دیواری کا تقدس پامال کرتے ہوئے گرد آلود راہوں کی مسافر بننے نکل پڑی۔ اکبر نے کہا تھا کہ کسی محفوظ مقام پر پہنچتے ہی خلع کا مقدمہ کر کے طلاق لے لیں گے اور پھر ہماری اپنی دنیا ہوگی...... صرف میں اور وہ......" اس کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ ضیا پھر پتھر چننے لگا۔

"کاش یہ مجھے انہی چھوٹے کنکروں سے سنگسار کردے۔" زمزمہ نے اسے دیکھتے ہوئے سوچا۔

"محفوظ مقام آیا؟" ضیا نے دور نہر میں پتھر اچھالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں...... زمزمہ نے گرم شال کو اپنے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ سردی ایک دم ہی زیادہ لگنے لگی تھی۔

"خانم کا اڈہ......" وہ قہقہہ مار کے ہنسی...... ضیا کو نہ جانے کیوں غصہ سا آیا...... ایک ساتھ کتنے ہی پتھر زور سے اچھال دیے۔ پانی میں ایک دم شور سا اٹھا تھا۔

"اس نے مجھے ایک کنواری لڑکی بتا کر میرے زیادہ دام اینٹھنے چاہے، میں پتھر بنی اپنا سودا ہوتا دیکھتی رہی...... پھر جیسے میں مر کر دوبارہ زندہ ہوئی تھی۔ موت کے بعد کا حساب شروع ہوا تھا۔ میں نے اپنے اعمال کی سزا بھگتنی تھی تو میں تیار تھی...... لیکن اس کا فائدہ کیوں ہوتا۔ میں نے خود خانم کو ساری بات بتا دی۔ سچ، سچ، وہ حیران رہ گئی۔ پھر اس نے مجھے بتایا، اکبر ایسے ہی دور دراز علاقوں کی بچیاں ورغلا کر لاتا تھا۔ اور مہنگے داموں بیچ کے چلا جاتا تھا۔ اکبر اس دوران قہقہے لگا کر ہنستا رہا۔ اور پھر میں نے اس کی ہنسی کو مار دیا۔ وہ آنکھیں... پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا تھا۔" وہ پھر ہنس رہی تھی۔

"تم نے کیا کہا؟" ضیا کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے اس کی طرف مڑا تھا۔

"میں نے خانم کو کہا، میں خود تمہارے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہوں، اسے پیسے دینے کی ضرورت نہیں...... اور آرام سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ خانم کی تو باچھیں کھل گئیں، اکبر البتہ مجھے مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ خانم نے اپنے آدمیوں سے اس کی وہ درگت بنائی کہ ساری عمر وہ مجھے بھول نہیں سکے گا۔"

"اور تمہارا شوہر......" ضیا کے اچانک پوچھنے پر وہ جھٹکے سے اٹھی تھی۔ کندھوں کے گرد لپٹی ہوئی چادر زمین

پر گر گئی تھی۔

"میرے خط نے اسے سب سمجھا دیا ہوگا۔ وہ تو ہمیشہ ہی میری بات مانتا تھا۔" وہ کھوسی گئی۔

"میں تو نہ جا سکی...... لیکن پتا کروایا تو پتا چلا تھا کہ وہ ملک ہی چھوڑ گیا ہے۔ لیکن میرے ساتھ بے وفائی نہ کر سکا۔ اس کے گھر والے خود کو قصور وار کہتے ہیں...... لیکن اب کیا فائدہ ضیا۔"

"تمہیں لوٹ جانا چاہیے زمزمہ......" ضیا اس کے قریب آیا تھا۔

"اللہ نے آج تک تمہاری حفاظت کی ہے۔" اس کے لہجے میں امید تھی۔

"مجھے لگتا ہے ضیا میں سب سہہ لوں گی اب...... لیکن وہ جو پہلی نظر مجھ پر ڈالے گا نہ...... زخمی، شکوہ زدہ، لہو رنگ، وہ میں برداشت نہیں کر پاؤں گی۔" وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھے پھوٹ، پھوٹ کے رو دی تھی۔ ضیا نے آگے بڑھ کر چادر اٹھا کے اس کے سر پر ڈال دی تھی۔

☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ اور اقرا ابھی تک گھر واپس نہیں لوٹی تھی۔ زرینہ بیگم کی پریشانی بڑھنے لگی تو مجبوراً حمزہ کے کمرے کا رخ کیا...... وہ بے فکر سا لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں دروازے میں کھڑی سوچتی رہیں۔ اس وقت حمزہ کو اقرا کے بارے میں بتائیں نہ بتائیں۔ وہ اس کے غصے سے واقف تھیں۔ نہ صرف ان سے خفا ہوتا بلکہ اقرا کو بھی خوب سناتا۔ انہیں اقرا پہ بھی غصہ آرہا تھا۔ انہوں نے بار، بار تاکید بھی کی تھی کہ عصر کے بعد تک گھر آجائے لازمی...... لیکن اب کافی دیر ہو چکی تھی۔ انہیں لگا مزید دیر نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ اندر آگئیں۔

"حمزہ۔" پریشان لہجے میں انہوں نے پکارا تو حمزہ چونک گیا۔

"امی......" وہ فوراً اٹھتے ہوئے ان کے پاس آیا تھا۔

"کیا ہوا امی...... خیریت؟" ماں کے پریشان چہرے نے اسے سچ میں پریشان کر دیا تھا۔

"اقرا ابھی تک گھر نہیں آئی۔" انہوں نے ڈرتے، ڈرتے کہا تھا۔

"اُف......" حمزہ نے گہری سانس کھینچی تھی۔

"آپ نے تو میرا دم نکال لیا تھا......" وہ مطمئن سا مسکرایا تو زرینہ اسے اچنبھے سے دیکھنے لگیں۔

"کیا مطلب......؟ صبح کی گئی ہے شام ہو رہی ہے، اس میں کوئی پریشانی والی بات نہیں؟" انہیں غصہ آگیا۔

"بالکل......" اس نے مسکراتے ہوئے ماں کو اپنے ساتھ لگایا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیونکہ وہ کسی غیر کے ساتھ نہیں گئی۔ لالہ کے ساتھ ہے وہ۔" لیپ ٹاپ پر نظریں جماتے ہوئے اس نے سادہ لہجے میں بتایا تھا۔ اور زرینہ بیگم کے چہرے پر ابھرنے والے غصے اور نفرت کے تاثر کو نہ دیکھ پایا تھا۔ ٹھیک اسی وقت دروازہ بجا تھا۔

"لیں...... وہ آبھی گئیں۔" کہہ کر وہ اٹھ کر چھلاوے کی طرح باہر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ اور زرینہ غصے سے لب کچلتی دھیرے، دھیرے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے باہر چلی آئیں۔

"مجھے پتا تھا کہ تم دونوں ہی ہوگی۔" چہرے پر مسکراہٹ امڈی چلی آرہی تھی۔

زرینہ بیگم نے حیرت سے بیٹے کے چہرے پر بولتے جذبات دیکھے تھے، خوشی اس کے انگ، انگ سے پھوٹ رہی تھی۔

"سوری دیر ہو گئی۔ السلام علیکم پھپھو......" مختصر جواب دے کر لالہ، زرینہ کی طرف بڑھی تھی۔ اور زرینہ، اقرا کی طرف جو نہ جانے کیوں خود کو کسی مجرم کی طرح لالہ کے وجود کے سائے میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تو اب تم بھی لالہ کی طرح شام تک آوارہ گردیاں کرو گی۔" سخت لہجے میں کہتی انہوں نے اقرا کی نازک کلائی اس قدر سختی سے پکڑی تھی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے تھے۔ لالہ البتہ ان کی بات پر

بے بسی سے لب کچل گئی۔

"کیا کررہی ہیں امی...... چھوڑیں۔" حمزہ تیزی سے ماں کی طرف آیا تھا۔

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو حمزہ...... بجائے بہن سے باز پرس کرنے کے۔" وہ الٹا حمزہ پہ برسنے لگیں۔

لالہ کی آنکھیں جلنے لگیں۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ یہ سب صرف اس وجہ سے تھا کہ اقرا، لالہ کے ساتھ آئی تھی۔ اگر اس وقت وہ کسی اور دوست کے ساتھ آئی ہوتی بھلے اس لڑکے کے ساتھ تو زرینہ بیگم کا رویّہ بالکل الٹ ہوتا۔ وہ نہ صرف اقرا کی بات کا پردہ رکھتیں بلکہ حمزہ اگر کچھ کہنے کی بھی جرأت کرتا تو اس سے بھی بھڑ جاتیں۔ اسے وقتی تاسف گھیرنے لگا تھا...... کاش وہ اقرا کو اس آوارہ لڑکے کے ساتھ دیکھ کر مکمل اگنور کردیتی...... کوئی داغ تو زرینہ بیگم کے دامن کو بھی چھو گزرتا...... لیکن وہ جانتی تھی، وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی۔ زرینہ بیگم سے نفرت اپنی جگہ لیکن اقرا اسے سگی بہنوں کی طرح ہی عزیز تھی۔ وہ معصوم تھی اور لالہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اپنی ماں کا کیا کبھی بھی پتھر بن کر اس کی راہ میں آئے۔

"خدا کی پناہ...... سب کچھ جانتے ہوئے تم دونوں آنکھیں بند کیسے کرسکتے ہو...... کل کلاں کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میں......"

"امی پلیز......" حمزہ نے غصے سے ماں کو ٹوکا تھا۔

"امی وہ تو دیر ہوگئی تو میں لالہ آپی کی طرف چلی گئی۔" اقرا نے بات بنائی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں امی کی باتوں کے ردعمل میں لالہ سچ ہی نہیں اگل دے۔

"کیوں...... دیر ہوگئی تھی تو گھر نہیں آسکتی تھی۔" زرینہ اور تپ گئیں۔

"امی ہو کیا گیا ہے آپ کو...... لالہ کے ساتھ آگئی تو اچھی بات ہے ناں۔" حمزہ نے دوبارہ ماں کو ٹوکا۔

"میں تم لوگوں کی طرح آنکھیں بند نہیں کرسکتی...... تم لوگ تو بچے ہو...... تمہیں ابھی لوگوں کو سمجھنا کہاں آتا ہے۔" تیز نظروں سے لالہ کو گھورا۔ وہ اقرا کو دیکھنے لگی۔ لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ سی مچلی۔ اقرا کا دل ڈوب سا گیا۔

"امی...... پلیز......" حمزہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیسے ماں کو چپ کراتا...... چپ سی کھڑی لالہ اسے خود سے صدیوں کی دوری پر دکھائی دینے لگی۔

"میں چلتی ہوں۔" ہاتھ لانگ کوٹ کی جیب میں ڈالے اس نے مسکراتے ہوئے اقرا سے کہا تھا۔ کوئی اسے رکنے کے لیے نہیں کہہ سکا تھا، کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

"میں چھوڑ دیتا ہوں۔" حمزہ آگے ہوا...... لالہ نے ایک طنزیہ نگاہ اس کے وجود پر ڈالی تھی۔

"تمہیں شرم تو نہیں آتی نہ حمزہ......" آنکھوں کے ساتھ، ساتھ لبوں نے بھی زہر سا اگلا تھا۔ حمزہ ساکت سا وہیں جم گیا تھا۔

"دیکھا...... دیکھی اس کی بے شرمی......" زرینہ کے منہ سے جھاگ اڑنے لگا۔ اقرا ان سے لپٹ گئی۔

"آئندہ خیال رکھنا اقرا......" جاتے، جاتے اس نے مڑ کر اقرا کو جن نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ اقرا اندر تک کانپ گئی تھی اور حمزہ چونک گیا تھا۔ کوئی بات تو تھی جو لالہ نے اقرا کو نظروں کی زبانی سمجھائی تھی۔ اور شاید وہ سمجھ بھی گئی تھی۔ تبھی اس نے اقرا کے چہرے کا رنگ بدلتے دیکھا تھا۔

اس نے کھلے دروازے کی طرف دیکھا...... چوکھٹ خالی تھی...... لالہ کب کی جا چکی تھی...... زرینہ کی آواز اب بھی اس کے کانوں کے پردے چٹخا رہی تھی۔ مگر اب وہ بے حس سا کھڑا تھا۔

☆☆☆

سردی بڑھ رہی تھی...... راستے دھند میں غائب ہونے لگے تھے۔ دونوں طرف سے رواں دواں ٹریفک کی روشنیاں بھی اس دھند میں کہیں غائب ہوتی جارہی تھیں۔ اندھیرے کو مٹانے میں ناکام...... لانگ کوٹ کی جیب میں ہاتھ، اونی شال اوڑھے وہ اندھیرے اور دھند سے بے پروا فٹ پاتھ پر چلی جارہی تھی۔ گرم نمکین پانی ہر منظر مزید دھندلانے لگا تھا۔

وہ زرینہ کی اکلوتی بھتیجی تھی...... ان کے اکلوتے

بھائی کی واحد اولاد...... پھر بھی جس حقارت سے وہ اسے دیکھتی تھیں...... لالہ کا دل کرتا کہ وہ اسی وقت زمین میں زندہ درگور ہوجاتی...... زرینہ پھپو کی باتیں، ان کے طعنے جس قدر اسے ان سے بدظن کرتے...... اسی قدر وہ اسے ٹھیک بھی لگتی تھیں۔

ایسا اس لیے تھا کہ اس نے کئی بار پھپو کو امی کے سامنے ان کے منہ پر بے غیرتی اور بے حیائی کے طعنے دیتے سنا تھا انہوں نے تو لالہ کو بھی بے شرم کہا تھا۔ لیکن اس کی ماں کی نظریں ہی ہمیشہ جھکی تھیں...... وہ خود کے لیے تو کیا لالہ کے لیے بھی کبھی ایک لفظ نہ بول سکی تھیں۔ اور یہ بات ایک بار نہیں لالہ نے ہمیشہ نوٹ کی تھی...... اور اسے پتا چلا تھا کہ پھپو کی آنکھوں میں عزت کا فخر تھا اور امی کی آنکھوں میں محبت کا داغ...... جو انہیں ہی نہیں لالہ کو بھی نظریں جھکانے پہ مجبور کردیتا تھا۔

"میں آپ کو بھی معاف نہیں کروں گی امی...... کبھی نہیں......" سختی سے آنکھیں رگڑتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر جیسے خود کو باور کرایا تھا۔

"کیا ہوں میں؟" راستے ویران ہونے لگے تھے۔ وہ یونہی بے پروا سمت کا تعین کیے بنا چلتی رہی۔

"کل لالہ...... بدکردار ماں کی بدنصیب بیٹی۔" کھمبے پہ لگے بلب کی روشنی میں اسے فٹ پاتھ پہ پتھر نظر آیا تھا۔ زوردار ٹھوکر رسید کرتے ہوئے اس نے جیسے سارا غصہ اس پتھر پر نکالا تھا۔

"اوئے۔" غصیلی بھاری مردانہ آواز پر اس نے چونک کر سامنے دیکھا تھا۔ وہ تین مرد تھے۔ بڑی، بڑی مردانہ شالیں اوڑھے فٹ پاتھ کے کنارے بیٹھے شاید نشہ کرنے میں مصروف تھے۔ پتھر شاید سیدھا انہی کو پڑا تھا۔ تبھی انہی میں سے ایک شخص تقریباً غرایا تھا۔ وہ تینوں کھڑے ہورہے تھے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں لالہ انہیں نہیں دیکھ پائی تھی۔ اسے آج یقین آیا تھا کہ واقعی غصہ حرام چیز ہے۔ انسان کو بڑی سے بڑی مشکل میں پھنسا سکتا ہے۔ ان تینوں کے چہروں پر پھیلے پر اب شیطانیت غالب آنے لگی تھی۔ ہونٹوں کے ساتھ آنکھوں میں بھی شیطانی مسکراہٹ چمکنے لگی تھی۔

"مجھے حوریں کیوں نظر آنے لگی ہیں اکبر۔" مکروہ چہرے والے اس شخص نے دانت نکالتے ہوئے لڑکھڑاتے لہجے میں کہا۔

"چھوڑو یار۔" دوسرے نے لالہ کی طرف پیش قدمی کی۔ لالہ بے اختیار دو قدم پیچھے ہوئی۔ سڑک ویران تھی۔ یہ ایک ذیلی سڑک تھی سو ٹریفک بالکل نہیں تھی...... اس کا دل بے قابو ہونے لگا۔ حواس ساتھ چھوڑنے لگے۔

"زما جانان راغلے...... زما جانان راغلے......"

وہی مکروہ چہرے والا زور، زور سے گنگنانے لگا۔ لالہ کو لگا بس یہی ایک لمحہ تھا اس کے پاس...... ورنہ وہ ساری عمر اس جگہ سے ہل نہیں پائے گی۔ اس نے ان کے قریب آتے سایوں کو خوفزدہ ہو کر دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ مکروہ چہرے والا اس کے بالکل قریب پہنچ کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا...... اس نے پلٹ کر دوڑ لگادی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ تینوں نشے میں تھے، دوڑ بھی لیتے تب بھی مین روڈ تک اس سے پہلے نہیں پہنچ سکتے تھے۔ تب تک وہ کسی سے مدد لے سکتی تھی۔ وہ پاگلوں کی طرح دوڑتی ہوئی مین روڈ پر آئی تھی۔ بلب کی زرد روشنی میں لڑکھڑاتے قدموں سے وہ ابھی تک اس کے پیچھے تھے۔ اس نے ذرا دیر ٹھہر کر سمت کا تعین کیا اور پھر ایک طرف دوڑنے لگی پتا نہیں اسے سڑک ناپتے کتنی دیر ہوچکی تھی۔

مین سڑک پر بھی اِکّا دُکّا ٹریفک تھی۔ اس کی اونی شال پھسلتے پھسلتے اس کے شانوں سے ہوتی فٹ پاتھ پر گرگئی۔ وہ ذرا دیر رک کے اسے اٹھانے لگی تھی۔ جب گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس نے اس کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ وہ چند پل کے لیے بے بس سی وہیں گرگئی۔ لینڈ کروزر اس کی سائڈ پر رک چکی تھی۔ لائٹس ابھی تک اس کے وجود کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔

لینڈ کروزر کا دروازہ کھلا اور بھاری بوٹوں میں مقید قدم دھمک سی پیدا کرتے آہستہ، آہستہ چلتے اس کے

قریب آئے تھے۔ وہ بہ مشکل شال اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ سامنے کھڑے شخص کو پہچاننے میں اسے ایک لمحے سے بھی کم لگا تھا۔ اس کا دل بے تحاشا دھڑک اٹھا تھا۔

”گاڑی میں بیٹھو۔“ لالہ نے دیکھا اس کے گال کا گڑھا کافی گہرا ہو گیا تھا۔

”میں، میں خود چلی جاؤں گی۔“ تیزی سے شال اپنے گرد لپیٹتی، اس نے اپنا اعتماد بحال کرنا چاہا تھا۔

”گاڑی میں بیٹھو لالہ۔“ ڈمپل ایک سیکنڈ میں غائب ہوا تھا۔ آواز میں بھی سختی در آئی تھی۔

”میں نے کہا ناں......“ اس نے کہنا چاہا کہ تبھی اس نے اسلحہ بردار آدمیوں کو تیزی سے اپنے دائیں بائیں جگہ سنبھالتے دیکھا تھا۔ وہ ساکت رہ گئی تھی۔

”فکر مت کرو، یہ تمہیں ہاتھ نہیں لگائیں گے۔“ وہ پھر مسکرا رہا تھا۔

لالہ کو اس کی مسکراہٹ زہر لگی۔

”اب خود بیٹھو گی یا میں......“ ذومعنی لہجے میں کہتا وہ لالہ کو مزید سلگا گیا۔

”کیونکہ خیر سے میں ان کی طرح شریف تو بالکل بھی نہیں ہوں۔ اگر تم خود نہ بیٹھیں تو میں ہاتھ بھی لگا سکتا ہوں۔“ وہ دو قدم آگے آیا تھا۔ لالہ تیزی سے اس کے پہلو سے ہوتی فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی۔ جس کا دروازہ ایک ملازم اسی کے لیے کھول چکا تھا۔

”تم سب ٹیکسی لے کر آجانا فارم...... میں خود آجاؤں گا۔“ دروازہ خود بند کرتے ہوئے اس نے اپنے آدمی سے کہا تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے فوراً چابی اسے پکڑا دی تھی، وہ گھوم کر فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ ہوتے ہی لالہ چونکی تھی۔

”ان سب کو تو بیٹھنے دیں۔“ وہ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بولی۔

”کیوں......؟“ گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اس نے معصومیت سے پوچھا تھا۔

”کیا مطلب کیوں؟ میں یوں اکیلے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گی۔“ وہ چلتی گاڑی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے ناکامی ہوئی تھی۔

”میں کسی کا ڈرائیور نہیں ہوں۔“ مسکراتے ہوئے جواب آیا تھا۔ لالہ کو لگا، وہ اس کی بے بسی پہ مسکرا رہا تھا۔ اسے غصہ آنے لگا۔

”ہاں، تو یہی تو میں کہہ رہی ہوں، میرا ڈرائیور بننے کی بھی آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ سخت لہجے میں بولی۔

”تمہارے لیے تو میں کچھ بھی .... بن سکتا ہوں۔“ لکیر سا ڈمپل گہرا ہوا تھا۔ لالہ کا دل کیا اپنے لمبے ناخن اس کے ڈمپل میں گھسیڑ دے۔

”کچھ بھی مطلب......؟“ لالہ نے پوچھا تھا۔ اور اسی لمحے اس نے گاڑی روک دی تھی۔ اچانک...... گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے تھے۔ لالہ نے بہ مشکل خود کو سنبھالا تھا۔

”کچھ بھی مطلب......“ وہ پورے کا پورا اس کی طرف رخ پھیر گیا تھا۔ لالہ کی دھڑکنیں بند ہونے لگی تھیں۔

”کچھ بھی مطلب...... کچھ بھی۔“ اس کی آنکھوں میں کتنے رنگ تھے۔ وہ سمجھ نہیں سکتی تھی۔ اس کے الفاظ اس قدر صاف تھے کہ لالہ بخوبی سب مطلب سمجھ سکتی تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں...... اسے بے ساختہ اس سے بے انتہا خوف آیا تھا۔ وہ سمٹ کے بند کھڑکی سے جیسے چمٹ کے رہ گئی تھی۔

”ضیا...... دور ہٹو پلیز۔“ اسے تکتے وہ زور سے چلائی تھی۔ اور حیرت انگیز طور پر وہ فوراً مسکراتے ہوئے سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر دی تھی۔ لالہ نے تیزی سے موبائل نکالا۔ بیٹری ختم ہو چکی تھی، سیل آف تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ وہ کسی کو بھی انفارم نہیں کر سکتی تھی۔ نہ ہی کوئی اس سے رابطہ کر پا رہا ہوگا۔ سب کس قدر پریشان ہوں گے اور ضیا...... ضیا نہ جانے اسے کہاں لے کر جانے والا تھا۔ کیا کرنے والا تھا۔ وہ اس وقت کو کوسنے لگی جب وہ ضیا سے خوفزدہ ہو کر اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ لالہ نے ضیا کو دیکھا۔ جو چیونگم چباتا آگے دیکھ رہا تھا۔ بلیک کلر کی شلوار قمیص میں اس کی سفید رنگت مزید نکھر ہی گئی تھی۔ اس کی شخصیت میں عجیب سا وقار تھا۔ وہ اپنی شخصیت کے بالکل الٹ تھا۔ شکل صورت سے تو شریف ہی لگ رہا تھا۔ لالہ کے دل کو ڈھارس سی ہونے لگی تھی۔

”اکثر مکروہ چہرے انہی خوب صورت چہروں کے پیچھے چھپے ہوتے ہیں......“ نئی سوچ نے پھر سے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ اسٹیئرنگ پہ مضبوطی سے جمے وہ اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ جس پر ڈارک براؤن کلر کا گندھا ہوا دھاگا بے حد جچ رہا تھا۔

”کیا کروں میں؟“ وہ بڑبڑائی۔

”نیچے اترو......“ مسکراتے ہوئے ضیا نے جواب دیا تھا۔ وہ چونکی۔ گاڑی رک چکی تھی۔

”یہاں، یہاں کیوں اتروں......؟“ وہ بدبدائی۔

”کیوں، یہاں نہیں اترو گی تو کیا میرے ساتھ میرے گھر چلنے کا ارادہ ہے؟“ وہ اس کی طرف جھکتے ہوئے شرارت سے بولا تھا۔ لالہ نے حیرت سے سامنے دیکھا تھا۔ اور اگلے لمحے اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں گلی کا منظر بے حد واضح تھا۔ گلی خاص طویل تھی جو اس وقت بالکل ویران تھی۔ گلی کے بالکل آخری سرے پر ذرا سا ترچھا بنا ہوا گیٹ اس کے گھر کا تھا۔

”اترو گی یا گاڑی...... اسٹارٹ کر دوں؟“ وہی دوستانہ بھاری مسکراتا لہجہ......

”لیکن میں نے تو تمہیں ایڈریس نہیں بتایا۔“ وہ سامنے دیکھتے ہوئے گم صم سی بولی۔

”تم نے تو شاید مجھے اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا ناں......“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا اور لالہ کی طرف دیکھا جو اب واقعی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔

”مجھے تمہارے ایک، ایک پل کی خبر ہے لالہ۔“ اس کی طرف جھکتے ہوئے اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تھا۔ لالہ کو اس کی آنکھوں سے خوف سا آ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولنا چاہا لیکن نہ کھلا۔ ضیا نے

ذرا سا آگے ہو کے اس کے قریب ہوتے ہوئے اس کے لیے دروازہ کھول دیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ تبھی وہ فوراً اندر غائب ہوگئی تھی۔ ضیا نے مسکراتے ہوئے گاڑی واپس موڑ لی تھی۔ اسے یقین تھا کہ آج رات تو اس نے لالہ کے خوابوں میں جگہ یقیناً پالی تھی۔ وہ سیٹی بجانے لگا تھا۔ گاڑی کی اسپیڈ بھی بڑھادی تھی۔

☆☆☆

طویل گلی کو کراس کر کے اس نے گیٹ کو ذرا سا دھکا دے کر دیکھا تھا۔ گیٹ کھلا تھا۔ وہ تیزی سے اندر آگئی اور اتنی ہی تیزی سے گیٹ دوبارہ بند بھی کر دیا۔ سامنے ہی برآمدے میں فون پر شاویز کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں اس کے چہرے پر چھائی پریشانی واضح نظر آرہی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پہ ہی جائے نماز پر بیٹھی سبین آنسوؤں سے تر چہرہ لیے اس کے لیے ہی دعا گو تھیں شاید...... گیٹ کے کھٹکے پہ وہ دونوں چونکے تھے پھر لالہ نے ان دونوں کو ہی تیزی سے اپنی طرف آتے دیکھا تھا۔ سبین تو قریب آتے ہی اس سے لپٹ گئیں۔

ان کی گرم آغوش میں نہ جانے کیوں اس کے اندر کی تپش مزید بڑھ گئی۔ ضیا کے خوف پر زرینہ پھپو کی کڑوی کسیلی باتیں اور طعنے غالب آنے لگے۔ اس کی پلکیں بھیگنے لگی تھیں۔ وہ بے آواز رونے لگی تھی۔

''کہاں تھیں اقرا کے ساتھ تھیں ناں تم...... پھر حمزہ کے بغیر وہاں سے کیوں نکلیں...... وہ بھی رات کے وقت...... مجھے فون کر کے بلا لیا ہوتا۔'' شاویز نے اس کا بازو دھیرے سے تھام کر اسے ماں سے الگ کیا تھا اور سوالوں کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی۔ زرینہ پھپو حسبِ عادت اسے بھی کوئی کہانی سنا چکی تھیں۔ شاویز بولتا جا رہا تھا اور وہ بت بنی سن رہی تھی۔ اندر کا شور زیادہ تھا۔ باہر کی آوازیں سنائی ہی نہیں دے رہی تھیں۔

''تھکی ہوئی آئی ہے شاویز...... ابھی اسے کچھ آرام کرنے دو۔ نہ جانے کیسے اس وقت گھر تک آئی ہے۔'' سبین نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

''یہی تو میں پوچھنا چاہ رہا ہوں امی...... کہ آخر اسے اس وقت اکیلے آنے کی ضرورت کیا تھی؟'' وہ سخت غصے میں تھا۔ اور اس کا غصہ بجا تھا۔ شہر کے حالات جس قدر خراب تھے، مرد بھی زیادہ دیر رات کو گھر سے باہر نہیں رکتے تھے۔ اور آج اتنی دیر تک اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ، ڈھونڈ کے وہ کس قدر خوار ہوا تھا صرف وہی جانتا تھا۔

''حمزہ چھوڑنا چاہ رہا تھا لیکن پھپو نے منع کر دیا۔'' اس نے صاف بتا دیا لہجہ اب بھی بھیگا ہوا تھا۔

''زرینہ پھپو......'' شاویز کا تو منہ کھل گیا۔

''اُف میرے خدا......'' وہ سر پکڑ کر رہ گیا۔

''حمزہ نے بھی کچھ نہیں کہا۔'' سبین جیسے گہرے صدمے سے بولیں۔

''بے غیرت لوگوں کے بچے بھی بے غیرت ہوتے ہیں امی۔'' ایک ایک لفظ چبا کر کہتی وہ اپنی اصلی جون میں واپس آئی تھی۔

''اچھا چھوڑو، تم اندر جا کر آرام کرو میں کچھ کھانے کے لیے لاتی ہوں۔'' امی ہمیشہ کی طرح زرینہ پھپو کی بات چھڑتے ہی بات بدل گئی تھیں۔ اسے اندر ہی اندر تاسف گھیرنے لگا اور اس کی ماں ان کے خلاف دو لفظ کیوں نہیں بولتیں کہ سن کر اس کی بھی کچھ روح شانت ہو۔

''نہیں، میں اب سوؤں گی۔ آپ لوگ بھی آرام کریں۔'' وہ صاف لہجے میں منع کرتی کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''سنو......'' شاویز بھاگ کے اس کے قریب آیا تھا۔ وہ رکی۔

''آئندہ زرینہ پھپو کی طرف جانے کی کوئی ضرورت نہیں...... اور جہاں بھی دیر ہو جائے مجھے بلا لیا کرو۔ یوں اکیلے نہ نکل پڑا کرو اوکے۔'' اس کے لہجے میں بھائیوں کی دھونس تھی۔ وہ اداسی سے مسکرا دی اور سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔

''امی، اب آپ بھی جا کر سو جائیں۔'' اس کے جاتے ہی شاویز نے ماں سے کہا۔

''لیکن اس نے کھانا تو کھایا نہیں۔'' وہ اداس تھیں۔

''پتا ہے ناں آپ کو......'' وہ ماں کو شانوں سے تھامتا ان کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

''کتنا چڑ جاتی ہے وہ زرینہ پھپو کی باتوں سے...... ابھی کہاں ہوگی اسے بھوک...... لیکن آپ بالکل بے فکر رہیں بڑی ہوگئی ہے لالہ...... بھوک لگے گی تو اٹھ کر خود ہی کچھ بنا لے گی۔'' اس کی آواز میں تسلی تھی۔ سبین کو اس کی بات پر یقین کرنا ہی پڑا تھا۔

☆☆☆

حویلی کے پائیں باغ میں برآمدے سے کچھ دور الاؤ کے ارد گرد لکڑی کی چوکیوں پر بیٹھے سبھی نفوس خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ سب سے زیادہ گل مینہ چہک رہی تھی اور اس کی باتوں پر سہراب علی خان کے بلند قہقہے اور اوزگل کی دھیمی ہنسی کسی جھرنے کے گرنے جیسی آواز پیدا کر دیتی...... سرد خاموش ماحول میں چہکتی باتوں اور ان سب کی دھیمی، دھیمی گفتگو بے حد خوب صورت سماں باندھ رہی تھی۔

''با...جی ...... آپ نے کہا تھا اس ہفتے مجھے بھی لالہ کے پاس شہر بھیج دیں گے۔''

الاؤ پہ ہاتھ سینکتی گل مینہ کو اچانک ہی یاد آیا۔

''کہا تو تھا لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ اپنے آپ سے مکر جاؤں۔'' گھنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مینہ تو تڑپ اٹھی۔

''وہ کیوں با...جی......؟'' وہ اٹھ کر ان کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔ چہرے پر ایک دم مایوسی لو دینے لگی۔ انہوں نے دایاں بازو اس کے گرد لپیٹتے ہوئے اسے ساتھ لگایا تھا۔

''وہ اس لیے کہ تمہارے بعد بھلا میرا کیا ہوگا؟'' انہوں نے پیار سے کہتے ہوئے اس کی پیشانی چوم لی۔ اوزگل نے رشک سے اپنی چھوٹی بہن کو دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بابا کی زندگی میں اگر کوئی انسان اہم تھا تو صرف گل مینہ ہی تھی۔

ضیا اور اس کی حیثیت ثانوی تھی۔ سہراب کی کائنات کا محور گل مینہ تھی۔ ضیا ان کا واحد سپوت تھا، ان کا وارث...... انہیں اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ لیکن بہر حال ان کے کچھ اصول انہیں ضیا سے بھی زیادہ پیارے تھے۔ لیکن اوزگل نے دیکھا تھا۔ جہاں بات گل مینہ کی آتی تھی۔ وہاں وہ اکثر اصول بھی توڑ دیتے تھے...... اور ایک دفعہ اس نے ہی مذاق میں کہا تھا۔

''با...جی اپنے اصولوں پر مجھے اور ضیا کو قربان کر دیں لیکن مینہ۔ وہ گل مینہ پر یہ سارے اصول ہی قربان کر دیں گے۔'' اسے یاد تھا اس کی بات پہ با...جی خوب دل کھول کر ہنسے تھے۔ اور آخر میں مسکراتے ہوئے گود میں بیٹھی معصوم سی گل مینہ کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔

''ایسا ہو بھی سکتا ہے۔ گل مینہ میں تو میرا دل دھڑکتا ہے۔''

''با...جی ......'' مینا کی تیز روٹھی آواز پر وہ چونکی۔ با...جی اب بھی مسکرا دیے تھے۔ سرخ و سفید چہرے پر الاؤ میں جلتی آگ کا آتشی رنگ اسے مزید نکھار بخش رہا تھا۔ اوزگل کو ان کی گھنی مونچھوں تلے شرارت سے مسکراتے ہونٹ بے حد خوب صورت لگے۔

''اچھا مذاق کر رہا تھا......'' انہوں نے پیار سے اسے ساتھ لگایا۔

''تم دونوں تیاری کر لو...... میں نے ضیا سے کہہ دیا ہے۔ جلد ہی تمہارا کسی اچھے پرائیویٹ کالج میں داخلہ ہو جائے گا۔'' انہوں نے بالآخر خوشخبری سنا دی۔ گل مینہ تو اچھل پڑی۔

''سچ با...جی ......''

''ہاں با...جی کی جان...... لیکن یہ تو بتاؤ میں تو تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔ تم مجھ سے اتنی دور رہ کر کیسے گزارہ کرو گی۔'' انہیں تشویش تھی۔

''یہ چار پانچ گھنٹوں کی تو مسافت ہے با...جی

......پھر بیٹیاں کہاں ساری عمر ماں، باپ کے گھر رہتی ہیں۔'' اس نے شرارت سے کہیں پڑھا فلسفہ سنایا تھا۔ لیکن اوزگل نہ جانے کیوں سہم سی گئی۔ اس نے یکلخت با..جی کے چہرے پر چھائی مسکراہٹ غائب ہوتے دیکھی تھی۔ اسے لگا آگ کا الاؤ ابھی پھیل جائے گا۔ سب بھسم کر جائے گا کیونکہ اس نے دیکھا تھا اس کے با کو بیٹوں کی شادی کے نام سے بھی چڑ تھی۔ وہ ان سے.... بے حد محبت کرتے تھے انہیں خود سے جدا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن یہ گل مینہ......

اسے گل مینہ پر غصہ آنے لگا۔ اسے لگا ہنستے مسکراتے با..جی اب خواہ مخواہ بگڑ جائیں گے......سارا ماحول دہشت ناک ہو جائے گا۔ محبت، مسکراہٹ اور یہ فسوں......سب ایک لمحے میں ختم ہونے والا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' با..جی کی دھیمی آواز پہ اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ الاؤ کے دوسری طرف آگ کے لپکتے شعلوں میں با..جی کے سرخ پڑتے چہرے پر اب بھی ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ گہری مسکراہٹ سجائے گل مینہ ان سے خوشی سے لپٹتی جا رہی تھی۔ اوزگل کی نظریں ان دونوں پر جم سی گئیں......گل مینہ کی قسمت پہ اسے رشک سا آنے لگا تھا، گل مینہ کیا تھی ان کے لیے۔'' اس نے ان دونوں کو تکتے ہوئے سوچا۔

''آزمائش ہے......آزمائش ہے تو......'' قہقہے لگاتی اللہ لوک بالکل اچانک ہی گل مینہ کے قریب آ کے چلائی تھی۔ وہ اس قدر اچانک وہاں آئی تھی کہ کوئی بھی اسے آتا نہ دیکھ سکا تھا نہ کچھ دیر تک حرکت کر سکا تھا۔

''پکڑ ہوگئی تیری......پکڑ ہوگئی......'' وہ اب قہقہے لگا، لگا کر کہتی الاؤ کے قریب آ چکی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی کچھ سمجھتا اس نے دونوں ہاتھوں میں جلتی لکڑیاں اٹھالی تھیں۔ دونوں لکڑیوں کے سروں پر شعلے لپک رہے تھے۔

''مہلت ختم ہونے لگی ہے۔'' وہ آگ سہراب علی خان کو دکھانے لگی۔ انہوں نے بنا خوفزدہ ہوئے خوف سے چلاتی گل مینہ کو حفاظت سے اپنے پیچھے کیا اور دھیرے، دھیرے اللہ لوک کے قریب آنے لگے تھے۔ یہی حرکت اللہ لوک کے پیچھے کھڑی اوزگل نے بھی کی تھی۔ دھیرے، دھیرے وہ بھی اللہ لوک کے قریب آنے لگی تھی۔

''تیری مہلت ختم......تیری مہلت ختم......'' وہ چلا رہی تھیں۔

''خالی ہاتھ رہ جائے گا تو...... پکڑ بڑی سخت ہے...... تیری پکڑ ہوگئی......'' وہ بھڑکتی لکڑی ان کی طرف بڑھاتے ہوئے دیوانہ وار کہتی اور وہ جھٹکے سے پیچھے ہو کر اپنا چہرہ جلنے سے بھی بچاتے اور اسی قدر تیزی سے مزید آگے بھی ہو جاتے پھر اس سے پہلے کہ سہراب علی خان ان تک پہنچتے، اوزگل نے انہیں جالیا تھا۔ جھٹکے سے ان کے ہاتھ سے لکڑیاں لے کر الاؤ کی طرف اچھال دی تھیں۔

اللہ لوک بپھر سی گئی تھیں۔ مزید چلانے لگیں، اوزگل نے ان کا کمزور وجود بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔

''بی بی جانے، بی بی جانے......'' وہ ان کو بچوں کی طرح پچکارنے لگی تھی۔

''آگ بھڑک رہی ہے بچے...... میں نے خود دیکھا......آگ بھڑک رہی ہے، تندور گرم کر لیے گئے ہیں۔'' وہ تیز، تیز لہجے میں اوزگل کو بتانے لگیں۔

''پکڑ ہوگئی ہے......پکڑ ہوگئی ہے۔'' وہ اب سسکتی بڑبڑاتی اللہ لوک کے وجود کو تھامے اندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ڈری سہمی گل مینہ سہراب علی خان کے مضبوط وجود سے چمٹ گئی تھی اور وہ وہیں کھڑے ضبط سے مٹھیاں بھینچ رہے تھے۔ اللہ لوک کی چیختی آواز اب بھی ساری حویلی کا سناٹا چیرے دے رہی تھی۔ نہ جانے کیوں الاؤ کی آگ مزید بھڑکنے لگی تھی۔

''لگتا ہے زندہ قبروں میں ایک اور اضافے کا وقت آگیا ہے۔'' انہوں نے نخوت سے سوچا تھا۔

☆☆☆

اس نے...اپنے آپ کو بستر کے بجائے لق و دق صحرا میں تپتی ریت پہ پڑا پایا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ کر بیٹھ گیا

اور پھر اتنی ہی تیزی سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے ایک گھبرائی ہوئی نگاہ چاروں طرف دوڑائی تھی۔ اس کے چاروں طرف ریت کا نہ ختم ہونے والا سمندر تھا، سخت تیز چمکدار دھوپ میں چمکتی ریت کو دیکھتے ہی اس کی نظریں بھی جھلسنے لگی تھیں۔

''یہ میں کہاں آگیا؟'' وہ ششدر سا دل میں سوچ رہا تھا۔

''اور اب میں یہاں سے نکلوں گا کیسے؟'' وہ مزید پریشان ہوا اور پھر چند لمحے یونہی مایوس سا خاموش کھڑا ارد گرد دیکھتا وہ چلنے لگا تھا۔ اسے یقین تھا کچھ دیر گرم ریت پر چلنے کے بعد اس کے پیروں میں چھالے نکل آئیں گے کیونکہ اس کے پیر ننگے تھے، اسے یہ بھی معلوم تھا کہ کچھ دیر بعد ہی سخت دھوپ اور گرم ہوا اسے جھلسا دینے والی تھی۔ اور اس نے پیاس سے مر جانا تھا۔ کیونکہ فی الحال اس کے پاس کچھ بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ ان سخت ترین عوامل کا مقابلہ کر سکتا اور سمندر جیسے وسیع صحرا میں بھی ایسا کچھ نظر نہیں آرہا تھا کہ جو اس کے لیے مددگار ثابت ہوتا۔ اسے اپنے لیے بے حد بے بسی سی محسوس ہوئی تھی۔ اس نے کچھ دیر لمبی سانسیں لیں اور پھر ایک طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ پورے پندرہ منٹ پاگلوں کی طرح دوڑتے ہوئے وہ اچانک ٹھٹک کر رکا تھا۔ اسے اچانک یہی احساس ہوا تھا کہ اس قدر تیز دھوپ میں اور گرم ریت پر چلنے کے باوجود بھی اسے تپش محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہ سب صرف اس کا خیال تھا سر پہ آگ برساتے سورج کو دیکھ کر اسے پہلا احساس یہی ہوا تھا کہ ریت گرم ہوگی اور ہوا جھلسا دینے والی لو کی طرح ......اور پیاس کی شدت سے ایڑیاں رگڑ، رگڑ کے وہ جان دے، دے گا۔

لیکن اب اسے احساس ہوا تھا، اس قدر شدید گرمی میں بھی ریت نرم اور ٹھنڈی تھی اور ہوا بھی اتنی گرم نہیں تھی کہ اس کی تپش اسے جلا کر رکھ دیتی......وہ صحیح معنوں میں حیران رہ گیا تھا۔ ماجرا تھا تو کیا تھا؟ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا......گرم نہ سہی پھر بھی وہ اس لق و دق صحرا میں زیادہ وقت نہیں گزار سکتا تھا۔ وہ اپنی شرٹ کے بٹن کھولتا دوبارہ چلنے لگا تھا۔

اس نے کافی فاصلہ طے کر لیا تھا لیکن اب بھی اس ریت کے سمندر کی حد نظر نہ آسکی تھی۔ تبھی اس نے کچھ شور سا سنا تھا۔ وہ کچھ دیر سمت کا اندازہ لگانے کے بعد بے تحاشا اس سمت دوڑا تھا۔ کچھ دور دوڑنے کے بعد ہی آوازیں واضح ہوگئی تھیں......وہ کسی کے چلانے کی آواز تھی......کوئی مدد کے لیے پکار رہا تھا......وہ اور تیز بھاگنے لگا۔ ریت کے سمندر میں کوئی نقطہ سا ابھرا تھا اس نے بھاگنے کی رفتار بڑھا دی......نقطہ بڑا ہونے لگا تھا۔

یہ سرخ اینٹوں سے بنا کنواں تھا......آواز اس کنویں کے اندر سے آرہی تھی۔ وہ تیزی سے کنویں کے قریب آیا تھا اس نے کافی اونچی منڈیر سے نیچے جھانکا۔ جھولتے ڈول کو مضبوطی سے تھامے کوئی لڑکا مدد کے لیے مسلسل پکار رہا تھا۔ وہ کافی گہرائی میں تھا۔ وہ اس کا مکمل چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

''سنو......'' اس نے ہاتھوں کا پیالہ بنا کر زور سے پکارا تھا۔ کنویں کی دیواروں سے سر ٹکراتی اس کی آواز کی گونج بے حد شدید تھی۔ وہ لڑکا اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔

''ڈرو مت تم کس کے رسی تھامے رہو۔'' اس نے لڑکے کو حوصلہ دلاتے ہوئے کہا۔

''میں ابھی تمہیں اوپر کھینچ لوں گا۔'' اس نے مزید زور سے چلاتے ہوئے اس بچے کو تسلی دی اور تیزی سے ڈول سے بندھی رسی کو اوپر کھینچنے لگا۔ بچہ آہستہ، آہستہ اوپر آنے لگا۔ اس کا سرخ و سپید خوب صورت چہرہ اب واضح نظر آنے لگا تھا۔ بے حد خوب صورت آنکھیں اپنے مسیحا پہ جمی تھیں، اس کی آنکھوں میں چمکتی امید وہ واضح دیکھ سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چل رہے تھے۔ ڈول کافی اوپر آگیا تھا۔ اور عین اسی وقت ڈول جھٹکا کھا کے ذرا سا نیچے کھسکا تھا۔ بچے کے منہ سے زوردار چیخ نکل گئی۔ باریال نے دیکھا ڈول کے بالکل قریب سے بندھی رسی

پرانی ہونے کے باعث گل سی گئی تھی۔ تبھی وہ شاید اس صحت مند بچے کا وزن برداشت نہیں کرتے ہوئے جگہ، جگہ سے اُدھڑنے لگی تھی۔

"ڈرو مت...... میں ابھی تمہیں نکال لوں گا۔"

اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے اس نے بچے کو تسلی دی۔ اور مزید تیزی سے رسی کھینچنے لگا۔ جس قدر بچہ اوپر آرہا تھا اسی قدر باریال کا جوش بڑھتا جارہا تھا۔ اور پھر اچانک ہی دھکا سا لگا تھا۔ رسی ایک دم ہی تیزی سے اس کے ہاتھ میں آئی تھی۔ باریال نے گھبرا کر پہلے رسی کو پھر تیزی سے آگے بڑھ کر نیچے کنویں میں گہرائی میں گرتے ڈول کو دیکھا تھا۔ لڑکا خوفزدہ پھٹی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحہ بہ لمحہ اس سے دور جارہا تھا۔ اور پھر وہ کسی نقطے کی طرح اندھیرے میں گم ہونے لگا تھا۔

"بھائی......" بچے کی روح فرسا پکار پر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ لائٹ نہیں تھی شاید...... اسی وجہ سے کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ پسینے میں شرابور باریال نے تیز، تیز سانس لیتے ہوئے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن کمزور سی ہونے لگی۔ اس نے جلدی سے تکیے کے نیچے رکھا موبائل اٹھایا اور فلیش جلا کر سائڈ ٹیبل پر پڑی ننھی سی بوتل اٹھالی۔ دوا لینے کے بعد کچھ دیر وہ یونہی بیٹھا سوچتا رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ کوئی نفسیاتی مریض تھا یا ڈپریشن کا شکار تھا لیکن نہ جانے کیوں پچھلے دس سال سے اس طرح کے خواب آ، آ کر اسے پریشان کرتے رہتے تھے۔ دیدے نے کافی دم دعا بھی کروائی۔ ڈاکٹرز سے بھی کنسلٹ کیا لیکن سب بے سود...... کبھی ہفتوں تو کبھی مہینوں بعد آنے والا یہ خواب جب آتا تو نہ جانے کتنے ہی دن باریال بے چین ہی رہتا...... یادداشت میں رہ جانے والی چند کڑیوں سے نئی کڑیاں ملاتا، اس کا کھوج لگانے کی کوشش بھی کرتا مگر ناکام ہی رہتا۔

ڈاکٹرز کے مطابق ان خوابوں کا تعلق اس کے ماضی سے تھا۔ کوئی ایسا واقعہ جو وہ بھول نہیں پارہا تھا۔ وہ خود کسی حادثے کا شکار ہوا ہوگا اور یہ خوف اس کے دل میں بیٹھ گیا۔

لیکن...... باریال خود جانتا تھا کہ نظر آنے والا بچہ وہ خود ہرگز نہیں تھا...... وہ تو ہمیشہ اسے بچانا چاہتا ہے۔ حادثہ اس کے ساتھ تو نہیں کسی اور کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ کون ہے؟ کیوں اسے مدد کے لیے پکارتا ہے؟ باریال کو لگتا تھا اس خواب کا تعلق اس کے مستقبل سے تھا...... جلد یا بدیر...... کہیں نہ کہیں وہ لڑکا، کسی نہ کسی صورت اس سے ٹکرانے والا تھا۔ اسے بس تھوڑا سا ہوشیار رہنا تھا۔

اس نے دونوں ہتھیلیوں کی مدد سے چہرے سے پسینہ صاف کیا اور اٹھ کر آئینے کے سامنے آٹھہرا۔

"کیونکہ...... حقیقت میں، میں اسے گرنے نہیں دوں گا...... وہ جو کوئی بھی ہے میں اسے ضرور بچالوں گا۔"

اس نے آئینے میں اپنی نظروں میں دیکھتے ہوئے خود سے عہد کیا تھا۔

☆☆☆

اس رات وہ سو نہ سکی تھی...... ساری رات جاگتے گزری تھی اور وجہ ضیا کے ساتھ، ساتھ اقرا بھی تھی۔ ضیا کا اپنی طرف التفات محسوس کر کے وہ اس قدر خوفزدہ نہ ہوئی تھی جس قدر اقرا کو اس لڑکے کے ساتھ دیکھ کر۔ اقرا اسی سال کالج آئی تھی کم عمر تھی اور ناسمجھ بھی...... لیکن وہ لڑکا اسے شاویز کا ہم عمر لگا تھا۔ شکل سے سنجیدہ معلوم ہونے کے باوجود وہ لڑکا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ آوارہ ٹائپ ہی لگا تھا۔

ساری رات اسے رہ، رہ کر پھپو کے طعنے بھی یاد آتے رہے تھے۔ دل چاہتا تھا وہ اس معاملے کو ایسے ہی چھوڑ دے۔ بے پروا ہوجائے۔ جس طرح اس نے ساری عمر ماں کے کردار کے طعنے سنے ہیں، ویسے ہی پھپو کے نصیب میں بھی لکھے جائیں لیکن یہ ایک حقیقت تھی، وہ ایسی نہیں تھی۔ وہ چاہ کر بھی ایسی نہیں بن سکتی تھی۔ نہ ہی ایسا کوئی منفی قدم اٹھانے کا سوچ سکتی تھی۔ اسے بہرحال کچھ کرنا تھا کیا کرنا تھا؟ یہ وہ نہیں سمجھ پارہی تھی۔ ساری رات سوچنے سمجھنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ اسے جلد از جلد حمزہ کو اس بارے میں ہوشیار کرنا تھا۔

وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھ چکی تھی اور اسے طرح اندازہ بھی ہورہا تھا کہ ان دونوں کو ہی یہ بات صرف کھٹک رہی ہوگی بلکہ وہ اس معاملے کو ڈسکس کرنے کے لیے جلد از جلد دوبارہ ملنے کی کوشش بھی کریں گے...... اور یہ بھی ممکن تھا کہ وہ لڑکا اقرا کے ڈر کا فائدہ اٹھا کر اسے کسی انتہائی قدم کے لیے بھی اکساتا...... اور اقرا اگر کسی ایسے اقدام کے لیے راضی ہوجاتی تو معاملہ ہاتھ سے نکلتے دیر نہیں لگنی تھی۔ اور لالہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اقرا جیسی معصوم لڑکی صرف ماں کے کرموں کا پھل ساری عمر طعنے برداشت کر کر کے گزار دیتی۔ لیکن لالہ یہ بھی جانتی تھی کہ کچھ باتیں تو بس اوپر ہی طے کردی جاتی ہیں...... اور جو صرف ہمارے اعمال کی کھیتی ہوتی ہیں۔

ساری رات کی بے سکونی سے سر میں شدید درد تھا۔ وہ یونیورسٹی بھی نہ جاسکی تھی۔ دوا لے کر آرام کرنے لیٹی تو دوپہر میں امی کے جگانے پر ہی آنکھ کھلی۔ امی نے اسے ثمرہ کے آنے کا بتا کر فریش ہونے کو کہا تو وہ حیران سی رہ گئی۔ بیٹھک میں آئی تو ثمرہ کو اپنا منتظر پایا۔

"ایک دن نہیں آئی تو تم گھر تک ہی پہنچ گئیں۔" دوستانہ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ثمرہ کو چڑایا، وہ منہ بنا کے مسکرادی۔

"دیکھ لو...... تمہارے بغیر چین نہیں ملتا......" اس کے لہجے میں بھی خلوص تھا، وہ تھی بھی ایسی...... خالص مٹی سے گندھی نرم مزاج سی لڑکی......

"اور کوئی اور بھی بہت بے چین تھا۔ شکر کرو وہ نہیں آیا......" ثمرہ کی مذاق میں اچانک کہی گئی بات پہ اس کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔ ضیا علی خان کا سراپا جیسے آنکھوں میں آسمایا تھا۔

"لالہ......" ثمرہ نے یوں اسے گم صم ہوتے دیکھا تو پکاری۔

"ہاں۔" وہ بری طرح چونکی۔

"کیا ہوا لالہ......؟ تم ٹھیک تو ہو ناں......؟" ثمرہ پریشان ہوگئی۔

"کچھ نہیں، میں ٹھیک ہوں۔" لالہ اداسی سے مسکرائی۔

"اچھا سنو...... بریکنگ نیوز دینے آئی ہوں تمہیں۔" ثمرہ اسے چہک کر بتانے لگی۔

"نیکسٹ منتھ ہم ٹور پر جارہے ہیں، آج میم تبسم نے بتایا۔ تم بھی چلوگی ناں......"

"کس طرح کا ٹور......؟" تفریح کا جان کر ہمیشہ کی طرح لالہ کا منہ بن گیا تھا۔ ثمرہ کا چہرہ بجھ سا گیا۔

"مری جائیں گے کچھ اور تفریحی مقامات پر بھی...... یونیورسٹی ٹور ہے یار...... میم تبسم بھی ہمارے ساتھ ہی جائیں گی۔ اب تم نہ پھڈا ڈال دینا۔" اس نے لالہ کو وارن کیا۔

"جاؤ تم لوگ مزے کرو......" لالہ مسکرائی۔

"کیا مطلب......؟" نمرہ سمجھ گئی تھی اس کا جواب پھر بھی سننا چاہتی تھی۔

"تم جانتی ہو...... میں یہ سب افورڈ نہیں کرسکتی۔" اس نے سادہ سے لہجے میں منع کردیا۔ اسی وقت سبین چائے کے ساتھ لوازمات لیے اندر آئیں۔

"آنٹی سمجھائیں ناں اسے۔ اتنی مشکل سے تو مری دیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اب یہ ساتھ نہیں ہوگی تو میں وہاں جاکر کیا کروں گی۔" نمرہ نے سبین آنٹی سے مدد چاہی۔ وہ ناسمجھی سے لالہ کو دیکھنے لگیں۔

"امی، یونیورسٹی ٹور پر جارہے ہیں سب دوست...... بس یہ نمرہ کی بچی چاہتی ہے کہ میں بھی چلوں لیکن آپ تو جانتی ہیں ناں......"

"تو اس میں کیا مسئلہ ہے لالہ......؟" انہوں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ لالہ حیرانی سے ماں کو دیکھنے لگی۔ وہ سبین جو گھر سے اس کے نکلنے، یونیورسٹی جانے تک کے خلاف رہی تھیں۔ شہر سے باہر جانے کے لیے اس قدر آسانی سے مان گئی تھیں۔

"اچھا ہے ناں...... تھوڑا ریلیکس ہوجاؤ گی۔ یہاں تو تم سارا دن پڑھائی اور اِدھر اُدھر کی فضول باتوں کی ٹینشن میں خود کو ہلکان کیے رکھتی ہو کچھ دیر اس سب سے دور پُرفضا مقام پر اپنے دوستوں کے ساتھ انجوائے کروگی تو اچھا لگے گا تمہیں۔"

"لیکن امی......" وہ حیرانی سے پوچھنے لگی۔ "آپ کو میری فکر نہیں رہے گی۔"

"نہیں۔" وہ مسکرائیں۔

"نمرہ ہے ناں تمہارے ساتھ۔ جس کی اتنی اچھی بہن جیسی دوست ہو اس کی بھلا کیا فکر کرنی۔"

"یہ ہوئی ناں میری آنٹی والی بات......" نمرہ چلاتے ہوئے ان سے لپٹ گئی۔ سبین محبت سے مسکرادیں۔ لالہ کی نظروں میں البتہ سوچ کے سائے گہرے تھے۔ کوئی تھا جو اس کی سوچوں پر سوار تھا۔

☆☆☆

"با.. جی ...... آپ نے بلایا؟" اسٹڈی روم کا جہازی سائز دروازہ دھکیلتی وہ وہیں رکتے ہوئے بولی تو اپنی مخصوص چیئر پر بیٹھے با... جی نے کتاب سے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

یہ کمرا اس حویلی کا سب سے بڑا کمرا تھا...... ملازموں سے سنا تھا کہ یہ کمرا اسہراب علی خان کے بڑے بھائی نے بہت محبت سے بنوایا تھا۔ تین کمروں کی درمیانی دیواریں ہٹا کر تینوں کمروں کی چھتوں کو جگہ، جگہ خوب صورت منقش ستونوں کا سہارا دے کر اسے ایک وسیع و عریض ہال کی شکل دی گئی تھی۔ اس کمرے کی ہر دیوار پر فرش سے چھت تک بہت خوب صورت اور نفیس طرز کے بک شیلف بنائے گئے تھے۔ جن کے ساتھ ہر کونے میں اوپری حصے تک رسائی کے لیے منقش لکڑی کی سیڑھی بھی رکھی گئی تھی۔

اوزگل کو یہ کمرا ہمیشہ سے بہت اٹریکٹ کرتا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ اس کے تایا کو کتابوں سے عشق تھا اور اس عشق کی گواہی یہ کمرا خود تھا۔ نہ جانے کیسے یہ جنون اوزگل میں منتقل ہوا تھا۔ اسے بھی کتابوں سے عشق تھا حالانکہ وہ صرف مڈل پاس تھی۔ لیکن کتابوں کے جنون میں اس کا علم حائل نہیں ہوسکا تھا۔ کبھی، کبھی اس کا دل کرتا وہ فراغت سے اس کمرے کے خوابیدہ ماحول میں بیٹھ کر سارا دن کتابیں پڑھتے ہوئے گزارے لیکن یہ کمرا صرف با.. جی کے زیر استعمال تھا اور یہاں کسی کو بھی آنے کی اجازت نہیں تھی۔ گل مینہ آسکتی تھی لیکن اسے کوئی ایسا شوق نہیں تھا۔ کتابوں کو دیکھ کر تو وہ یوں بھاگا کرتی جیسے کوئی بد روح دیکھ لی ہے، سو اوزگل کا یہ جنون ایک خواب ہی رہا تھا۔ اب بھی اسے با.. جی نے یہاں بلایا تھا لیکن وہ دروازے پر ہی رک گئی تھی۔ آگے نہ جاسکی تھی۔

''آجاؤ بچے۔'' با...جی نے اس کی ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہوئے آواز دی تو وہ دھیرے، دھیرے اس کمرے کی خوشبوؤں اپنے اندر اتارتی ان کے قریب آ گئی۔

''میں نے گل مینہ کا ایڈمیشن کروادیا ہے۔کل ضیا جائے گا تو تم لوگ اس کے ساتھ ہی جاؤ گے۔'' با...جی کتاب میز پر رکھتے ہوئے اسے بتایا۔

''ہم لوگ؟'' وہ حیران ہوئی۔

''ہاں، تم بھی گل مینہ کے ساتھ جاؤ گی۔ وہ ابھی سمجھدار نہیں ہے کہ اکیلے رہ سکے۔ جب تک اس کی تعلیم مکمل نہیں ہوجاتی تم اس کے ساتھ ہی رہوگی۔ اور اس طرح مجھے ضیا کی بھی فکر نہیں رہے گی۔ ملازموں کا کیا بھروسا...... کس چیز کا خیال رکھتے ہیں کس چیز کا نہیں رکھتے......'' انہوں نے اوزگل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم میری سمجھدار بیٹی ہو، تم وہاں ان دونوں کے ساتھ ہوگی تو میں بھی بے فکر رہوں گا۔'' ان کے چہرے پر گہری مسکراہٹ تھی۔ اوزگل کا دل بے پایاں خوشی سے بھر گیا تھا۔

''آپ بے فکر رہیں با...جی ......'' اس کے لہجے سے سچی خوشی چھلکنے لگی تھی۔

''اب تم لوگ سب پیکنگ کرلو تاکہ بعد میں پریشانی نہ ہو۔ ضیا کو تو جانتی ہو تم...... آندھی طوفان کی طرح آتا ہے چلا جاتا ہے۔'' ضیا کا نام لیتے ہی ان کے لہجے میں مٹھاس گھلنے لگی تھی۔

''جی با...جی......'' مؤدب لہجے میں کہتی وہ باہر کی طرف مڑ گئی۔

☆☆☆

مری کی خوب صورت وادی میں داخل ہوتے ہی ہلکی ہلکی سی بارش نے ان کا استقبال کیا تھا۔ ہر طرف پھیلی روئی کے گالوں جیسی شفاف برف ان سب کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی تھی۔ سبھی نفوس بے حد خوش تھے۔ چیڑ، پائن، شاہ بلوط کے اونچے، اونچے درخت سائے کو پھیلنے میں مزید مدد دے رہے تھے۔

بس میں سوار لڑکے، لڑکیاں، کھڑکیوں کے پردے ہٹائے قدرت کی صناعی کو دیکھنے اور سراہنے میں مصروف ہوچکے تھے۔ لالہ کی نظریں بھی بارش کے قطروں سے دھندلاتے شیشے پہ جمی تھیں۔ اس کی سائڈ پر ڈھلوان میں لگے درخت اور گہری کھائی تھی۔ اسے ان درختوں کو دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ ڈھلوان میں لگے درخت اور نیچے کھائی میں جا بجا موجود رہائشی مکان اور پتھروں سے بنی مسجدیں سب اسے ورطۂ حیرت میں ڈال رہی تھیں۔ بارش کے قطروں نے جب منظر دھندلانے شروع کیے تو اس نے سردی کی پروا کیے بغیر تیزی سے شیشہ ہٹادیا تھا۔ بارش کی چھینٹیں اندر آ رہی تھیں اور اس کے کندھے سے لگی کھڑکی کے پار تکتی نمرہ اور اس کا چہرہ بھگو گئی تھیں۔ نمرہ جھٹکے سے پیچھے ہوئی اور لالہ پیچھے ہونے کے بجائے مزید آگے یوں کہ تازہ ٹھنڈی ہوا اور پھوار اس کا چہرہ چھونے لگیں۔ سفید کامدار چادر سر سے ڈھلک سی گئی۔ تو جیسے اس کے ریشمی بالوں کو نوید حیات ملی تھی۔ کالی سیاہ لٹیں آزاد ہوتے ہی اس کے خوب صورت چہرے پر رقص کرنے لگیں۔ ڈور اسٹیپ پر ٹھہرے ضیا کی نگاہ سب سے ہوتی اس پری پیکر پر آ ٹھہری تھی اور پھر گویا واپس پلٹنا ہی بھول گئی۔ اس کو چہار سو چاندنی سی بکھرتی محسوس ہوئی۔ سونا سا چمکتا محسوس ہوا تھا لمبی کالی پلکیں گرائے چہرہ کھڑکی کے قریب کیے وہ نہ جانے کون سا سحر اپنے اندر اتار رہی تھی۔

''لالہ......شیشہ بند کرو یار سردی ہے، بیمار پڑ جاؤ گی۔'' زہرہ نے دور سے اسے پکارا تھا۔ ضیا نے گھنی پلکوں کو یکبارگی اٹھتے دیکھا۔

''ہائے، محسوس تو کرو...... مری مجھے ویلکم کررہا ہے۔'' مسکراتے ہوئے اس نے ایک غرور سے کہا تو سب لڑکیوں نے مل کر ''اوئے ہوئے'' کا نعرہ لگایا۔ لالہ اور نمرہ شرارت سے ہنس دیں۔ دو خوب صورت رنگ بدلتی سی جھلک دیتی آنکھیں بھی مسکرائی تھیں۔ اور پھر اچانک ہی ضیا نے آگے بڑھ کر چلتی بس کا دروازہ کھول دیا تھا۔

''اوئے......'' پائدان پہ بیٹھے بیچارے لڑکے جو

سیٹ نہ ملنے کی وجہ سے قربان ہوئے تھے تڑپ کے اٹھے سب ان کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

''یہ کیا ضیا؟'' سامنے بیٹھی میڈم تبسم نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

''میم دیکھیں تو...... مری کسی کو ویلکم کر رہا ہے۔'' گہری مسکراتی نظروں سے لالہ کو تکتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''واؤ......'' سب نے تعریفی انداز میں کہتے ہوئے ہلکی، ہلکی تالی بجانا شروع کی تھی۔ لالہ نے بس ایک نظر ضیا علی خان کو دیکھا اور اپنی سائڈ کا شیشہ بند کر دیا تھا۔ باقی سب البتہ اب ضیا کی تقلید میں کھلے شیشوں سے موسم انجوائے کر رہے تھے۔ گاڑی میں کچھ بے سُروں نے تال بھی چھیڑ دیے تھے۔

☆☆☆

''باری......'' دیدے کی پکار پہ اس نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا...... پھر لیپ ٹاپ بند کر کے سائڈ پر رکھ دیا۔ ماں جب بھی اس کے پاس ہوتیں وہ یونہی سارے کام سمیٹ لیا کرتا تھا۔ دیدے اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''تمہارا کام کافی بڑھ گیا ہے؟'' انہوں نے محبت پاش نظروں سے اس کے وجود کو حصار میں لیا تھا۔

''کچھ دنوں کی بات ہے دیدے...... سائٹ کا کام ختم ہوتے ہی فارغ ہو جاؤں گا۔'' ماں کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ ادب سے بولا تھا۔

''اصل میں، میں سوچ رہی تھی کہ......'' دیدے بولتے، بولتے رک سی گئیں۔

''کیا ہوا دیدے؟'' وہ پریشان ہو گیا۔

''تمہیں امن کیسی لگتی ہے؟'' ان کی اگلی بات پہ وہ حیران ہوا تھا۔

''یہ اچانک امن میم کیسے یاد آ گئیں آپ کو؟'' وہ حیرانی سے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہر وقت تو پر چھائی کی طرح تمہارے ساتھ رہتی ہے۔ اس میں یاد آنے والی کون سی بات ہے۔'' دیدے برا منا گئیں۔

''اُف......'' وہ دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''آپ کچھ الٹا سوچ رہی ہیں ناں دیدے؟'' وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''تو کیا غلط سوچ رہی ہوں؟'' دیدے نے الٹا اس سے سوال کیا۔

''بالکل غلط......'' وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔

''لیکن کیوں؟'' دیدے بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اتنی پیاری تو ہے وہ...... پھر دیوانوں کی طرح تمہارے اردگرد چکر کاٹتی رہتی ہے۔'' بات کے آخر میں وہ شرارت سے مسکرائی تھیں۔ باریال نے خفا نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

''وہ صرف اور صرف میرے کام کی وجہ سے دیدے، ایسی کوئی بات نہیں جیسا آپ سوچ رہی ہیں۔'' وہ صاف مکر گیا۔

''مجھے بچہ مت سمجھو باری۔'' انہوں نے دھونس جمائی۔

''آپ بھی تو مجھے غلط سمجھ رہی ہیں دیدے۔ اگر ان کو مجھ میں کوئی انٹرسٹ ہے بھی تو یہ یکطرفہ ہے۔'' ٹھوس لہجے میں کہتا وہ ان کے سامنے کھڑا تھا۔ دیدے کی آنکھوں میں الجھن سی جاگی۔ ان کا بیٹا کبھی جھوٹ بولتا تھا نہ کچھ ان سے چھپاتا تھا۔

''لیکن وہ تو......؟'' انہیں افسوس ہونے لگا۔

''دیدے......'' اس نے ماں کو کندھے سے تھام لیا۔

''میرے کچھ خواب ہیں...... پورے ہو جائیں تو ضرور سوچوں گا اس بارے میں...... لیکن فی الحال صرف کام۔'' مضبوط لہجے میں کہتا وہ ان کے شکوک مکمل مٹا گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں چھائی مایوسی خود باریال کو بھی اچھی نہیں لگی تھی۔ لیکن حقیقت یہی تھی سو وہ فی الحال ان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆☆☆

جس ہوٹل میں ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ نسبتاً ویران جگہ پہ تھا۔ ہوٹل کی عمارت آگے کی طرف جبکہ کار پارکنگ اور لان پچھلی سائڈ پر رکھے گئے تھے.

جہاں چاروں طرف لکڑی کی خوب صورت دیوار بنا کر کھائی سے کچھ آگے تک کا ایریا کور کیا گیا تھا۔ اس طرف کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ ساری وادی نظر آتی تھی۔ دور شفاف سڑکوں پر چلتی ٹریفک، ڈھلوانی برفیلے پہاڑ اور بادل سے ڈھکے اونچے درخت جو سرِ شام دل لبھا رہے تھے، رات ہوتے ہی کسی آسیب کی طرح لگنے لگے تھے۔

نمرہ کے ابو نے نمرہ اور لالہ کے لیے علیٰحدہ کمرے کا انتظام کر دیا تھا۔ باقی لڑکیوں نے میم تبسم کے ساتھ ہال کمرے کو چنا تھا۔ نمرہ کا دل بھی وہیں انجوائے کرنے کا تھا لیکن اسے چونکہ لالہ کی طبیعت کا اندازہ تھا۔ تبھی اس نے باپ سے کہہ کر الگ روم کا بندوبست کیا تھا۔ تاکہ لالہ وہاں صحیح معنوں میں انجوائے کر سکے۔

جس وقت وہ ہوٹل پہنچے رات ہو چکی تھی۔ سامان رکھ کر وہ دونوں باہر پچھلی طرف آ گئی تھیں۔ اس طرف کونے میں ایک چھوٹا سا کیفے بھی کھلا تھا۔ نمرہ فوراً اس طرف چلی گئی۔ لالہ دھیرے، دھیرے چلتی لکڑی کی اس چھوٹی سی دیوار کے قریب آ گئی۔ بارش کب کی رک چکی تھی لیکن ہوا میں نمی بدستور تھی۔ چاروں طرف اترنے والی کہر نے ہر منظر نگلنا شروع کر دیا تھا پھر بھی دور سے کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس اور عمارتوں پر لگے بلب جب، کبھی جھلملا جاتے تو بے حد اچھا لگتا۔ وہ اس گرل کے بالکل قریب آ گئی۔ اور نیچے کھائی میں دیکھنے لگی جہاں پاتال کے اندھیرے چھائے تھے۔

''کتنے ہنستے مسکراتے لوگوں کو نگل گئی ہوگی یہ سیاہ کھائی۔'' اس نے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔

''کاش یہ مجھے بھی نگل لے...... ایک روتا، بسورتا انسان کہ جس کی نہ کسی کو ضرورت ہے اور نہ جس کو کسی اور کی......'' اس کی آنکھیں جلنے لگیں لیکن اندھیرے میں دیکھنے کے قابل نہ ہوئی تھیں...... منفی سوچوں نے ایک بار پھر اس کے دماغ کو اپنی شکنجے میں لیا تھا۔

''لالہ...... کافی......'' نمرہ نے اسے کافی کا مگ تھماتے ہوئے پکارا جو اس نے خاموشی سے تھام لیا۔

''اتنی تاریک کھائی میں دیکھتے ہوئے تمہیں خوف نہیں آتا۔'' نمرہ نے گہری کھائی پہ ایک نظر ڈالتے ہی جھرجھری سی لی۔

''بدکردار ماؤں کی بیٹیوں کو شاید کسی چیز سے خوف نہیں آتا۔ موت سے بھی نہیں۔'' اس کی بات پر نمرہ چند لمحے ساکت رہ گئی تھی۔

''اتنی گھٹیا بات تم اس قدر آسانی سے کیسے کہہ سکتی ہو لالہ۔'' اس کے لہجے میں تاسف سا سمٹ آیا تھا۔ ''ان کے ماضی کے متعلق تم جانتی بھی کیا ہو؟ اور پھر بھی تم ایسا کیسے کہہ سکتی ہو یار...... ہیں تو تمہاری ماں ہی۔'' اسے واقعی لالہ کی سوچ پہ افسوس ہو رہا تھا۔

''لوگوں کی زبانی روز سن لیتی ہوں ان کے ماضی کے متعلق قصے...... جتنے نشتر روز میری روح سہتی ہے وہ کافی ہیں میری ماں کا کردار جاننے کے لیے۔'' اس کے لہجے کے ساتھ اس کی آنکھیں بھی بھیگنے لگی تھیں۔

''ایسا کچھ نہیں ہے لالہ...... لوگوں کا تو کام ہی باتیں کرنا ہیں اور پھر سبین آنٹی...... کتنی نائس ہیں...... یقین کرو انہیں تو دیکھ کر دل میں احترام خود بخود ابھرتا ہے۔'' نمرہ اسے سمجھنے لگی۔

''احترام......'' لالہ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ مچلی۔

''تم پہلی لڑکی ہو دادو کے بعد جس کے منہ میں امی کے لیے یہ لفظ سن رہی ہوں۔ ورنہ گھر سے بھاگی ہوئی عورت کا اس دنیا میں کیا مقام ہے تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔''

''تم بہت نیگیٹو سوچتی ہو لالہ......'' نمرہ کافی کے سپ لیتے ہوئے دور جلتی بجھتی لائٹس کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''میرے خیال میں تمہیں کچھ اسپیس رکھنی چاہیے دل میں۔'' اس کے لہجے میں خلوص تھا۔

''کاش تم میری جگہ ہوتیں نمرہ...... تم تب ہی سمجھ پاتیں۔'' وہ بھی کافی پینے لگی اندر کی کڑواہٹ مزید بڑھنے لگی۔

''شاید......'' نمرہ نے مختصر جواب دیا...... وہ اس بحث کو اب ختم کر دینا چاہتی تھی۔

☆☆☆

کھڑکی کے پردے ہٹا کر اس نے ایک نظر باہر دیکھا تھا۔ کھڑکی کے شیشے ابھی تک بارش کے قطروں سے نم تھے۔ تبھی باہر کے منظر دھندلا رہے تھے۔ مری کی پہاڑیوں پر اترنے والی شب سرد تاریک بھی تھی۔ لیکن ہوٹل کے پچھلی طرف والا لان روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔

''مری مجھے ویلکم کر رہا ہے۔'' مسکراتی آواز پر اس نے بے خود سا ہو کر کھڑکی کھول دی۔ سرد ہوا کے جھونکے نے اسے چھوا اور انوکھی سی خوشبو اس کی روح تک میں سرائیت کرنے لگی۔ اس نے کوٹ کے کالر اوپر کیے اور نیچے دیکھنے لگا۔

لان رات کے اس پہر سردی کے باوجود لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ صرف جس طرف کھائی تھی اس طرف تھوڑا سا ایریا ویران تھا اس طرف تھا بھی نسبتاً اندھیرا...... ضیا کچھ دیر وہیں دیکھتا رہا بلا ارادہ ہی...... یونہی دیکھتے رہنے سے اچانک ہی کسی کا عکس واضح ہوا تھا۔ گرل کے بالکل قریب ہی دو سائے تھے جو اتنی دیر تک دیکھتے رہنے کے باعث آہستہ، آہستہ واضح ہونے لگے تھے...... وہ دو لڑکیاں تھیں جو اس ویران قطعے پر کھڑی شاید اس گھائی کے اندھیرے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ سفید لمبی شال سے وہ فوراً لالہ کو پہچان گیا تھا۔ چند سیکنڈ لگے تھے اسے سوچنے میں...... وہ کھڑکی بند کرنے ہی لگا تھا کہ سائڈ ٹیبل پر دھرا موبائل بجنے لگا۔ اس نے کوفت سے اسکرین دیکھی۔

''با..جی ......'' کا نام بلنک کر رہا تھا لمبی سانس لیتے ہوئے اس نے خود کو کمپوز کیا اور کال پک کرتے ہوئے دوبارہ کھلی کھڑکی میں آ ٹھہرا۔

''حال سناؤ بیٹے۔'' با..جی کی مسکراتی آواز ابھری۔ نہ جانے کیوں وہ مسکرا نہ سکا۔ اس کی نظریں اب بھی دور کھڑی لالہ پر جمی تھیں۔

''ٹھیک ہوں با..جی ......'' مختصر جواب دیا۔

''تو پھر کیا پروگرام ہے؟ کل آ رہے ہو ناں......'' با..جی نے پوچھا وہ مزید کھڑکی کے قریب ہو گیا۔

''نہیں با..جی ......'' اس نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد جواب دیا۔

''کیوں؟ خیریت تو ہے ناں؟'' با..جی پریشان ہو گئے۔

''میں کچھ دوستوں کے ساتھ مری آیا ہوا ہوں لیکن آپ فکر نہ کریں با..جی ...... میں ابراہیم کو کہہ دوں گا۔ وہ وہیں ہے۔ میری گاڑی لے کر پہنچ جائے گا۔'' اس نے انہیں اطمینان دلایا۔

''کیوں؟ تم اپنی گاڑی میں نہیں گئے وہاں؟ دوران خان ہے تمہارے ساتھ؟'' مطمئن ہونے کے بجائے وہ مزید پریشان ہو گئے۔

''با..جی، یونیورسٹی ٹور پر آیا ہوں، اب سب کو تو ساتھ نہیں لا سکتا تھا ناں۔'' وہ بیزار سا ہونے لگا۔

''یہ تو اچھی بات نہیں ہے بیٹا۔'' وہ خفا ہوئے۔ اس بار ضیا خاموش رہا تھا۔

''خیر...... تم ابراہیم کو کہہ دو...... کل آ جائے بچیوں کو لینے۔''

''جی با..جی۔''

''اور ایک بات یاد رکھنا ضیا...... تم میری بے آرام راتوں اور بے چین دنوں کے گواہ ہو...... میری ہر تڑپ، ہر تکلیف کا قرض وصولنا ہے تمہیں وہ بھی سود سمیت...... مجھے ناکافی نہیں چاہیے۔'' ان کے تلخ لہجے پر ضیا کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔

''بے فکر رہیں با...... آپ کی تکلیف، آپ کی شرمندگی میں بھول بھی نہیں سکتا ایک، ایک پائی وصول کروں گا...... سود سمیت ہی۔'' اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک جاگی تھی۔

''فون رکھتا ہوں، اپنا خیال رکھنا۔'' انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔ ضیا نے سامنے دیکھا۔ لالہ وہاں نہیں تھی۔ اس نے غصے سے دیوار کو لات رسید کی تھی۔

باقی آئندہ ماہ

ادراک

عاصمہ عزیز

محمد مہد علی مجھ سے محض دو سال بڑا میرا یعنی سارہ علی کا سگا بھائی تھا لیکن میری اس سے ازلی دشمنی تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ بجا ہوگا کہ اُس کی مجھ سے ازلی دشمنی ہے کیونکہ بقول میرے مجھ جیسی معصوم اور رحم دل لڑکی میں ایسی صلاحیت پائی ہی نہیں جاتی کہ وہ کسی دشمن سے بھی دشمنی نبھا سکے کجا کہ اپنے سگے بھائی سے لیکن بدقسمتی سے میرے ہٹلر نما بھائی میں یہ صلاحیت کوٹ، کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آج اگر ہٹلر زندہ ہوتا تو وہ مہد کی صورت میں



اپنے جانشین کو سامنے پا کر خوشی سے پھولے نہ سماتا۔ لیکن خیر دنیا میں موجود اپنے جانشینوں کی کارکردگیاں ملاحظہ کر کے اس کی روح کو کافی طمانیت نصیب ہوتی ہوگی۔ ہاں تو میں آپ کو بتا رہی تھی کہ محترم مہد نے مجھ سے دشمنی نبھانے کا کبھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ بچپن میں جب بھی بابا میرے اور اس کے لیے کھلونے لاتے تو وہ اپنے کھلونوں پر دوسری نظر ڈالے بغیر میری معصوم اور خوب صورت ڈولز کو توڑنا مروڑنا اپنا فرض سمجھتا تھا اور میری آنکھوں سے بہتے موٹے، موٹے آنسو گویا اس کے دل پر ٹھنڈی پھوار کی طرح برستے تھے۔ وقت نے اپنے پر پھیلائے اور اسی طرح اس کے مظالم سہتے، سہتے میں نے میٹرک اور مہد نے انٹر میں قدم رکھ لیے تھے۔ میں ’طوبٰی‘ اور آیان اسکول میں میٹرک تک بہت اچھے دوست تھے۔ آیان چونکہ ہمارے ساتھ والے گھر میں رہتا تھا اس لیے بچپن سے ہی اسکول سے واپسی کے بعد اس کے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اگرچہ وہ مجھ سے سینئر تھا لیکن میرے میٹرک میں پہنچتے ہی مہد کی ہٹلرانہ طبیعت ایک دفعہ پھر عود کر آگئی تھی اور اس نے اماں کو خوب بھڑکا کر میری آیان سے دوستی ختم کروانے کی اپنی سی کوشش کی تھی لیکن میں نے بھی اس کی بہن ہونے کا پورا، پورا حق ادا کرتے ہوئے اماں اور اس کی باتوں پر کبھی کان نہیں دھرے۔

وہ فروری کی ایک سرد شام تھی جس میں آسمان پر سرمئی رنگ کے بادل چھائے ہوئے تھے، میں اپنی میتھس کی کتاب سینے سے لگائے آیان سے سوالات سمجھنے کی غرض سے اس کے گھر جا رہی تھی کیونکہ ان دنوں میٹرک کے امتحانات تلوار کی طرح میرے سر پر منڈلا رہے تھے۔

’’کہاں جا رہی ہو اس وقت...؟‘‘ مہد نے گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہوئے سخت تفتیشی لہجے میں پوچھا تھا۔

’’پڑھنے جا رہی ہوں کچھ سوالات سمجھ نہیں آ رہے تھے۔‘‘ میں نے برا سا منہ بنا کے نہ چاہتے ہوئے بھی جواب دیا تھا۔

’’کوئی ضرورت نہیں ہے اس کارٹون کے گھر جانے کی...... بچی نہیں ہو اب تم......‘‘ اس نے گیٹ سے ہٹتے ہوئے درشت لہجے میں کہا تھا۔ اور میں اس کی بات ایک کان سے سن کے دوسرے سے نکالتے ہوئے سرعت سے گیٹ سے نکل آئی تھی۔ ایک گھنٹا پڑھنے کے بعد تھکن سے چور جس وقت میں گھر لوٹی تو میری توقع کے عین مطابق مہد اماں کے کان میرے خلاف خوب بھر چکا تھا۔ پتا نہیں اس کی کون سی پرخاش تھی جو وہ اس طرح نکالتا تھا۔

’’ہمارے منع کرنے کے باوجود تو پھر اس کے گھر منہ اٹھا کے چل نکلی۔‘‘ اماں نے مجھے لاؤنج میں قدم رکھتے دیکھ کر خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

’’آپ بھی ناں اماں...... اب میں منہ ادھر چھوڑ کے کیسے جا سکتی تھی۔‘‘ میں نے صوفے پر نیم دراز ٹی وی دیکھتے مہد کے مسکراتے چہرے کو گھورتے ہوئے کہا۔

’’بس پٹر، پٹر زبان چلتی ہے اس کی...... ارے کتنی دفعہ کہا ہے تجھ سے کہ ہمارے مذہبی گھرانے میں لڑکیوں کا لڑکوں سے دوستیاں نبھانے کا کوئی رواج نہیں۔ ایک دفعہ پھر کان کے پردے کھول کے سن لے۔‘‘ اماں نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے ایک دفعہ پھر مجھے لتاڑا۔

’’بس رہنے دیں اماں...... جب خاندان بھر کی عورتیں مل بیٹھ کر ایک دوسرے کی ’’صفات‘‘ بیان کر رہی ہوتی ہیں اس وقت مذہب یاد نہیں آتا کسی کو۔ ہم ڈبل اسٹینڈرڈ لوگوں کو مذہب کا جو حکم اپنی خواہشات کے مطابق لگتا ہے اس کو لے لیتے ہیں باقی سب بھول جاتے ہیں۔ آخر ہم سب دین کے اندر پورے کے پورے داخل کیوں نہیں ہو پاتے؟‘‘ میں نے جذباتی انداز اپناتے ہوئے اماں کو متاثر کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔

’’تو ڈیئر سسٹر آپ یہ کوشش کیوں نہیں کر لیتیں...... اسلام میں تو کسی لڑکی کا نامحرم لڑکے سے دوستی کرنا بھی جائز نہیں...یہ بھی تو ہمارے دین کا ایک حکم ہے۔‘‘ مہد نے ٹی وی آف کرتے ہوئے اپنی ٹانگ اڑانا فرض سمجھا تھا۔

’’اللہ انسان کو اس کی نیتوں کے مطابق ہی جزا و سزا دینے والا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں۔ وہ بالکل آئینے کی طرح شفاف ہے اور مجھے اپنے بچپن کے دوست پر بھی پورا اعتماد ہے۔‘‘ میں نے اس کے لیکچر پہ تفصیلی جواب دیا تھا۔ جبکہ اماں ہمیں بحث میں الجھتے دیکھ کر مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئی تھیں۔

’’ہونہہ اعتماد...... محض خوش فہمی ہے جناب کی۔‘‘ مہد نے دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔

’’خوش فہمی ہو یا غلط فہمی تمہیں اس سے کیا۔ اب تم پہلے اماں کے کان بھرنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔‘‘ میں نے منہ پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

’’فکر نہ کرو تم سے برا کوئی ہے بھی نہیں اس دنیا میں۔‘‘ یہ کہتے ہوئے مہد مجھ پر کشن اچھالتے ہوئے کمرے سے بھاگ نکلا تھا۔

☆☆☆

اس طرح بحث مباحثے کرتے ہوئے وقت کافی آگے سرک چکا تھا۔ اب ہم کالج، یونیورسٹی لیول کے اسٹوڈنٹس تھے۔

بی اے کے امتحانات سے فراغت کے بعد میں ناولز اور رسالے پڑھ کے اپنی چھٹیوں کے مزے لوٹ رہی تھی۔ اس وقت بھی کشادہ لان کے وسط میں پڑی پلاسٹک کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھی میں ناول پڑھنے میں مگن تھی۔ لان کے ایک طرف لگے چنبیلی اور گلاب کے پھولوں کی مہک سارے میں پھیلی شام کو مزید حسین بنا رہی تھی۔ اپنے لمبے بالوں کو آگے کر کے ایک طرف سلسلے میں ناول پڑھنے میں منہمک تھی کہ کوئی چیز میرے منہ پر آ کر گری۔ سامنے کھڑے مہد اور اپنے ہاتھوں میں ابھی کچھ دیر پہلے پریس کی ہوئی اس کی شرٹ کو دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا تھا۔

’’یہ کیا بدتمیزی ہے؟‘‘

’’چلو شاباش اٹھو اور دوبارہ پریس کرو شرٹ...... کوئی کام ڈھنگ سے نہیں ہوتا تم سے۔‘‘ مہد نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے اٹھاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

’’نوکر نہیں لگی ہوئی میں تمہاری۔‘‘ میں نے صاف ہری جھنڈی دکھائی۔

’’ٹھیک ہے بچو نہ کرو پریس......‘‘ مہد کو تن فن کرتے اُدھر سے جاتے دیکھ کر میں نے سکون کی سانس لی لیکن اگلے دو منٹ بعد اس کے ہاتھ میں اپنے عزیز ترین ناولز اور لائٹر دیکھ کر میرا سارا سکون غارت ہو گیا تھا۔ اس لیے اپنے ناولز کی جان بخشی کے لیے میں نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے تھے اور وہ مجھ معصوم پر ظلم کی انتہا کرتے ہوئے اپنے پورے مہینے کے کپڑے پریس کروا کے اپنے دوست کے ساتھ گھومنے نکل گیا تھا۔ اور اب میرا غصے سے برا حال تھا۔ کچھ دیر اس کے کمرے میں پڑے اس کے پرفیومز، سی ڈیز اور دیگر چیزوں کو پٹخ، پٹخ کر رکھنے کے بعد اپنا غبار نکالنے کے لیے آیان کے گھر جانے کی غرض سے کمرے سے نکل آئی تھی۔

☆☆☆

’’واؤ، آیان کی منگنی ہو رہی ہے؟‘‘ آیان کی مما کی بات سن کے میں نے اُن کے لاؤنج میں قدم رکھتے ہوئے خاصی پُرجوش آواز میں کہا۔

’’کہاں بیٹا...... یہ مانے تو تب ناں۔‘‘ انہوں نے رسمی علیک سلیک کے بعد مجھ سے اپنا دردِ بیان کیا تھا۔

’’کیوں، کیا مسئلہ ہے اسے...... کوئی ضرورت نہیں ہے سارا پروگرام چوپٹ کرنے کی۔ اتنے عرصے بعد تو کوئی تقریب دیکھنا نصیب ہوگی۔‘‘ بے نیازی سے میگزین کی ورق گردانی کرتے آیان کو گھورتے ہوئے میں نے کہا تھا جیسے یہاں اس کی نہیں کسی تیسرے بندے کی بات ہو رہی ہو۔

’’بیٹا تم ہی سمجھاؤ اسے......‘‘ آنٹی نے سمجھانے

کی ذمّے داری میرے کمزور کندھوں پر ڈالتے ہوئے کچن کا رخ کیا تھا۔

”اب چھوٹو کیا مسئلہ ہے... کیوں انکار کررہے ہو اپنی کزن سے شادی کرنے سے۔“ میں نے آنٹی کے اٹھتے ہی پوچھا۔

”سب سے بڑا مسئلہ ہی یہی ہے کہ کسی کو میری چوائس جاننے کی فرصت ہی نہیں۔“ آیان نے میگزین صوفے پر پٹختے ہوئے منہ پھلا کے کہا۔

”ہونہہ بڑے آئے شہزادہ گلفام کہیں کے... اب کیسی لڑکی اترے تمہارے لیے۔“ میں نے مصنوعی غصے سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے جیسی......“ آیان نے مسکراہٹ دباتے ہوئے شرارت سے کہا تھا اور اس کی مما نے لاؤنج کراس کرتے ہوئے یہ بات بڑی فرصت سے سنی تھی۔ شک تو انہیں پہلے ہی تھا لیکن اب یقین ہو چکا تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے ایک منٹ میں کہیں غائب کر دیں جس کی وجہ سے اُن کا بیٹا ان کی بھانجی سے شادی سے انکار کر رہا تھا۔

”اوں ہوں۔ تمہارا سر پھاڑ دوں گی اگر ایسا سوچا بھی تو......“ میں نے تڑخ کر کہا۔

”منہ دھو رکھو میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں ہے دور، دور تک......“ آیان نے مجھے سامنے پڑا کرسٹل کا گلدان اٹھاتے دیکھ کر فوراً اپنا بیان بدلا تھا۔

☆☆☆

شام ڈھل رہی تھی اور سورج اللہ کے اذن سے مغرب کی جانب سفر کرتے ہوئے اپنی نارنجی شعاعیں آسمان پر بکھیر رہا تھا۔ ابو کی اسٹڈی میں اس وقت لگی عدالت کے کٹہرے میں مجھے کھڑا کیا گیا تھا اور شاید زندگی میں پہلی دفعہ مہد میری وکالت کرنے کے فرائض سر انجام دے رہا تھا۔ اماں آج خلافِ معمول صبح سے ہی خالہ کی طبیعت کی ناسازی کی وجہ سے اُن کے گھر تھیں ورنہ شاید میرے اس وقت کٹہرے میں کھڑے ہونے کی نوبت ہی نہ آتی۔

ابھی کچھ دیر پہلے آیان کی مما میری اور آیان کی دوستی کو لے کر جس طرح کی باتیں ابو کی موجودگی میں بنا کر گئی تھیں انہیں سننے کے بعد میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی ابو کے سامنے اس وقت سر اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی۔ ہمیشہ مجھ سے شفقت اور محبت سے پیش آنے والی آیان کی مما میرے بارے میں ایسی باتیں بھی کر سکتی ہیں، یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔ شاید ہم میں سے بہت سے لوگ کئی چہرے لیے پھرتے ہیں اور وقت اور ضرورت کی مناسبت سے وہ چہرہ سامنے لے آتے ہیں۔ آیان کا ان کی بھانجی سے شادی سے انکار کی وجہ وہ مجھے قرار دے رہی تھیں لیکن ہم اپنی صاف نیت ان کو دکھا نہیں سکتے تھے۔ اس وقت ابو کے سامنے صوفے پہ سر جھکائے بیٹھتے ہوئے مجھے اپنے بھائی مہد کی کہی ہوئی یہ بات بڑی شدت سے یاد آئی تھی کہ یہ دنیا بڑی ظالم ہے یہ ہماری نیتوں کے اخلاص کو جانے اور سمجھے بغیر اپنی سوچ اور ظرف کے مطابق کسی پہ الزامات لگانے میں کبھی دیر نہیں کرتی۔ اسٹڈی روم میں لگے ڈارک براؤن پردے کمرے کے ایک طرف رکھی رائٹنگ ٹیبل اور اس کے سامنے ریک میں سجی طرح، طرح کی کتابیں مجھے آنٹی کی زبان بولتی ہوئی سنائی دے رہی تھیں۔ گویا کمرے میں موجود ہر چیز میں آنٹی کی زبان اُگ آئی تھی اور میرا پورا وجود اس وقت سماعت بنا ہوا تھا۔

”ہماری بیس سالہ تربیت کو مٹی میں ملاتے ہوئے لمحے بھر کے لیے بھی نہیں سوچا اس نے۔ یہ صلہ مل رہا ہے ہمارے اندھے اعتماد کا کہ ہمیں محلے کے لوگ آ کے باتیں سنائیں گے۔“ ابو کی سرد آواز نے کمرے کے سکوت کو توڑا تھا۔ غالباً ابو مجھ سے اتنا ناراض تھے کہ انہوں نے مجھے ڈائریکٹ مخاطب کرنا بھی پسند نہیں کیا۔

”ابو، آنٹی کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان کا بیٹا اگر شادی سے انکار کر رہا ہے تو اس میں سارہ کو انوالو کرنے کی کیا تک بنتی ہے۔ مجھے یقین ہے سارہ کا

اس سب میں کوئی قصور نہیں۔“ میرے ٹہوکا دینے پہ مہد نے ابو کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔

”رائی ہوتی ہے تو پہاڑ بنتا ہے۔ دنیا جہان کو چھوڑ کر اس لڑکے کی ماں کو تمہاری بہن ہی ملی تھی کیا؟“ ابو کو مہد کی کم عقلی پہ گویا افسوس ہوا تھا۔ ابو کا لہجہ اور باتیں سن کر میرا دل چاہا کہ میں ایک منٹ ضائع کیے بغیر یہاں سے غائب ہو جاؤں۔ میں نے بہ مشکل آنکھوں سے امڈتے آنسوؤں کو نکلنے سے روکا تھا۔

”ابو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ کو اپنی اولاد سے زیادہ غیروں کی بات پہ یقین ہے۔“ مہد نے ناراضی سے کہا تھا۔ ابو اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے میں مزید کوئی بات سنے بغیر پاؤں پٹختی باہر لان میں نکل آئی تھی۔ کشادہ لان میں بچھے سرسبز گھاس کے فرش پر میں آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی تھی۔ سورج مکمل طور پر ڈوب چکا تھا۔ سامنے دیوار پر لگے چھوٹے سے لیمپ کی روشنی لان کی خوبصورتی کو عیاں کرنے سے قاصر تھی۔

”اندھیرا واحد چیز نہیں ہوتی جو چیزوں کو چھپاتی ہے، یہ انسان کی عقل پر چھایا پردہ بھی ہے جو یہ کام زیادہ بہتر طریقے سے سر انجام دے سکتا ہے۔“ لان میں لگے واحد لیمپ پہ نگاہیں ٹکائے میں نے بے اختیار سوچا تھا۔ آج سے پہلے تک میری عقل پہ چھایا پردہ ہی تھا جو مجھے آنٹی کی محبت میں لپٹی بناوٹ نظر نہیں آئی تھی اور میں بلا جھجک آیان سے ملنے اس کے گھر نکل پڑتی تھی۔ آنٹی کے میرے کیریکٹر کے بارے میں نوازے گئے القابات اور ابو کی بدگمانی نے میرے اندر آگ لگا دی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس آگ سے ہر چیز کو جلا کر بھسم کر دوں۔ دکھ اس وقت اتنا نہیں ہوتا جب دنیا آپ کے خلوص کو غلط رنگ پہنا دیتی ہے بلکہ دکھ اس وقت شدید ہوتا ہے جب آپ کے بہت اپنے آنکھوں پر دنیا کی عینک لگا کر آپ کو دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

”کہاں سیر کرنے گئی ہوئی تھی ابو کے سامنے

تمہاری زبان؟“ کچھ دیر بعد مہد نے میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔

”جب میرا کوئی قصور ہی نہیں ہے تو مجھے کوئی ضرورت نہیں کسی کو وضاحتیں دینے کے لیے زبان استعمال کرنے کی۔“ میں نے غصے سے کھولتے ہوئے جواب دیا۔

”اکثر ہمارا قصور بھی کہیں نہ کہیں ہوتا ہے لیکن ہمیں دوسروں کی غلطیوں کے آگے اپنا کوئی قصور دکھائی ہی نہیں دیتا۔“ مہد نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

”میرا کیا قصور ہے؟ کوئی اگر بچپن کی دوستی کو بھی غلط رنگ دے سکتا ہے تو قصوروار بھی وہی ہے۔“

”میں نے تمہیں کتنی دفعہ کہا کہ بچپن ختم ہوتے ہی بچپنا بھی ختم ہو جانا چاہیے۔ تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ ہم جس سوسائٹی اور کلاس میں موو کرتے ہیں وہاں لڑکے اور لڑکی کی دوستی کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ پھر آپ کی نیت چاہے کتنی ہی صاف اور پاکیزہ کیوں نہ ہو دنیا کے پاس نہ تو آپ کی نیت جانچنے کا پیمانہ ہوتا ہے نہ ہی وقت۔“

”ہونہہ دنیا......“ میں نے تنفر سے ہنکارا ابھرا تھا۔

”تمہیں پتا ہے سارہ ہمارے معاشرے میں بہت سے مسائل اللہ کی مقرر کردہ حدود کو پھلانگنے کی وجہ سے ہی جنم لیتے ہیں۔ قرآن میں محرم اور نامحرم رشتوں کے بارے میں بتا کے مرد و عورت کو اُن کی حدود واضح الفاظ میں سمجھا دی گئی ہیں۔ اب چاہے ہماری نیت کتنی ہی صاف کیوں نہ ہو ہم کسی کو بہن یا بھائی جیسا دوست مان کے لمبی لمبی گفتگو اور بے تکلفی کے تمام ریکارڈ توڑ دیتے ہیں تو دراصل اسلام کے مثالی حجاب کے اصولوں کو رد کرتے ہیں۔ حجاب صرف سر اور چہرہ ڈھانپ لینے کا نام نہیں ہے پیاری بہن بلکہ حجاب مرد و عورت دونوں کی نگاہ، گفتگو اور چال میں بھی ہونا ضروری ہے۔“ مہد مدھم لہجے میں اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا اور میں عجیب ہونق شکل بنا کے حیرت سے اسے سن رہی تھی کہ وہ اتنی اچھی باتیں بھی کر سکتا ہے۔

وہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا واقعی ہم مشرق اور مغرب کی درمیانی راہ نکال کر اس پر چل رہے ہیں۔ ہم نہ تو مکمل طور پر اپنی مشرقی اسلامی روایات پر عمل کر کے اس راہ پر چل رہے ہیں اور نہ ہی مکمل طور پر مغربی راہ پر گامزن ہونا پسند کرتے ہیں۔ آج ہمارا کلچر جو شاید مستعار ہے ہمارا ایمان بنا ہوا ہے۔ میں سر جھکائے لان کی گھاس کے تنکے نوچتے ہوئے مہد کی باتیں سن رہی تھی۔

”چلو اندر چلتے ہیں۔ ویسے تو مجھے پتا ہے کہ تمہاری اوپر کی منزل بالکل خالی ہے لیکن امید ہے کہ کچھ پلے پڑ ہی گیا ہوگا تمہارے۔“ مہد یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کی بات سمجھتے ہوئے میں نے خفگی سے اسے گھورنا اپنا فرض سمجھا تھا۔

اس دن کے بعد سے ابو کی خفگی ہنوز برقرار تھی۔ میں جب بھی ان کے سامنے جاتی وہ بغیر مجھے مخاطب کیے منظر سے ہٹ جاتے اور میں سوچتی رہ جاتی کہ آیان سے دوستی رکھنا کیا میری اتنی بڑی غلطی تھی۔ شاید ہم لڑکیوں کی چھوٹی، چھوٹی غلطیاں بھی یہ معاشرہ میگنیفائنگ لینز (محدب عدسہ) لگا کے دیکھتا ہے۔ ایک بات جو اماں اور مہد کے کئی بار سمجھانے سے میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، وہ مجھے آنٹی کے مجھ پر انگلی اٹھانے کے بعد بہت اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ جس چیز یا کام سے اللہ نے ہمیں دور رہنے کا حکم دیا ہے اس کے کرنے سے ہمیں ہمیشہ شر کا سامنا ہی کرنا پڑتا ہے، وہ شر چاہے ہمارا اپنا پیدا کردہ ہو یا ہمارے اردگرد دوسرے لوگوں کا۔ لیکن جس طرح پوزیٹو چارج نیگیٹو کو اپنی طرف کھینچتا ہے اسی طرح انسان کی بھی یہ فطرت ہے کہ وہ اکثر ان کاموں کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے جن میں شر (برائی) کا اندیشہ ہو۔ اسی لمحے مجھے اس بات کا ادراک ہو گیا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے ابو کو کیسے منانا ہے۔





بازی مات ہوئی

تہمینہ چوہدری

”جن سے محبت ہوتاں وہ ایسے نہیں مل جاتے جیسے صبح کا ناشتا......“ عروبہ کے الفاظ میری سماعتوں میں ایسے چبھ رہے تھے جیسے تیر یا پھر چھوٹی، چھوٹی سوئیاں جو کوئی آہستہ، آہستہ میرے بدن میں چبھو رہا ہو۔ نفسیات کہتی ہے کہ جس سے آپ کی دوستی سات سال سے زیادہ رہے اس سے آپ کی دوستی عمر بھر رہتی ہے پھر پری سے تو میں سات سال سے مسلسل محبت کر رہا تھا۔ بے تحاشا، بے پناہ محبت...... میں کبھی، کبھی

خود بھی اپنی محبت کی حد میں ناپنے کی کوشش کرتا تو میری یہ تمام کوششیں میرا منہ چڑا رہی ہوتیں۔ مجھے لگتا لال حویلی کے تمام مکین جیسے پتھر کے بن گئے تھے۔

سرد، بے بہر...... بے حس...... مجھے تو لگتا تھا کہ پری کی طرف جانے والے تمام راستے بڑے سیدھے اور سپاٹ تھے...... مگر شاید یہ عائد سلیم یعنی میری بہت بڑی غلط فہمی تھی۔ راستہ کوئی بھی سیدھا اور سپاٹ نہیں ہوتا، ہر راستے کی اپنی اونچ نیچ ہوتی ہے جو صرف چلنے والے ہی کو پتا ہوتا ہے بظاہر مجھے سب کچھ بڑا آسان لگتا تھا مگر مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ آگے چل کر کون سے موڑ مڑنے والے ہیں، میں اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ یہاں آیا تو میں پری سے ملنے تھا مگر جیسے ہمت جواب دے گئی ہو۔

آج کیمپس میں بھی خاموشی کا راج تھا۔ وگرنہ تو چہل پہل دیکھنے والی ہوتی تھی۔ میں رک گیا تھا، ٹھہر گیا تھا...... مجھے لگا میں چوراہے پر کھڑا ہوں مگر یہ فیصلہ کرنے میں بالکل ناکام کہ مجھے آگے بڑھنے کے لیے کون سا راستہ چننا چاہیے۔ میں موبائل اٹھا کر کھڑا ہوگیا تھا جو بار، بار بج رہا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ سارے میسج پری کے ہوں گے مگر اس وقت میں خود کو وقت دینا چاہتا تھا۔ شاید میں اپنے اندر جاری جنگ کو کسی منطقی انجام تک پہنچانا چاہتا تھا۔ ان سب میں یہ طے تھا کہ میرے دل کے سارے راستے صرف پری کی جانب ہی جاتے تھے مگر میں اسے قبل از وقت پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ کر پھر سے لال حویلی چلا آیا تھا۔ یہ حویلی میرے دادا نے بنوائی تھی۔ یعنی میرے ابا کے بھی ابا نے سو مرکزی دروازے سے لے کر بیٹھک تک اور وہاں سے لے کر بڑے کمرے اور پچھلے صحن تک ہر چیز میں انہی کی پسند جھلکتی تھی۔ ایک قرینے میں رکھی تمام چیزیں بے حد نفیس اور عمدہ ذوق کی آئینہ دار...... اور اس سے کہیں بڑھ کر تنک چڑھے یہاں کے مکین جو شاید خود سے آگے کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔

ہم پانچ بہن، بھائی تھے۔ چار بھائی اور ہماری ایک اکلوتی بہن جس میں شاید ہماری جان بستی تھی اور اس نے شاید اسی چیز کو اپنا ہتھیار بنالیا تھا۔ مجھے بھی اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ ہمارے بے ضرر سے لاڈ پیار سے وہ اتنا بگڑ جائے گی کہ اس کی کسی بھی بات کو ٹالنا ایک بہت بڑا محاذ ثابت ہوگا، بات اگر چھوٹی موٹی چیزوں تک محدود رہتی تو شاید اس کی یہ من مانیاں چلتی بھی رہتیں مگر یہ بات میری زندگی کی تھی۔

مجھ سے جڑی تھی بلکہ پری سے جڑی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ مجھے پھر سے اسی ضدی لہر سے گزرنا ہوگا مگر کہیں نہ کہیں میں تیار تھا۔ میں بیٹھک سے ملحقہ بڑے کمرے میں آگیا تھا۔ اسے ہم بیک وقت کھانے کا کمرا، ٹی وی والا کمرا، پنچایت والا کمرا یا پھر یونہی گپیں لگانے والا یا پھر غیبتیں کرنے والے کمرے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ گھر کے تمام چھوٹے بڑے فیصلے جیسے کھانے میں کیا پکایا جائے سے لے کر کس کی شادی کہاں کی جائے تک کے تمام فیصلے یہیں ہوتے تھے۔ میں، اماں اور عروٰی کو جیسا چھوڑ کر گیا تھا وہ ویسے ہی ایک دوسرے سے سر جوڑے پتا نہیں کیا سازشیں کر رہی تھیں۔ مجھے اندر آتا دیکھ کر ایک بھیانک قسم کی خاموشی در آئی تھی۔ عروٰی تو وہاں سے ناک آؤٹ ہی کر گئی تھی جیسے یہ فریضہ اماں کو سونپ کر گئی ہو کہ وہ مجھ سے بات کریں۔ اماں کو بھی جانے کیا ہوگیا تھا ایسے لگتا تھا جیسے وہ کبھی، کبھی صرف عروٰی کی ہی زبان بولتی تھیں۔

مسئلہ میری شادی کا تھا...... میری زندگی کا تھا اور میں یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اگر پری نہ بھی ہوتی تب بھی میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو چپ چاپ کسی ایک کھونٹے سے باندھ دیے جاتے ہیں۔ میں تو جوتا بھی بغیر سوچے سمجھے جانچے نہیں خریدتا تھا کجا کہ میں کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر بیاہ رچا لیتا۔

''عائد میرے بچے......'' مجھے پتا تھا جب

سارے ہتھیار بیکار ٹھہریں گے تو اماں اسی ہتھیار کو آزمائیں گی جسے سب ایموشنل بلیک میلنگ کہتے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں روتی ہوئی عورت پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے مگر یہی روتی ہوئی عورت آپ کی ماں ہو تو پھر آپ کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کے بارے میں سارے سیانے چپ ہیں۔

''اماں پلیز......!'' میں بہت بے بس سا تھا۔

''میرا اچھا بیٹا ہے ناں عائد......'' اب وہ منتوں پر اتر آئی تھیں۔ میں تھوڑا اور بے بس ہوا جس عورت نے مجھے جنم دیا تھا کم از کم اس کے سامنے میں بے حد بے بس ہو جاتا تھا۔ اماں سے بحث کرنا میرے لیے کٹھن مرحلہ ثابت ہوتا۔ اسکول سے لے کر کالج، یونیورسٹی اور پھر اب اپنی شادی تک باقی سب کو تو میں اینٹ کا جواب پتھر سے بھی دے دیتا تھا مگر جتنی محبت میں پری سے کرتا تھا اتنی ہی محبت میں اماں سے بھی کرتا تھا۔ پری کی محبت تو سات سال سے میری دل میں براجمان تھی مگر اماں سے میں پچھلے چھبیس سال سے محبت کر رہا تھا۔ اگر یوں کہا جاتا تو شاید غلط نہ ہوتا کہ اماں اور پری بیک وقت دونوں میری کمزوری تھیں، میں بچپن سے ہی بڑا تخریب کار واقع ہوا ہوں، میں معاف نہیں کرتا یا پھر شاید یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ میں چاہ کر بھی معاف نہیں کر پاتا اور اگر میں معاف بھی کر دیتا تو پھر میں تاعمر کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ میں بچپن سے ہی اپنا بدلہ پورا کرتا تھا۔ کبھی چھوڑتا نہیں تھا۔ ناک میں دم کرنے میں تو میں ماہر تھا۔

''تمہیں پتا ہے ناں عروٰی کا، بچے تم بات مان لو میری، تمہیں پتا تو ہے وہ کتنی ضدی ہے اور اپنی ضد منوانے کے لیے وہ کسی بھی حد کو پار کر لیتی ہے، یہ تو تم اچھے سے جانتے ہو۔'' پتا نہیں اماں اس کی ضد پر مجبور تھیں، لاچار تھیں یا مجھے لاچار کرنا چاہتی تھیں۔

''اماں! بچپن سے ہر ضد پوری کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ اب لوگوں کی زندگیوں کے فیصلے بھی اپنے ہاتھوں میں لے لو۔'' میرے لہجے میں تلخی نمایاں تھی۔

موسم ایک دم ہی بہت حبس بھر ہوگیا تھا۔ آسمان بے حد گدلا لگنے لگا تھا۔ زرد اور مٹیالا یا پھر مجھے لگ رہا تھا...... خدا معلوم...... میں نے گہری سانس بھری ...... اماں میری باتوں سے قائل نہیں ہوئی تھیں۔

''اماں میں اس موضوع پر اور کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا، یہ عروٰی کی ضد ہوگی مگر میری زندگی کا معاملہ ہے میں پری سے کبھی دستبردار نہیں ہو سکتا۔'' میں دوٹوک انداز میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میری تلخی سے اماں کے چہرے کا رنگ گویا اُڑ سا گیا۔ وہ جیسے بیٹے اور بیٹی کے درمیان پس سی رہی تھیں مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ بات اگر جنگ کی تھی تو پھر جنگ ہی سہی۔

☆☆☆

''عائد تم کہاں ہو؟'' پری کے لہجے سے اس کی پریشانی عیاں تھی۔ میں واقعی بہت دنوں سے صرف اسے ہی نظر انداز کر رہا تھا اور میرے نظر انداز کرنے کی وجہ صرف یہی تھی کہ میرے لہجے سے میری پریشانی بھانپ لینے والی پری یونہی پریشان ہو جائے گی۔

''میں یہیں ہوں پری! ہمیشہ تمہارے پاس۔'' میرے لہجے میں، میری آواز میں بے پناہ محبت تھی۔ جو صرف پری کے لیے مخصوص تھی۔ میں تو شاید اب بھی اس سے کنی کتراتا رہتا مگر اس کے میسج کی وجہ سے پریشان ہو کر آنا ہی پڑا تھا۔ ہم اس وقت چائے خانے میں بیٹھے تھے جو پری کی سب سے زیادہ پسندیدہ جگہ تھی اور وہ اکثر یہیں ملنے کی خواہش کرتی تھی۔ جب بھی رنجیدہ ہوتی، غصہ ہوتی یا پھر بہت خوش ہمیشہ یہیں آتی تھی۔ اس وقت شام کے سات بج رہے تھے اور وہ اپنی اکیڈمی سے سیدھی اِدھر ہی آ گئی تھی۔

''مجھے پتا ہے عائد تم ہمیشہ میرے ساتھ ہو مگر محبت بھی سند مانگتی ہے، کسی رشتے کی معتبر سند...... ہمیں یونیورسٹی سے نکلے چار سال ہوگئے ہیں، میرا ایم فل مکمل ہوگیا ہے۔ تم اپنا فیملی بزنس سنبھال رہے ہو، اب جلد ہی میرے CSS کے پیپرز بھی ہو جائیں گے۔

اب مجھے اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا؟'' وہ بھی شاید لوگوں کے سوالوں کے جواب دے، دے کر تنگ گئی تھی۔ اس کے انداز میں غصہ نمایاں تھا۔ ہم کونے کے صوفے پر براجمان تھے اس لیے شاید ہی کوئی متوجہ تھا۔

''یہ ساری باتیں مجھے پتا ہیں پری!'' میں ایک لمحے کے لیے اکتا سا گیا۔ ہر طرف ایک محاذ سا کھلا تھا۔

''مجھے لگا تم بھول گئے ہو۔'' میرے اس طرح بولنے پر اس کا چھوٹی سی سرخ وسفید ناک مزید سرخ ہوگئی۔ کچھ شاید سردی سے اور کچھ میری باتوں سے۔

''مجھ سے اب تم تب ہی بات کرنا جب تم اپنی اماں کو منا کر میرے گھر لے آؤ بلکہ اماں کو نہیں عروئی کو کیونکہ سارے چھوٹے' بڑے فیصلے تو وہی لیتی ہے ناں۔'' وہ بہت طنزیہ انداز میں گویا ہوئی۔

وہ اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بیگ کندھے پر اور مجھے کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر یہ جا وہ جا۔

''یار......'' میں پھر سے سر تھام کر بیٹھ گیا تھا۔

اتنے سارے دن پری سے دور میں اس لیے رہا تھا کہ میں اسے ناراض کر سکتا تھا اور نہ ہی پریشان دیکھ سکتا تھا۔ فرار ہمیشہ اس کی شدید پریشانی کا مظہر ہوتا تھا۔ وہ جب بھی بے حد پریشان ہوتی منظر سے کچھ بھی کہے سنے بنا بھاگ جاتی اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں کسی بھی منطقی انجام تک پہنچنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے گاڑی گھر کی طرف موڑ لی تھی۔ آج ابا بھی آگئے ہوں گے انگلینڈ سے۔ شاید وہی میرے لیے کچھ کر سکیں۔ میں حویلی آتے ہی اماں، ابا کے سر پر پہنچ گیا تھا۔

''میرا فیصلہ کیوں نہیں کرتے؟'' بیزاری اور تلخی سے میں بولا۔

''کیسا فیصلہ عائد......؟'' ابا حسب عادت اپنی راکنگ چیئر پر بیٹھے پڑھنے میں مگن تھے۔ میرے اس طرح بولنے پر چونک اٹھے تھے۔ انہیں خوب خبر تھی اس معاملے کی جو وہ لٹکا کر گئے تھے مگر اب جانے کیوں انجان سے بن رہے تھے۔

''میری اور پری کی شادی کا فیصلہ......آپ لوگ کب ان کے گھر جا رہے ہیں؟'' میں نے بھی بلی تھیلے سے ایک ہی بار نکال باہر کی۔

''اچھا! ہم ان کے گھر جا رہے تھے؟'' ابا کا انداز مزاحیہ سا تھا۔ میں نے شاید ہی انہیں کبھی سنجیدہ دیکھا ہو۔ یا پھر شاید یوں کہہ لیجیے کہ ابا کبھی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتے تھے۔

''عروئی نہیں مان رہی ناں......'' اماں کا لہجہ دھیما تھا کیونکہ وہ شروع سے جانتی تھیں کہ ان کے شوہر نامدار کسی بھی چیز کو بے جا سر چڑھانے کے خلاف تھے۔

''دیکھو عائد...... بے جا لاڈ پیار، ہر فرمائش پوری کرنا غلط نہیں ہے مگر جب یہ سب حد سے بڑھ جاتا ہے تو بیماری کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کسی بھی بیماری کو جب ہم لاعلاج چھوڑ دیتے ہیں تو وہ ناسور بن جاتی ہے اور جو حصہ بھی جسم کا ناسور بن جاتا ہے اسے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔'' وہ اب بے حد سنجیدہ تھے، میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ ان کے کہنے کا آخر مطلب کیا تھا۔ وہ اعتدال پسند تھے مگر ہم نے خود عروئی کو بگاڑ دیا تھا۔ وہ ہمیشہ ٹوکتے تھے مگر ہم نظر انداز کر جاتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ وہ عروئی سے محبت نہیں کرتے تھے شاید وہ ہم سب سے زیادہ پیار کرتے تھے' وہ اعتدال پسند تھے۔

''میں نے تب بھی ٹوکا تھا جب وہ اوور لیول کر رہی تھی اور تم سب نے ارحم کی شادی کے سارے فیصلے اسے تھما دیے تھے۔'' ارحم میرے بڑے بھائی کا نام تھا۔ میں بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا اور عروئی ہم چاروں بھائیوں کی سب سے چھوٹی بہن...... ارحم، ارقم اور احمد کی شادی کے سارے فیصلے لڑکی دیکھنے سے لے کر کھانے اور پھر دینے، دلانے تک سب کام اماں، عروئی کے مشورے سے ہی کرتی تھیں۔ شاید ان کی کوئی بہن ہی نہیں تھی۔ اس لیے وہ اپنے بہنوں والے

سارے ارمان بھی اسی پر پورے کرتی تھیں۔

''اب اس مسئلے کا حل کیا نکل سکتا ہے؟'' میں بھی لاچار تھا۔

''میں بے بس ہوں، اپنے بھائیوں سے مشورہ کرو یا پھر ناسور کو کاٹ کر پھینک دو۔'' انہوں نے چشمہ پھر سے آنکھوں پر چڑھا لیا تھا۔

''اللہ نہ کرے......'' اماں نے تڑپ کر کہا تھا گویا وہ بھی سمجھتی تھیں اور کہیں نہ کہیں مانتی بھی تھیں کہ عروئی اب ایک ناسور کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

''پتھر دل، کٹھور......'' میں دل ہی دل میں نہ جانے کتنے القابات سے اب سب کو نوازتے ہوئے باہر نکل آیا تھا۔ نیا کسی طور پار لگ ہی نہیں رہی تھی۔

☆☆☆

بڑے دنوں کی سرد جنگ اور طویل جدوجہد کے بعد پتا نہیں کیسے اماں نے عروئی کو راضی کر ہی لیا تھا کہ وہ ایک نظر پری کو دیکھ آئے۔ میں بے تحاشا خوش تھا، میں نے فوراً پری کو ٹیکسٹ کیا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ بھی بہت زیادہ خوش ہوگی۔ مجھ سے میری خوشی سنبھالی نہیں جا رہی تھی، نہ چھپائی جا رہی تھی مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ اس بساط پر شہ عروئی کی تھی مگر مات مجھے ہونا تھی۔ میں جسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سمجھ رہا تھا' وہ میرے لیے زندگی کا سب سے بڑا دکھ ثابت ہوا۔ جانے عروئی نے پری کے گھر جا کر کیا تماشا کھڑا کیا تھا کہ پری نے ان کے آتے ہی مجھے فون کیا تھا۔

''اگر انکار ہی کرنا تھا تو تم خود ہی کر دیتے عائد یوں اپنی بہن کے ہاتھوں ذلیل کروانا کیا ضروری تھا؟'' مجھے اس کا لہجہ بے حد بھیگا، بھیگا محسوس ہوا تھا۔

''پری تم رو رہی ہو؟''

''روؤں نہ تو اور کیا کروں اپنی قسمت پر۔'' وہ تڑپ کر بولی۔

میری زندگی کی دو محبوب ترین عورتیں اماں اور پری، میں جو کبھی کسی کی غلطی نہیں معاف کر سکتا تھا مجھے لگتا تھا یہ دونوں کبھی کچھ غلط کر ہی نہیں سکتیں۔ شاید

غزلیں

شبِ الفت کو محبت کی سزا دیتے ہیں
ایسا کرتے ہیں اب ہم اس کو بھلا دیتے ہیں

مانگ کر دیکھتے ہیں ان کی وفا اور جفا
اور انہیں دیکھیے وہ ہمیں کیا دیتے ہیں

آپ رہیں تو بزم میں کچھ احساس ہوگا
محفلِ دل کو تو ہم اور سجا دیتے ہیں

لاکھ کرلیں وہ جفا ظلم کے نشتر بھی چبھا
ہم تو عادی ہیں جو بدلے میں وفا دیتے ہیں

کون سنتا ہے یہاں درد کے قصے اے دل
اپنے ہی سائے کو غم دل کے سنا دیتے ہیں

کاوش: فہمیدہ غوری، گلشن اقبال، کراچی

☆☆☆

بجھتے ہوئے چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
کچھ کچھ سحر کے رنگ پُر افشاں ہوئے تو ہیں

وابستہ جن سے لطف و محبت کی آس تھی
چہرے وہ آج ہم پہ مہرباں ہوئے تو ہیں

کل تک چمن میں خاک سی اڑتی تھی ہر طرف
آج اس روش، روش پہ چراغاں ہوئے تو ہیں

اب کے نہ جانے جشنِ بہاراں ہو کس طرح
زخم جگر ہمارے نمایاں ہوئے تو ہیں

ہم کو غم و الم نے ہی جینا سکھا دیا
کوکب ہماری زیست پہ احساں ہوئے تو ہیں

شاعرہ: ثمینہ کوکب، جہلم

محبوب اسی کو کہتے ہوں گے جس کے غلط کو بھی ہم غلط نہیں کہہ پاتے جس کا غلط بھی ہمیں صحیح لگتا ہے، پری نے غصے سے فون بند کردیا تھا۔ میں اماں سے کچھ نہیں کہہ پایا تھا۔ وہ تو اس سارے کھیل میں مہرہ تھیں مگر اس دن مجھے اپنی اکلوتی پیاری بہن سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔ بے پایاں نفرت...... جتنا مجھے اس سے پیار تھا اس پیار سے کہیں بڑھ کر نفرت......

میں چپ کر گیا تھا۔ بالکل چپ، ایک موت سی خاموشی میرے وجود میں در آئی تھی۔

''پری تم مجھ سے کورٹ میرج کرلو۔'' میں تھک گیا تھا خود سے لڑکر۔

''عائد تم پاگل ہوگئے ہو؟'' وہ چیخ اٹھی۔

''تمہاری بہن نے مجھے کہا کہ میں بڑی عمر کی عورت ہوں ٹھیک ہے میں بیس سال کی نہیں ہوں لیکن بیس سال سے کہیں زیادہ ایجوکیشن ہے میری۔ میرا CSS کلیئر ہوگیا تو میں سی ایس پی ہوں گی۔ نکاح کا ایک وقت ہوتا ہے عائد اور جس وقت پر وہ لکھا ہوتا ہے وہ ہوجاتا ہے، کسی کا اٹھارہ سال کی عمر میں تو کسی کا اٹھائیس سال کی عمر میں۔''

وہ بول رہی تھی۔ اور میں محض سن رہا تھا۔

''پچھلے چار سال سے میں تمہارا انتظار یہ سننے کے لیے کررہی ہوں میں اپنے اماں، ابا کی اکلوتی بیٹی ہوں' میں ان کا سر محض اپنی خواہش کی وجہ سے نہیں جھکا سکتی ہوں۔'' وہ پھر سے رو رہی تھی۔ میرے دل کو بے تحاشا دکھ نے گھیر لیا۔ وہ عورت جو دنیا میں مجھے سب سے زیادہ عزیز تھی وہ محض میری وجہ سے رو رہی تھی۔

''پلیز عائد...... تم وہی کرو جو تمہاری اماں چاہ رہی ہیں، مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں......'' وہ مجھے کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اسے جانے دیا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اب میرے کہنے سے بھی نہیں رکے گی۔ روکا تو انہیں جاتا ہے جو رکنا چاہتے ہیں مگر وہ جو اپنی مرضی سے آگے بڑھ جائیں ان کا ہم کیا کریں۔

☆☆☆

میں شاید عروئی کا قتل ہی کردیتا اگرچہ میری سوچ یقینی قابلِ مذمت تھی۔ ہم دونوں کی اس لڑائی کی وجہ سے اماں کی شوگر بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ میں ایک عورت کو کھو چکا تھا اب میں دوسری کو کھونے کی ہمت نہیں رکھتا تھا۔ میں اپنے ہی اندر قید ہوکر رہ گیا تھا۔

ایک بے قراری سی میرے وجود میں در آئی تھی۔ مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔

عروئی کی شادی ہوگئی تھی۔ میرے لیے اب وہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہی تھی۔ میری زندگی سے خارج...... میرے رشتوں سے خارج اس نے میرے لاڈ کا بہت ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔ گھر اگرچہ وہ آتی رہتی تھی پر میں اسے معاف نہیں کرسکا تھا۔ لیکن میں اسے ایک سبق ضرور سکھانا چاہتا تھا تبھی اس کی شادی کے تین سال بعد جب اس کا بیٹا دو سال کا تھا جو اس کی کمزوری تھا جس میں اس کی جان بستی تھی جو اس کی ''پری'' تھا۔ میں اسے لے کر وہاں سے بہت دور چلا آیا تھا۔ خدا جانتا تھا بچے کو نقصان پہنچانے کی غرض سے نہیں بلکہ کچھ عرصے کی کسک دینے کے لیے تاکہ وہ میرا دکھ محسوس کرسکتی۔ مجھے بھی اسے وہی شہ اور مات کی بازی دینی تھی جو کبھی اس نے مجھے دی تھی۔

''اب تمہیں احساس ہوگا کہ اپنی محبوب چیز کو کھو کر کیسا لگتا ہے؟'' میں خط لکھا چھوڑ آیا تھا۔ آپ کو شاید میں نے بتایا تھا ناں کہ جب میں معاف کردیتا ہوں تو تعلق توڑ دیتا ہوں۔

جو کسک میری زندگی میں تھی وہی اب عروئی کی زندگی میں بھی رہنی تھی۔ مگر کچھ عرصے کے لیے تاکہ وہ میرا دکھ محسوس کرسکتی۔

ہاں میں کٹھور تھا اتنا ہی جتنا وہ میرے لیے بن گئی تھی۔ مگر میں اس کے جتنا کٹھور اور سنگ دل بن ہی نہیں سکا تھا۔

میں کنز ٰی ظہور...... جسے ہمیشہ جیتنا پسند تھا۔ اب پچھلے اٹھارہ سال سے ہار کے احساس کے ساتھ جی رہی ہوں۔ اس ہار کو برداشت کرتے، کرتے اپنوں سے ہی چھپاتے، چھپاتے اب میرے اعصاب جواب دینے لگے ہیں۔ میں جس نے زندگی میں ہمیشہ اپنی من مانی کی، اب فریاد لے کر کس کے پاس جاؤں اور کس کے کندھے پر سر رکھ کر روؤں کہ یہ سب کچھ میرا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ میں نے اس شادی کے لیے اپنے دادا،

پچھتاوا

نظیر فاطمہ



دادی، ماں، باپ، بہن بھائیوں اور سب سے بڑھ کر دانش عمار (میرا پھپوزاد اور سابقہ منگیتر) کا دل دکھایا۔ اپنی خودسری میں، میں نے ان سب کے دلوں کو اپنے پیروں تلے روند دیا تو پھر میں خوش کیسے رہ سکتی تھی۔ میرے ساتھ یہ ہی ہونا چاہیے تھا۔

میں گھر بھر کی لاڈلی، باپ کی دلاری اور دادا، دادی کی آنکھوں کا تارا تھی۔ ماں سے زیادہ میرے لاڈ دادی نے اٹھائے تھے، اتنی محبتیں تھیں میرے پاس پھر بھی نہ جانے کہاں خلا رہ گیا کہ میں ظہور پرویز کی جھوٹی محبت کے جال میں پھنس گئی۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ میں نے یہ جال خود اپنے اوپر اس طرح لپیٹ لیا کہ اب چاہوں تو رہائی ممکن نہیں۔

میں اپنے گھر میں ایک بہن سے چھوٹی اور ایک بہن اور دو بھائیوں سے بڑی تھی۔ آپی انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کر کے شہر کے مشہور انگلش میڈیم اسکول میں پڑھا رہی تھیں۔ میں ماسٹرز کے فائنل ایئر میں تھی۔ میری چھوٹی بہن بی اے، بھائی ایف ایس سی اور سب سے چھوٹا میٹرک میں تھا۔ امی ایک سرکاری اسکول میں استانی تھیں اور ابو کا اپنا کاروبار تھا۔ دادا نے ایک چھوٹا سا اسکول بنا رکھا تھا جہاں وہ اپنے اصولوں کے مطابق بچوں کو تعلیم دیتے تھے۔ ان کا یہ اسکول علاقے میں کافی مشہور تھا اور اچھا خاصا چل رہا تھا۔ گھر میں روپے پیسے کی کوئی کمی تھی اور نہ ہی محبتوں کی۔ پھر میں نے یہ حرکت کیوں کی؟ شاید اپنی آپی کی ضد میں...... پتا نہیں کیوں میں دل ہی دل میں اپنی آپی سے جیلس تھی۔ وہ بہت ذہین اور خوب صورت تھیں جہاں جاتیں چھا سی جاتیں۔ خوب صورتی اور ذہانت میں تو میں بھی ان سے کم نہیں تھی پھر بھی نہ جانے کیوں میں ہر بات میں ان سے مقابلہ کرتی تھی۔

☆☆☆

آپی کو اسکول میں جاب کرتے ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا کہ ان کی شادی ہوگئی۔ آپی پریگننٹ ہوئیں تو ان کو کچھ مسائل ہوگئے۔ چھٹے مہینے کے بعد ڈاکٹر نے سختی سے بیڈ ریسٹ کی ہدایت کی۔ آپی اسکول کی نوکری چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں اور اسکول مینجمنٹ اتنی لمبی چھٹی دینے کو تیار نہیں تھی سو طے یہ پایا کہ آپی اپنی جگہ کسی ٹیچر کا انتظام کردیں جو اُن کی جگہ پڑھا سکے تو انہیں چھٹی مل سکتی ہے۔ میں پڑھائی سے فارغ ہوچکی تھی اور اب دادا کے ساتھ اسکول چلی جاتی تھی۔ آپی نے دادا سے بات کی تو ان کے مشورے پر میں نے آپی کی جگہ اسکول جانا شروع کردیا۔ یہاں سب کا رویہ بہت اچھا اور پروفیشنل تھا سو میں جلد ہی ایڈجسٹ ہوگئی۔

مجھے اسکول جاتے ہوئے مہینہ ڈیڑھ ہی ہوا تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ اسکول کے اسپورٹس ٹیچر ظہور آتے جاتے مجھے مسکرا کر دیکھتے ہیں۔ آہستہ، آہستہ بات دعا سلام تک پہنچی، پھر ہم بریک میں ایک دوسرے سے بات چیت کرنے لگے اور پھر ایک روز اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر you will marry me کہہ دیا۔ مجھے اسی وقت اس کا ہاتھ فوراً جھٹک دینا چاہیے تھا کیونکہ میں ایک منگنی شدہ لڑکی تھی، جی میری منگنی میرے پھوپی زاد دانش عمار کی خواہش پر اس سے ہوچکی تھی۔ بقول پھپو وہ مجھے بہت پسند کرتا ہے۔ البتہ اس کے بارے میں میرے خیالات بس ٹھیک ہی تھے۔ نہ تو میں اسے ناپسند کرتی تھی اور نہ ہی اس سے شدید قسم کی محبت کرتی تھی۔ پھپو نے دستِ سوال دراز کیا اور دادا، دادی نے امی، ابو کے مشورے کے بعد انہیں ہاں کردی اور میرے ہاتھ میں دانش عمار کے نام کی انگوٹھی پہنادی گئی تھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر ظہور نے اپنا سوال دُہرایا تو میں وہاں سے اٹھ گئی۔

☆☆☆

''آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' دو روز بعد چھٹی کے وقت اس نے مجھ سے سوال کیا کہ دو روز سے میں نے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کی تھی۔

''آپ کو ایسی بات نہیں کرنی چاہیے تھی میں انگیجڈ (منگنی شدہ) ہوں۔''

''مگر میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔'' اس نے پست آواز میں کہا۔

مجھے اسے ڈانٹنا چاہیے تھا مگر نہ جانے مجھے کیا ہوا کہ اس کے اقرارِ محبت نے ایک دم مجھے بہت خاص ہونے کا احساس دلایا اور میں خاموشی سے اسکول کا گیٹ پار کرگئی۔ باہر دانش عمار مجھے لینے کے لیے آیا ہوا تھا، میں بائیک پر بیٹھ کر اس کے ساتھ چلی گئی۔ وہ اتنا کیئرنگ تھا کہ اس کو بس یا وین سے میرا اسکول جانا پسند نہیں تھا۔ صبح، ابو مجھے چھوڑ دیتے تھے اور واپسی پر وہ مجھے گھر ڈراپ کردیتا تھا اُس کا دفتر اسکول کے قریب ہی تھا اور وہ اپنی لنچ بریک میں یہ کام کرتا تھا تاکہ مجھے واپسی پر پبلک کنوینس میں خوار نہ ہونا پڑے۔

پھر ظہور ہر روز اپنی محبت کا راگ الاپنے لگا اور میں دھیرے، دھیرے اس سے متاثر ہونے لگی۔ مجھے تو پہلی بار بھی اس کا اظہار برا نہیں لگا تھا۔ تبھی کوئی سخت رد عمل نہیں دیا تھا۔ اس کے مسلسل اظہار سے میں جیسے پگھل کر بہہ گئی۔

''ظہور! میری منگنی ہوچکی ہے۔'' میں نے کمزور سا احتجاج کیا۔

''مجھے بتاؤ تم مجھے پسند کرتی ہو یا نہیں؟'' اس نے سوال کیا۔

''کرتی ہوں مگر میں اپنے گھر والوں کے خلاف نہیں جاسکتی۔'' میرا لہجہ حتمی تھا۔

''اچھا بتاؤ تم دانش کو پسند کرتی ہو؟'' مجھے اس سوال کا کوئی جواب نہیں سوجھا۔

میری خاموشی نے اسے حوصلہ دیا۔

''دیکھو تمہیں اس شخص سے شادی کرنی چاہیے تم پسند کرتی ہو نہ کہ اس سے جسے تم ناپسند کرتی ہو۔''

''اب سوچتی ہوں ظہور نے مجھے بہت غلط مشورہ دیا اصل میں شادی اس سے کرنی چاہیے جو آپ کو پسند کرتا ہو، وہی شخص آپ کو پورے مان، سمان سے رکھ سکتا ہے۔''

''ناپسندیدہ لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا بہت مشکل ہوتا ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا اور میں اس کی بات سے سو فی صد متفق ہوگئی کہ ناپسندیدہ شخص کے ساتھ زندگی گزارنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ مگر میں دانش عمار کو ناپسند تو کبھی نہیں کرتی تھی۔

''تم دانش کو منع کردو، وہ تمہیں لینے نہ آیا کرے۔ میں تمہیں چھوڑ دیا کروں گا۔'' وہ ہر روز مجھے ہدایت کرتا۔

''تم دانش سے صاف، صاف بات کر کے اس منگنی کو ختم کرو تاکہ میں اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیجوں۔'' وہ ہر روز اپنی بات دُہراتا، اسی تکرار میں آپی کی چھٹی ختم ہوگئی اور انہوں نے اسکول جوائن کرلیا تو میرے اور ظہور کے بارے میں باتیں ان تک بھی پہنچیں تو وہ پریشان ہوگئیں۔ جس دن آپی نے دوبارہ اسکول جوائن کیا اسی دن میرا چھوٹا سا فیئر ویل تھا سو میں بھی وہیں موجود تھی۔ ظہور مجھ سے ملنے کا راستہ بند ہوجانے پر پریشان تھا۔ چھٹی کے وقت ہم دونوں باتیں کررہے تھے جب آپی وہاں چلی آئیں۔ آپی کو دیکھ کر وہ مؤدب ہوگیا۔

''چلو کنزیٰ گھر چلیں۔'' آپی میرا ہاتھ تھام کر اسکول سے باہر لے آئیں۔

☆☆☆

''کنزیٰ یہ تم کن چکروں میں پڑگئی ہو؟ تم جانتی ہوناں کہ دانش تم سے کتنا پیار کرتا ہے۔'' آپی چھلے کے بعد میکے آئی ہوئی تھیں سو دوپہر کے کھانے کے بعد میرے کمرے میں چلی آئیں۔

''مگر میں تو اسے پسند نہیں کرتی پھر؟'' میں... بدلحاظ ہوگئی۔ آپی میرے انداز پر یک لخت خاموش ہوگئیں۔ شاید وہ جان گئی تھیں کہ پانی سر سے اونچا ہوچکا ہے۔

''دیکھو کنزیٰ وہ ٹھیک آدمی نہیں ہے......'' آپی نے میرا ہاتھ تھام کر بات شروع کرنا چاہی مگر میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

''ہاں، دنیا میں ایک آپ ٹھیک ہیں اور دوسرے آپ کے میاں... باقی دنیا تو لوفروں سے بھری پڑی

ہے۔'' آپی روہانسی ہوگئیں مگر انہوں نے ہمت نہیں ہاری۔

''ظہور اور میں نے آگے پیچھے اسکول جوائن کیا تھا۔ پہلے اس نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے صاف اور واضح الفاظ میں ٹوک دیا اور اب وہ تمہیں......''

''بس کردیں آپی، بس کردیں۔ اول تو میں آپ کی اس بات پر یقین نہیں کرتی اور اگر ایسا ہے بھی تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے ظہور سے جدائی (ظاہر ہے اب ہر روز ملنا ممکن جو نہیں رہا تھا) کے احساس کو شاید زیادہ ہی سر پر سوار کرلیا تھا جو اتنی بدلحاظی دکھا رہی تھی۔

''کنزیٰ جو بھی قدم اٹھانا سوچ سمجھ کر اٹھانا۔'' آپی مجھ پر کوئی اثر ہوتے نہ دیکھ کر اٹھ گئیں۔

''میں دودھ پیتی بچی نہیں ہوں۔ جو کروں گی سوچ سمجھ کر کروں گی۔ آپ اس معاملے میں خاموش رہیے گا۔'' میں آپی کے ساتھ بہت ہی روڈ ہوگئی تھی۔

☆☆☆

میں دادا کے اسکول کے کاموں کے بہانے سے ظہور سے ملنے لگی۔ ایک روز دانش نے مجھے اور ظہور کو ایک ریسٹورنٹ میں دیکھ لیا۔ شام کو گھر آکر اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے رونا دھونا مچایا کہ یہ مجھ پر الزام لگا رہا ہے۔ وہ بیچارہ خود کو مجرم سمجھنے لگا۔ آپی کو معلوم ہوا تو انہوں نے ساری بات دادا کو بتادی۔

''کنزیٰ! تمہاری پھپو شادی کی تاریخ مانگ رہی ہیں۔'' چند روز بعد دادا میرے پاس آئے۔

''دادا اگر میں کہوں کہ مجھے دانش سے شادی نہیں کرنی تو......؟'' میں نے بے حیائی سے اپنی آنکھیں دادا پر ٹکادیں۔

''مجھے معلوم ہے میری بیٹی ایسا کبھی نہیں کرسکتی، دادا کو تنگ کررہی ہو ناں......'' انہوں نے لاڈ سے اپنی چھڑی میرے بازو میں ہلکے سے چبھوئی مگر میرے اندر ایک شخص کی چاہ نے اتنی ہلچل مچائی ہوئی تھی کہ میں اپنے گھر والوں کی چاہت کو نظر انداز کرگئی۔

''دادا مجھے معاف کردیں مگر دانش سے شادی میں نہیں کروں گی، میں ظہور سے......'' میری زبان لڑکھڑا گئی۔

''بس!'' دادا غصے سے ہاتھ اٹھا کر دہاڑے۔

''تم ہماری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہو...... میں دیکھتا ہوں تم دانش سے شادی کیسے نہیں کرتیں۔''

''تو پھر آپ خود کو یہ سب دیکھنے کے لیے تیار کرلیں۔'' میں لمحوں میں بے خوف ہوگئی اور دادا حیرت اور دکھ کی زیادتی سے گنگ...... پھر سب نے اپنی سی کرلی مگر میرا انکار، انکار ہی رہا۔ سب سے آخر میں ابو میرے پاس آئے۔

''بیٹا، میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے، مجھے خاندان میں رسوا مت کرو، میں نہیں سہہ سکوں گا کہ لوگ کہیں کہ عبدالرشید کی بیٹی نے پسند کی شادی کرنے کے لیے منگنی توڑ ڈالی۔'' انہوں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ امی بھی ان کے پیچھے کھڑی تھیں۔ انہوں نے مجھے خونخوار نظروں سے دیکھا اور ابو کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کو خاموش تسلی دی۔

''آپ جو بھی کہیں مگر میں آپ کا دیا ہوا یہ طوق ساری زندگی کے لیے اپنے گلے میں نہیں پہن سکتی۔'' میں نے بدلحاظی کی انتہا کرتے ہوئے انگوٹھی اتار کر ان کے سامنے پھینک دی۔ پتا نہیں میں اتنی ظالم کیسے ہوگئی تھی۔ میں جو کسی جانور کو تکلیف میں دیکھ کر تڑپ جاتی تھی، میں نے اپنے باپ کو اتنی تکلیف پہنچائی کہ ان کی روح کو زخمی کردیا اور مجھے اس کا احساس تک نہیں ہوا۔ روح زخمی ہوجائے تو انسان ڈھے جاتا ہے۔ میرے ابو بھی روح پر لگنے والے اس زخم سے ایسے گرے کہ پھر کبھی اٹھ نہ سکے۔ ہارٹ اٹیک نے انہیں اسپتال تک جانے کی مہلت بھی نہیں دی۔ ان کی موت سے میرے اندر شرمندگی کا ہلکا سا احساس جاگا۔ میں دنوں اپنے ابو کو روتی رہی، کسی نے مجھ سے ہمدردی نہ کی کہ یہ سب میری ہٹ دھرمی کی وجہ ہی ہوا تھا۔ مگر ابو کے چالیسویں کے بعد ظہور سے ہونے والی ملاقات نے جیسے میرے

سارے غم دھو دیے جب اس نے بتایا کہ وہ جلد ہی اپنے گھر والوں کو میرے گھر بھیجے گا۔ میں نے اسے تھوڑا انتظار کرنے کو کہا تاکہ ابو کی موت کو تھوڑا وقت گزر جائے۔ میں ظہور سے مل کر چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ گھر آئی تو دانش کو اپنے انتظار میں پایا۔

''کنزیٰ تم میری......''

''پلیز دانش! میں کوئی بات نہیں سننا چاہتی، تم کیسے انسان ہو؟ تم میں کوئی سیلف ریسپیکٹ ہے یا نہیں؟ میں نے کتنی دفعہ انکار کیا ہے اور تم پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔ جاؤ پلیز، جان چھوڑو میری۔'' میری بدلحاظی عود کر آئی۔ دانش کی بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اس نے جاتے، جاتے پلٹ کر مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔

''میں دعا کروں گا کہ زندگی میں کبھی تمہیں خالص محبت کے لیے ترسنا نہ پڑے۔'' میں نے نخوت سے سر جھٹک دیا۔ دانش چلا گیا اور مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ میں ہیرا کھو کر کوئلہ جھولی میں ڈالنے جا رہی ہوں کہ جو جلتا ہوا ہو تو دامن جلا دیتا ہے اور بجھا ہوا تو دامن سیاہ کردیتا ہے۔

☆☆☆

دانش سے میرا رشتہ ختم ہوگیا۔ اب میں کھل کر ظہور سے ملنے لگی۔ گھر میں سب نے مجھ سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ ابو کی موت کے تقریباً چھ ماہ بعد ظہور نے اپنی امی، بھائی اور بھابی کو رشتے کے لیے ہمارے گھر بھیجا۔ مجھے چونکہ معلوم تھا، میں نک سک سے تیار تھی۔ یہ لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے مگر کسی نے ان کو پانی تک پوچھنے کی زحمت نہیں کی۔ اس روز میرے ماموں اسلام آباد سے ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے۔ انہیں مہمانوں کے آنے کا پتا چلا تو وہ جا کر ان سے ملے۔ شاید امی نے انہیں ساری بات بتادی تھی۔ مجھے اس بات پر شدید غصہ تھا کہ کسی نے ان سے سیدھے منہ بات کیوں نہیں کی۔

''کنزیٰ! بیٹا مہمانوں کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرو۔'' ماموں کی ہدایت پر میں چلا اٹھی۔

''کیوں؟ آج سے پہلے آنے والے مہمانوں کے چائے پانی کا انتظام میں کرتی تھی؟ مہمانوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک ہمارے خاندان کی روایت کب سے ہوگئی؟'' ماموں میرے ردِعمل پر میرے قریب آئے۔

''کنزیٰ! یہ مہمان صرف تمہارے ہیں، اس لیے آج سارا انتظام تمہیں خود کرنا ہے۔'' انہوں نے میرے کندھوں پر دباؤ ڈال کر عجیب سے لہجے میں کہا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی سے کچن کی طرف چلی گئی۔

جب میں چائے اور دیگر لوازمات کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی تو دادا، دادی اور ماموں ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے شکر ادا کیا۔

''دیکھیے چچا جان! آپ لوگ کنزیٰ پر دباؤ مت ڈالیں۔ اگر وہ سب کے سمجھانے پر بھی نہیں مانی تو اس کی خواہش پوری کردیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جذبات میں آکر آپ لوگوں کی عزت کو پیروں تلے روند کر چلی جائے۔'' ماموں، دادا کو سمجھا رہے تھے، امی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھیں۔

''باجی! آپ پریشان نہ ہوں، مجھ سے جو ہوسکے گا میں کروں گا۔ بس اس معاملے کو جلد از جلد نمٹا دیں۔'' ماموں آرمی میں کرنل تھے۔ معاملات کو بہت آگے تک جا کر دیکھتے تھے۔

میں اپنے گھر والوں کی مجبوری اور اپنی دلی رضامندی سے بیاہ کر ظہور کے ساتھ آگئی۔ پھپو کی فیملی سے صرف پھپو کچھ دیر کے لیے شادی میں شریک ہوئی تھیں۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا میں جنت مل گئی ہو...... مگر میں بھول گئی تھی کہ جنت کی ہواؤں جیسی دعائیں تو میں پیچھے چھوڑ آئی تھی۔

☆☆☆

ظہور کا خاندان ہر لحاظ سے ہمارے خاندان سے کم تھا مگر میں نے اس چیز کو چنداں اہمیت نہیں دی۔ ان کی بڑی بھابی نے مجھے دبے لفظوں میں بتایا کہ ظہور

کا غصہ بہت تیز ہے، خاندان والے اسے اپنی بیٹی دیتے ہوئے ڈرتے تھے۔ میں نے اسے بھی جلن اور حسد سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔

میری شادی کو تقریباً ڈیڑھ سال ہو گیا تھا۔ میری بڑی بیٹی دو تین ماہ کی تھی جب مجھ پر حقیقت کھلی کہ میں کیا کچھ ہار گئی ہوں۔ اس روز ظہور کے ایک دوست آئے ہوئے تھے۔ رات کو ظہور نے مجھ سے کہا کہ میں بیٹی کو لے کر سو جاؤں۔ آج وہ اپنے دوست کے ساتھ دوسرے کمرے میں سوئیں گے۔ رات کو نہ جانے کون سا پہر تھا جب شدید پیاس سے میری آنکھ کھلی۔ میں نے سائڈ ٹیبل پر رکھا جگ اٹھایا تو وہ بھی خالی تھا۔ پیاس کی شدت نے مجھے بستر سے نکل کر کچن تک جانے پر مجبور کر دیا۔

پانی پی کر میں واپس کمرے میں جانے لگی تو ساتھ والے کمرے سے ظہور کا بلند قہقہہ سنائی دیا۔ میں غیر ارادی طور پر رک گئی۔

''ہاں یار، کہہ تو، تو ٹھیک رہا ہے، پسند تو مجھے منزئی ہی آئی تھی مگر اس نے پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دیا۔ الٹا میری بے عزتی کی کہ ہمارے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے اس لیے ایسا مناسب نہیں ہے، ہاں بھئی کہاں وہ مسلم ٹاؤن میں ان کا ایک کنال کا گھر اور کہاں کرشن نگر کا ہمارا یہ آٹھ مرلے کا پرانی طرز کا گھر جس میں میرے دو بھائی بھی شریک ہیں مگر جب میں نے کنزئی کو دیکھا تو وہ مجھے منزئی کا پرتو لگی۔ پھر میں نے سوچا کیوں نہ اس پر کوشش کی جائے۔ میں اندر سے ڈر رہا تھا کہ ہے تو منزئی کی بہن...... اس جیسی ہی ہو گی مگر نہ جی یہ تو بہت آسانی سے میری جھولی میں آن گری اور اپنا بچپن کا رشتہ تک ختم کروا لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بے وقوف مجھ سے اتنی محبت کرتی ہے، میں نے اس کو ورغلا کر اس سے شادی کر کے منزئی سے اپنی...... بے عزتی کا بدلہ لیا ہے بس ہاہاہا...... اس کے ذریعے میں لمبا ہاتھ مارنے کے چکر میں تھا مگر اس کے گھر والوں نے تو اسے خود سے الگ کر کے پھینک دیا ہے۔'' میں ظہور کی باتیں سن کر بے جان ہوتے قدموں سے کمرے تک آئی۔ میرے کانوں میں آپی کی باتیں گونجنے لگیں۔

''وہ ٹھیک آدمی نہیں ہے اس نے پہلے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی۔'' میں غصے سے اٹھی اور بیگ میں اپنا سامان ڈالنے لگی۔ پھر کچھ یاد آنے پر صوفے پر گر کر رونے لگی۔

''کس منہ سے واپس جاؤ گی، بولو کنزئی بیگم...... دادا، دادی کی بات بھول گئی ہو۔''

''آج سے ہمارا تمہارا ہر تعلق ختم...... کبھی واپسی کا خیال بھی آئے تو سمجھنا ہم مر گئے ہیں اور تم اکیلی ہو۔ اس دنیا میں تمہارا سب کچھ صرف ظہور ہے۔'' نکاح کے بعد دادا نے مجھ سے کہا تھا اور دادی نے ان کی تائید کی تھی۔ میں نے اپنے آنسو پونچھے، میں اپنا مان، عزت، محبت سب کچھ ہار گئی تھی۔ مان، عزت اور محبت لٹ جائے تو زندگی کانٹوں بھرے راستے پر برہنہ پا چلنے کے مترادف ہوتی ہے اور اب میں پورے اٹھارہ سال سے اس راستے پر بغیر کسی سہارے کے برہنہ پا چل رہی ہوں۔

کچھ اور وقت گزرا تو مجھ پر کھلا کہ ظہور گھر میں سب سے چھوٹا تھا تو اس پر گھر کی کوئی ذمّے داری نہیں تھی سو اب بھی اس میں احساسِ ذمّے داری نام کو نہ تھی۔ ہماری تین بیٹیاں ہو گئیں تو اس نے مجھ سے کہا کہ بچوں کے اخراجات وہ اکیلے پورا نہیں کر سکتا سو میں نوکری کروں...... میں نے نوکری کر لی مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ جاب میرے گلے میں اس ہڈی کی طرح پھنس جائے گی جسے میں نہ نگل سکوں گی اور نہ اُگل سکوں گی۔ کیونکہ میری اس نوکری کے بعد ظہور گھر اور بچیوں کے اخراجات سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ جب میری تنخواہ کا ایک روپیہ بھی نہ بچتا تب جا کر وہ مجھے چند ہزار پکڑاتا۔ اس کو میرا ذرا احساس نہیں تھا۔ ہر کام، ہر چیز کے لیے مجھے خود بھاگ دوڑ کرنا پڑتی تھی۔ میں نوکری کے ساتھ گھر، بچے اور ہر کام سنبھالتی تو مجھے

کسی کا پھول لہجہ یاد آ جاتا۔

''کنزئی، میں تمہیں زندگی میں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دوں گا۔ تمہیں پھولوں کی طرح سنبھال کر رکھوں گا۔'' میں بے بسی کے احساس سے آنے والے آنسوؤں کو سختی سے پونچھ دیتی۔ ظہور بچیوں کی ہر ذمّے داری سے آزاد تھا۔ اس سب کے دوران جب بھی اپنی ضرورت کے لیے ظہور مجھ سے محبت کا اظہار کرتا تو یہ اظہار میری انا پر طمانچے کی طرح لگتا مگر میں لب سیے سب برداشت کرتی گئی کہ ایسا کرنا میری مجبوری تھا۔

میں خاموش سے خاموش ہوتی گئی اور ظہور مجھے دانش کے حوالے سے طعنے دینے لگا۔ جیسے، جیسے میری خاموشی بڑھتی گئی اس کے طعنوں میں شدت آتی گئی۔ میں پل، پل مرتی رہی، جب تک میری ساس زندہ رہیں پھر بھی کچھ بھرم قائم تھا۔ ان کے فوت ہونے کے بعد ظہور مجھ پر ہاتھ اٹھانے لگا۔ میری بچیاں بڑی ہو رہی تھیں۔ میں چپ چاپ سب برداشت کرتی گئی۔

دادا، دادی کا انتقال ہو گیا تو میری بہنوں نے مجھ سے ملنا شروع کر دیا۔ امی اور دونوں بھائی کینیڈا جا بسے تھے، سب اپنی، اپنی زندگیوں میں مصروف، خوش اور مطمئن تھے۔ صرف میں ہی تھی جو اپنی زندگی میں مصروف تو تھی مگر خوش اور مطمئن ہرگز نہیں تھی۔

☆☆☆

سالوں گزر گئے میری سزا میں کمی نہیں آئی۔ آج میری بڑی بہن کی شادی کی سالگرہ تھی۔ وہاں دانش سے ملاقات ہوئی، میری صحت اور رنگ و روپ پہلے جیسا نہیں رہا تھا مگر دانش بہت نکھرا اور سوبر لگ رہا تھا۔ میری اس سے صرف دعا سلام ہوئی پھر وہ آپی کے شوہر کے ساتھ باتوں میں لگ گیا۔ میں آپی کے پاس آئی تو وہاں دانش کی بیوی بھی تھی بہت فریش اور مطمئن......

آپی کی زبانی مجھے پتا چلتا رہتا تھا کہ وہ اپنی فیملی کی کتنی پروا کرتا ہے۔ جب، جب میں یہ سنتی تب، تب میرا احساسِ زیاں اور پچھتاوا اور بڑھ جاتا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے پھولوں کا پورا ٹوکرا رکھا ہوتا ہے مگر ہم صرف ایک پھول کی ضد لگا کر بیٹھ جاتے ہیں، میں نے بھی پھولوں کے ٹوکرے کو ٹھکرا کر ایک ایسے کانٹوں بھرے پھول کی ضد کی تھی جس نے مجھے پور، پور زخمی کر دیا۔

شاید ظہور نے دانش سے دعا سلام کرتے دیکھ لیا تھا، اسی لیے گھر آتے ہی مجھے اس کے حوالے سے طعنے دینے لگا۔ آج میرا ضبط جواب دے گیا۔

''ہاں! تم سے شادی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے جسے میں چاہ کر بھی ٹھیک نہیں کر سکتی۔'' میرا اتنا کہنا تھا کہ ظہور مجھ پر پل پڑا۔ میری بیٹی نے اسے روکنے کی کوشش کی تو ظہور نے اسے مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر وہ بھی اسی کا خون تھی۔ اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''مجھے ماما مت سمجھیے گا جو آپ سے مار کھا لیتی ہیں، آپ نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو نتائج کے ذمّے دار آپ خود ہوں گے۔'' اس کا لہجہ بہت ہی کٹیلا تھا۔ اس نے نفرت سے باپ کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ظہور چیزوں کو ٹھوکریں مارتا گھر سے نکل گیا۔ میں حیرت سے اپنی بیٹی کا چہرہ تکتی رہی کہ اس میں اتنی عقل، اتنی پرکھ کہاں سے آئی۔ شاید اس نے اپنی ماں کی زندگی سے سبق سیکھا تھا۔

اب جا کر میں سوچتی ہوں کہ لڑکیاں کتنی بے وقوف ہوتی ہیں کہ اپنے گھر والوں کی خالص محبتیں چھوڑ کر سراب کے پیچھے بھاگنے لگتی ہیں۔ بھاگتے، بھاگتے جب ٹھوکر لگتی ہے تو اِدھر اُدھر دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ تپتے صحرا میں بالکل اکیلی رہ گئی ہیں۔ سچ ہے سگے رشتے ہی آپ کے اصل خیر خواہ ہوتے ہیں، ان سگے اور خالص رشتوں کو ٹھوکر پر رکھ کر جوڑے جانے والے نئے رشتے صرف اور صرف پچھتاوا دیتے ہیں اور کچھ نہیں جیسے آج میری جھولی میں محرومیوں اور پچھتاوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔



عورت کہانی: پیاری

ایک عام تاثر یہی ہے کہ عورت ایک کمزور اور کم تر ہستی ہے . . . مگر یہی کمزور اور کم تر ہستی صنفِ مخالف پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتی اور وقت پڑنے پر چٹان جیسی مضبوطی بھی دکھاتی ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے شروع ہونے والے اس نئے سلسلے عورت کہانی میں ہماری معروف قلم کار فرحین اظفر نے یہی بتانے کی کوشش کی ہے۔

جداگانہ موضوعات لیے کہانیوں کا نیا سلسلہ آپ جیسے باذوق قارئین کی نذر

دن کے دس بجے یعنی صبح دس بجے بجیلہ عرف بجو، میاں، بچوں اور ان سے متعلق تمام جملہ کاموں جیسے آفس اور اسکول کی تیاری، ناشتا اور اس کے بعد کے سارے پھیلاوے کو سمیٹ کر ابھی، ابھی فرصت پا کر بیٹھی تھی بلکہ بیٹھی بھی کہاں تھی بس، یونہی ذرا گھڑی دو گھڑی کمر ٹکا کر گھونٹ، گھونٹ چائے کے ساتھ گزری رات کا امرت حلق سے اتار رہی تھی۔

چائے کی مٹھاس ایک تلخی لے کر اندر اتری اور سینے



ں کہیں اٹک گئی۔ رات اس کا گھر والا بڑے موڈ میں تھا۔ ہا اس کے ریشمی بالوں کو سہلا، سہلا کر بکھیر ڈالتا تھا۔

''میں بہت تھک چکی ہوں۔'' اس نے راج کے دو پر بڑی ادا سے اپنا سر رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے گویا سرخ بتی جلا کر بے قابو ہوئے ٹریفک روکنے کی کوشش کی تھی۔ راج کی سنہری آنکھوں میں ڈورے اتر آئے مگر اس نے پروا نہیں کی۔

دن بھر سسرال والوں کی دعوت نمٹاتے گزرا تھا، جو کے خاوند کی فرمائش پر پتا کسی وجہ اور حیل وحجت کے نے کر ڈالی تھی۔ کوئی ہاتھ بٹانے والا تو تھا نہیں۔ وہ ای جان مار کر فارغ ہوئی تھی۔

سراج جسے سبھی راج کہتے تھے شاید شکر گزاری کے سے مغلوب تھا۔ لیکن اس نے دن کے اختتام پر ھکن کھائی اور غصے کو پیا تھا، وہ بہت ان چاہے انداز میں اس کھیل کا حصہ بن گئی تھی۔ جسے راج اپنی آخری حد تک کھیلنا چاہتا تھا۔

''کسی نے تعریف کے دو جھوٹے بول بولنا گوارا نہیں کیے۔''

دل کو لگا صدمہ جب دھیرے، دھیرے منہ کو آنے لگا تو اس نے منہ ہی موڑ لیا۔ انجام سے بے پروا ہو کر اس نے صرف اپنی کہی، اپنی سنائی اور اس کے کہے سنے کو ان کہا ان سنا کر کے بستر سے ہی اتر آئی۔

راج زبردستی کا قائل نہیں تھا۔ اس کی ضرورت بھی پورے حق کے باوجود ایک وقار آمیز اجازت کی منتظر رہتی تھی۔ یہ الگ بات کہ جیسا آج ہوا ویسا پہلے کبھی ہوا نہیں تھا۔ اس لیے اسے اس صورتِ حال کو قبول کرنے میں دشواری کا سامنا رہا۔ مگر وہ اس سے روٹھا ہوا نہیں تھا۔ دوسری طرف اپنے تئیں اسے انکار کا مزہ چکھا کر بھی

وہ ایسی شانت نہ ہو سکی تھی جیسا ہو جانا چاہیے تھا۔
باقی رات ویسے بسر ہوئی جیسی عام راتیں نہیں ہوتیں۔ خفا، اداس اور کسی پرانے باورچی کے ہاتھوں جیسی جلی کٹی۔
اسے راج اور اس کے گھر والوں سے شکایتیں تھیں بلکہ راج سے نہیں صرف گھر والوں ہی سے......
''انہوں نے کبھی ہمیں وہ اہمیت نہیں دی جو دینی چاہیے۔'' سرفہرست اس کا احساس کمتری کھڑا تھا۔
''بینا کا رشتہ کر دیا۔ سب سے آخر میں ہمیں بلایا جب بات پکی کرنے لگے۔ سیدھا بارات میں بلاتے نا......''
کبھی کبھی وہ بالکل گاؤں کی گنوارنوں کی طرح راج کے سامنے ہاتھ چلا چلا کر دانت پیستی......
''لو بھئی بینا اب اپنے ہونے والے شوہر کے ساتھ شادی کی شاپنگ کریں گی۔''
ایک روز اس نے راج کو خوب جتایا اور ''ہونے والے'' پہ ایسے زور ڈالا، جیسے نالائق بیٹے کی پٹائی کرتے ہوئے باپ آخری ڈنڈے کی ضرب لگاتا ہے۔ اور یہ ضرب راج کے دل پہ پڑی۔ مگر اس کی اچھی بات یہ تھی کہ وہ غصے میں، شدید غصے میں بھی آپے سے باہر نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت بھی گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ اور وہ اپنی ہی ضرب سے بلبلا اٹھی۔ یا شاید راج کی ایک سانس ہی اسے جوتے کی طرح پڑ گئی تھی۔
''یاد ہے ناں ہمارے مایوں میں میری کتنی خواہش تھی کہ ساتھ ساتھ بٹھا کر رسم کر لیں۔ تب تو بڑی رسم و رواج کی پابند تھیں آپ کی اماں......''
وہ سالوں پرانے بھیگے کپڑے کو اس دن نچوڑ رہی تھی۔ اب جب کہ حالات کی دھوپ نے اس کا سارا نم سکھا دیا تھا۔
''کیوں پرانی باتیں یاد کر کے دل جلاتی ہو۔ وہ زمانہ اور تھا۔''
''اونہہ...... زمانے کو الزام دے کر لوگ صرف اپنے دوہرے معیار کا پردہ رکھتے ہیں اور کچھ نہیں۔''
اس کے سینے سے سانس ایسے پھنس کے باہر نکلی جیسے سلائی مشین کی بابن میں سے دھاگا نکلتا ہے۔ بل در بل الجھا ہوا۔
عزت اور ازدواجی زندگی کی سفید پوش چادر کی بخیہ گری بھی اس سے ایسی ہی ہو پائی تھی۔ جگہ جگہ سے ٹانکے ادھڑے تھے، کہیں دوہری سلائی تھی تو کہیں رفو......
چائے کا آخری گھونٹ ٹھار ہو چکا تھا۔ کپڑوں کا ڈھیر بے بسی سے اس کی راہ تکتا تھا اور وہ اس پہ نظریں ٹکائے اپنے اور راج کے پرانے رشتے کو نئے سرے سے سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی تھی اور جانے کب تک ہوتی رہتی کہ فون بج اٹھا۔
''اوفوہ کون بدنصیب ہے جسے کام نمٹا کر بھی سونے کی فرصت نہیں ملی۔'' انتہا کی خودترسی اس میں جذب ہو رہی تھی۔ اور انتہا کی ناامیدی کی شعاعیں منعکس کرتا چہرہ، اداسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔
فون پر عائلہ تھی۔ اپنی اکلوتی دوست کی تازہ اور بشاش آواز سن کر اس نے، پژمردگی کے سائے خود پر سے ہٹانے کی کوشش بھی بہت بے دلی سے کی۔
''کہاں غائب ہو جمیلہ کتنے دن سے انتظار کر رہی ہوں کہ اب فون کرو کہ تب لیکن جناب کو فرصت ہی نہیں۔''
عائلہ کی شاپنگ اور تفریح کی تفصیلات دل کی اس حالت کے ساتھ سننا بھی بڑے جگرے کا کام تھا۔ اسے لگا عائلہ نے اسے غلط طعنہ دے مارا۔ اصل میں وہ تو دنیا کی سب سے فارغ عورت ہے۔
''بس بھئی میاں، گھر، بچے، سسرال...... اس کے علاوہ اور کہاں۔ میں تو بھاگ کے کہیں جا بھی نہیں سکتی۔''
اس نے کچھ دیر پہلے کے خود پہ کھائے ہوئے ترس کو جھوٹا کر کے عائلہ کے آگے ڈال دیا۔
''ٹھیک کہا۔ تم جیسی عورتیں دنیا میں آتی ہی پیا کو پیاری ہونے کے لیے ہیں۔'' اس نے بھی بلاتکلف اسی کا جملہ دہرا لیا۔
''پتا نہیں تم لوگوں کو شاید گھٹی میں اپنے ہونے والے خصم کا پسینہ چٹایا جاتا ہے کہ بس جینا ہے تو اس کی خوشی کے لیے اور مرنا ہے تو اسی پہ۔'' عائلہ نے تو اس کی

...اں بھی جھنجھوڑ ڈالیں۔ دل میں بلاوجہ دم بہ دم بڑھتی ...ی میں اس سے یہ بات برداشت نہیں ہوئی تو درمیان ...ی ریسیور رکھ دیا۔ اور سارا غصہ میلے کپڑوں پر نکال ...کسی سزا کی طرح وہ جانے انجانے میں خود کو مشقت ...ڈال رہی تھی، ورنہ کپڑے دھونے کے لیے ماسی ہفتے ...دوبارہ آ جاتی تھی لیکن اس نے تو کچن کی صافیوں کو بھی ...لیاں نہ دیں۔
آخری کپڑا الگنی پر پھیلاتے سمے اسے اپنی اس ...خواہ کی چڑ کا بھید بھی سمجھ آ ہی گیا۔
''میں اپنی روٹین سے بور ہو گئی ہوں۔ میں کولہو ...گھومتے بیل کی طرح تو نہیں، جو ناچتا ہے تو گھومتا ہے ...رتا ہے تو چکر کھاتا ہے۔ اس کی زندگی میں دائرے کو ...تے کھروں کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔''
فیصلہ ہو چکا تھا۔
اس نے دو فون کھڑکائے۔
ایک وین ڈرائیور کو اور دوسرا عائلہ کو۔
بچوں کو ان کی دادی کے یہاں بھیج کے اب وہ اپنی ...ے کے لیے جا رہی تھی۔ ایک عام مڈل کلاس عورت ...رح سستی برانڈڈ شاپنگ کا مہنگا مرہم خرید کے ...ڈکھی دل کی پٹی کرنے کے لیے۔

☆☆☆

...راستہ چلتے... بھانت بھانت کی آوازوں اور نت ...گوں کے چہروں کے درمیان ایک پل اس کے دل ...آیا۔
...وہ اپنی پسند کا کام کر کے بھی خوش نہیں تھی۔
...مہینوں کی جمع پونجی چند گھنٹوں میں آدھی سے زیادہ ...ی تھی۔ اس نے اپنی مڑی ہوئی انگشت میں لٹکتے ...رانہ ٹیگ والے شاپرز کو دیکھا۔
...کتنی جان مار کے، کتنی ضرورتوں کو دبا کے، اپنے ...ے معصوم چہروں پہ لکھی خواہشوں کو صبر اور شکر کے ...ھا کے وہ آج اس جگہ تک پہنچی تھی تو اب، سب ...ھا اس کے سامنے رکھا تھا۔
...اتنی چپ، چپ کیوں ہو۔ نہ ہنسی میں وہ کھنک ہے، نہ لہجے میں وہ دھنک۔''
''کل دعوت میں سب کے سامنے آپا جان نے راج سے پورے آٹھ ہزار نکلوا لیے۔ بینا کی شادی قریب ہے اور......''
عائلہ جیسی بے پروا نے بھی جب محسوس کر لیا تو اس نے بھی پردہ اٹھا دیا۔ اس کے دل کو یک بارگی کسی بوجھ کے کندھوں سے ڈھو جانے کا سا آرام ملا۔
''تو تم کو کیا...... راج جانے اور اس کی آپا...... تمہاری تیاری تو ہو گئی ناں؟''
اس نے بات کرتے ہوئے پراٹھا رول کو بے دردی سے دانتوں سے کھینچا۔
''ویسے بھی تم اس ٹائپ کی عورت نہیں ہو یہ...... خاندانی سیاست اور مکار عورتوں کے داؤ پیچ کھیلنے والی۔ ورنہ ہمت تھی ان چنڈالنوں کی کہ یوں تمہاری آنکھوں کے سامنے......''
اس نے گاڑھے میونیز اور پگھلے ہوئے پنیر میں لتھڑے چکن کو دانتوں تلے ایسے کچلا جیسے۔ اپنی دوست کو دکھ دینے والی اس کی نند کو ہی کچا چبایا ہو۔
''ہاں کوئی مہینوں تپیا کاٹے اور کوئی جذباتی ڈھکوسلوں سے......'' دل کی بات دل میں دباتے اس نے سامنے سے کسی مرد کو اپنی طرف آتے دیکھا۔
جو اسے نہیں جانتی تھی مگر وہ جانتا تھا۔ اس کے چہرے پہ کسی پرانی جان پہچان کا اخبار چھپا ہوا تھا۔
''اوہ......'' وہ سمجھ گئی۔ وہ عائلہ کا واقف کار تھا۔
جمیلہ ضبط کر کے بیٹھی رہی۔ بات نکلی، پھر چلی پھر بڑھ کر رات کے کھانے سے رات کی مصروفیات کی طرف لپکنے لگی تو، وہ بنا کچھ کہے وہاں سے اٹھ گئی۔
اسے عائلہ کی جان پہچان کے طویل سلسلوں سے کوئی دقت نہیں تھی۔ وہ ایسی ہی من موجی تھی۔ یاروں کی یار ٹائپ...... لیکن ان میں مرد بھی شامل تھے۔ کبھی کبھی یہ بات اسے الجھا دیتی تھی۔ وہ عائلہ کو پسند کرتی تھی مگر اس سے جڑے دوستیوں کے دھاگے کو اپنے آنچل میں بخیے ٹانکنے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔
عائلہ دور تھی لیکن ہانپتی کانپتی اسی کے پاس آرہی تھی۔ اطمینان کرکے وہ واپس گھومی۔
تبھی ایک منظر نے اس کے قدموں سے منّ منّ وزنی پتھر لا باندھے۔
سامنے عائلہ کا شوہر بھی ٹھیک عائلہ ہی کی طرح اپنی کسی شناسا کو لیے کھڑا تھا۔ وہ فوراً آگے بڑھنا چاہتی تھی۔
عائلہ اور اس کی زندگی کی کوئی پرت ایک دوسرے سے ایسے چھپی نہیں تھی کہ دکھائی نہ دیتی۔ مگر ایک بھرم کے سہارے وہ اپنی خوشگوار ازدواجی زندگی کا بھید اگر بھید ہی رہنے دینا چاہتی تو سجو کو اس کا بھرم رکھنا آتا تھا۔ پر...... دیر ہوگئی۔
وہ ہل نہ سکی اور عائلہ اس کے سر پر پہنچ گئی۔ سجو کی دوستی اس کے لیے، محبوب کے خون سے لکھے گئے پریم پتر کی طرح قیمتی تھی۔ وہ اس کے لیے کوئی بھی قیمت چکا سکتی تھی۔ ابھی ابھی اپنے کسی دوست سے ایکسکیوز کرکے بھاگی چلی آئی تھی۔ مگر یہاں تو منظر ہی اور تھا۔
سجو کے پیروں نے اٹھنے کی ہامی ہی جب بھری جب وہ ان دونوں کے سامنے سے خراماں گزر گیا۔ بنا کسی شناسائی کی رمق دیے۔
گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ عائلہ کا صرف چہرہ ہی نہیں، پورا وجود یہاں تک کے رنگے ہوئے بالوں تک میں سفیدی پت گئی۔ اس کے اسٹیرنگ گھماتے ہاتھوں کی رگیں عمر رسیدہ عورتوں کی طرح ابھر آئی تھیں۔
”مجھے سسرال کی طرف ڈراپ کردو، بچوں کو بھی لینا ہے۔“
اس نے ماضی قریب کے کسی سانحے کا حوالہ دیے بغیر اپنا ارادہ کسی اینٹی ہینگ اوئٹی کی طرح اس کے کانوں میں انڈیلا اور گمان کیا کہ اسے افاقہ ہوجائے گا۔
☆☆☆
سسرال کی دہلیز پہ پڑے قدم جتنے پژمردہ تھے، واپسی میں ان کے بالکل برعکس جان سی پڑ گئی تھی۔
وجہ تھی آپا جان کا لایا ہوا وہ قیمتی بھاری جوڑا جو اُن کی ہتھیلیوں میں سورج کی طرح چمک رہا تھا۔ وہ سجو کے لیے تھا۔
”راج سے پیسے لے تو لیے پر خیال آیا کہ خالی اپنی تیاری کرکے جاتی کیا اچھی لگوں گی۔ پتا نہیں میری بھابی نے بھی بنائے نئے کپڑے کہ نہیں۔“
اس کا منہ سرخ سا رنگ گیا۔ کچھ شرمندگی سے کہ اس نے برا گمان کیا تھا اور کچھ اس خیال سے کہ کپڑے تو اس نے بنا لیے تھے۔
راج کے آنے میں وقت تھا۔
بچوں کو لے کر اپنے گھر کے دالان میں قدم رکھا تو ان کی چہکاروں سے دل کچھ شانت تو ہوا، پر ایک اضطراب راکھ میں اندر کہیں سلگتی چنگاری کی طرح تپش دے رہا تھا۔
وہ اس اضطراب سے پریشان تھی اور وجہ بوجھنے سے قاصر بھی۔ آپا کی زبان درازی کا پردہ عائلہ کے سامنے اٹھانے کے بعد اب وہی کچھ اندر دہک رہا تھا۔
مغرب کے سائے پھیل گئے تھے جب بچوں کی بھوک جاگ گئی۔ اس کی ممتا الجھن کے دھاگوں میں سے ہڑبڑا کر باہر نکلی۔ ربر بینڈ تلے دبے باقی ماندہ نوٹوں میں سے چند ایک کھڑچ کی آواز کے ساتھ باہر کھینچے اور بڑے والے کی مٹھی میں دبا دیے۔
”آپ کولڈ ڈرنک لے آؤ۔ میں برگر بنا دیتی ہوں۔“
ننھے دل پارٹی کا نعرہ لگا کر اچھل کود کرنے لگے اور وہ مسکراتی ہوئی کچن میں آگئی۔
☆☆☆
پورے چاند کا آدھا سفر ابھی باقی تھا۔
اس نے سوئے ہوئے معصوم چہروں کے گرد حفاظتی حصار کھینچا۔ اور راج کی راہ دیکھتی نظریں لاؤنج کے باہر بیرونی دروازے تک کا سفر کرکے خالی لوٹ آئیں۔
دل تو کہتا تھا کہ ایک بار ہمت کرکے اس کی خیریت کا سندیسہ منگوا لے مگر کوئی چیز اندر ہی اندر چاٹ کھاتی کسی، پچھل پیری کی طرح ان دیکھا ہاتھ بڑھا کر اس کے بازوؤں سے لپٹ جاتی۔

میاں بیوی کے درمیان انا کی فصل اُگ آئے تو سر [پیر]وں تلے رکھ کر اس فصل کو کاٹنا پڑتا ہے اور اس درانتی [تلے] اگر عزتِ نفس آجائے تو اس کا جنازہ پڑھے بغیر دفن [ک]رنا پڑتا ہے۔ ہر ایک کے اندر اتنی ہمت نہیں ہوتی۔ یہ [پھ]ول سالوں کی تپسیا کے بعد کسی کسی کے من میں کھلتا [ہے]۔ وہ فی الوقت اس کے بیچ سے محروم انا کی کانٹے دار [جھا]ل میں خود کو لہولہان ہونے سے بچانے کی کوشش میں [س]ادھے کھڑی تھی۔
اسی وقت عائلہ کا فون آگیا۔ وہ مری پہنچ گئی تھی۔
”اتنی جلدی؟“
اس کے لب بے یقینی سے پھڑپھڑائے کہ وہ خود تو [ا]بھی پچھلی رات کے زہر کی کڑواہٹ سے ابھر نہیں سکی [تھی]۔ اور کہاں عائلہ، جو ایک صوبے سے دوسرے کا لمبا [سفر] بھی تمام کر گئی تھی۔
”ہاں یار، بائی ائر آنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔“ اس کا [انداز]ل سے بے پروائی کے نوالے نگل کے بولتا تھا مگر سجو [ا]ٹک اٹک کے نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ ڈالا۔
”کس کے ساتھ......“
”ارے بھئی بابر کے ساتھ اور کس کے ساتھ...... [تم]ہارے میاں کو تو سیریں کرانے کی فرصت [نہیں]۔ ویسے...... وہ بڑے دل والا ہے۔ تمہاری رونی [صورت] بھی اس کے دل......“ وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہی [تھی] شاید کچھ ایسا جو اس... کو کالے گلابوں کے کفن سے [ڈھانپ] دیتا۔ مگر اس کے کانوں میں یک دم شروع ہو جانے [والا کہر]ام دھڑ دھڑ دل کی دیواروں سے سر مارنے لگا۔
عائلہ کی شادی سے پہلے اور بعد کی ساری محرومیاں [آنکھوں] کے سامنے لائن حاضر ہوگئیں۔ ماں کا قصور، بیٹیوں [کی] غربت کی مار جو بڑی بے رحم ہوتی ہے، قسمت [کے لکھے] جو بہت بے پروا ہوتے ہیں۔ باپ کی دوسری [شادی او]ر اس کے بعد بیٹیوں کے سودے نما بندھن، جن [کی قسط] در قسط چڑھتے سود نے ان کو سانس تک مرضی سے [لینے کی آز]ادی بھی چھین لی تھی۔
[ایس]ے حالات میں عائلہ تو کیا کوئی بھی معصوم کچے خوابوں کو، اپنے سگے رشتوں کے ہاتھوں نچتے دیکھنے والی نار بہک سکتی تھی مگر یہ کیا......
محبت کے ریپر میں لپٹا خود ستائش و نمائش کا یہ خمار ایسا چڑھا کہ پھر اتر ہی نہ پایا یا آزمائشوں کے سلسلے اتنے دراز تھے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے، معاشرتی اور مذہبی حدود و قیود کے گجرے نوچ کر پھینک دیے۔ رنگ رسیا خاوند کو عورت کا وہ رنگ دکھایا جس، میں عورت، عورت نہیں رہتی۔ طوائف یا شاید ڈائن بن جاتی ہے۔
عائلہ بھی اپنی عصمت کے مومی پتلے میں پنجے گاڑ کر اس کا لہو چوس رہی تھی۔ اور قہقہوں کے شور میں کہیں اس کی آنکھوں کی نمی اگر ہوتی بھی تو دکھائی کس کو دیتی۔
☆☆☆
رات کے کالے سائے گہرے ہوکر در و دیوار کی رونق چاٹنے لگے۔ وہ اب بھی صوفے کے پاس کھڑی تھی۔ جب عائلہ سے بات ہوئی تب رات اتنی سر منہ چڑھی نہیں تھی وہ تب بھی صوفے کے پاس کھڑی تھی۔
اس تب اور اب کے بین بین عورت اور مرد کی جنسی، جسمانی اور نفسیاتی کیسی ہی دقیق ضرورتیں دماغ کے جھروکوں سے جھونکوں کی طرح گزریں۔ ایسا اوق تعلق بھی کس کام کا۔ کوئی تعارف مانگے تو رشتہ نہ ہو۔ کوئی نام پوچھے تو پہچان نہ ہو۔ کوئی پائمداری کھنگالے تو نرے بھربھرے ڈھانچے کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگے۔
سے کی تسبیح سے کتنے ان پڑھے دانے پھسل کر خاک کی خوراک بن گئے۔
اس کی آنکھ کھلی تو وہ صوفے پہ ہی پڑی تھی۔ رخساروں پہ نمکین لکیروں کے نشان مقدس صحیفے کی طرح ثبت تھے مگر کوئی پڑھنے والا بھی تو ہوتا۔
”عائلہ......“ گزشتہ سے جھانکتا ایک ببول سا خیال اٹھا اور دل میں پیوست ہوگیا۔
”کیسی عورت تھی وہ، جس کے پاس اسے پڑھنے کے لیے ہر روز ایک نئی آنکھ ہوتی تھی۔ اور...... اور میرے پاس......“
اس کے اندر وحشت کا کیکٹس اُگ آیا۔
لق و دق صحرا میں مذاق اڑاتی موت کی رنگت

والی مریل چیونٹیاں اپنے زہریلے ڈنک لیے اس کی طرف بڑھنے لگیں۔ وہ دم کٹی ناگن کی طرح تپتی ریت پر ناچنے لگی۔

ریت ٹیلا در ٹیلا ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کی طرح بے رحم ٹکڑوں میں بٹی اس کی وحشت کو مٹھی بھر بھر اس کی آنکھوں میں جھونک رہی تھی۔ تبھی اسے احساس ہوا وہ بچ نہیں سکتی، بھاگ نہیں سکتی۔ اس کے پیروں میں بھاری بیڑیاں پڑی ہیں اور اسے کسی اور گھسیٹنا چاہتی ہیں۔

اس نے پلٹ کر نظر ڈالی۔

پشت پر نخلستان کھڑا تھا۔ اشجار کی چوٹیوں پر آگ دہک رہی تھی۔ نارنجی شعلوں کے عکس میں عائلہ کا جانا پہچانا مگر بدہیت چہرہ اسے پکار رہا تھا۔

وہ اسے اپنی اور بلا رہی تھی۔ وہ اسے اس باغ کا پھل کھلانا چاہتی تھی۔ جس کے بیج میں خود سری اور بغاوت کی بُو آتی تھی۔

پیروں کی زنجیریں اب اژدھوں میں بدل گئی تھیں اور اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ اپنے قدم ان کی منشا کے خلاف لے جاتی۔

تبھی اسے کسی نے آواز دی۔ دور بہت دور سے آتی ہلکی صدا جرسِ صحرا کے مانند سماعتوں میں گونجی۔ اس کے لبوں سے ایک دل دوز چیخ نکلی۔ اور اگلے پل کسی کی بانہوں نے اسے تھام لیا۔

وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچی اور ٹکر ٹکر نا سمجھی سے اسے تکنے لگی۔

”کیا ہوا۔ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا۔“ راج نے پچکار کر اس سے پوچھا۔

اس کے لبوں پہ ایک محبت کی خوشبو چراتی ہوئی مسکان تھی۔

وہ اب بھی نا سمجھی کی کیفیت میں تھی۔ راج تشویش سے اس کے رخساروں پہ ہاتھ پھیرتا، تاسف و رنج کے ثبوت مٹا رہا تھا۔

”تم روئی ہو...... کیوں...... کیا ہوا......؟“ اس کے لہجے میں تفکر کی آنچ پر محبت کی ہانڈی ابلنے لگی۔

”کب سے دروازہ بجا رہا تھا۔ جب تم نے کھولا نہیں تو گاڑی سے لاک کی چابی نکال کے لایا بچے بھی بے خبر سو رہے ہیں۔“

سجو کسی لب دم مریض کی طرح اس کے بازو کے سہارے سے لگی، دھیرے دھیرے بیڈ روم تک آئی اور اس کی گود میں سر رکھ دیا۔

”آج سارا دن دل کی کیفیت عجیب سی رہی۔ بار بار تمہارا خیال آتا رہا...... رات کو...... تم ناراض تھیں ناں......“

”میں...... ناراض......؟ نہیں تو۔“

اس نے اپنی بھری ہوئی آنکھیں چھپانے کے لیے منہ ہی چھپا لیا۔

تحفظ کے انمول احساس نے خود سپردگی کی کیفیت کو جنم دیا۔ کل اس سے دور بھاگنے والی آج خود ہی نزدیک آ گئی۔ سینے سے ہاں راج کے سینے میں لپٹی بانہوں میں سما گئی۔

”آج میں آپ کو بتائے بغیر گھر کی دہلیز پھلانگ گئی تھی۔ اس لیے آپ کا دل پریشان رہا۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

راج اس فرمانبرداری پر اس پہ ہزار جان سے نچھاور ہو گیا۔

اور اس نے گھنٹوں سے ریں ریں کرتے دل کو تحفظ کی آغوش میں کسی ننھے بچے کی طرح سکون سے پلکیں موندتے دیکھ کر سوچا۔

”تو دل کی اداسی بے سبب نہیں تھی۔ یہ نہ لگے بندھے معمول کی وجہ سے تھی نہ آپا جان کے ڈھکوسلوں کی جیت کی وجہ سے۔ نہ دعوت کی تھکن تھی نہ اپنی کم مائیگی کے احساس کے سبب...... بس ایک پیا کی پیاری...... پیا سے دور جا بیٹھی تھی۔“

اپنی اداسی کا کارن جان کر اس نے طمانیت بھری سانس کھینچی اور خود کو محبت کے دھارے میں بہہ جانے کے لیے بے بس چھوڑ دیا۔

کرنی کا پھل

اُمِ ایمان



وہ مصلے پر بیٹھی بہت دیر سے بیٹے کی کامیابی کے ...گو تھی۔ نماز، قرآن کی تو بہت پہلے ہی سے پابند ...اب اس کی عبادت و فرائض میں وظائف بھی ...ہو گئے تھے۔ ریحان کو ڈاکٹر بنانا اس کا ایک ایسا ...تھا جس کی تعبیر کی تکمیل جب اسے اپنی ذات میں نہ مل سکی تھی تو اس نے اپنی خواہش کو مرنے نہیں دیا تھا بلکہ جذبوں کا پانی دے کر زرخیز کیا تھا پھر اسے اپنی اولاد میں منتقل کر دیا تھا۔

ابھی گزرے کل ہی کی تو بات تھی جب فضا گاؤں سے ایف ایس سی کرنے والی واحد لڑکی تھی۔ بچپن میں

دیکھے گئے ڈرامے میں سفید اوور آل پہنے وہ خوب صورت سی ڈاکٹر اسے اتنی بھائی کہ من ہی من میں تہیہ کرلیا کہ ڈاکٹر ہی بننا ہے۔ اماں، ابا لاکھ ان پڑھ سہی مگر اس کے شوق کی راہ میں رکاوٹ کبھی نہ بنے..... نویں میں جب اس نے سائنس کے مضامین رکھے ابا کا سر فخر سے بلند ہوگیا تھا۔ پھر ہائی فرسٹ ڈویژن میں میٹرک کرنے کے بعد اس کے فخر کو پہلا جھٹکا تب لگا جب وہ کالج میں آئی تھی۔ گاؤں سے اے پلس مارکس لینے والی وہ واحد لڑکی جس کی قابلیت اور ذہانت کا سارا گاؤں معترف تھا اور ان سب کو یقین تھا کہ فضا ڈاکٹر ہی بنے گی۔ اماں تو لاڈ سے اسے ڈاکٹر ہی کہہ کر پکارتی تھیں اور انہی کی زبانی سن کر سب کے منہ پر ہی ڈاکٹر فضا ہی چڑھ گیا تھا۔ مگر فضا کے یقین میں دراڑ کالج آکر پڑی جب اس نے ذہانت اور قابلیت کی اصل شکل یہاں آکر دیکھی۔ بہت محنت کے بعد بھی ایف ایس سی میں اس کا درجہ ایک ایوریج طالبہ کا رہی رہا۔ ہاسٹل میں اسے رہنے کی اجازت نہیں تھی اور گاؤں سے شہر آنے جانے میں ہی اتنا وقت لگ جاتا کہ وہ بہ مشکل تھوڑی سی دیر آرام کرکے بہت مشکل سے ہی سہی اپنا سبق یاد کر پاتی۔

اردو میڈیم سے ایک دم انگلش میڈیم کا فاصلہ عبور کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی جبکہ اس جیسی پانچ لڑکیوں کے علاوہ باقی تمام طالبات ہی انگلش میڈیم اسکولز سے ہی آئی تھیں۔ وہ صرف اساتذہ پر ہی اکتفا کرتی تھی جبکہ تقریباً پوری کلاس ہی میٹرک کے امتحانات کے بعد ایف ایس سی کا آدھے سے زیادہ کورس رٹ کے آئی تھی اور لیکچرز کے دوران بھی وہ حیرت سے ان کو دیکھ کر رہ جاتی جب ٹیچر سے بھی پہلے وہ بول اٹھتیں۔ خیر اس کے ڈاکٹر بننے کا خواب اس وقت ٹوٹ گیا جب اس کی سرتوڑ کوشش کے باوجود بھی ایف ایس سی میں اس کی سیکنڈ ڈویژن آئی تھی، مطلب وہ میڈیکل کے لیے کوالیفائی کرنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔ اس غم نے اسے ہفتوں بیمار اور دنیا سے بیگانہ کیے رکھا۔ پھر سائنس اور سائنسی مضامین سے دل ایسا گھبرایا کہ اس نے پرائیویٹ بی اے آرٹس کے مضامین میں بہت اچھے نمبروں سے پاس کرلیا اور جب ایم اے کرنے کی ٹھان ہی رہی تھی کہ اماں ابا نے ساتھ والے گاؤں میں چچا کے بیٹے سے اسے بیاہ دیا۔

وہاں سب اس کی تعلیم سے جنون سے واقف تھے سو بلال نے فوراً ہی ایم اے کی کتابیں لا کردی تھیں اور ایم اے کا رزلٹ آتے ہی اسے کئی خوشیاں ایک ساتھ ملی تھیں۔ اس کے چچا گاؤں کے چوہدری تھے اور کئی سال سے اپنے گاؤں کے لیے گرلز اسکول کے اجرا کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے بیٹے ریحان کی پیدائش اور اپنے گھر کے احاطے میں بنے پرائمری اسکول میں ایک سرکاری ٹیچر کے طور پر اس کی تقرری آگے پیچھے ہی عمل میں آئی تھی۔ جہاں وہ بے حد خوش تھی وہاں بیٹے کو دیکھ کر وہی شوق پھر سے انگڑائی لے کر بیدار ہوا تھا مگر اس بار خواب کا تعلق ریحان کے حوالے سے تھا۔

اسکول کا کام احسن طریقے سے سنبھال لیا تھا اس نے کہ جذبہ اور شوق دونوں ہی جوان تھے۔ بیٹے کو بھی سنبھالنے کے لیے ساس تھیں۔ اس بار اس نے اپنے والی غلطی نہیں دُہرائی تھی بلکہ خاندان والوں کی مخالفت مول لے کر بیٹے کو شہر میں بہت چھوٹی عمر سے ہی ہاسٹل میں رکھا تھا باوجود اس کے کہ اس کا خاوند بھی اس کے اس عمل سے زیادہ خوش نہیں تھا مگر جلد ہی ان سب کو احساس ہوا کہ اس کا فیصلہ صحیح تھا۔ اس کا بچہ تیزی سے اس کی توقع کے مطابق ترقی کر رہا تھا۔ اس کے بڑھتے گریڈز اسے خوش کرتے۔ اسکول میں اس کی دلچسپی اور لگن نے بچوں کی تعداد کو اور بچوں کے والدین کے اس پر اعتماد کو بڑھا دیا تھا۔

اس کے بیٹے کے شاندار نمبروں سے مڈل کا امتحان پاس کرتے ہی اسے ترقی ملی اور قصبے میں ایک مڈل اسکول میں اس کا ٹرانسفر ہوگیا۔ اگرچہ اس کی جگہ دوسری ٹیچر کی تعیناتی ہوگئی تھی مگر علاقے کے لوگ اور اس کے سسر کی کوشش رنگ لائیں اور جہاں اس گرلز اسکول کو پرائمری

ڈل کا درجہ ملا وہاں اسے ترقی دے کر ایک بار پھر اسی ل میں ہیڈ کے طور پر بھیجا گیا۔ اس دوران ریحان ٹرک میں پوزیشن لے کر نہ صرف اس کے سر کو بلکہ ے خاندان کا سر فخر سے بلند کر دیا تھا۔ انہی دنوں اس اس کی وفات اس کے لیے ایک ذہنی دھچکا ثابت ۔ ساتھ ہی ایک عرصے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کے گھر کو اتارا تھا۔

''یہ..... یہ کیسے ہوسکتا ہے ریحان کے ابو..... ے بیٹے نے کتنی محنت کی تھی، اس کے نمبرز اتنے ار تھے۔ پھر میں نے کتنی دعائیں بھی تو مانگی آپ..... آپ کو غلط فہمی ہوئی ہوگی۔'' وہ ہذیانی میں چیخ پڑی۔

''ریحان نے محنت بھی کی تھی۔ اس کے نمبرز بھی ار تھے اور تم نے دعاؤں میں بھی کمی نہیں رکھی..... ٹھیک مگر جو چیز انسان کی قسمت میں نہ ہو اسے ر تم چھین بھی تو نہیں سکتے۔ اسی میں میرے اللہ کی ہوگی..... بہتر ہے تم واویلا کرنے کے بجائے اپنا رل رکھو کیونکہ ریحان کو میڈیکل میں داخلہ نہ کا اتنا رنج نہیں جتنا تمہاری خواہش پوری نہ کا..... تمہارا سامنا کس منہ سے کرے گا اسی لیے ی نہیں آیا۔ اس نے کہا بابا میں امی کو کیسے بتاؤں ں ان کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔'' بلال کے ے انداز میں کہنے پر وہ چونکی۔

''وہ کہاں ہے؟ اور..... اور آپ نے غور سے دیکھا رزلٹ.....؟'' وہ بے قراری سے بولی۔

''آج کل کے دور میں کیا چیز مشکل ہے۔ ریحان اپنے دوست کے انٹرنیٹ پر رزلٹ چیک کیا ہے۔ اری طرح سو فیصد پُرامید تھا مگر جو اللہ کو منظور..... اپنے چچا کے گھر تک گیا ہے آجائے گا تھوڑی دیر تم اس کے سامنے بالکل بھی رونا مت اور اپنا رویہ ل رکھنا..... ماشاء اللہ جوان، لائق اور ذہین ہے ان ایک میڈیکل پر ہی تو دنیا ختم نہیں ہوجاتی انسان قدم بڑھائے تو ترقی کی کئی راہیں اس کی منتظر ہوتی ہیں۔'' پھر ریحان کے آنے تک بلال اسے سمجھاتا ہی رہا تھا۔

اسکول کی عمارت کی توسیع تو ہوئی تھی مگر اس کے جانے کا آج بھی وہی ذیلی دروازہ تھا جو اس کے گھر کے پچھواڑے سے اسکول سے میں نکلتا تھا۔ اب تو اسٹاف بھی بڑھ گیا تھا ساتھ ہی اس کی ذمّے داری تھوڑی کم ہوگئی تھی یا اس نے خود ہی ذمّے داریوں سے جی چرا لیا تھا اس کا فیصلہ وقت نے کرنا تھا۔

☆☆☆

وہ ویسی ہی ایک صبح تھی جیسی کئی سالوں سے فضا کے گھر میں طلوع ہوتی تھی۔ نماز، قرآن سے فارغ ہو کر وہ گھر کے کاموں میں مصروف تھی۔ کچھ دن افسردہ رہنے کے بعد ریحان نے باپ کے مشورے سے دوسری فیلڈ کو چن لیا تھا اس لیے کہ تعلیم کے شعبہ جات کی تو کمی نہیں بس پڑھنے اور محنت کرنے والا طالب علم ہو۔ ماں کی اب دلچسپی ہی نہیں رہی تھی انہوں نے اداسی سے بس اتنا ہی کہا تھا۔

''جیسی تمہاری مرضی بیٹا..... اللہ کامیاب کرے۔'' بیٹے کے نقشِ قدم پر چلاتے ہوئے بیٹی کا اس نے نزدیکی انگلش میڈیم اسکول میں ایڈمیشن کرایا تھا۔ حالانکہ سرکاری اسکولوں میں اردو میڈیم گزرے وقتوں کی بات تھی اب تو ہر سرکاری اسکول میں انگلش میڈیم کورس ہی رائج تھا خود اس کے مڈل اسکول میں پانچ اساتذہ کا اسٹاف کوالیفائیڈ اور ینگ لڑکیاں تھیں۔ ویسے ہی جذبے اور جوش کے ساتھ کچھ کرکے دکھانے کا عزم لیے ہوئے مگر پتا نہیں کیسی گرہ تھی جس نے اس کے دل میں انگلش میڈیم اسکولوں سے محبت کے شوق کو پروان چڑھایا تھا۔

اسکول میں اسمبلی کے لیے بجتی بیل پر وہ چونکی ابھی بہت سا کام ادھورا پڑا تھا۔ وقت سے پہلے اسکول پہنچنا اور اسکول اور بچیوں کی خاطر چھٹی کے بھی بہت بعد گھر واپس لوٹنا بہت پہلے کی باتیں تھیں..... اب تو کئی عرصے سے خود کو بہلاوے کے ہزار حیلے تھے۔

"میں نے بہت وقت دیا اس اسکول کو، اپنی جوانی دی خونِ جگر سے سینچا تب جا کر یہ اس مقام تک پہنچا کہ ڈویژن کا نمبرون اسکول بن پایا۔ اب نئے لوگوں کی باری ہے۔" یہ اور اس جیسے کئی اقوال وہ خود نہ صرف دُہراتی بلکہ ٹیچرز کو بھی بتاتی رہتی کہ کیسے امتحانوں کے دنوں میں وہ بچوں کو اپنے گھر بھی لے جایا کرتی تھی اور دن رات ایک کر دیا کرتی تھی۔ اسکول میں لگے سایہ دار کئی درخت اس کی اسکول سے محبت کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ ٹیچرز اس کی محنت اور لگن کو سراہتیں......

"میم! ٹیچر ثانیہ کہہ رہی ہیں، آج کسی آفیسر کا وزٹ ایکسپیکٹڈ ہے تو آپ ذرا جلدی آجایئے گا۔" چھوٹے، چھوٹے کئی کام نبٹاتے وہ اسکول کا ایک چکر لگانے کا سوچ ہی رہی تھی جب ہفتم کلاس کی ایک بچی نے مس ثانیہ جو اس کی غیر موجودگی میں انچارج ٹیچر تھیں کا پیغام آ کر دیا۔ وہ پرس، موبائل سنبھالتی جلدی سے اسکول آ گئی۔ پھر دن کیسی مصروفیات میں گزر گیا پتا ہی نہیں چلا۔ اسکول آنے پر کئی کام اپنی توجہ کے منتظر ملے کہ اسٹاف جتنا بھی کوآپریٹیو ہوتا کچھ کام اور ذمے داریاں ایسی تھیں جو سراسر اس کی اپنی ذمے داری تھیں اور دوسرے کے لیے ناگزیر بھی ورنہ شاید وہ ان سے بھی آنکھ چرا کر وہ بھی باقی اسٹاف کے حوالے کر دیتی۔

پیون کو بلا کر اس نے مشعل بیٹی کے اسکول دوڑایا کہ اس کا اسکول ذرا فاصلے پر تھا۔ وہ اکیلی آسکتی تھی مگر فضا گھبراتی تھی کہ اتنی سے بچی اکیلے گھبرا نہ جائے۔ پہلے وہ کسی بھی کلاس کی دو بچیوں کو بھیج دیا کرتی تھی جو اسے اسکول سے لے کر آتی تھیں مگر اسی سال ان کے اسکول پیون کی تعیناتی نے جہاں اسکول کو فائدہ دیا تھا وہاں اسے ذاتی طور پر کئی کاموں کی آزادی ہو گئی تھی۔

آفیسر کا وزٹ خوش اسلوبی سے ہو جانے کے بعد اس نے کلاسز کا ایک راؤنڈ لگایا اور چھٹی سے قبل انچارج کو کئی ہدایات دے کر ایک بار پھر اپنے گھر آ گئی۔ اس بار مشعل اس کے ہمراہ تھی۔ کھانا کھلا کر اسے کچھ دیر سلا دیا کہ اٹھ کر اسے پہلے قرآن پاک اور پھر ٹیوشن پر بھی بھیجنا ہوتا تھا۔

"میں بہت متاثر ہوں میم آپ سے...... حیران ہوتی ہوں آپ کی ہمت اور اسٹیمنا پر کہ کسی طرح [illegible] کر لیتی ہیں آپ سب کچھ...... گھر کا سارا کام خود کرتی ہیں، اسکول کی ذمے داری بہترین طریقے سے سنبھالی ہوئی ہے، بچے ہیں تو تعلیمی لحاظ سے پرفیکٹ اور شاید میں ہے کہ ہوسکتا ہے اس سال آپ کی پروموشن کے بھی چانسز ہیں۔" صوفیہ نے رشک سے اسے دیکھتے ہو... کہا جبکہ باقی ٹیچرز نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا تھا۔ وہ سب ہی اس کی بات سے متفق تھیں۔

"بس بھئی اللہ کا کرم ہے سب اس میں میرا کوئی کمال نہیں، وجہ تو شاید میری بھی سمجھ میں بھی نہیں آئی اس کی نوازشوں کی بس ایک بات ہے کہ ہم میاں بیوی نے کبھی اپنی حلال کمائی میں حرام کی آمیزش نہیں کی۔ [illegible] بھی لقمہ کھلایا اولاد کو حلال ہی کھلایا۔" حلیمی سے مسکرا [illegible] کہتے وہ ایک بار پھر اسکول سے اپنی محبت، لگاؤ کا ذ[illegible] کرتے ہوئے خصوصی طور پر اپنے سسر کا ذکر کرنا [illegible] بھولی تھی جنہوں نے اسکول کے لیے زمین تو دی تھی، دی تھی اس کے لیے بھاگ دوڑ بھی بے حد کی تھی تب [illegible] کر اس دور افتادہ گاؤں میں سرکاری سطح پر گرلز اسکول [illegible] قیام ممکن ہو سکا تھا۔ پھر بریک کے آف ہونے کی [illegible] بجتے ہی وہ سب اٹھ کر اپنی، اپنی کلاسز میں چلی گئیں۔

ابھی وہ اسکول کا راؤنڈ لینے کا ارادہ کر ہی رہی تھیں کہ مشعل کے اسکول سے فون آنا اسے تشویش [illegible] مبتلا کر گیا کہ ابھی تو اس کی چھٹی میں بھی بہت دیر تھی [illegible] دوسری طرف سے جو کچھ کہا گیا اسے سن کر وہ شاکڈ [illegible] تو رہ گئی تھی ...... مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے کلاس کی [illegible] سے ذہین بچی جسے اس نے ٹیوشن کے لیے کسی [illegible] بھی نہیں بھیجا کہ ہوسکتا ہے ڈھیر سارے [illegible] میں اسے اتنی توجہ نہ مل سکے سوا اپنی ایک جاننے والی [illegible] ہاں اسے ٹیوشن بھیجتی تھی جو بڑی مشکل سے [illegible] پڑھانے پر تیار ہوئی تھی اور منہ مانگا معاوضہ لیتی تھی [illegible] پھر کیا مسئلہ تھا کہ اس بار منتھلی ٹیسٹ میں اس کی پرفارمنس بہت ہی کم تھی...... سر درد سے پھٹنے لگا تھا [illegible]

[illegible]...... ریحان کے بعد اب ساری امیدیں مشعل سے [illegible] وابستہ تھیں گو کہ ریحان بھی تعلیمی لحاظ سے بے حد اچھا جا رہا تھا مگر فضا کی نظر میں ترقی اور تعلیم کا جو معیار [illegible] وہ ڈاکٹر سے کم نہیں تھا۔ وہ جو ایک ہفتے میں دو تین [illegible] گریڈز لے لیا کرتی تھی، آج اس سے بھی گئی تھی۔ اس [illegible] سے پڑھایا ہی نہیں گیا۔ سو چھٹی سے پہلے ہی گھر آ گئی۔ [illegible] لال سے جب بے حد پریشانی میں اپنا مسئلہ بیان کیا [illegible] وہ حیرانی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"فضا بچوں کی پڑھائی کو تم نے زندگی، موت کا مسئلہ بنالیا ہے پہلے ریحان اور اب مشعل...... اس کی [illegible] تو دیکھو اور کلاس...... ابھی وہ صرف ابتدائی کلاس کا [illegible] مرحلہ طے کر رہی ہے اور ایسی عمر میں بچوں کا دھیان [illegible] پڑھائی پر کم ہی ہوتا ہے۔ ٹھیک ہو جائے گی وہ۔" مگر [illegible] ل کی تسلی بھی اس کی پریشانی کو کم نہ کر سکی......

"مشعل جانو...... کیا مسئلہ ہے آپ کے [illegible]...... کتنے کم مارکس لیے آپ نے اس بار...... کوئی [illegible] ہے تو مجھے بتاؤ بیٹا!"

"کچھ نہیں امی...... بس ویسے ہی......" وہ اٹک، [illegible] کر اتنا ہی کہہ سکی...... خیر اسے ٹیوشن پر روانہ کرنے کے [illegible] اس نے عصر کی نماز پڑھ کر گھر کے ایک دو کام نپٹائے اور [illegible] بلال گھر سے باہر جانے لگے تو انہیں کہا کہ اسے مشعل [illegible] ٹیوشن والی ٹیچر کے گھر چھوڑتے جائیں گے۔ لگے [illegible] ان سے بھی مشعل کا مسئلہ ڈسکس کر لے گی اور اسے [illegible] ساتھ لے آ جائے گی۔ بلال نے اسے تین گلیاں چھوڑ کر ٹیچر [illegible] کے پاس چھوڑا تھا۔

"آپ چلے جائیں، مشعل اور میں اکٹھے [illegible] گے۔" اس نے اترتے ہی کہا۔ بلال سر ہلا کر [illegible] گاڑی اڑا لے گئے۔ مشعل کی یہ ٹیچر بھی ایک [illegible] مانے مشہور اسکول میں پڑھاتی تھی اور بڑی [illegible] سے بچی کو پڑھانے پر راضی ہوئی تھی۔ [illegible] اندھی ہو گئی ہو مشعل، کیسے منی کو پکڑا ہوا ہے، [illegible] کیا اسے، کوئی کام آتا ہے تمہیں کرنا کہ [illegible] ابھی چار، پانچ برتن کیا دھونے کو دے دیے،

ایک کپ توڑ ڈالا تم نے اور اب ایک ذرا سی بچی نہیں پکڑی جا رہی تم سے...... میں ذرا کام ہی کر لوں کوئی......" ٹیچر کی آواز نہیں تھی کوئی صورِ اسرافیل تھا جو فضا کے کانوں میں پھونکا گیا تھا۔ انتہائی سلجھی ہوئی اور شائستہ لہجے والی وہ ٹیچر کیسے کرختگی سے اس کی معصوم بچی سے مخاطب تھی۔ فضا کے قدم جیسے زمین میں ہی گڑ گئے تھے۔

بعض اوقات انسان کو سالوں کی تعلیم وہ نہیں سکھا سکتی جو زندگی جیسی پیچیدہ چیز ایک لمحے میں سکھا دیتی ہے۔ وہ تیزی سے ادھ کھلے دروازے سے اندر آئی۔ کارپٹ پر آنکھوں میں آنسو لیے اس کی معصوم مشعل اناڑی پن سے بچی کو پکڑے بیٹھی تھی۔ کفگیر کو ہاتھ میں پکڑے چیختی چلاتی ٹیچر کا رنگ فق ہو گیا اور آواز جیسے دم توڑ گئی۔

ایک چھوٹی سی بات نے اسے بہت کچھ سکھا دیا تھا مگر ساتھ میں آئینہ بھی رکھ دیا تھا۔ جب ہماری نیتوں میں کھوٹ اور اعمال میں فریب ہوگا، ہماری دعائیں کیونکر قبولیت کا درجہ پائیں گی۔ ہماری مناجات اور پوری کوشش کے بعد بھی دعا قبول نہ ہو تو سمجھ جانا چاہیے کہ ہمارے عمل میں کہیں نہ کہیں کھوٹ کی آمیزش ہے۔ اس نے اپنے فرائض کی بجا آوری میں کوتاہی برتی تھی۔ اس کے بیٹے کو منزل کا نشان کہاں سے ملتا؟ حقوق اللہ تو پورے کرتی تھی وہ مگر حقوق العباد...... اپنا کام غلط توجیہات خود کو دے کر دوسروں کے سپرد کر دیتا...... تو اس کی بیٹی کو سچا رہبر کیسے ملتا...... زندگی ہر انسان کو کوئی نہ کوئی ٹھوکر لگا کر صحیح اور غلط کا فرق سمجھا دیتی ہے...... کوئی اسی ٹھوکر سے سنبھل کر اپنا قبلہ درست کر لیتا ہے اور صحیح منزل کی طرف چل پڑتا ہے اور کوئی اگلی اس سے بھی بڑی ٹھوکر کھانے تک ویسے ہی نیت اور اعمال میں...... بے ایمانی کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ فضا اگلی صبح دس سال پرانی والی فضا تھی جبھی اسمبلی سے بھی پہلے آج اسکول میں موجود تھی، اپنے اسکول کے فرائض کی بجا آوری کے لیے پوری تندہی اور خلوصِ نیت کے ساتھ......

امرت

شیریں حیدر

قسط 15

تخلیقِ کائنات سے لے کر اب تک... کئی ادوار بدلے مگر عورت کی کہانی ہر دور میں لگ بھگ وہی رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں رشتوں کی ڈور میں باندھا تو اس کا مقصد یہ تھا کہ ہم اپنی تخلیق کے مقصد کو اور بھی خوب صورت بنائیں مگر اس کے پیدا کردہ دل میں جذبے بھی اسی کے پیدا کردہ تھے۔ محبت، نفرت، رشک، حسد، رنج، غصہ اور خوشی... اب ہم پر منحصر ہوتا ہے کہ ہم کس جذبے کو خود پر حاوی کرلیتے ہیں، یہ ہماری خصلت بن جاتا ہے اور ہماری کل شخصیت کا خلاصہ... یہی ہمارے کردار کی تعمیر کرتا ہے اور ہم اسی کا تاثر دوسروں پر عمر بھر کے لیے چھوڑتے ہیں۔ ہماری عادات صرف ہم پر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی زندگیوں پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ کسی کی زندگی کا سفر کس طرح سہل یا کٹھن ہوتا ہے اس کا انحصار ان لوگوں پر ہوتا ہے جو اُن کی زندگی کے اہم کردار ہوتے ہیں اور جن کا ہونا یا نہ ہونا اہمیت رکھتا ہے۔ پیدائش سے لے کر اپنی موت تک رشتوں کی ڈور سے بندھے ہوئے کردار زندگی کو ہنس کر گزارتے ہیں یا رو کر، مشقت سے سانس لیتے ہیں یا خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھولتے ہوئے اس کا سارا دارومدار ان سے وابستہ رشتوں پر ہوتا ہے۔ وقت بدل جاتے ہیں مگر کہانی وہی رہتی ہے اور اپنی باری سے اس میں مختلف کردار شامل ہوتے رہتے ہیں۔

زندگی کے انہی پیچ و خم اور نشیب و فراز سے نبرد آزما ہوتی ایک چشم کشا تحریر......



تختۂ دار پر جھولتے، جھولتے میں خود بھی دیکھ رہی تھی، جانے ایسا کیسے ہوا تھا، مجھے ہاتھوں پیروں سے باندھ دیا گیا تھا اور پھر مجھے ہوا میں معلق کر دیا گیا تھا، انہوں نے اپنے منہ چھپا رکھے تھے اور کمرا بھی بھرا ہوا تھا۔ نہ میں کسی کو شناخت کر سکتی تھی نہ ان کی تعداد کے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکتی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں نشتر تھے...... پھر انہوں نے خنجروں کا رخ میری طرف کیا اور خود بھی میری طرف بڑھنے لگے۔ میرا سر اُن میں سے ایک نے مضبوطی سے پکڑا، دوسرے نے اپنا خنجر نکالا اور میری گردن پر رکھ دیا۔ میری گردن پر اس خنجر کی تیز اور سرد دھار محسوس ہو رہی تھی، میرا جسم سن ہو گیا تھا، زبان خشک ہو کر تالو سے چپک گئی تھی، چیخنا چاہا تو چیخ بھی نہ سکی تھی۔ ”کوئی ہے جو مجھے بچائے!“ میں پوری قوت سے چیخی، ساری فضا میں میری چیخ کی آواز گونج گئی مگر کوئی مدد کو نہ آیا، یہ ہوا کہ میرے حلق کی حرکت سے خنجر کی نوک نے جلد کو چیر دیا۔ ہولے، ہولے سے لال اور گرم لہو کی ایک باریک ندی میری گردن کے دونوں اطراف سے نیچے کی طرف پھسلنے لگی۔

میرا سر اس تیز دھار خنجر کے ایک اور وار سے تن سے جدا کر دیا گیا اور اسے بالوں سے پکڑ کر ایک بڑے سے کنڈے کے ساتھ چھت سے لٹکا دیا گیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میں اب سب کو دیکھ سکتی تھی۔ ان کی تعداد گن سکتی تھی، باتیں سن سکتی تھی اور دیکھ سکتی تھی کہ وہ میرے تن کے کیسے ٹوٹے کر رہے تھے۔ ایک تیز دھار خنجر میرے پیٹ کے نچلے حصے پر چلا اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیٹ کھل گیا، میں اندر سب کچھ دیکھ سکتی تھی، دل، جگر، پھیپھڑے اور گردے...... اور ہاں اس میں میرا بچہ بھی۔ خنجر رکھ کر انہوں نے ہاتھوں سے الٹ پلٹ شروع کر دی۔ جیسے وہ کچھ ڈھونڈ رہے ہوں۔ انہوں نے میرے پیٹ کے اندر سے کچھ کھینچ کر باہر نکالا۔ کچھ اور...... مزید اور۔ نکالی جانے والی چیز میں کھوکھلی ہو گئی۔ نکالا جانے والا وجود خاموش تھا، چلا نہیں رہا تھا نہ اپنے یوں بے گھر کیے جانے پر رو کر احتجاج کیا تھا۔

میں اب بھی کٹے ہوئے سر کے حلق سے چیخ رہی تھی۔ ”اسے مت نکالو، اسے وہیں رہنے دو، اسے اس بے رحم دنیا میں رُلنے کے لیے مت نکالو، اسے اگر مرنا ہے تو میرے وجود کو ہی اس کی قبر بن جانے دو، اگر اسے جینا ہے تو اسے میرے اندر ہی سانسیں لینے دو مگر اسے وہیں رہنے دو، دنیا میں مت لاؤ۔“

مگر میری فریادیں کوئی نہیں سن رہا تھا، وہ شاید بے حس تھے، اندھے تھے، بہرے تھے مگر گونگے نہ تھے۔ ان کی مسلسل بھنبھناہٹ میں سن رہی تھی، وہ بول رہے تھے اور یوں لگتا تھا کہ جیسے کہیں آگ لگی ہوئی ہو جسے وہ بجھانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کسی کے سانس نہ لینے کی بات ہو رہی تھی۔

”اسپیشلسٹ کو فوراً بلاؤ!“ واضح آواز میرے کان میں آئی تھی۔

میری فریادوں کا کوئی اثر نہ ہوا، اسے نہ صرف میرے وجود سے کھینچ کر باہر نکالا گیا بلکہ اس کے اور میرے بیچ تعلق کی ڈور کو بھی کاٹ دیا گیا۔ وہ ڈور ایک بے مقصد رسی کی طرح ہوا میں جھول رہی تھی، میرے اور اس کے بیچ کا جسمانی ربط ٹوٹ گیا تھا اور میں ادھوری ہو گئی تھی۔ پھر کوئی میرے جسم سے جدا ہونے والے میرے اس اہم حصے کو لے کر بھاگ گیا، اس نے ابھی تک اپنے یوں منقطع کیے جانے پر کوئی احتجاج نہ کیا تھا...... نہ رو کر نہ چلا کر، نہ بول کر نہ ہاتھ پاؤں مار کر۔

تعلق کی رسی ہوا میں جھول رہی تھی، میں اسے پکڑنا چاہتی تھی مگر میرے سر کے ساتھ ہاتھ منسلک نہ تھے، ہاتھ جانے کہاں تھے ”کوئی ہے؟“ میں نے چلا کر کہا۔ ”مجھے اس رسی کا ایک سرا پکڑا دو کوئی میری مدد کرو پلیز!“ کوئی ن نہیں رہا تھا۔ میرے وجود کے اندر سے وہ مسلسل کچھ نکالے جا رہے تھے اور اسے کھوکھلا کیے جا رہے تھے، جانے وہ ڈھونڈ رہے تھے؟ ”کوئی میری سنے گا؟“ میں نے نڈھال ہوتے ہوئے وجود کی آخری طاقت کو جمع کر کے سوال کیا۔

”میں ہوں ناں میری جان!“ ایک مہربان ہاتھ نے مجھے تھام لیا تھا۔ میرے ہوا میں جھولتے ہوئے سر کو اپنے اتھ لگا لیا اور ہوا میں جھولتی تعلق کی اس ڈور کو پکڑ کر میرے ہاتھ میں پکڑا دیا، ہاتھ تختۂ دار پر تھا اور سر...... اب میرا سر بھی ہول نہیں رہا تھا، میرے وجود کو طاقت کا احساس ہوا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا میری جان!“ میرے بالوں میں نرم لیوں کو پھیرتے ہوئے اس مہربان آواز نے کہا۔

”دادی جان؟“ اس لمس میں کیسا جادو تھا، میں مدہوش ہونے لگی، سکون رگوں میں اترنے لگا تھا۔

☆☆☆

”کتنا اندھیرا ہے!“ میں نے سوچا، آنکھیں بند تھیں مگر دماغ کی کوئی کھڑکی کھلی تھی اور کانوں میں کچھ مانوس وازیں آئیں تو احساس ہوا کہ میں اسی دنیا میں تھی، عالم ارواح میں نہیں۔ ابروؤں کو پوری طاقت سے کھینچا مگر پپوٹوں نے ایک دوسرے کو اتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کہ چھوڑا نہیں۔ میں نے کوشش معطل کر دی، کانوں کو غور کرنے کا موقع یا، آوازیں اور کراہیں تھیں، میں کسی ایسی جگہ پر تھی جہاں سب تکلیف میں تھے مگر میں وہاں کیوں تھی؟ مجھے تو کسی کلیف کا احساس نہ تھا، وجود ہلکا پھلکا سا تھا۔ میں کسی بھیانک خواب سے جاگی تھی؟

آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں مگر جسم کے کسی اور حصے کو ہلا جلا کر دیکھنا چاہیے، میں نے سوچا، خواب کے کچھ حصے یاد انے لگے، میرا ہاتھ دادی جان کے ہاتھ میں تھا اور ان کی انگلیوں کی نرم پوریں میرے بالوں میں مساج کر رہی تھیں، لکل ویسے ہی جیسے وہ چھٹی والے دن ہمارے بالوں میں تیل کے ساتھ مساج کرتی تھیں۔ ’مگر دادی جان تو اب اس یا میں نہیں!‘ خیال آیا۔ ’تو کیا میں اس دنیا میں ہوں جہاں پر دادی جان ہیں؟‘ خود سے سوال کیا۔

”آہ!“ پورا جسم دُکھ اٹھا تھا۔ ’وہاں سے جا کر تو کوئی لوٹ کر نہیں آتا!‘ خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ صرف ایک کو ہونٹوں تک لانے کی کوشش کی تھی کہ ہونٹ یوں سوکھ رہے تھے، ان پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں جیسے کہ صحرا میں پیاس ہوتا ہوگا۔ درد کی لہر پیٹ کے نچلے حصے سے اٹھی تھی اور دماغ تک اس کی جھنجناہٹ ہوئی تھی۔ ”ہاہ!“ ایک اور کراہ۔

”میم...... مسز زین کو ہوش آ گیا ہے۔“ ایک آواز سارے میں گونجنے لگی۔ ”میم مسز زین کو ہوش آ گیا ہے!“ ں آواز کی گونج دیواروں اور چھتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ ”میم مسز زین کو ہوش آ گیا ہے۔“ آسمان سے زمین تک ایک آواز تھی۔ ”میم، مسز زین کو ہوش آ گیا ہے۔“

”کمبل......“ میں نے بہ مشکل کہا۔

”آپ کے اوپر دو کمبل ہیں امرت!“ اس آواز سے میں شناسا تھی مگر کس کی تھی، اس وقت دماغ اس کو رجسٹر نہیں پا رہا تھا۔

”تم ٹھیک ہو ناں بیٹا؟“ ایک مہربان سی آواز نے سوال کیا، دادی جان تھیں وہ کیا؟ میں نے آنکھیں کھول کر کی سعی کی مگر آنکھیں نہ کھلیں۔ یوں محسوس ہوا جیسے پلکوں کو آپس میں سی دیا گیا ہو۔

”میری آنکھیں......“ میں نے کہا مگر مجھے خود ہی کچھ اور سنائی دیا تھا۔

”کیا کہا تم نے امرت؟“ اسی شناسا آواز نے سوال کیا۔

”درد محسوس ہو رہا ہے تمہیں کہیں بیٹا؟“ سوال کیا گیا۔

”ہوں......“ کہہ سکی تھی، کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی کہ ایک، ایک روم، ایک، ایک پور، ایک، ایک مسام اور ایک، سود کھ رہا تھا۔

”سب ٹھیک ہو گیا ہے بیٹا!“ اس مہربان آواز والے ہاتھوں نے میرے گال کو تھپتھپایا تھا۔ اتنے گرم ہاتھ جیسے ہک رہے ہوں، میرا وجود اتنا سرد تھا جیسے کسی لاش کا ہوتا ہے۔

''میں کہاں ہوں۔'' اب کے کوشش کر کے میں نے اپنا سوال اُن تک پہنچا دیا تھا۔
''سسٹر ان کے ہونٹوں پر گلیسرین لگائیں، بہت خشک ہو رہے ہیں اور آنکھوں کو بھی صاف کروائیں تا کہ ان کی آنکھیں کھل سکیں۔'' اس شناسا سا آواز نے کہا تھا، میں نے پوری قوت سے ابرو اوپر کھینچے، آنکھیں تو نہیں کھلیں مگر پلکوں کے پردوں کے بیچ جھری بن گئی اور اس میں سے مجھے خود پر جھکے ہوئے دو چہرے نظر آ گئے تھے۔ ایک ڈاکٹر یاسمین تھیں جن کی آواز مجھے شناسا لگ رہی تھی اور دوسری وہ عمر رسیدہ خاتون ڈاکٹر جو اُن کے ساتھ آپریشن تھیٹر میں تھیں، جنہوں نے مجھے بے ہوش کیا تھا۔
''ہوں......'' تکلیف سے نکلنے والی کراہ میں کوشش کے باوجود نہ روک سکی تھی۔ حواس اب لوٹ رہے تھے، مجھے یاد آنے لگا کہ میں کس مرحلے سے گزری تھی، موت کو شکست دی تھی مگر معلوم نہیں کہ فقط اپنی ہی زندگی بچا پائی تھی یا کسی اور کی بھی۔
''تم ٹھیک ہوناں امرت؟'' ڈاکٹر یاسمین نے سوال کیا۔
''جی!'' میں سسکی۔
''تم کل سے بے ہوش رہی ہو، ہوش میں بہت مشکل سے آئی ہو...... تمہارا آپریشن سات گھنٹے طویل تھا، تمہارے جسم نے بے ہوشی کی دوا کو زیادہ ہی سنجیدگی سے لیا اور ہوش میں لانے کی کوششیں ناکام جا رہی تھیں......''
''اللہ کا لاکھ، لاکھ شکر ہے کہ تم اب ٹھیک ہو۔'' دوسری ڈاکٹر نے کہا تھا۔
''ہوں......'' سوال زبان سے نکل ہی نہ رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا اور اس وجود کے ساتھ کیا ہوا جو میرے وجود میں بس رہا تھا، پل رہا تھا، دنیا میں جانے کس انداز سے آیا تھا، اب سوچ رہی تھی کہ وہ ہے بھی کہ نہیں...... میں پھر غنودگی میں جا رہی تھی۔

☆☆☆

''یہ کیا کر رہی ہو تم؟'' اس نے درشتی سے میرا ہاتھ پکڑ کر مروڑا۔ چند منٹ پہلے اتنا مہربان نظر آنے والا اور مجھ پر یوں پیار لٹانے والا کس طرح مجھ سے بات کر رہا تھا۔
''تم پریشان ہو کسی بات سے؟'' میں نے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے بہ مشکل آزاد کروایا۔
وجہ یہ تھی کہ میں اس کے ہاتھ سے سگریٹ چھیننے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کیونکہ میں دیکھ رہی تھی کہ وہ نصف گھنٹے سے ایک سگریٹ سے دوسرا سگریٹ سلگا رہا تھا۔ شادی کے اولین دنوں بلکہ ہفتوں تک وہ میرے سامنے اور کمرے میں سگریٹ نہیں پیتا تھا، نہ ہی گاڑی میں۔ یہ وہ وقت تھا جب میں سمجھوتوں کی سولی پر ٹنگی ہوئی تھی اور اپنی نئی زندگی کو قبول کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ دل ہر وقت اپنی بدقسمتی کے نوحے پڑھتا اور میں کوشش کرتی کہ زین کو میری سوچوں کی بھنک نہ پڑے۔ وہ مجھے چاہتا تھا تو میں بھی پوری ایمانداری سے اسے چاہنا چاہتی تھی۔ محبت کے دھوکے کا وہ وقت اب بیت چکا تھا، وہ دھڑلے سے میرے سامنے اپنی گم گشتہ محبتوں کے رونے روتا علی الاعلان میرے سامنے سگریٹ پیتا اور مجھے لگتا ہے کہ وہ ''بھرے ہوئے'' بھی ہوتے تھے کیونکہ اس کے بعد وہ شانت ہو جاتا تھا۔
اول، اول تو میں نے اپنے وجود کو اپنی گم گشتہ محبت کے سحر سے آزاد کیا تھا اور پوری دیانت داری سے اپنے آپ کو اس کے سپرد کیا تھا، کبھی بھولے سے بھی اپنی سوچوں میں کسی کو نہ آنے دیا۔ زین کی وارفتگیوں نے مجھے جلد ہی بتا دیا کہ میں خوش قسمت تھی، مجھے کیا علم تھا کہ وہ اپنی وارفتگیاں تصور میں کسی اور پر لٹاتا تھا۔
''ہوں؟'' اس نے مجھے حیرت سے دیکھا۔ ''اوہوں!'' مختصر سا جواب۔
''تم ٹھیک تو ہو زین؟''

''ہاں!''
''میرے ساتھ خوش ہوناں؟'' اس کا انداز عجیب سا لگتا تھا، اس کی محبت پا کر بھی مجھے لگتا میں اس کی چاہت نہ تھی۔
''میں تو سمجھا کہ تم پر زبردستی کر کے میری شادی تم سے کر دی گئی ہے۔'' اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے ایش ٹرے میں بجھایا۔
''تمہیں ایسا کیوں لگا زین؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔
''تمہارے رویے سے...... گریز سے!''
''میں اپ سیٹ تھی زین، تم جانتے ہو۔'' میں نے نہ چاہ کر بھی صفائی پیش کی۔
''تایا جان کی وفات سے ہم سبھی متاثر ہوئے تھے مگر تم تو یوں بی ہیو کرتی تھیں جیسے......'' وہ رکا، میری طرف دیکھا۔ ''جیسے تمہیں میرے چھونے سے حقارت محسوس ہوتی ہو، نفرت کرتی ہو تم مجھ سے۔''
''میں تم سے محبت کرتی ہوں زین!'' میں نے اس کے کندھے سے لگ کر کہا۔
''جانِ زین!'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا تھا۔ ''مجھے تو لگنا شروع ہو گیا تھا کہ کہیں تم کسی اور کو تو نہیں چاہتی تھیں۔'' اس نے میرے دل کا چور پکڑا تو میں نے شکر کیا کہ اس کی نظریں میرے چہرے پر نہ تھیں۔
''تمہیں پا کر میں خود کو بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں زین!'' میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا، میرے الفاظ میں سچائی تھی۔ میں خود کو خوش قسمت سمجھتی تھی کہ میں نے اپنے باپ کا مان نہیں توڑا تھا۔

☆☆☆

''اگر میں کہیں باہر ہوا کروں امرت...... جب پاپا پوچھیں تو تم کوئی نہ کوئی بہانہ کر لیا کرو۔'' اس نے اپنے اوپر پرفیوم کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے کہا۔
''بہانہ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''وہ کیوں؟''
''کیونکہ میں دوستوں کے ساتھ باہر جاتا ہوں تو پاپا کو میرے دوست اور میری مصروفیات بری لگتی ہیں...!''
''چاچو کو تمہارے دوست کیوں برے لگتے ہیں زین؟''
''یہ تو انہی کو علم ہو گا۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''شاید ان کا اپنا کوئی دوست نہیں ہے اس لیے، ممکن ہے کہ مجھ سے جیلس ہوتے ہوں۔'' وہ ہنسا۔
''باپ ہیں تمہارے وہ زین!'' میں نے سرزنش کی۔ ''اپنے باپ کے بارے میں یوں بات نہیں کرتے۔''
''اوہ کم آن امرت...... مجھے ایک باپ ہی کافی ہے، تم بھی میرا باپ بننے کی کوشش نہ کرو۔'' اس کے یوں کہنے پر میری ہنسی چھوٹ گئی۔
''مما کو دیکھو، کتنی آزاد خیال ہیں، ہمارے ساتھ دوستوں کی طرح ہیں، اس لیے ہم ہر بات ان کے ساتھ آزادی سے شیئر کر لیتے ہیں۔ وہ میرے سب دوستوں اور میری سب مصروفیات کو جانتی ہیں اور خواہ مخواہ مجھ پر تنقید اور طنز نہیں کرتیں پاپا کی طرح......''
''چاچو طنز یا تنقید نہیں کرتے ہوں گے، انہیں تشویش ہوتی ہو گی جب تم اتنی رات گئے تک گھر پر نہیں ہوتے ہو۔''
''تشویش...... ہونہہ!''
''ہمارے گھر پر بھائیوں کو تاکید تھی کہ مغرب کے وقت گھر لوٹ آیا کریں، دادی جان، ابو جان اور امو جان...... اس بات کو یقینی بناتے تھے کہ ان کے دوستوں کے بارے میں مکمل معلومات ہوں۔ بھائی جب جاتے تھے تو بتا کر جاتے تھے کہ کس دوست کے ہاں اور کیوں جا رہے ہیں، کتنی دیر میں لوٹیں گے۔ جب اس وقت تک نہیں لوٹتے تھے تو

ظاہر ہے کہ والدین کو تشویش ہوتی تھی۔“

”تو کیا وہ اُن کے پیچھے ٹیلی فون کھڑکاتے تھے کہ فوراً لوٹیں؟“

”نہیں...... ایسی نوبت ہی کبھی نہیں آئی اور اگر کوئی چند منٹ کی دیر سویر ہو جاتی تو بھائی خود ہی فون کر کے بتا دیتے تھے یا گھر لوٹ کر معذرت کر لیتے تھے۔“

”تم، تمہارے بھائی اور باقی خاندان جس فرسودہ نظامِ زندگی کا حصہ ہیں، بدقسمتی سے میرے پاپا کا بھی وہی بیک گراؤنڈ ہے۔ شہر آ کر رہائش اختیار کر لی، کاروبار کیا، پیسہ کمایا، ترقی کر لی، ایک ماڈرن خاندان میں شادی کر لی، اولادوں کے لیے خواب بُنے اور ان کی تعبیر کے لیے مجھے اٹھارہ سال کی عمر میں دیس نکالا دے دیا...... مگر“ وہ رکا۔ ”اتنا کچھ بدل کر بھی......“ اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ”اگر کچھ نہیں بدلا تو وہ ان کے اندر کا پینڈو پن ہے۔“ اس نے ایک ہی ہلے میں میرے سارے خاندان کو پینڈو کہہ دیا تھا۔

مجھے تو اس لفظ پر کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا، اگر ہمارا تعلق ایک گاؤں سے تھا تو اصل اہمیت اس بات کی تھی کہ گاؤں میں پیدا ہو کر بھی ہمارے ماں باپ کی سوچ میں اتنی وسعت تھی کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کے ساتھ، ساتھ ہم دو بیٹیوں کو بھی تعلیم کے حصول کے لیے چار سال تک گوجرانوالہ ہر روز بھیجا اور دو سال تک لاہور میں ہاسٹل میں رکھ کر پڑھایا تھا۔ ان کے ہم پر اعتماد کی انتہا ہی تو تھی اور ہم نے اس اعتماد کو قائم رکھنے کی پوری کوشش کی تھی۔ یونیورسٹی میں یوں تو ہم لیے دیے رہتے تھے مگر دوستوں میں سے جب بھی کوئی پوچھتا کہ ہمارا تعلق کہاں سے ہے اور جب میں بتاتی کہ نور پور سے تو تمنا بہت جھلاتی تھی۔ مجھے چٹکی کاٹتی، اسے پہلے بولنے کا موقع ملتا تو وہ فوراً کہتی۔ ”گوجرانوالہ سے۔“

”تم ایسا کیوں کہتی ہو تمنا؟“ میں بعد میں اسے پوچھتی۔ ”نور پور سے تعلق ہونا کیا کوئی ایسی بات ہے کہ جس کی وجہ سے ہم احساسِ کمتری کا شکار ہوں؟“

”کوئی ایسی برتری والی بات بھی نہیں ہے، جیسے نور پور۔ نیویارک کے ساتھ ہی تو ہو۔“ وہ کہتی تو میری ہنسی نکل جاتی۔

☆☆☆

ماں باپ کی عزت اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے ہی تو چلتی ہیں ہم بیٹیاں۔ مجھے بھی ہر لمحہ اپنے والدین اور بھائیوں کی آن کا خیال رہتا تھا مگر نصف وقت ”خیریت“ سے نکال کر باقی نصف وقت میں، میں خود کو اس محبت کے سحر سے بچا نہ سکی جس نے میرے دل پر نقب لگائی تھی۔ بس یہ احساس تھا کہ میں اس محبت کو پا لوں گی، مجھے کامل کی لگن پر بھی یقین تھا اور اپنی قسمت کی خوبی پر بھی...... پھر بھی میرے دامن میں آج تک اس بات کا پچھتاوا نہیں کہ میں نے کچھ غلط کیا۔ جو جذبہ میرے دل میں جاگا تھا وہ تو فطری امر تھا، اللہ کے حکم سے ہوا تھا مگر اس کی پاکیزگی کو برقرار رکھ کر میں نے خود کو پچھتاؤوں سے بچا لیا تھا۔ میرے پاس کوئی ایسا لمحہ نہیں کہ جس سے مجھے کوئی احساسِ شرمندگی ہو۔

محبت کے اس احساس کو ہم نے دلوں میں سینچا تھا، روحوں سے ملایا تھا، جسمانی ربط کی طلب ہی نہ ہوئی تھی۔ ہاتھ کی پشت پر چند غیر محسوس سے لمس تھے جن میں اس ناکام محبت کی خوشبو بستی تھی۔ تنہائی میں وہ لمس جاگ اٹھتے اور میں اپنے ہاتھوں کی پشت کو گالوں پر لگا کر، ناک کے قریب لے جا کر اُن کی خوشبو کو اپنے اندر اتارتی تھی۔ ایسا بھی صرف تب تک ہوا تھا جب تک میں تنہا تھی، پُرامید تھی اور وعدوں کی ڈور کو تھامے ہوئے تھی۔ جونہی وہ میری دسترس سے باہر ہوا، میں نے اسے سوچنا چھوڑ دیا، کچھ عرصہ تو سانسیں بھی لگتا تھا کہ رک، رک کر آ رہی ہیں مگر خود کو عادی تو کرنا تھا اس کے بغیر۔ اسے چھوڑنے اور زین کو خود کو سونپنے کے بیچ کوئی عرصہ تھا ہی نہیں کہ ان یادوں کے لیے مرقد بنا لیتی، سو زین کی محبت سے ہی گرد اڑ، اڑ کر ان یادوں پر پڑنے لگی۔

☆☆☆

”میں تمہیں پہلی بار کب اچھی لگی تھی زین؟“ میں نے اس کی بانہوں کے حلقے میں سمٹ کر سوال کیا۔

”تمہیں کس نے کہا کہ تم مجھے اچھی لگی تھیں؟“ میں نے...... ایک دم اس کے چہرے کی طرف دیکھا، یقیناً وہ مذاق کر رہا تھا مگر نہیں۔ میرے دل میں کچھ ٹوٹا۔

”تو پھر تم نے شادی کیوں کی مجھ سے......؟“ میں نے سوال کیا۔

”کسی نہ کسی سے تو کرنا تھی ناں!“ وہ ہنسا۔

”تو کسی اور سے کر لیتے...... مجھ سے ہی کیوں کی؟“ میں ٹھٹکی۔

”بھئی تم سے اس لیے کہ میں اپنے پاپا کو خوش کر سکوں۔“

”اچھا جی؟“ میں نے مصنوعی ناراضی سے کہا۔ ”ویسے کتنا عجیب اتفاق ہے کہ میں نے بھی تم سے شادی اپنے... ابا جان کو خوش کرنے کے لیے ہی کی تھی۔“

”ورنہ تم کسی اور سے کرتیں؟“ اس نے میرے چہرے پر کچھ کھوجا۔

”ظاہر ہے بھئی، تم نے مجبوری میں شادی کی ہے، جو مجبور نہ ہوتے تو اپنی مرضی سے کر لیتے...... اس لیے......“ میں نے اسے جلانے کے لیے مذاق کے لہجے میں وہی بات کہی جو اس نے مجھ سے کہی تھی۔

”امرت آج تم نے مجھے دوبدو جواب دیا ہے ناں...... مجھے بہت برا لگا ہے، آئندہ سے ایسا بھونڈا مذاق نہ کرنا......“ اس نے میرے وجود کو جھٹکا۔

”کیا ہو گیا ہے زین، کیا کہہ دیا ہے میں نے؟“ میں یوں اچانک اس کے بدلے ہوئے انداز سے پریشان ہو گئی تھی۔

”کہ تم نے مجبوری میں میرے ساتھ شادی کی ہے۔“

”تم نے ایسا کہا تو میں نے بھی مذاق میں کہہ دیا۔“ میں نے نرمی سے کہا۔ ”اگر تمہیں برا لگا ہے تو سوری!“

''ہونہہ سوری...... مائی فٹ! مرد کو چار' چار شادیوں کی اجازت کسی وجہ سے دی گئی ہے اور اس کی فطرت ہے کہ وہ کسی ایک پر مطمئن نہیں ہوتا...... مگر عورت اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے کسی اور کے بارے میں سوچے تو یہ گناہِ کبیرہ ہے۔'' نماز نہ قرآن مگر سنی سنائی باتوں سے اسے پورا علم تھا کہ مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہوتی ہے...... کیوں اور کن حالات میں، اس کا علم غالباً نہیں ہوگا۔ اور چار شادیوں کے لیے شرائط کیا ہیں، اس کی بابت بھی وہ کچھ نہیں جانتا ہوگا۔

''تم اتنا سیریس کیوں ہو رہے ہو زین؟''

''میں سیریس ہوں...... واقعی سیریس ہوں۔ ایک، ایک لفظ جو میں نے کہا ہے وہ سچ ہے۔''

''کون سا ایک، ایک لفظ؟'' میں نے حیرت سے سوال کیا۔

''کہ میں نے تم سے شادی کر کے اپنے باپ کے ساتھ اپنی مجبوری کا سودا کیا ہے اور میں عمر بھر کے لیے اس سودے میں بندھے رہنے کا پابند نہیں ہوں۔''

''ہوں!'' میں نے سینے کی گہرائی سے سانس لی، اسے روکا اور آہستہ، آہستہ چھوڑا۔

'میں نے بھی مجبوری میں اپنے باپ کی بات مانی تھی۔'' میں نے اس کے چہرے کو دیکھ کر صرف سوچا۔ 'مگر میں...... بدقسمتی سے عمر بھر اس مجبوری کے سودے سے بندھی رہنے کی پابند ہوں۔ کیونکہ میرا باپ اب اس دنیا میں نہیں ہے اور ماں کو میں دکھ نہیں دے سکتی...... یوں بھی میرے ہاتھ میں کسی کے پاس لوٹ کر جانے کا کوئی آپشن نہیں ہے...... جو داستان مکمل ہونے سے پہلے پھاڑ کر پھینک دی گئی تھی اسے اب کوئی دوبارہ تحریر کیوں کرتا؟'

''کیا سوچ رہی ہو تم؟'' اس نے خالی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''میں نے کیا سوچنا ہے؟'' میں نے باقی کی سانس کو یکمشت خارج کیا۔ ''سوچتے تو وہ ہیں جن کے پاس دماغ ہوتا ہے۔''

''چلو شکر ہے کہ تم نے آج اس بات کا اعتراف تو کر لیا۔'' وہ منہ پھاڑ کر ہنسا تھا، میری بے بسی پر یا اپنی بے حیائی پر۔

☆☆☆

''آج تم بہت پیاری لگ رہی تھیں۔'' اس نے میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہا۔ میں تھوڑی دیر پہلے ہی کمرے میں آئی تھی۔ تمنا کی شادی کے بعد اس کے سسرال کے ساتھ امو جان نے چاچو کی پوری فیملی کو اپنے ہاں کھانے پر مدعو کیا تھا اور ساتھ گاؤں میں رہنے والے باقی لوگوں کو بھی۔ دیر تک امو جان کے پاس میں اور تمنا بیٹھی رہی تھیں، اپنے بچپن کی کئی باتیں یاد کر، کر کے ہنستی رہی تھیں۔ شامیر کو کتنا مس کیا تھا، اس شام صرف وہ نہ تھا اور ابو جان کی وفات کے بعد پہلی بار ان کے گھر میں اتنی رونق لگی تھی۔

''شکریہ...... تمہارا حسنِ نظر ہے۔'' میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

''صرف مجھے ہی نہیں، تم بہت سے لوگوں کو اچھی لگ رہی تھیں۔''

''اچھا...... وہ بہت سے لوگ کون ہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''سرمد تو تمہیں مسلسل اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔'' اس کے کہنے پر میرا دل عجیب انداز سے دھڑکا تھا۔

''وہ کیوں مجھے دیکھیں گے بھلا، ان کی اپنی اتنی پیاری بیوی ہے۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔ ''مجھے تو صرف تمہارا دیکھنا اور سراہنا اچھا لگتا ہے زین!''

''تمہیں محسوس نہیں ہوا کہ وہ تمہیں کس وارفتگی سے دیکھ رہا تھا، میں نے تو سنا ہے کہ عورت اپنے اوپر پڑنے والی ہر نگاہ کا مفہوم سمجھتی ہے...... جانتی ہے کہ کون اسے کس نیت سے دیکھ رہا ہے۔''

''سچ، میں تو مہمانوں کی خاطر داری میں ایسی مصروف تھی کہ ایسی کسی بات پر غور ہی نہیں کیا...... اور کیا بھائی اگر بہنوں کو دیکھیں تو اس میں کوئی برائی ہے؟''

''کون سے بھائی ہیں جو اپنی بہنوں کے لیے رشتے بھیجتے ہیں؟'' اس نے کڑا کے سے کہا تو گویا اس نے مجھ پر اپنی ریسرچ مکمل کر رکھی تھی، کاش اس سے نصف ریسرچ میرے ابو جان نے بھی اس کے بارے میں کی ہوتی۔

''وہ ماضی ہے زین......'' میں نے تحمل سے کہا۔ ''جس گھر میں لڑکیاں ہوتی ہیں اس گھر میں رشتوں کا آنا کوئی انوکھی یا انہونی بات نہیں ہے۔ میرے لیے جانے کس، کس کا رشتہ آیا ہوگا اور اسی طرح تمنا کے لیے۔ نصیب تو انسان کا اللہ نے لکھا ہے، جہاں جوڑ ابنا ہوتا ہے وہاں خود بخود رشتہ فائنل ہو جاتا ہے۔''

''دیکھو امرت!'' اس نے میری طرف انگلی اٹھائی۔ ''مجھے اتنا بھولا بن کر دکھانے کی ضرورت نہیں ہے، میں تمہارے چلتروں کو سمجھتا ہوں۔ کون سی شریف لڑکی ہے جو نصف شب کو جاگ رہی ہو اور اپنے کمرے کی بتی جلا کر دروازہ بھی کھلا رکھا ہو کہ کوئی اس کی کشش سے کھنچ کر اس کمرے تک آئے۔ پھر تم اپنا بستر چھوڑ کر اس کے ساتھ تنہا لاؤنج میں وقت گزارو، اسے کافی بنا کر دو، اپنی اداؤں سے اس کا دل جیتنے کی کوشش کرو۔'' دھک، بھک...... جانے کیا، کیا دھماکے ہو رہے تھے، میں اس کی باتوں کا کیا جواب دیتی۔ ''یونہی تو نہیں تمنا نے میثاق کو پھنسایا اور تم نے مجھے!''

''تو تم تو پوری طرح نہیں پھنسے...... تمہارے دل میں تو اب بھی کوئی اور بستی ہے، تم اب بھی اس سے ملتے ہو، تنہائی میں بھی۔'' میں نے رسان سے کہا۔ ''میں نے کم از کم تمہارے ساتھ کوئی بددیانتی نہیں کی۔''

''تو کیوں چپکی ہوئی ہو تم مجھ سے اگر میں اتنا ہی برا ہوں؟'' وہ چیخا۔ ''دفعان کیوں نہیں ہو جاتی ہو تم میری زندگی سے۔''

''آہستہ بات کرو زین!'' میں نے اسے کہا۔ ''میں کیوں دفعان ہو جاؤں، میرے ساتھ شادی ہوئی ہے تمہاری، ہم ایک مقدس رشتے کی ڈور میں بندھے ہیں، تمہاری زندگی سے اگر کسی کو نکلنا چاہیے تو وہ ان کو نکلنا ہوگا جن کے ساتھ تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔''

''بن جائے گا اس سے بھی رشتہ...... بہت جلد......'' اس نے کہا۔ ''بس ذرا مجھے اپنے باپ کو یقین دلا لینے دو کہ میں نے ان کی پسند سے شادی کی ہے اور وہ مجھ پر پورا بھروسا کرتے ہوئے اپنے کاروبار کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں پکڑا سکتے ہیں۔''

☆☆☆

''یہ کیا بکواس ہے...... کیا تم ہر وقت زانی، زانی کہتی ہو مجھے؟'' اس نے میرے بالوں کی بنی ہوئی چٹیا کو ہی میری گردن کے گرد بل دے کر کھینچا، اس طرح کہ میری سانس رکنے لگی۔

''میرے بال چھوڑو اور میری گردن بھی زین!'' میں نے گھٹی، گھٹی آواز میں کہا۔

''مار ڈالوں گا میں تمہیں، اس کے بعد اگر تم ایک لفظ بھی بولیں تو!''

''میں تمہیں غلط راستے پر چلتے دیکھ کر کیونکر خاموش رہ سکتی ہوں زین!''

''کیا غلط کیا ہے میں نے؟'' اس نے دانت پیس کر کہا، جھٹکے سے مجھے چھوڑا اور بیڈ پر پٹخا۔

''رات جب میں نے تمہیں فون کیا تو تم کسی لڑکی کے ساتھ تھے...... اور پس منظر میں آنے والی آوازیں......'' میں اس سے زیادہ وضاحت نہ کر سکی تھی۔

''تو...... تو کیا ہوا؟'' اس نے اپنے پاؤں سے میرے گھٹنے پر ٹھوکر ماری۔ ''میں زارا کے ساتھ تھا اس کے گھر پر، اس کے کمرے میں...... بس یا مزید تفصیل بھی سننا چاہتی ہو تم؟''

''کس رشتے سے...... کس ناتے سے تم رات کو ایک بجے اس کے کمرے میں تھے...... کیا ان کی ماں بھی وہیں تھی

یا تم دونوں؟'' آخر بیوی تھی میں اس کی اور اس سے استفسار کر سکتی تھی جو کہ اسے بھلا نہ لگ رہا تھا۔

''تمہاری ماں ہوتی ہے ہمارے ساتھ رات کو ایک بجے اس کمرے میں؟''

''میں تمہارے نکاح میں ہوں، بیوی ہوں تمہاری، میری ماں کیوں اس کمرے میں ہوگی۔'' میں نے جواب دیا۔

''زارا کے اور تمہارے بیچ کوئی شرعی رشتہ نہیں ہے...... اس سے تمہارا تعلق گناہ ہے، صرف یہ بتانے کی کوشش کر رہی ہوں میں۔''

''ہو جائے گا شرعی بھی۔'' وہ طنز سے ہنسا۔

''بہتر ہے زین کہ تم اس سے نکاح کر لو......'' میں نے دل پر پتھر رکھا۔'' تمہارا اس سے بغیر شادی کے تعلق زنا کے زمرے میں آتا ہے، بس اتنی سی بات میں نے تم سے کہی اور تم نے اس کا بتنگڑ بنا لیا ہے۔''

''تمہیں ہمارے تعلق کی نوعیت کا کیا پتا...... میرے باپ کو بھی نہیں پتا۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔'' اس کے بعد تم مجھے یہ لفظ نہ کہنا سمجھیں، ہم دونوں کے بیچ تو دلوں اور روحوں کا تعلق ہے، یہ شادی وادی، نکاح شکاح...... سب بے معنی رشتے ہیں، تم سے نکاح کر کے کیا میں تمہاری محبت میں مبتلا ہو گیا ہوں؟''

''کم از کم ہمارے بیچ کے جسمانی تعلق کی بنیاد تو ہے ناں!'' میں نے اپنا لہجہ نرم کیا۔'' ضمیر پر اس بات کا بوجھ تو نہیں ہوتا۔''

''ہمارے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہے! دو لوگ جس جسمانی تعلق کو اپنی مرضی سے قائم کریں اسے زنا کون کہتا ہے؟'' اس نے مضحکہ خیز انداز میں سوال کیا۔

''قرآن کہتا ہے اسے زنا!'' میں نے چیخ کر کہا۔'' اور اس کی سزا سنگساری ہے سمجھے تم۔'' میں نے دانت پیسے۔

''تو چلو تم حد نافذ کرو...... سنگسار کر دو ہم دونوں کو...... لگا دو شکایت پولیس کو اور کہو کہ ہم دونوں مجرم ہیں...... محبت کے، پیار کے، ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کے، اس لیے ساتھ رہتے ہیں، اس لیے ہر روز ملتے ہیں کہ نہ ملے تو مر جائیں گے۔ وہ کہتی ہے کہ جس روز وہ مجھے نہ دیکھے، اس دن کو وہ اپنی عمر میں شمار نہیں کرتی۔''

''لعنت ہے تم دونوں پر!'' وہ پہلا دن تھا جس دن میں نے اس سے کھل کر بات کی تھی، اس نے کھل کر اپنی اور زارا کی محبت اور تعلق کا اقرار کیا تھا جس پر اسے کوئی شرمندگی نہ تھی۔ وہ یہ سارے ارشادات فرما کر سو گیا تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ میں نے کون سا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں مجھے اتنا بدکردار شوہر ملا۔ اس روز پہلی بار کھل کر مجھے اس سے نفرت ہوئی تھی اور میں نے اس کے منہ پر اس پر اور زارا پر لعنت بھیجی تھی۔

☆☆☆

اسی واقعے کی اگلی صبح فجر کے وقت جانماز پر بیٹھے ہوئے دعا کے لیے ہاتھ اٹھے تو میں زار، زار رونے لگی، گڑگڑانے لگی، اللہ تعالیٰ سے رو رو کر اس کے لیے ہدایت مانگی تھی۔ دل میں یہی خیال آیا کہ میں خود کو اتنی پاک دامن سمجھ کر رات کو شکوہ کر بیٹھی تھی کہ جانے کس گناہ کی پاداش میں وہ میرا شوہر بنا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ میری کسی بات سے وہ ہدایت پا جائے، توبہ کر لے، گناہ کے راستے سے پلٹ آئے۔ میں نے اپنے تکبر کے بول کی بھی معافی مانگی اور دل میں کئی عہد کیے، خلوص سے کئی دعائیں مانگیں۔

نماز کے بعد جب میں قرآن مجید کھول رہی تھی تو سورۂ نسا کھول لی، اس کا صرف ترجمہ اور تفسیر پڑھنے لگی۔ نصف گھنٹا یوں تیزی سے گزر گیا، نماز کے بعد الارم لگا کر میں ہر روز نصف گھنٹے کے لیے قرآن پاک پڑھتی تھی اور پھر اسکول کے لیے تیار ہوتی تھی۔ قرآن پاک کو سمیٹا، جانماز تہ کی اور ایک نئے عزم کے ساتھ تیار ہونے لگی۔ اپنی تیاری مکمل ہوئی تو میں نے حسب عادت زین کو جگایا۔

''زین...... زین!'' میں نے اسے نرمی سے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تھا، ہر روز کی طرح۔'' جاگو، دفتر نہیں جانا ہے تمہیں؟''

''تنگ مت کرو مجھے تم......'' اس نے چادر منہ تک کھینچی۔

''لیٹ ہو جاؤ گے پیارے!'' میں نے اس کے پاس بیٹھ کر پیار سے کہا۔

''تم دفعان ہو جاؤ...... میری پروا چھوڑ دو، اپنی شکل گم کرو میری نظروں کے سامنے سے۔'' اس نے میری کمر میں کہنی ماری اور میں اپنے آنسو ضبط کرتی ہوئی اپنی شکل گم کرنے کے لیے اس کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

''تم روئی ہو کسی بات پر؟'' سارہ کی ایکسرے مشین جیسی آنکھیں۔

''نہیں تو......'' میں نے زمین پر کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

''میری طرف دیکھو امرت!'' اس نے میرا گھٹنا چھوا۔

''تمہارا کام ختم ہو گیا اپنی کلاس کا؟'' میں نے یونہی جھکے، جھکے پوچھا۔

''تم مجھے اپنی کلاس سے نکالنا چاہتی ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

''سارہ میری دوسری ٹیچر آتی ہی ہوگی، پلیز تم اس وقت مجھے نہ چھیڑو!'' میں نے اسے سمجھایا، آنکھیں خشک تو تھیں مگر متورم ہو رہی تھیں۔ اس روز بچوں کی چھٹی تھی، تمام ٹیچرز اپنی اپنی کلاسوں کی سجاوٹ کے لیے اسکول آئی تھیں کیونکہ اگلے روز والدین اور اساتذہ کی میٹنگ تھی، امتحانات سے قبل سلیبس اور بچوں کے ماہانہ ٹسٹ کی رپورٹ دینے کے سلسلے کی اس میٹنگ کے لیے ہر دو ماہ کے بعد اسی طرح محنت سے کلاسیں سجانا پڑتی تھیں۔ اس روز دفتر کے اسٹاف میں سے کوئی بھی اپنی کرسی پر موجود نہ تھا اس لیے نسبتاً آزادی محسوس ہو رہی تھی۔

''اٹھو میرے ساتھ کینٹین چلو......'' اس نے میرے ہاتھ سے قینچی اور ربن چھین کر میز پر رکھے چارٹ پیپر پر رکھے۔'' جب تک تم مجھ سے بات نہیں کرو گی، میں تمہیں چھوڑنے والی نہیں ہوں۔'' اس نے مجھے کھینچا۔'' کام ہوتا رہے گا۔''

''سارہ پلیز...... مجھے جلدی کام ختم کر کے واپس جانا ہے۔'' وہ سارہ تو نہ ہوتی جو میری ایک بھی سن لیتی۔

''سارہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' کینٹین میں سموسہ چاٹ کھاتے ہوئے میں نے اسے دسویں بار کہا تھا مگر وہ جو مان کر دے۔

''مجھے صرف یہ بتاؤ کہ زین نے کیا کہا ہے؟'' اس نے ضدی انداز میں سوال کیا۔

''میں تمہیں سچ کہہ رہی ہوں......'' میں نے اسے پھر یقین دلایا۔'' میں نماز کے بعد روتی رہی ہوں۔''

''مگر کیوں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''ندامت سے اور پچھتاوے سے سارہ!''

''کس بات کی ندامت؟''

''میں نے رات زین کو بہت برا بھلا کہہ دیا تھا، بہت rude ہو گئی تھی اس کے ساتھ، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''کوئی شخص نامعقولیت کی بہت سی حدیں پھلانگے گا تو ہی امرت اس کے ساتھ rude ہو سکتی ہے!'' اس نے ... کر کہا۔'' یہ بات میں دعوے سے کہتی ہوں۔''

''اب اتنی بھی اچھی نہیں ہوں میں۔'' میں نے مسکرانے کی سعی کی۔

''تمہارے بارے میں اپنی رائے میں اپنے خون سے لکھ کر دے سکتی ہوں۔'' اس نے پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''میں کیا کرتی سارہ اگر اللہ نے تمہیں اس دنیا میں نہ بھیجا ہوتا۔''

''کاش اللہ نے مجھے سارہ بنا کر دنیا میں بھیجنے کے بجائے مرد بنا کر بھیجا ہوتا......اور تمہیں میرے نصیب میں لکھا ہوتا۔'' اس نے پوری سچائی سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تمہاری نیت مجھ پر خراب ہے......'' میں نے بات کو مذاق میں ٹالا۔

''اچھی خاصی!'' وہ بھی قہقہہ لگا کر ہنسی۔ ''اب بتاؤ کہ کیا ہوا تھا؟'' اصل سوال اب بھی اس کے ذہن میں سوالیہ نشان کی طرح تھا، اس سے فرار ممکن نہ تھا۔ میں نے اصل بات گول کر دی اور اسے بتایا کہ یونہی خواہ مخواہ چھوٹی سی بات پر زین سے تکرار ہو گئی تھی۔

☆☆☆

''ماما!'' میں ان کے کمرے میں گئی تھی۔ وہ پاؤں پر کوئی لوشن لگا کر ٹانگیں پسارے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھیں، پیروں کے نیچے تولیا تھا اور وہ فون سیٹ پر کچھ کر رہی تھیں۔

''آؤ آؤ......'' وہ ذرا سا سمٹیں۔ ''بیٹھو وہاں!'' انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا مگر میں ان کے پیروں کے پاس ان کے بیڈ پر ہی ٹک گئی۔

''میں یہاں ٹھیک ہوں۔''

''کہو کوئی بات کرنی ہے؟'' انہوں نے فون پر کوئی پیغام پڑھا، مسکرا کر اس کا جواب دیا اور فون کو بیڈ پر الٹا رکھ دیا۔

''جاب پر سب ٹھیک تو ہے ناں؟''

''جی......جاب تو ٹھیک ہے۔'' میں رکی۔ ''گھر پر ہی کوئی مسئلہ ہے ماما!''

''کیا ہوا ہے گھر پر، ملازموں میں سے کسی نے چھٹی مانگ لی ہے کیا؟''

''گھر کے ملازم مجھ سے چھٹی نہیں مانگتے ماما!'' میں نے کہا۔

''بھئی وہ اسی طرح کرتے ہیں، سیدھے سبھاؤ بات کرنے کی جرأت تو ہوتی نہیں تو کبھی کسی کی سفارش اور کبھی کسی کی۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں!'' میں انہیں یہ تک نہ کہہ سکی کہ گھر کے سارے ملازمین میری اوقات سے بھی واقف ہیں اور گھر والوں کے میرے ساتھ سلوک سے بھی۔ ساجدہ کے ذریعے جو رائے کبھی کبھار سننے کو ملتی تھی اس سے یہی معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ میں ساجدہ کو ڈانٹ دیتی تھی یا اسے سرزنش کرتی تھی کہ ملازموں کو گھر کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے مگر اس سے حقیقت کا چہرہ تبدیل نہیں ہو سکتا تھا۔

''تو پھر کیا بات ہے؟'' انہوں نے ابرو اچکائے۔ ''جلدی بات کرو، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔'' انہوں نے الٹا پڑا ہوا فون اٹھایا، اس پر پیغام پڑھا اور مختصر سا کوئی جواب لکھ کر میری طرف متوجہ ہوئیں۔ ان کے پاس وقت کا نہ ہونا ہی تو ان کی زندگی کا اور اس گھر کا سب سے بڑا المیہ تھا، ساری خرابیوں کی جڑ اور سارے مسائل کی ماں۔

''ماما آپ زین کے سارے دوستوں کو جانتی ہیں؟'' میں نے ڈرتے، ڈرتے کہا۔

''ہاں......تقریباً کیوں کیا ہوا ہے؟'' انہوں نے اعتراف، شک اور سوال سے بھرا جملہ رک، رک کر پورا کیا۔

''آپ کو یہ بھی علم ہے کہ اس کے دوستوں میں لڑکیاں بھی ہیں؟'' میں نے جھجک کر کہا۔

''تو؟'' چتون چڑھا کر انہوں نے پوچھا۔

''تو آپ کو اس میں کچھ برا نہیں لگتا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہارے اندر سے نور پور والی سوچ نکلتی کیوں نہیں امرت؟'' انہوں نے مجھے ہی لتاڑ دیا۔ ''کیوں تم اتنی پسماندہ ہو، بچے شہروں میں رہے ہیں، مخلوط تعلیمی اداروں میں پڑھے ہیں......اور ان کی دوستیوں میں مرد و زن کی تفریق نہیں ہوتی۔'' انہوں نے وضاحت کی۔ ''اپر کلاس میں دوستی کا مطلب دوستی ہوتا ہے......نہ کوئی لڑکا ہوتا ہے اور نہ کوئی لڑکی۔ اگر میں اپنے کسی اسکول، کالج یا یونیورسٹی کے دوست کو سرِ راہ ملوں اور اس سے ہیلو ہائے کر لوں، فون یا فیس بک پر اس سے رابطہ کر لوں تو کیا جمال ہر وقت میری ٹوہ میں رہنے لگے گا، کیا اسے لگے گا کہ میں کسی اور کے عشق میں مبتلا ہو گئی ہوں؟'' انہوں نے لیکچر جھاڑا۔ ''اب یہی دیکھ لو، میرے اسکول کے زمانے کا فرینڈ ہے عرفی، جانے کہاں سے ڈھونڈ کر مجھے نکالا ہے، ابھی تک اس نے شادی نہیں کی، مجھے کہہ رہا ہے کہ میں اسے اپنے جیسی کوئی ڈھونڈ کر دوں۔'' انہوں نے فون پر ہونے والی پیغام رسانی کا حوالہ دیا۔ ''تو کیا کوئی سننے والا سمجھے گا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے، جمال کو علم ہوگا تو وہ مجھ پر شک کرنے لگے گا کہ میرے اور میرے دوست کے بیچ کچھ غلط سلط سلسلہ ہے؟''

''مرد و زن کے بیچ کوئی دوستی نہیں ہوتی ماما اور اگر ایسا ہو رہا ہے تو اس دوستی کی کوئی حدود تو ہوتی ہوں گی؟''

''تو زین اگر اپنے دوستوں سے مل لیتا ہے، ان سے گپ شپ لگا لیتا ہے، سگریٹ پی لیتا ہے، اسنوکر کھیل لیتا ہے، فلمیں دیکھ لیتا ہے......تمہیں لگتا ہے کہ یہ سب اس کی حدود سے باہر ہے، یہ سب گناہ ہے، اسے اس کی بیوی، والدین اور معاشرہ ایسی دوستیوں کی اجازت نہ دے کیونکہ اس کی بیوی ان دوستوں سے حسد کا شکار ہو گئی ہے؟'' وہ چتون چڑھا کر بولیں۔

''بات اس سے کہیں آگے ہے ماما!''

''کیا آگے ہے؟'' وہ چلّائیں۔ ''سوتا ہے کیا وہ لڑکیوں کے ساتھ؟''

''جاگتا ہے وہ ان کے ساتھ راتوں کو ماما!'' میں نے اپنا لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کی۔ ''کاش آپ میری بات کو سمجھیں، سوتا وہ گھر پر آ کر ہی ہے، اس لیے آپ اور چاچو سمجھتے ہیں کہ وہ گھر پر ہی ہوتا ہے۔''

''یہ کیا فضول بات ہے امرت!'' انہوں نے مجھے جھاڑا۔ ''شرم آنی چاہیے تمہیں میرے بیٹے پر ایسا الزام لگاتے ہوئے۔''

''آپ کا بیٹا......'' میں نے گہری سانس لی۔ ''وہ ایسا کرتا ہے ماما، دھڑلے سے کرتا ہے اور اس نے میرے سامنے اس بات کو تسلیم کیا ہے، نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ ایسا کرنے میں وہ حق بجانب ہے......وہ اسے گناہ بھی نہیں سمجھتا ماما اور کہتا ہے کہ گناہ صرف تب ہوتا ہے جب کسی لڑکی کے ساتھ جبر ہو رہا ہو، جو جسمانی ناجائز تعلق اور رشتہ فریقین کی مرضی سے استوار کیا جاتا ہے اسے وہ ٹھیک سمجھتا ہے۔''

''اگر وہ ایسا کہتا ہے تو ایسا ہی ہوگا، وہ کون سا کسی کے ساتھ زور زبردستی کرتا ہوگا، آج کل کی لڑکیاں ایسی ہی ہیں، شاطر، چالاک اور ان میں سے کسی نے اگر زین کو پھنسا لیا ہے تو......'' وہ رکیں۔ ''تم تسلی رکھو، میں زین کو سمجھاؤں گی۔''

''زین یا آپ چاہے جو بھی کہیں ماما مگر قرآن یہ نہیں کہتا، میں نے بڑی وضاحت سے دوبارہ سب کچھ پڑھا ہے......حالانکہ مجھے پہلے بھی شک نہیں تھا۔''

''تم زیادہ مولوائن بننے کی کوشش نہ کیا کرو میرے اور زین کے ساتھ، تمہاری اسی طرح کی باتیں اسے چڑا دیتی ہیں!'' انہوں نے انگلی اٹھا کر مجھے تنبیہ کی۔ ''مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اسے جان بوجھ کر چڑاتی کیوں ہو؟''

''میں اسے چڑاتی ہوں ماما؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''یا اس نے میری زندگی کو......'' میں کچھ سخت کہتے، کہتے رک گئی۔ میرا یہ مقصد تو ہرگز نہ تھا، میں نے تو سوچا تھا کہ ماما کو بتاؤں گی، وہ چونکیں گی، پریشان ہوں گی کہ ان کا بیٹا غلط راستے پر چل رہا ہے، اسے سرزنش کریں گی، سمجھائیں گی، ماں ہونے کا حق استعمال کریں گی اور وہ راہِ راست

پڑ آ جائے گا۔ میں اپنی محبت سے اسے منالوں گی اور کوشش کروں گی کہ وہ اپنے ماضی پر شرمسار ہو اور آئندہ ایسا نہ کرے مگر میری توقع کے برعکس وہ الٹا مجھے ہی ڈانٹ رہی تھیں۔ کوئی دیکھتا تو سمجھتا کہ ان کی آنکھوں پر ان کی اولاد کی محبت کی پٹی بندھی ہوئی ہے مگر اصل میں ان کی آنکھوں پر غفلت کی وہ پٹی بندھی ہوئی تھی کہ وہ غلط کو درست اور درست کو غلط کہہ رہی تھیں۔ ان کی تربیت میں سقم تھے اور کوتاہی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو غلط اور صحیح میں تفریق نہ سکھا سکی تھیں۔ اب بھی اس کی حرکتوں پر آنکھیں بند کر کے وہ جس جرم کی مرتکب ہو رہی تھیں، اس کا نتیجہ تباہی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

''اگر آپ کو یہ سب ٹھیک لگتا ہے تو میں چاچو سے بات کروں گی، شاید انہیں میری بات سمجھ میں آ جائے۔''

''تمہاری یہ مجال......'' ان کے منہ سے تھوک میرے منہ پر برسا تھا۔ ''اپنی حد میں رہنا سیکھو، میں نے یہ بات تمہیں اس گھر میں آنے کے ساتھ ہی سمجھا دی تھی اور بارہا تمہیں بتایا ہے کہ جمال سے تم نے کوئی بھی بات کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔'' انہوں نے مجھے صاف دھمکی دی تھی۔

''حد میں، میں تو ہوں مگر آپ کا بیٹا ساری حدود پار کر گیا ہے ماما اور دکھ تو یہ ہے کہ آپ اسی کو درست سمجھتی ہیں...... رہی بات چاچو سے بات کرنے کی تو وہ مجھے کرنا ہوگی چاہے اس کا کچھ بھی نتیجہ نکلے۔'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا، مجھے لگا کہ کہیں وہ غصے میں مجھے ٹانگ ہی نہ مار دیں۔ ''جتنا برا میرے ساتھ ہو رہا ہے، اس سے برا اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔'' کہہ کر میں کمرے سے نکل آئی۔

☆☆☆

''تم ناراض ہو مجھ سے جانم؟'' وہ کتنے پیار سے پوچھ رہا تھا۔

''ہوں......'' میرے منہ سے نکل گیا۔ ''میرا مطلب ہے کہ نہیں۔''

''جانتا ہوں کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو سکتیں...... مما کو خواہ مخواہ کا وہم ہو گیا ہے۔'' اس نے مجھے بانہوں میں سمیٹا تو گویا اسے یہ ٹیکنیک بھی ماما نے بتائی تھی کہ وہ مجھے چاچو سے بات کرنے سے روک سکیں۔ میں بھی چاچو سے کیا بات کرتی، الٹا انہیں پریشان ہی کرتی اور جانے مجھے ان سے بات کرنے کا موقع بھی ملتا کہ نہیں، اس لیے میں نے اس بات کو غنیمت جانا کہ میری دھمکی کارگر ہو گئی تھی اور خود کو اس کے سپرد کر دیا۔

''میں تمہارے ہی بھلے کے لیے کہتی ہوں زین!'' میں نے نرمی سے کہا۔ ''نہیں چاہتی کہ تم اپنے گناہوں کی وجہ سے آخرت میں عذاب بھگتو، یقین کرو اگر تمہیں وہ پسند ہے تو میں تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ اس سے شادی کر لو۔'' میں نے فراخ دلی سے کہا۔

''ہوں......''

''میں دل کی پوری سچائی سے یہ سب کہہ رہی ہوں تمہیں!'' میں نے اس کے کندھے پر سر رکھا۔

''جانتا ہوں مگر......'' اس نے مجھے اپنی بانہوں میں سمیٹا۔ ''ایسا کر نہیں سکوں گا میں۔''

''کیوں؟'' میں نے اسی لہجے میں سوال کیا۔

''پاپا نہیں مانیں گے......'' اس نے بے بسی سے کہا۔ ''وہ بھی نہیں مانے گی۔''

''چاچو سے میں بات کروں گی...... مگر وہ کیوں نہیں مانے گی؟'' میں حیران ہوئی۔ ''اس طرح گناہ کی زندگی سے خوش ہے وہ؟''

''وہ کسی کے ساتھ مجھے شیئر نہیں کر سکتی، اس لیے نہیں مانے گی، پورے کا پورا زین چاہیے اسے، بلا شرکت...... اور اس کے لیے جو اس کا مطالبہ ہے وہ پاپا کے لیے ناقابلِ قبول ہوگا۔'' میں سن ہو کر رہ گئی۔

''زین......'' میرے منہ سے نکلا۔ ''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں بہت عجیب سی صورتِ حال میں پھنس گیا ہوں امرت...... زارا بہت انتہا پسند ہے، کسی دن نہ جاؤں تو نیند آور گولیاں کھا کر مر جانے کی دھمکی دیتی ہے۔''

''اس میں ایسا کیا ہے زین جو......'' میں سسکی۔

''اس میں وہ......'' وہ کچھ کہتے، کہتے رکا، شاید یہ کہ اس میں وہ خاص بات ہے جو کسی اور میں نہیں، میں اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''اس میں وہ کشش ہے امرت جو میرے وجود کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے۔'' اس نے اپنا فقرہ پورا کیا، میں پاتال کی گہرائیوں سے اس کا منہ تک رہی تھی۔ واقعی ایک ہی نوعیت کے لوگ ایک دوسرے کے لیے کشش محسوس کرتے ہیں۔ ''مجھے اس کے وجود کی پیاس محسوس ہوتی ہے، طلب محسوس ہوتی ہے...... اس کا نشہ ہوتا ہے مجھے جو ٹوٹتا ہے تو میں سانس بھی نہیں لے پاتا۔''

''میں اس سارے قصے میں کہاں ہوں زین؟''

''یہی تو المیہ ہے امرت کہ تم اس سارے قصے میں غلط جگہ پر ہو۔'' اس نے یوں کہا جیسے اس میں سارا قصور اس کا ہو۔

''جو کچھ تمہیں لگتا ہے کہ غلط جگہ پر ہے، اسے اس جگہ سے ہٹا دو زین اور جس کے بغیر تمہیں سانس نہیں آتی اور تمہارا نشہ ٹوٹتا ہے اسے اپنی زندگی میں لے آؤ...... کئی زندگیوں کو عذاب بنانے سے اور اپنی آخرت کے لیے عذاب جمع کرنے سے بہتر ہے کہ جائز راستہ اختیار کرو۔'' میں نے رسان سے کہا۔ ''مجھے تو سوچ کر بھی گھن آ رہی ہے کہ تم نے کیسی زندگی کا انتخاب کیا ہے، تم نے برے اور بھلے کی تمیز مٹا دی ہے، تمہیں واقعی اس کے ساتھ ہونا چاہیے، میرے ساتھ نہیں۔'' اس دن مجھے اس سے اتنی شدید نفرت محسوس ہوئی کہ اس کے بعد میرے اور اس کے بیچ سب کچھ تبدیل ہو گیا۔

☆☆☆

''دماغ ٹھیک ہے تمہارا...... پاگل ہو گئی ہو تم کیا؟'' وہ چلّا رہی تھی مجھ پر۔ اسکول کا وقت ختم ہوئے کافی وقت گزر تھا، میں نے ڈرائیور کو اس دن لیٹ آنے کا کہا تھا کیونکہ میں سارہ سے بات کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ساری بات سن کر جو ردِعمل ظاہر کیا تھا، مجھے اسی کی توقع تھی۔

''سارہ میرے پاس اور کوئی آپشن باقی نہیں ہے۔'' میں نے سارہ کے سامنے اعتراف کیا۔ ''وہ مجھے چھوتا ہے تو مجھے گھن آتی ہے، کمرے میں موجود ہوتا ہے تو میں اس کی قربت کے لمحات سے ڈرتی ہوں۔''

''اب یہ سب کچھ بہت لیٹ ہو چکا ہے امرت!'' سارہ نے مجھے سمجھایا۔ ''اب تم اس کے بچے کی ماں بننے والی ہو۔ یہ سوچنے، کہنے اور کرنے کا وقت نہیں ہے...... بچہ، ماں، باپ کے بیچ ایک بڑا اہم رابطہ ہوتا ہے، اس کے آنے سے پڑے گا۔''

''تمہارے دو بچے تو ایسا رابطہ نہ بنے تم دونوں کے بیچ!'' میں نے اس کا چہرہ ٹٹولا۔

''ہا...ہا...!'' وہ ہنسی۔ ''تمہیں سمجھانے کے لیے یہ روایتی سا فقرہ منہ سے نکل گیا مگر ساتھ ہی اس کے بودے پن کا ہوا تو سوچا کہ کاش تم اس کو پکڑ نہ سکو مگر تم بھی پوری ٹیچر ہو، کیسے ہو سکتا ہے کہ تم میری غلطی نہ پکڑتیں۔''

''میں نے ٹھیک کیا ناں سارہ؟''

''اتنا نہیں......'' اس نے کہا۔ ''زیادہ ٹھیک تب ہوگا جو تم اپنے چاچو کو ساری بات من وعن بتا دو......''

''نہیں سارہ...... بہت مشکل ہے، میں تو ہنی مون والے قصے کو بھی چاچو کو آدھے ادھورے انداز میں بتاتے ہوہار رہی تھی، شرم کے مارے کہا ہی نہیں جا رہا تھا کچھ!''

’’تمہیں کیوں شرم آ رہی تھی، کیا تم نے کوئی غلطی یا بے ہودگی کی تھی؟‘‘ وہ تلملائی۔

’’سوچتی ہوں سارہ کہ بیویوں کو اپنے شوہروں کے عیوب کو ڈھکنے کا حکم ہے......‘‘ میں نے ہکلا کر کہا۔ ’’میں یہ سب باتیں چاچو کو بتا کر گناہ گار تو نہیں ہوئی؟‘‘

’’واہ، واہ، واہ......واہ امرت، تم سے اچھی پتی ورتا بیوی اور کون ہوگی دنیا میں!‘‘ اس نے مجھے داد دینے کے لیے باقاعدہ تالیاں بجائیں۔ ’’عیب اور جرم میں فرق ہوتا ہے بی بی!‘‘ اس نے زور دے کر کہا۔ ’’گناہ اور اس پر سینہ زوری......جانتی ہو کہ اس گناہ کی سزا کیا ہے؟‘‘ اس نے میری آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا۔

’’اچھی طرح......‘‘ میں نے وثوق سے کہا۔

’’تم کوئی غلطی کر کے دیکھو......کس طرح تمہیں بچ چورا ہے میں سنگسار کر دیں گے تمہاری ماما اور تمہارا زین!‘‘

’’جانتی ہوں!‘‘ میں نے سر ہلا کر کہا۔

’’وہ کسی رحم کا حقدار نہیں ہے امرت، اسے اس کے اس گناہ کی سزا ملنی چاہیے کیونکہ یہ گناہ نہ اس سے نادانستگی میں ہوا ہے اور نہ ہی فقط ایک بار!‘‘

’’میں سزاؤں اور جزاؤں کے فیصلے کرنے والی کون ہوں پیاری؟‘‘ میں نے کھوئے، کھوئے لہجے میں کہا۔

’’بس اور کچھ نہیں......تم اس کے باپ کو بتاؤ، اس لڑکی کی ماں نے تو اسے اپنے مفادات کے لیے ڈھیل دے رکھی ہے اور زین کو کاٹھ کا الو بنا کر اس کا گھر بھی خراب کر رہی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ دونوں اس سے مالی فوائد بھی حاصل کر رہی ہوں گی......جس طرح تم نے بتایا ہے کہ مالی لحاظ سے وہ کمزور ہیں۔ جو عورت اپنی عزت کو یوں......‘‘ وہ رکی۔ ’’وہ یہ سب پیسے کے لیے کر رہی ہے، وہ اپنا جسم بیچ رہی ہے اور زین اسے اس کی محبت سمجھ رہا ہے۔ وقت آئے گا جب اسے کھرے اور کھوٹے کی پہچان ہوگی۔‘‘

’’جانے کب آئے گا ایسا وقت اور میں اس وقت کو دیکھ پاؤں گی یا نہیں!‘‘

☆☆☆

سرد خانے جیسا درجۂ حرارت دو کمبلوں کے باوجود بھی مجھے ٹھٹھرائے ہوئے تھا، میں کوشش کر رہی تھی کہ میرے دانت نہ بجیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اردگرد سب مُردے ہوں، خاموش، کوئی گہری بے ہوشی میں تھا کوئی کسمسا رہا تھا۔ میں خود بھی غنودگی میں تھی، کچھ آوازیں واضح تھیں اور کچھ مبہم۔

’’انہیں کمرے میں شفٹ کر دیں میم؟‘‘ کسی نے سوال کیا تھا۔

’’ابھی نہیں......‘‘ ڈاکٹر یاسمین کی آواز تھی۔ ’’ابھی یہ کمرے میں جائیں گی تو تنہا ہوں گی، ان کے گھر سے کوئی آ جائے تو۔‘‘

’’ان کے گھر پر اطلاع کر دیں کہ......؟‘‘

’’اس کی ضرورت نہیں ہے......‘‘ بات کاٹ کر ڈاکٹر یاسمین نے کہا تھا۔

’’اور کوئی نہیں تو کم از کم ان کے شوہر......‘‘ نرس کی آواز آئی۔

’’ان لوگوں کو جس صدمے کا سامنا ہے، اس میں، میں سمجھتی ہوں کہ اس کا ہوش میں آنا کوئی بڑی خبر نہیں ان کے لیے، اسے یہاں سکون سے پڑا رہنے دیں کچھ دیر......میں جب مناسب سمجھوں گی تو آپ کو بتا دوں گی کہ اس کے گھر اطلاع کر دیں۔‘‘

’’جس طرح آپ مناسب سمجھیں میم!‘‘

’’صدمہ؟‘‘ یہ ایک لفظ اتنا بڑا پہاڑ بن گیا کہ اس کے بوجھ تلے میں دب گئی۔ اپنے زندہ بچ جانے کی خوشی بھی ماند

پڑ گئی۔ ’’صدمہ تو میرا تھا، نقصان تو میرا ہوا تھا، کسی اور کو اس صدمے سے کیا!‘‘ میں سوچ کر رہ گئی۔ وہ جو چند سانسیں بھی لیے بغیر دنیا چھوڑ گیا ہوگا اس کا صدمہ اتنا بڑا تھا کہ میرے بچ جانے کی خوشی ماند پڑ گئی تھی، میرا وجود اتنا ہیچ تھا سب کی نظروں میں......زین کے گھر والوں کو اگر زین نے حقیقت بتا دی ہوگی تو میرے گھر والوں کو میں عزیز نہ تھی کیا؟ دل چاہا کہ چیخ، چیخ کر روؤں مگر رو نہ سکی۔ درد میرے وجود کو ٹکڑوں میں کاٹ رہا تھا، ٹوٹے، ٹوٹے ہو کر میرا جسم ہوا میں بکھر رہا تھا...

’’یا اللہ، یہ سب میرے لیے کیوں، کیوں میری آزمائش ختم ہونے میں نہیں آتی، میں کس حد تک برداشت کر سکتی ہوں!‘‘

’’تم ہوش میں ہو ناں امرت؟‘‘ ڈاکٹر یاسمین کا ہاتھ میرے ماتھے پر تھا۔

’’ہوں......‘‘ نوحوں کی طرح ایک کراہ نکلی، کاش نہ آتی ہوش میں۔

’’اللہ نے بہت کرم کیا ہے پیاری تم پر، ہم نے جڑ سے سب کچھ نکال کر پھینک دیا ہے اور مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ یہ مسئلہ دوبارہ نہیں ہوگا، انشاء اللہ، تمہارے چند مزید ٹسٹ ہیں جو کچھ دنوں کے بعد کر کے radiation کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوگا۔‘‘

دل چاہا کہ ان سے پوچھوں کہ کیا ہوا تھا......کتنی سانسیں لیں اس نے......یا پیدا ہی مردہ ہوا......مگر منہ سے ایک پورا فقرہ بھی ادا نہ ہوا اور ٹوٹے پھوٹے سے فقرے سے انہیں کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا، میں پھر غنودگی میں جا رہی تھی۔

☆☆☆

’’کہاں پر ہو بیٹا؟‘‘ چاچو کی کال تھی۔

’’گھر پر ہوں چاچو!‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’سب ٹھیک ہے ناں چاچو؟‘‘ میں سمجھی کہ کچھ بھول گئے ہوں گے اس لیے کال کی ہے۔

’’زیبا گھر پر ہے یا چلی گئی؟‘‘ ان کا اگلا سوال۔

’’وہ تو چلی گئی ہیں چاچو......آپ مجھے بتائیں کیا کام ہے؟‘‘

’’کام......تم کتنی دیر میں تیار ہو سکتی ہو؟‘‘ ان کا سوال تھا۔

’’کس چیز کے لیے چاچو؟‘‘ میں نے حیرت سے کہا۔

’’میرے دفتر آنے کے لیے!‘‘ انہوں نے بشاشت سے کہا۔

’’دفتر......میں مگر کیوں؟‘‘ مجھے اپنی حالت دیکھ کر عجیب لگا کہ وہ مجھے اپنے دفتر میں کیوں بلا رہے تھے۔

’’کام ہے بیٹا، کچھ کاغذات پر تمہارے دستخط چاہئیں۔‘‘

’’کون سے کاغذات پر چاچو؟‘‘

’’گاڑی میں نے بھجوا دی ہے، تم فوراً تیار ہو جاؤ اور جلدی آ جاؤ، ساجدہ کو بتا کر آنا کہ تم ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہو۔‘‘ وہ اپنی بات پوری کر کے فون بند کرنے ہی والے تھے۔

’’مگر وہ......زین، ماما کو بتا دے گا۔‘‘ میں نے اپنے اندیشے کو زبان دی۔

’’وہ دفتر میں نہیں ہے، کسی کام سے کھاریاں بھیجا ہے میں نے اسے۔‘‘ چاچو نے وضاحت کی۔ تیار میں نے کیا ہوا تھا، اپنی چادر اوڑھی اور لاؤنج میں آ کر ساجدہ کو بتایا کہ چاچو سے گاڑی منگوائی ہے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے۔ گاڑی پہنچی تو میں روانہ ہوئی۔

☆☆☆

’’تم اسپتال سے سیدھی اپنے نئے اپارٹمنٹ میں جاؤ گی، یہ ہے تمہارے نئے اپارٹمنٹ کی ایک چابی اور یہ اس کی ...ت کے کاغذات۔ یہ فلیٹ میں نے تمہارے نام سے لیا ہے اور اسے تم اپنے چاچو کی طرف سے ایک حقیر سا تحفہ سمجھ لو،

یہ کسی زیادتی کی تلافی تو نہیں کر سکتا مگر یہ جانتے ہوئے کہ زین کتنا لالچی ہے میں نے اسے تمہارے نام سے لیا ہے، شاید اس وجہ سے ہی وہ تمہارے ساتھ اپنے سلوک کو بہتر کرلے۔'' وکیل کے ہاتھ سے فائل لے کر چاچو نے اس پر خود دستخط کیے۔ پھر مجھ سے انہوں نے چند کاغذات پر دستخط کروائے اور وکیل صاحب نے اجازت چاہی۔

''اس کی ضرورت نہیں ہے چاچو!'' میں نے ان کے ہاتھ سے چابیاں نہیں پکڑیں۔ ''جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ میری قسمت ہے، اس میں آپ کا تو کوئی قصور نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی اور کو موردِ الزام ٹھہرا رہی ہوں۔''

''میرے ضمیر پر بہت بوجھ ہے میری بیٹی، میں جانتا ہوں کہ تمہارے ساتھ انجانے میں میرے ہاتھوں زیادتی ہو گئی ہے۔ جو میں جانتا کہ یہ نالائق جسے کمال بھائی، اباجی کی خواہش کی تکمیل میں اپنی بیٹی دینے کو تیار ہو گئے تھے وہ اس ہیرے کا اہل نہیں ہے تو میں انکار کر دیتا، بھائی کو ناراض کر لیتا مگر تمہاری زندگی کو مشکل میں نہ ڈالتا۔''

''چاچو...... ان سب کی ضرورت ہے نہ یہ کہنے کی!'' میں نے دل پر پتھر رکھا۔ ''آپ میری طرف سے فکرمند نہ ہوں۔''

''میں روزِ قیامت اپنے بھائی کو منہ نہیں دکھا پاؤں گا، سکون سے سو بھی نہیں سکتا میں۔''

''یوں نہ سوچیں چاچو!'' میں نے اپنے سر پر رکھے ہوئے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ''اللہ نے میرے لیے کچھ بہتر مستقبل رکھا ہوگا ناں۔''

''میری پیاری اور صابر بیٹی!'' انہوں نے مجھے تھپکا۔ ''تمہاری آہ میرے گھر کو لے ڈوبے گی، میں اس دن سے ڈرتا ہوں۔''

''پلیز چاچو، میں کسی کو بددعا نہیں دیتی۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔ ''میرے حق میں آسانیوں کے لیے دعا کیا کریں چاچو!'' ان کے اصرار پر میں نے ان کے ہاتھ سے چابیاں لے لیں۔ ''آپ کاغذات اپنے پاس رکھیں، میں انہیں کہاں سنبھال سکوں گی، اگر آپ زین اور ماما کو نہیں بتانا چاہتے تو انہیں آپ سنبھالیں۔''

''ٹھیک ہے...... فی الحال تم اس راز کو خود تک محدود رکھنا۔'' چاچو نے کہا۔

''اس رازداری کی کیا وجہ ہے چاچو، میں تو نہیں سمجھتی کہ آپ کو ان دونوں سے چھپا کر کچھ کرنا چاہیے اور اگر ایسا کچھ کر رہے ہیں آپ جو انہیں بتا نہیں سکتے تو بہتر ہے کہ نہ کریں۔''

''اپنے چاچو کی طرف سے تحفہ قبول کرنے پر کیوں اعتراض ہے تمہیں؟'' ان کے ان الفاظ کے بعد کچھ بولنے کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، انہوں نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور میں گھر کے لیے روانہ ہوئی۔

☆☆☆

''زائنہ اور ارسل سہ پہر سے آئے ہوئے ہیں اور تم گوشہ نشین ہوئی بیٹھی ہو؟'' وہ غیظ و غضب سے بھرا ہوا کمرے میں آیا تھا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے زین!'' میں نے کسلمندی سے کہا۔

''طبیعت ٹھیک نہیں ہے یا دماغ؟'' وہ دھاڑا۔ ''تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے آخر؟''

''بتایا ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' میں نے اپنے غصے پر قابو پایا۔

''کیا ہوا تمہاری طبیعت کو؟'' اس نے سوال کیا، تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ ''ہٹی کٹی نظر آ رہی ہو۔''

''میری حالت کو جانتے ہو تم زین...... پھر بھی سوال کرتے ہو۔''

''کیا سوچے گی زائنہ کہ تم اسے جان بوجھ کر اگنور کر رہی ہو!''

''زائنہ کو میری صورتِ حال کو سمجھنی چاہیے اور خواہ مخواہ میں اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔''

''ہو سکتا ہے کہ تم ارسل کی وجہ سے باہر نہیں جانا چاہ رہی ہو۔''

''ارسل کی کیا وجہ ہے؟'' میں سمجھی نہ تھی۔

''اس کا سامنا سب کے سامنے کرنا۔'' خباثت سے اس نے کہا۔

''میرے دل میں کوئی چور نہیں ہے زین اور نہ ہی مجھے ارسل بھائی کا سامنا کرنے کا خوف!'' میں نے غصہ دبانے کی سعی کی۔ ''تم جو بھی سمجھو، زائنہ جو چاہے سوچے مگر میرا اللہ جانتا ہے۔''

''اللہ تو پھر وہ سب بھی جانتا ہے جو ہم نہیں جانتے اور جو ہم چاہتے ہیں کہ کوئی نہ جانے۔'' ذومعنی سی بات۔

''بے شک...... وہ سب جانتا ہے، جو ہم نہیں جانتے، جو ہم کچھ لوگوں سے چھپانا بھی چاہتے ہیں اور کچھ کو بتا بھی دیتے ہیں۔''

''فضول بحث نہ کیا کرو میرے ساتھ۔'' اس نے اتنا سچ کہاں برداشت کرنا تھا۔ ''زچ کر دیتی ہو تم مجھے۔''

''تم جاؤ اور مجھے تنہا چھوڑ دو!''

''جانے کن، کن یاروں کو یاد کرتی ہو تم تنہائی میں؟'' سڑی ہوئی بات کہہ کر وہ زور سے دروازہ پٹخ کر باہر نکل گیا۔ دروازہ پٹخ کر بند کرنے والے لوگ زہر لگتے ہیں مجھے۔ دل چاہا کہ اسے روکوں، اس کا گریبان پکڑوں اور کہوں۔ ''کس منہ سے تم نے یہ بات کہی ہے میری بارے میں، کس طرح کی گندی سوچ ہے تمہاری جسے دیارِ غیر کی اتنی مہنگی تعلیم بھی نہیں بدل سکی......'' مگر میں سوچ کر رہ گئی۔ اس سے نفرت کی آگ میں ایک اور لکڑی کا سوکھا ہوا ٹکڑا گرا تھا اور اس نے اس آگ کو مزید بھڑکا دیا تھا۔

☆☆☆

''تمہیں لگتا ہے کہ وہ بہتر ہوگا؟'' سارہ نے پوچھا تھا۔ ''کیوں لگتا ہے کہ وہ بہتر ہو جائے گا، سدھر جائے گا۔''

''اپنے رب سے امید ہے سارہ، وہ تو پروردگار ہے، پالن ہار ہے، ہمارے دلوں کے بھید بھی جانتا ہے اور دلوں میں بھید بھری ان خواہشات کو بھی جنہیں زبان پر لانے کا سلیقہ بھی نہیں ہے ہمیں۔''

''جن کے دلوں پر مہریں لگ جاتی ہیں، انہیں کوئی دعا بھی تبدیل نہیں کر سکتی امرت!''

''دعاؤں سے پتھر بھی تو پگھل جاتے ہیں!'' میں نے دلیل دی۔

''وہ اور طرح کے پتھر ہوتے ہوں گے امرت...... جن پتھروں سے تم سر پھوڑ رہی ہو، یہ خود تو نہیں پگھلیں گے، ہاں تمہیں ضرور توڑ کر رکھ دیں گے۔''

''چلو ان کی طاقت اور اپنی برداشت دونوں آزما لیتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''ویسے ایک بات بتاؤ امرت!'' اس نے میری طرف گھور کر دیکھا۔

''تمہیں لگتا ہے کہ تمہیں زین سے اتنا پیار ہے کہ تم عمر بھر اس کے پلٹ آنے کا انتظار کر سکو گی؟''

''نہیں......'' میں نے فوراً کہا۔

''کیا نہیں؟'' اس نے سوال کیا۔ ''اس کے پلٹ آنے کا انتظار نہیں یا اپنے تھک جانے کا ڈر ہے؟''

''دونوں باتیں ہی نہیں......'' میں نے ہولے سے کہا۔ ''مجھے زین سے پیار نہیں ہے...... بلکہ سچ پوچھو تو مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے، گھن آتی ہے مجھے اس کے وجود سے۔ اپنے کمرے میں اس کے ہونے سے ذلت کا احساس ہوتا ہے، اس سے منسلک اپنے رشتے سے حقارت محسوس ہوتی ہے۔''

''کیا؟'' اس کی حیرت دیدنی تھی۔ ''تو پھر یہ سب کیا ہے، کس لیے امرت؟''

''اپنے مرے ہوئے باپ کی خواہش کی لاج رکھ رہی ہوں پیاری!'' میں نے پوری سچائی سے کہا۔ ''انہوں نے

مجھ زندہ وجود کو اپنے مرے ہوئے باپ کی خواہش کی بھینٹ چڑھایا تو میں سوچتی تھی کہ انہیں میری پروا نہیں ہے مگر ان کے نہ ہونے سے میرا ان کے ساتھ جو قلبی تعلق قائم ہوا ہے، مجھے اب احساس ہوا ہے کہ میں انہیں کتنا پیار کرتی ہوں، ان کی خواہش کا احترام کیا تو میں چاہتی ہوں کہ میرے مرے ہوئے باپ کی آخرت کی منزلیں آسان ہوں، میرے ذہن میں کبھی سوچ بھی نہ آئے کہ میرے ساتھ میرے باپ نے برا کیا تھا۔"

"تم کتنی عظیم ہو امرت...... کتنی صابر، تم اپنے دنیا سے چلے جانے والے باپ کی روح کو بھی تکلیف نہیں دینا چاہتی ہو۔" وہ تڑپ کر بولی تھی۔ "کاش میں اتنی صابر ہوتی، کچھ سال مشکل گزار لیتی تو شاید اس کے بعد میری بیٹیوں کی زندگیوں میں آسانی آ جاتی۔"

"ہر کسی کو اپنے مقدر کا اور اپنے انداز سے ملتا ہے، کوئی قسمت کو تبدیل کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

☆☆☆

"گھر میں بہت سی تبدیلیاں آئندہ چند ہفتوں میں آنے والی ہیں۔" چاچو نے کھانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھ کر قہوہ پیتے ہوئے تمہید باندھی تھی۔

"کیا تبدیلیاں آ رہی ہیں پاپا؟" حسنہ نے گرم جوشی سے پوچھا تھا۔

"یوسف اپنے گروپ کے ساتھ چند ماہ کے لیے ساؤتھ افریقا جا رہا ہے......" چاچو نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"آپ نے اجازت دے دی ہے اس کو؟" اس نے سوال کیا تھا۔

"بھئی اس کی مذہب کے نام کی دلیلیں...... اوپر سے اپنی مما کی تگڑی سفارش!"

"ہاں جیسے پہلے بھی آپ سب کچھ میری مان کر ہی کرتے ہیں ناں۔" بجائے خود پر نازاں ہونے کے ماما نے اس میں بھی منفی نکتہ نکال لیا تھا۔ وہ کسی بات پر خوش نہیں ہوتی تھیں۔

"سب تمہاری ہی مان کر تو یہاں تک پہنچا ہوں زیبا بیگم!" چاچو نے کہا۔

"میری کون سی مانی ہے تم نے؟"

"بھئی تم ہی چاہتی تھیں ناں کہ زین کو اب علیحدہ کر دیا جائے تو میرا خیال ہے کہ تمہاری اس تجویز پر بھی غور کیا جائے تو یہ عین حسبِ حال ہے، آج یہ دو ہیں، کل کو تین ہوں گے۔" میں بلش کر گئی۔ "اس لیے میں نے قریب ہی ایک ہاؤسنگ اسکیم میں ان کے لیے ایک فلیٹ خرید لیا ہے...... اب تم فیصلہ کرو کہ انہیں کب وہاں جانا ہے؟"

"جب تم کہو......" ماما کا چہرہ خوشی سے تمتمایا تھا۔ مائیں تو یوں بچوں کے گھر چھوڑ کر جانے پر اداس ہوتی ہیں مگر ماما کو خوش دیکھ کر لگا کہ وہ چاہتی یہی تھیں کہ زین علیحدہ ہو، آزاد ہو اور اپنی من مانیاں کرے۔

"تم بتاؤ......" چاچو مہربان ہوئے تھے۔ زین خاموش تھا، دل سے جانتا تھا کہ ماما جو کچھ کہیں گی اس کے حق میں ہوگا۔

"چلیں یوں کرتے ہیں، چند ہی ماہ کی تو بات ہے، اسپتال سے بچے کے ساتھ امرت اور زین سیدھے اپنے نئے فلیٹ میں چلے جائیں۔" ماما نے کہا۔ "کیا خیال ہے؟"

"بالکل نیک خیال ہے؟" چاچو نے کہا۔ "کیوں زین؟" انہوں نے اچانک زین سے سوال کیا تھا۔

"جی جی وہ......" وہ بوکھلا گیا تھا۔ "اتنا عرصہ کیا وہ فلیٹ خالی رہے گا؟"

"یار اتنا عرصہ تو اسے فرنش کرنے میں بھی لگ جائے گا۔" چاچو نے کہا تو زین مزید کچھ نہ بولا۔ میں اس بات سے ڈر رہی تھی کہ کہیں کسی کے ذہن میں یہ سوال نہ آ جائے کہ فلیٹ تھا کس کے نام پر۔

"اور کیا تبدیلیاں آنے والی ہیں پاپا؟" عارب نے معصومیت سے پوچھا۔

"اتنا سب کچھ کم ہے کیا؟" چاچو نے ہنس کر کہا۔

"ہاں بھئی یوسف کب روانگی ہے تمہاری؟" میں نے موضوع بدلا۔

"کاغذات کی تیاری کے چند مراحل ہیں، وہ مکمل ہو جائیں تو......"

☆☆☆

"درد کے لیے آپ کو انجکشن لگانا ہے......" نرس کی آواز آئی تھی۔ "کینولا پرانا ہو گیا ہے اور اس کے گرد سوجن ہو گئی ہے اس لیے اسے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔"

"ہوں......" کہنا چاہتی تھی کہ رہنے دو اس درد کو کہ اس درد کا احساس بہت سی چوٹوں کی تکلیف کو بھلائے ہوئے ہے۔ وہ درد جن سے یادیں ہی یادیں منسلک ہیں۔

"کچھ بولیں امرت میم!" نرس نے مجھے میرے نام سے پکارا تھا۔

"ہوں......" میں کراہی۔ "کوئی آیا؟" میں نے بصد کوشش کہا تھا۔

"آپ کے گھر سے؟" اس نے سوال کیا۔ وہ میرے بہت قریب کھڑی تھی اس لیے اسے سمجھ میں آ گیا کہ میں نے کیا کہا تھا کیونکہ میری آواز میں بہت نقاہت تھی۔

"جب انہیں اطلاع کریں گے تو وہ ضرور آئیں گے...... ابھی ڈاکٹر یاسمین کا خیال ہے کہ آپ کی حالت کو بھی سنبھلنے دیا جائے اور انہیں بھی۔"

"ہوں!" ایک اور سسکاری۔

"ارے یہ آپ کے خوب صورت بازو پر نشان کیسا ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"وہ......" میں اس سے زیادہ کچھ نہ بول سکی۔

"لگتا ہے کہ آپ کے شوہر کو سگریٹ پینے کی عادت بھی ہے اور سگریٹ آپ کے بازو پر بجھانے کی بھی۔" اس نے کیا درست قیافہ لگایا تھا۔ "میرے شوہر کی طرح!" اس نے فقرہ پورا ادا کیا۔

"سی!" سوئی چبھنے کی تکلیف کم تھی، اس یاد کی بہت زیادہ......

"مجھے ہاتھ مت لگاؤ زین!" میں نے سختی سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔

"کیوں کیا ہوا ہے...... ناپاک ہیں میرے ہاتھ کیا؟" اس نے اپنی طرف سے شرارت سے سوال کیا تھا۔

"صرف ہاتھ ہی نہیں، پورا وجود ناپاک ہے تمہارا!"

"زبان سنبھال کر بات کیا کرو ورنہ جانتی نہیں ہو تم مجھے!" اس نے دھمکی دی۔

"جتنا تمہیں اس مختصر عرصے میں جان لیا ہے اس کے بعد مزید جاننے کی ضرورت نہیں ہے مجھے، اتنا ہی برداشت نہیں ہو رہا ہے مجھ سے تو۔"

"بہت زبان چلتی ہے تمہاری!" اس نے دانت پیس کر کہا اور میں جو اس سے منہ موڑے بیٹھی تھی ایک دم چیخی۔ اس نے اپنے جلتے ہوئے سگریٹ سے میرے بازو کو داغ دیا تھا۔

"چاچو......" میں چیخی۔

"جسٹ شٹ اپ!" اس نے میرے گال پر تھپڑ مارا۔ "تمہاری آواز اس کمرے سے باہر نکلی تو میں ٹھڈے مار، مار کر تمہارا حشر کر دوں گا، چاچو کی چیلی!" تکلیف سے میری چیخیں ہی نہ رک رہی تھیں۔

میں نے اپنا دوپٹا منہ میں ٹھونس لیا اور غسل خانے میں جا کر اپنا بازو ٹھنڈے پانی کی دھار کے نیچے رکھ

دیا۔ میں نے جلتے ہوئے بازو پر ٹوتھ پیسٹ کا لیپ کیا تھا، اس پر ٹشو پیپر لپیٹ لیا تھا تاکہ بستر کی رگڑ نہ لگے، سسکیاں لے لے کر میں رو رہی تھی۔ جانے کیوں وہم تھا کہ وہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوگا اور معافی مانگے گا، اگرچہ وہ معافی کے قابل بھی نہ تھا۔ جب میں کمرے میں واپس آئی تو وہ سو چکا تھا، میں ایک طرف کو سمٹ کر لیٹ گئی۔

''اس کے بعد تم نے مجھے طیش دلایا یا مجھے دھتکارا تو میں تمہارے ساتھ ایسا برا کروں گا کہ تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہو گی۔'' اس کے الفاظ سے میں سن ہوگئی۔ میں جو یقین کر بیٹھی تھی کہ وہ سو رہا ہے، اس وقت اس کے لہجے سے ڈر گئی تھی، میں کیسی بزدل ہوگئی تھی۔ اس سے تھپڑ کھا کر کبھی کسی سے اور کبھی کسی سے اپنا منہ چھپاتی اور اب بازو، شکر ہے کہ میں پورے بازوؤں کی قمیصیں پہنتی ہوں اس لیے یہ گھاؤ کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ جو گھاؤ روح پر لگ رہے تھے وہ تو یوں بھی کسی کو نظر نہیں آتے تھے۔'' اور اس بات کی بھنک بھی پاپا کو یا ماما کو پڑی تو مجھ سے کسی بہتری کی کوئی امید نہ رکھنا۔''

ہونہہ...... وہ سمجھتا تھا کہ مجھے اس سے کسی بہتری کی بھلا امید بھی تھی۔

☆☆☆

''کیسی مرجھائی سی لگ رہی ہو تم!'' امو جان کی عقابی نظریں۔

''آپ کو علم ہے کہ مجھے کبھی اچھا میک اپ نہیں کرنا آیا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میرے سوال کا میک اپ سے کیا تعلق ہے؟'' انہوں نے حیرت سے کہا۔

''میک اپ سے ذرا میں بہتر لگتی......''

''تمنا اور فاطمہ بھی میک اپ نہیں کرتیں مگر ان کے چہروں پر جو رونق ہے وہ تمہارے چہرے پر ناپید ہے۔'' غضب کا تقابلی جائزہ۔ ''تم خوش تو ہو ناں؟ خواہ مخواہ تو اپنے باپ کی خواہش کی لاج نہیں نبھا رہی ہو؟'' کمال کی قیافہ شناسی......

''وہ دونوں تو ہیں ہی اتنی پیاری...... کچھ نہ کریں تب بھی پیاری لگتی ہیں......'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اور امو جان میں بہت خوش ہوں...... یقین کریں۔''

''تمہیں پتا ہے کہ جس طرح تمہیں میک اپ کرنا نہیں آیا، اسی طرح تمہیں اداکاری کرنا بھی کبھی نہیں آئی۔'' انہوں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''سچ کہہ رہی ہیں امو جان؟'' میں نے بات کو ہنسی میں ٹالنا چاہا...... مگر یہ نگوڑے آنسو جو ایسی ہنسی کے نتیجے میں آنکھوں سے نکل آتے ہیں اور امو جان جیسی حساس مائیں ان کی خوشبو سونگھ لیتی ہیں، بغیر دیکھے...... میں نے نظر چرائی۔

''میں جانتی تھی۔'' انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

''جو کوئی اپنے مرے ہوئے باپ کی خواہش کا مان رکھنے میں کامیاب ہو جائے امو جان تو اس میں برا کیا ہے؟'' میں نے آنسو روکتے ہوئے پوچھا۔

''جو چلا گیا، اس کی خواہشات اہم نہیں ہوتیں...... جینے والوں کی سانسیں بھی مشکل سے نکلیں، ایسا بھی کیا مان!'' انہوں نے روتے ہوئے کہا۔ ''یہی بات کہی تھی ان سے کہ اپنے مرے ہوئے باپ کی خواہش کے بجائے جو زندہ ہیں اس کی خواہش کا مان رکھ لیں مگر ان کے سر پر تو ایک ہی بھوت سوار تھا۔''

☆☆☆

''تمہارے گھر پر اطلاع کر دی ہے امرت اور شام کو وہ ملنے کے لیے آئیں گے، تم نے بہت بہادری سے سب کو ملنا ہے، کسی کو رو کر پریشان نہیں کرنا اور نہ خود پریشان ہونا ہے۔ تمہاری صحت ایسی نہیں ہے کہ تم رو دیا ٹینشن لو، تمہارا...

...شر قابو میں نہیں آ رہا ہے، اس لیے ہمیں دواؤں کے ساتھ ساتھ احتیاط کی بھی ضرورت ہے۔''

''جی!''

''تم سمجھ رہی ہو ناں میری بات کو؟'' انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

''جی!''

''انسان جو دنیا میں آتا ہے اسے واپس بھی جانا ہے، ہر ایک انسان کو، کوئی چند سانسوں کی زندگی مستعار لے کر ...تا ہے، کوئی چند دنوں، ہفتوں، مہینوں، سالوں کی اور کوئی ایسا ہوتا ہے جو موت کی خواہش کرنے لگتا ہے، خود کو بے کار ...بے مقصد سمجھنے لگتا ہے۔ ہر انسان کی پیدائش کا بھی مقصد ہوتا ہے اور اس کے جیے جانے کا بھی۔ ہم انسان ہیں ناں، ...تے نہیں، چند سال کی عمر پا کر مرجانے والوں کو کہتے ہیں کہ ان کا تو وقت ہی نہیں تھا، کم عمر چلا جائے تو کہتے ہیں بن ...لے مرجھا گیا۔''

''ہوں......'' میں نے گہری سانس لی۔ ان کی طویل تمہید مجھے دلاسا دینے کے لیے ہی تو تھی، مجھے تو پہلے ہی علم تھا ...ایسا ہوگا، ایک موہوم سی امید تھی، میں اس سے باتیں کرتی تھی تو اس کی طرف سے حرکت سے مجھے جواب ملتا تھا، لگتا تھا کہ اسے میرا ایک، ایک دکھ اور پریشانی سمجھ میں آتا ہے۔

''میں سمجھتی تھی کہ اس بڑے آپریشن کے نتیجے میں کم سے کم نقصان یہ ہوگا کہ تم پھر ماں نہیں بن سکو گی۔'' ڈاکٹر ...ن پھر گویا ہوئیں۔ ''مگر یہ تم پر اللہ کا خاص کرم ہے کہ اس نے ایسی کسی complication سے بچا لیا ہے...... ...ان ہوتے، ہوتے رہ گیا ہے۔''

''جی!'' میں مسلسل جی، جی کیے جا رہی تھی، اس کے علاوہ اور کیا کہتی۔

''تم اب کوشش کرو اور اٹھ کر بیٹھو...... میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں، نرس اور آیا تمہاری مدد کریں گی اور تمہیں ...چیئر پر بٹھا کر میرے پاس لائیں گی، تیار ہو تم؟''

''ہوں!'' میں نے سو جتن کر کے لبوں پر مسکراہٹ سجائی تھی۔

☆☆☆

میں سمجھ رہی تھی کہ دونوں مل کر آرام سے مجھے وہیل چیئر پر بٹھالیں گی مگر میرے زخم، زخم وجود کو سمیٹ کر اٹھانا بھی ...مرحلہ تھا، میں درد کے کتنے ہی مرحلوں سے گزر کر اس نشست پر بیٹھی تھی، چند لمحے پہلے میں ٹھنڈ سے فریز ہو رہی تھی ...اتنی سی کوشش کرنے کے نتیجے میں تکلیف سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔

''چلیں میم؟'' آیا نے پوچھا تھا۔

''ہاں چلیں!'' دونوں مل کر میری وہیل چیئر کو دھکیلتے ہوئے ایک بڑے سے ہال کی طرف جا رہی تھیں، باہر نرسری ...لگا ہوا تھا۔ وہاں اندر جاتے ہی درجۂ حرارت کا نمایاں فرق محسوس ہوا، نسبتاً گرمی تھی۔ اس کمرے میں دونوں ...میں چھوٹی، چھوٹی کاٹ لائن در لائن رکھی ہوئی تھیں اور ان میں زندگی کے لیے جدوجہد کرتے وہ ننھے، ننھے سے ...وں اور نالیوں میں جکڑے ہوئے، ایک، ایک ڈائپر پہنے ہوئے فقط۔ کاش، اے کاش! ڈاکٹر یاسمین اس ہال ...کی سرے پر نظر آئی تھیں، وہ غالباً کسی بچے کو چیک کرنے کے لیے آئی تھیں۔ ان کے قریب ہی ایک وہیل چیئر ...کمزور سی ماں، ایک نرس کی مدد سے ایک چھوٹے سے نحیف بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آؤ بھئی امرت! ٹھیک سے بیٹھ گئی ہو ناں؟''

''جی، ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

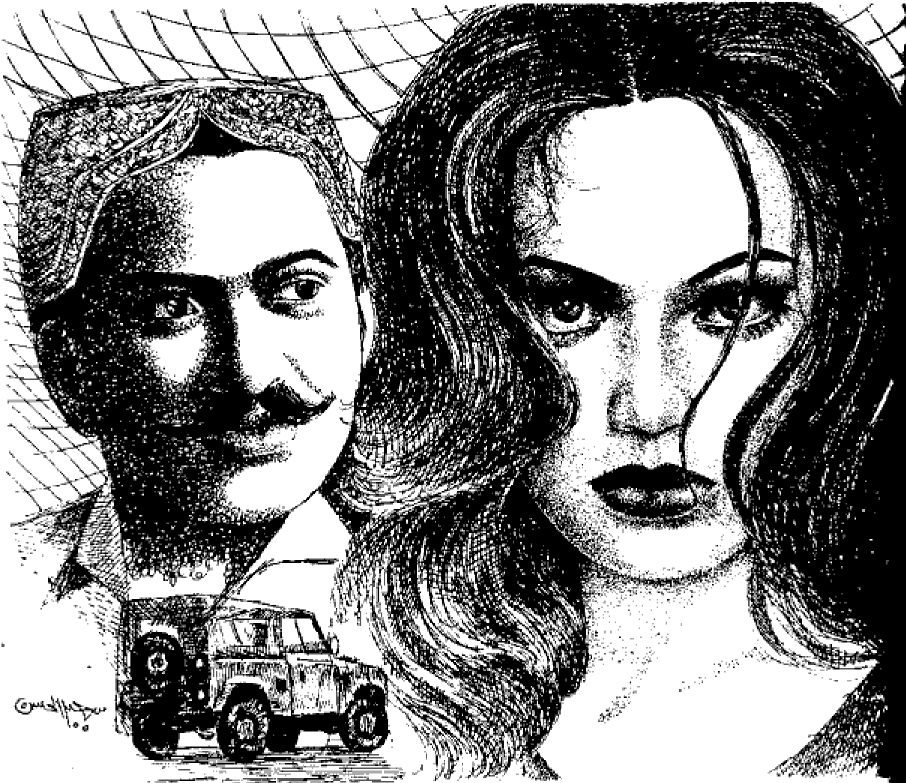
''درد زیادہ تو نہیں؟'' انہوں نے سوال کیا۔

"نہیں...... قابلِ برداشت ہے۔"
"تم تیار ہو؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔
"جی!"
"کس بات کے لیے؟" مسکرا کر سوال کیا گیا۔
"گھر جانے کے لیے۔" میں نے نہ سمجھتے ہوئے کہا۔
"اوہوں...... گھر جانے سے بڑا مرحلہ بھی کوئی ہو سکتا ہے...... اور گھر تو ہم تمہیں اتنی جلدی نہیں بھیجیں گے۔"
"تو پھر اور کیا ہے جس کے لیے مجھے تیار ہونا ہے۔"
"سامنے لے آؤ مریم!" انہوں نے اپنی نرس سے کہا اور نرس سامنے آئی تو اس کے ہاتھوں میں جو وجود تھا اسے دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن رک گئی، نرس کے ہاتھوں سے ذرا سا ہی بڑا وہ نحیف و نزار وجود، نالیوں کے سہارے سانسیں لیتا ہوا......
"یہ کیا ہے؟" نرس کو وہ بچہ اپنی طرف بڑھاتے دیکھ کر میں نے سوال کیا۔
"دو دن سے یہ یہاں اپنی زندگی اور موت کے بیچ کی جنگ لڑتے ہوئے اب نڈھال ہے، اسے اب تمہارے لمس کی ضرورت ہے، اسے تم نے اب زندگی کی طرف لانا ہے۔ اپنے لہو سے سینچ کر یہاں تک پہنچایا ہے اب اسے اس نعمت کی ضرورت ہے جو قدرت نے اس کے لیے تمہارے وجود میں اتاری ہے۔" ڈاکٹر یاسمین نے کہا۔
"یہ کیا ہے؟" میں نے پھٹی، پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔
"بچہ ہے امرت!"
"کس کا بچہ ہے یہ؟" میں بے یقینی سے مرنے لگی۔
"تمہارے پاس لائے ہیں تو کس کا ہوگا؟"
میرے اندر ممتا کے سوتے پھوٹ پڑے...... "میرا بچہ زندہ ہے، مجھے یقین نہیں آرہا۔" میں نے اسے مشکل سے اٹھایا، ایک تو سائز اتنا چھوٹا، اوپر سے نالیاں ہی نالیاں لگی ہوئیں، اس کی تکلیف اور بے بسی کا احساس مجھے رلانے لگا۔
"جذباتی نہیں ہونا امرت...... اسے اپنے وجود کے ساتھ لگاؤ، محسوس کرو۔ روؤ گی تو اس کے لیے اور تمہارے لیے بھی نقصان دہ ہوگا۔"
"میں...... مم......!" میرے منہ سے کوئی بات ہی نہیں نکل رہی تھی۔
"میں نے تمہارے دودھ کا سیمپل بھجوا کر ٹسٹ کروایا تھا، اللہ کے فضل سے سب ٹھیک ہے، تم ہمت کرو اور اب اس بچے کو دودھ پلاؤ، ہاں اپنے بیٹے کو!" وہ کہہ کر مسکرائیں۔ "آپا جی...... مریم، امرت کی مدد کریں اور اس کے بعد انہیں واپس اپنے کمرے میں شفٹ کریں، بچہ ابھی نرسری میں رہے گا۔ اسے جب تک نرسری میں رکھنا ہے تب تک امرت بھی اسپتال میں رہیں گی اور وہ وقت پر بچے کو دودھ پلانے کے لیے یہاں آئیں گی، اسے کمرے میں نہیں لے کر جانا، اس کے لیے نرسری سے باہر جانا خطرے سے خالی نہیں۔" مجھے اور نرس کو تاکید کر کے وہ چلی گئیں۔
آدھے گھنٹے کے بعد اس کی کچھ طلب کو مٹا کر مجھے واپس اپنے کمرے کی طرف لے جایا جا رہا تھا، اسے بھینچ بھینچ کر پیار تو کیا تھا مگر جان ہی نہ پائی تھی کہ وہ تھا کیا، بیٹا یا بیٹی! میں اس وقت بھی ایسی ہی بے خبر تھی جیسی اس کی پیدائش سے پہلے۔ اچانک میرے دماغ میں ایک کوندا سا لپکا، ڈاکٹر یاسمین نے اس روز یہ کیوں کہا تھا کہ میرے گھر والوں کو صدمہ ہے...... کیا انہیں نہیں بتایا گیا تھا کہ بچہ زندہ ہے......

(جاری ہے)

ماروی

عزہ خالد



"ماروی...... اری او ماوری......" لکڑی کے دروازے کا پٹ کھول کر گھر میں داخل ہوتے ہی جمن نے پکارا، وہ جو مٹی کے چولھے میں لکڑیاں جلانے کی کوششوں میں ہلکان ہو رہی تھی بابا کی آواز پر فوراً اٹھ کر صحن میں آگئی۔
"جی بابا سائیں۔"
"اری تو پاس ہو گئی ہے، تیرا یونیورسٹی میں داخلہ ہو گیا ہے۔" جمن کی آواز خوشی سے کانپ رہی تھی۔

''سچی......'' ماروی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی تھی۔ برآمدے میں جائے نماز پر بیٹھی کنیز بی بی نے جلدی سے دعا مکمل کی اور صحن میں آ گئی۔

''جمن...... لڑکی ذات ہے اتنا نہ پڑھا...... برادری ناراض ہو جائے گی۔''

''ہونے دے برادری کو ناراض، بس اللہ سائیں راضی ہونا چاہیے۔''

''جمن نہ بھیج شہر، وہاں کے لوگ پتا نہیں کیسے ہوں گے اور ماروی رہے گی کہاں؟ لوگ سو، سو باتیں بنائیں گے۔''

''ارے وہاں رہنے کے لیے گھر ہوتے ہیں، کیا کہتے ہیں انہیں...... بھلا سا نام تھا۔'' جمن نے ذہن پر زور دیا۔

''بابا سائیں ہاسٹل کہتے ہیں انہیں۔'' ماروی نے فوراً کہا۔

''ہاں، بابا ہاسٹل...... ہاسٹل میں رہے گی میری دھی۔''

''جمن لڑکی ذات ہے کل کو کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔'' کنیز کے ذہن میں ہزار وسوسے تھے۔

''اری نیک بخت اللہ سائیں پر بھروسا رکھ، الٹا سیدھا نہ سوچ...... ماروی پڑھ لکھ کر افسر بنے گی' اپنے بابا کا نام روشن کرے گی۔ ماسٹر جی کہتے ہیں، بابا جمن، ماروی پڑھائی میں بہت اچھی ہے۔ بارھویں میں پورے ضلع میں سب سے پہلا نمبر ہے اس کا...... اگر یہ یونہی محنت سے پڑھتی رہی تو بہت آگے جائے گی اور پھر سب کو بتایا کرے گی کہ میرا بابا کمہار ہے، مٹی سے برتن بناتا ہے۔'' جمن کی آنکھوں میں آنسو تھے خوشی کے آنسو...... وہ تصور میں کچھ سال آگے چلا گیا تھا۔ جہاں بڑی سی گاڑی میں بیٹھ کر ماروی گاؤں آئی تھی اور سب کو بتا رہی تھی کہ ''یہ میرے بابا سائیں ہیں۔'' اور لوگ رشک بھری نظروں سے جمن کو دیکھ رہے تھے۔

''پر بابا پیسوں کا انتظام کیسے ہوگا؟'' ماروی کو خرچے کی فکر ستانے لگی۔

''تو فکر نہ کر میں نے سارا انتظام کر لیا ہے تو بس شہر چلنے کی تیاری کر خوب دل لگا کر پڑھنا ہے تجھے، بابا کی لاج رکھنی ہے۔'' جمن نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

وہ اثبات میں سر ہلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا خواب تھے۔

کنیز بی بی نے ناراضی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

☆☆☆

آج یونیورسٹی میں اس کا پہلا دن تھا وہ اچھی خاصی کنفیوز تھی بار، بار بلاوجہ اپنی شیشوں والی کڑھائی کی بڑی سی چادر ٹھیک کرنے لگتی۔ اجنبی شہر، اجنبی ماحول، اجنبی لوگ...... یہاں دور، دور تک کوئی شناسا چہرہ نہیں تھا۔ اس نے گاؤں کے گرلز اسکول سے میٹرک کر کے انٹر پرائیویٹ کیا تھا اور اب...... کو ایجوکیشن...... اس کے لیے اچھا خاصا مشکل تھا۔ وہ بہت ذہین تھی، اپنے اسکول کی بہترین اور پُر اعتماد طالب علم رہی تھی پر یہاں آ کر اسے اپنا آپ عجیب دبو سا لگ رہا تھا۔ وہ کتابیں سینے سے لگائے ارد گرد یوں دیکھ رہی تھی جیسے مریخ پر آ گئی ہو۔ سامنے کھڑا گروپ اس پر بے تحاشا ہنس رہا تھا۔

''دیہاتی آئٹم......'' جانے کس طرف سے آواز آئی تھی اور وہ نظریں جھکائے آگے چل پڑی۔ پیچھے سے بے تحاشا ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں بڑی تیزی سے بھیگنے لگیں۔ اسے اپنے فیصلے پر اِک پل کے لیے پچھتاوا بھی ہوا پر اگلے ہی لمحے بابا کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگا۔

''میری بیٹی بہت بڑی افسر بنے گی اپنے بابا کا نام روشن کرے گی۔'' اس کے پست ہوتے حوصلے پھر سے بلند ہو گئے۔ اس نے آنسو صاف کیے اور اعتماد سے قدم آگے بڑھا دیے۔ بابا نے ہاسٹل کی فیس اور دیگر تعلیمی اخراجات کے لیے ماسٹر جی سے قرض لیا

وہ شہر آنے سے پہلے بابا کے ساتھ ماسٹر جی سے ...ئی تھی۔

''ماسٹر جی میں آپ کا یہ احسان ساری زندگی ...بھولوں گا۔'' جمن نے تشکر بھرے لہجے میں کہا اور ...کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بڑی عقیدت سے ...محسن کو دیکھ رہا تھا۔

''احسان کیسا بابا جمن...... یہ تو میرا فرض ہے، ...اپنے حصے کا دیا جلا رہا ہوں اور مجھے یقین ہے اس دیے ...روشنی سے اندھیرا ختم تو نہیں پر کم ضرور ہوگا۔''

''ماروی؟'' ماسٹر جی ماروی کی طرف مڑے ...جو بڑے احترام سے سر جھکائے کھڑی تھی۔

''شہر جا کر اپنا مقصد بھول مت جانا، تم اس ...قے سے ہو جہاں لڑکے بھی شہر پڑھنے نہیں جاتے ...لڑکی ہو کر جا رہی ہو، ان سفید بالوں کی لاج رکھنا ...رے زمانے کی مخالفت لے کر اتنا بڑا قدم اٹھا رہا ...'' وہ اسے سمجھا رہے تھے۔

''اس اجرک کے رنگ سلامت رہنے چاہیے ...'' ماسٹر جی نے اسے اجرک دیتے ہوئے کہا تھا۔

☆☆☆

''ارے واہ شہزادے، یہ موبائل فون کب لیا ...؟'' حامد نے عمار کے ہاتھوں میں لش، لش کرتا ہوا ...فون دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل ...۔ یہ فون سیٹ چند دن پہلے مارکیٹ میں نیا آیا تھا۔

''کل ہی لیا ہے یار......''

''یہ تو بہت مہنگا ہے ناں......؟''

''ہاں ہے تو۔'' عمار نے ٹیکسٹ لکھتے ہوئے ...دیا۔

''واہ یار تو، تو اپنے باپ کی جائداد سے خوب ...کر رہا ہے ایک ہم ہیں ابو ایک پھوٹی کوڑی نہیں ...تو......'' فہد نے رشک بھری نظروں سے عمار کو ...تے کہا۔

...گھر میں دو، دو گاڑیاں ہیں پر بسوں کے دھکے ...کھاتے ہیں ہمیں تو۔'' حامد نے دکھی دل سے کہا۔

''نصیب اپنا، اپنا......'' عمار شیخ کندھے اچکاتے ہوئے بولا اس کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔

''واہ شہزادے، قدرت نے تجھے اور تیرے نصیب دونوں کو فرصت میں بنایا ہے۔ لڑکیاں بھی ایسے مرتی ہیں اس پر، ایک ہم ہیں، ہمیں دیکھتے ہی بھائی بول دیتی ہیں۔'' فہد نے عمار کو دیکھتے ہوئے حامد سے کہا۔

''کہا ناں جگر نصیب اپنا، اپنا۔'' عمار نے گردن اکڑا کر کہا اور پھر ان دونوں کے ساتھ ڈیپارٹمنٹ کی طرف چل پڑا۔

''کالج میں بھی ساری لڑکیاں ایسے مرتی تھیں اس خبیث پر جیسے یہ پرنس ولیم ہو، یہ جسے اِک نظر بھر کے دیکھ لیتا سمجھ لے وہ گئی۔'' حامد اس کا بچپن کا دوست تھا۔

''بس رہنے دے اب ایسی بھی لیڈی کلر ٹائپ پرسنالٹی نہیں ہے اس کی۔'' فہد جانے کیوں اس کی اتنی تعریفوں پر چڑ سا گیا شاید وہ اس سے حسد محسوس کر رہا تھا۔

''پانی ڈال اس پر حامد، جل رہا ہے کھامڑ دوستوں سے جلتا ہے۔''

''میں کیوں جلوں گا، مجھے پتا ہے لڑکیاں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوتیں۔''

''بے وقوف...... ہاہاہا...... پاگل ہیں پاگل...... تیرے یار کے پیچھے۔'' عمار نے فخر سے کالر جھٹکا۔

''اچھا یہ بات ہے تو چل' یہ سامنے جو لڑکی آ رہی ہے اسے کسی طرح پٹا لے تو میں تجھے مان جاؤں گا۔'' فہد نے سامنے چادر کو اچھی طرح لپیٹے کتابیں سینے سے لگائے کلاس روم کی طرف آتی ماروی کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ...... اوہ مائی گاڈ......'' عمار خوب ہنس رہا تھا۔

''یہ پینڈو...... دیہاتی آئٹم...... یہ تو ایسے ہی چٹکیوں میں پٹ جائے گی۔'' عمار نے چٹکیاں بجاتے ہوئے کہا۔

''اتنے عرصے سے دیکھ رہا ہوں اسے، کسی سے

فالتو بات نہیں کرتی، اپنے کام سے کام رکھتی ہے نہ ہی عام لڑکیوں کی طرح توجہ حاصل کرنے کے لیے اوچھی حرکتیں کرتی ہے۔'' فہد اس سے متاثر تھا۔

''ہاہاہا...... تیرا بھی جواب نہیں ہے فادی...... آج تک اسے کسی لڑکے نے لفٹ کروائی ہی نہیں ہے، نہیں تو یہ پیلے اسکول کی پیداوار قدموں میں فوراً ڈھیر ہو جائے۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے، یہ لڑکی تھوڑی ڈفرنٹ ہے۔''

''میں تمہیں دکھاؤں گا صرف ایک ہفتے میں یہ عمار شیخ کے سحر میں جکڑی ہوگی۔''

''تو ایک نہیں دو ہفتے لے، لے بھلے۔''

''نہیں، میں صرف ایک ہفتے میں تمہیں دکھا دوں گا یہ عمار شیخ کے بائیں ہاتھ کی مار ہے۔''

''اور اگر تم ہار گئے تو؟''

''تو جو تم کہو گے وہ کروں گا۔''

''ٹھیک ہے، ایک ہفتہ ہے تمہارے پاس...... اگر تم ہار گئے تو یہ موبائل سیٹ میرا ہوگا، ڈن؟'' فہد نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''ڈن......'' عمار نے مسکراتے ہوئے کہا اُسے اپنی فتح کا ایک سو ایک فی صد یقین تھا۔

☆☆☆

اس نے ایک نظر سامنے پڑے قیمتی تحائف کو دیکھا اور پھر اپنی نظر ہاتھ میں پکڑے کارڈ پر جما دی...... جہاں بہت خوب صورت سی غزل لکھی تھی۔ اور نیچے عمار شیخ کا نام جگمگا رہا تھا۔

''عمار شیخ......'' وہ زیرِ لب بڑبڑائی تھی اس نے سامنے پڑے ٹیڈی بیئر کو دیکھا جس پر خوب صورت سا دل بنا ہوا تھا۔

ابھی کل ہی کی تو بات تھی جب وہ لائبریری میں بیٹھی بڑے انہماک سے کتاب پڑھ رہی تھی اچانک اس کی نظر سامنے بیٹھے عمار پر پڑی جو کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا پر بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ اچھی خاصی گھبرا گئی تھی وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

اب عمار نے اس کے لیے اتنے سارے قیمتی تحائف بھجوائے تھے۔ وہ پریشان سی صورت بنا۔ سامنے کرسی پر ڈھے گئی تھی۔

☆☆☆

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں۔'' دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں پا کر وہ کرسی کھینچ کر خود ہی بیٹھ گیا تھا۔

''آپ کل کیوں نہیں آئیں؟ میں نے آپ کا اتنا انتظار کیا...... یقین کریں آپ کو نہ دیکھوں تو لگتا ہے...... میرا دل رک جائے گا...... آپ میرے دل، دماغ پر چھائی جا رہی ہیں۔'' عمار کا دل جانتا تھا کہ وہ کتنی مشکلوں سے اتنی تمیز سے بات کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی اتنی زبردست اداکاری پر بہت خوش ہو رہا تھا۔

ماروی اسے دیکھ رہی تھی وہ امیر کبیر لڑکا، کمہار کی بیٹی سے اظہارِ محبت کر رہا تھا۔

''ماروی......! میری بات سن رہی ہو ناں......؟'' ماروی کی خاموشی اسے مزید شہہ دے رہی تھی اس نے ٹیبل پر رکھا ماروی کا ہاتھ تھامنا چاہا، ماروی نے اس کا ارادہ بھانپتے ہی فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''میں ماروی ہوں عمار شیخ...... ماروی نہ کل عمر کی وجاہت اور امارت سے متاثر ہوئی تھی نہ آج ہو گی ماروی نے اپنی مٹی، اپنے لوگوں سے وفاداری کا عہد کیا ہوا ہے، وہ اپنا عہد نبھائے گی۔ جمن کمہار کی عزت اتنی سستی نہیں جو میں ایک امیر زادے کے لیے داؤ پر لگا دوں...... تم نے بہت غلط سوچا میرے بارے میں۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی فوراً اپنی کتابیں اٹھا کر وہاں سے چلی گئی تھیں۔

عمار حیرت سے اسے جاتے دیکھ رہا تھا جانے کیوں آج اسے اپنا آپ اس پینڈو اور دیہاتی لڑکی کے سامنے بہت ہیچ اور کم تر لگ رہا تھا۔

▲▲▲

اے زندگی جواب دے

عالمی یومِ خواتین کی مناسبت سے عقیلہ حق کی پُرفکر تحریر



''میری سمجھ میں نہیں آتا وقت آگے کیوں نہیں بڑھ رہا، میرے خیال سے گھڑی خراب ہو گئی ہے۔'' خالد احمد نے ہاتھ میں بندھی گھڑی کو دیکھ کر جھنجلاتے ہوئے، گھڑی اتار کر سائڈ ٹیبل پر پٹخی اور کمرے سے باہر نکل آئے۔

☆☆☆

''ہاں، ہاں چاول بالکل ٹھیک ہیں، بس تم پیالو، اور دیکھو رائتے میں پودینے کے پتے توڑ کر باریک

کاٹ کر ڈالنا اور زیرہ پہلے سیدھے توے پر بھون لینا اور پھر کوٹ کر ملانا، مدیحہ کو رائتہ اسی طرح پسند ہے۔"
رخشندہ بیگم نے کسٹرڈ کی ڈش سجاتے ہوئے کچن میں کام کرتی ملازمین عورتوں کو ہدایت کی، آج ان کی بیاہی بیٹی جس کی شادی کو ابھی ایک ماہ ہی ہوا تھا ملنے آ رہی تھی، وہ تو خیر ماں تھیں، صبح ہی سے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے تھیں لیکن خالد...... خالد تو بہت ہی بے تاب تھے، جب دو دن پہلے مدیحہ کا فون آیا کہ وہ آج سارا دن ان کے ساتھ گزارے گی تو وہ آفس ہی نہیں گئے۔
اس کی شادی کے ٹھیک تین ہفتوں بعد اس کی اکلوتی نند کی شادی شروع ہو گئی۔ یوں مدیحہ چوتھی کی رات جو باپ کے گھر آ کر ٹھہری تو اس کے بعد، وہ نند کی شادی کی مصروفیات میں لگ گئی۔
خالد بہت بے چین ہوئے...... انہوں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ "مدیحہ، روز ان سے ملنے آیا کرے گی۔"
خالد اور رخشندہ کی ایک ہی تو بیٹی تھی، جو ان کی شادی کے پانچ سال بعد پیدا ہوئی تھی...... خالد کو بیٹی سے والہانہ محبت تھی۔ بیٹیاں تو ہوتی ہی محبت کے لیے ہیں۔
"میری سمجھ میں نہیں آ رہا، یہ گھڑی کی سوئیاں کیوں رک گئی ہیں اور آپ اب پتا نہیں کیا کرتی پھر رہی ہیں، میں کئی بار مدیحہ کو فون کر چکا، وہ فون ہی ریسیو نہیں کر رہی۔" خالد نے کچن کے دروازے میں کھڑے ہو کر کام میں مصروف رخشندہ کنول سے کہا۔
"توبہ ہے خالد...... آپ تو حد کرتے ہیں جانتے تو ہیں کہ بیٹی مزاجاً کس قدر لاابالی ہے، کہیں اِدھر اُدھر فون رکھا ہوا ہوگا، اب سسرال میں رہتی ہے، ہو سکتا ہے کسی کام میں مصروف ہو، بالکل نہیں گھبرائیں۔ رات کو ہی میری بات ہوئی تھی، اس نے کہا تھا ممی میں بہت تھک گئی ہوں، ہو سکتا ہے دو چار دن آ کر آپ کے پاس رہوں۔" انہوں نے بے قراری سے ٹہلتے شوہر سے کہا۔
"ہاں، ہاں یہی تو میں سوچ رہا ہوں، کل مجھ سے بھی مدیحہ بیٹی نے یہی کہا تھا۔ یا اللہ بیٹیاں بھی تیری کتنی بڑی نعمت ہیں ویسے رخشندہ میرے خیال سے دنیا کا سب سے بڑا جہاد لاڈلی بیٹی کو رخصت کرنا ہے۔ کبھی، کبھی میں سوچتا ہوں مجھے تو ایک رات اپنی بیٹی کو دیکھے بغیر نیند نہیں آتی تھی، آج کتنے دن ہو گئے اسے دیکھے بغیر......" انہوں نے بے اختیار داخلی دروازے کی طرف دیکھا کہ شاید...... اور پھر مایوسی ان کی آنکھ کی پتلی میں اتر آئی۔
سارے ہی باپ اپنی بیٹیوں کو بہت محبت سے پالتے ہیں، ان کے لیے ایک یا دس کی قید نہیں ہوتی، بیٹیاں تو پھول ہوتی ہیں ہر بیٹی اپنے باپ کی ملکہ ہوتی ہے چاہے شوہر کے لیے اس کی کوئی بھی حیثیت ہو اور جو آپ کی بیٹی کی ماں ہوتی ہے ناں وہ بھی تو آخر کسی کی بیٹی ہوتی ہے مگر یہ کوئی نہیں سوچتا۔
دروازے کی گھنٹی بجی تھی، گو کہ چوکیدار موجود تھا لیکن خالد صاحب خود تیزی سے گیٹ کی طرف جا رہے تھے کہ گیٹ پر یقیناً ان کی لاڈلی ہوگی۔
رخشندہ نے گہری سنجیدگی سے اپنے مجازی خدا کی پشت دیکھی اور نہ جانے کیوں ایک اداس سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر پھیل گئی۔

☆☆☆

"خیریت...... کہاں کی تیاری ہے؟" سلور کامدار سوٹ پر سلور کام کی بلیک شال اوڑھے ہلکے میک اپ میں وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔
احمد نے کنول کی پتلی سی کمر کے گرد بازو حمائل کرتے ہوئے وارفتگی سے کہا۔
مرد کی قربت اور محبت کا نشہ نیا، نیا تو کنول نے نہ تھا وہ ایک ادا سے مسکرائی۔ اور بڑی نزاکت سے اس کے چوڑے شانے میں منہ چھپا کر لجکتے ہوئے بولی۔
"بھول گئے آپ، آج ابو کے گھر جانا ہے ناں"
"ابو کے گھر جانا ہے؟" احمد جو اس کے جسم سے اٹھتی مہک اور گداز بدن کی لطافت میں گم تھا، اس کے لب سرسرائے۔ ساتھ ہی کوئی جملہ بھی سماعت میں گونجا۔
"دیکھو احمد میاں، میں تم کو بتائے دے رہی ہوں، یہ تمہاری جو بیوی ہے ناں یہ اپنے باپ کی سر چڑھی

...راہ بہت ہے مزاج میں، ذرا رسی کھینچ کر رکھنا، ورنہ یہ لڑکی ...سارے خاندان کو نچا کر رکھ دے گی۔"
"سارے خاندان کو نچا کر رکھ دے گی؟ لیکن ...اں بی آپ تو بہت ارمانوں سے، ساری دنیا کی ...ک چھان کر کنول کو بیاہ کر لائی ہیں، میری کوئی لو ...رج تو ہے نہیں یہ سب باتیں آپ کو پہلے سوچنا چاہیے ...یں، اب شادی کے دس دن بعد...... آپ کو کیوں ...نول میں برائیاں ہی برائیاں نظر آ رہی ہیں۔" وہ ...ران سے لہجے میں بولا۔
"اوہو...... زن مرید...... جمعہ، جمعہ آٹھ دن ...ادی کو ہوئے اور بیوی کی حمایت میں ماں کے دوبدو ...کھڑے ہوئے بہت خوب...... بھائی...... بہت ...ب...... اماں کی زندگی بھر کی قربانیوں اور تکلیفوں کا ...صلہ دے رہے ہو، پتا نہیں یہ آج کل کی لڑکیاں کیا ...ویذ گنڈے گھول کر پلاتی ہیں کہ اچھا بھلا مرد باؤلا ...ہو جاتا ہے۔" احمد کی بڑی بہن طلعت جو سسرال سے ...ک ہو کر اُن کے محلے میں ہی آ بسی تھیں اور پھر سارا ...ن ماں کے گھر آ کر ان کے سینے سے لگی، سارے گھر ...مرانی کرتی تھیں، ہاتھ نچا کر بولیں۔
"توبہ ہے آپا...... میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو ... ایسی باتیں کر رہی ہیں اور اماں بی پلیز آپ ...یں تو مت بس میں وہی کروں گا جو آپ کہیں گی اور ...ے بھی آپ گھر میں بڑی ہیں، جس بات میں آپ کی ...ی بس اسی بات میں ہماری خوشی......" احمد نے بیوہ ... کے گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے اُن کو بچوں ...طرح بہلایا۔
"تو پھر دیکھو، سب سے پہلے تو دلہن بیگم کا میکے ...ا کم کرو، یہ آج کل کی لڑکیاں میکے جاتی ہیں اور ...ئے، نئے گُر سیکھ کر آتی ہیں۔ اب ہر کوئی ہماری ... تو ہوتا نہیں کہ ہم نے تو اپنی بیٹی کو رخصت کرتے ... سمجھا دیا تھا کہ بیٹی ڈولی میں جا رہی ہو، جنازہ ہی ...ال سے اٹھے گا۔"
"جنازہ......؟" احمد، اپنی ماں کے سفید جھوٹ پر سوچتا ہی رہ گیا۔ لیکن ان کے آگے بولنے کی ہمت نہ پہلے تھی اور نہ ہی آج......
"جی ہاں، ابو کی طرف...... میں نے صبح آپ کو بتایا تو تھا۔" کنول نے اپنی کمر کے گرد احمد کے بازوؤں کی سخت گرفت کو ڈھیلا پڑتا محسوس کرتے ہی حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
اور احمد جو کہیں سوچوں میں گم تھا ایک دم سے جیسے ہوش میں آیا اور کنول سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔
"نہیں یار، بالکل موڈ نہیں ہے۔"
"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ احمد، آج ابو نے خاص آپ کے اعزاز میں ہی دعوت رکھی ہے ساتھ میں کچھ اور رشتے داروں کو بھی بلایا تھا، میں نے آپ کے گھر والوں سے بھی کہا تھا چلنے کے لیے لیکن آپ کی امی نے بھی منع کر دیا۔" کنول نے منہ بھرے لہجے میں کہا۔
"آپ کی امی......؟" احمد زیرِ لب بولا۔ "یہ آپ کی امی کیا ہوتا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ لوگ شادی ہو کر گھر بسانے تو آ جاتی ہیں لیکن میری امی اور آپ کی امی کی گردان ہی میں الجھی رہتی ہیں، مسز کنول احمد صاحبہ اب میری امی آپ کی بھی امی ہیں سمجھیں آپ!"
احمد نے خاصے بگڑے ہوئے موڈ میں اس سے کہا اور کوٹ ہینگر میں لٹکا کر الماری میں لٹکا دیا۔ احمد کو موڈ خراب کرنے کا جیسے بہانہ مل گیا تھا۔
مرد اور گرگٹ...... شاید ایک شخصیت کے دو نام ہوتے ہیں، برسوں پہلے پڑھا ایک جملہ اپنی معنویت کے اعتبار سے کنول کی سمجھ میں آ چکا تھا۔
"اچھا سوری...... چلیں میرے گھر سے بار، بار فون آ رہا ہے۔"
"پھر وہی......" احمد سچ مچ ہی اکھڑ گیا۔ ایک تو آفس کی ٹینشن پھر گھر میں گھستے ہی ماں، بہن کی باتیں اور پھر بیوی کی فرمائش وہ بیزار ہونے لگا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا جب تک لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی لمبے، لمبے وظیفے پڑھے جاتے ہیں، دعائیں کی جاتی ہیں، جہیز کے لیے چیزیں جمع کی جاتی

ہیں۔ ماں، باپ کا یہ حال ہوتا ہے آدھی رات کو بھی مناسب رشتہ آجائے تو بیاہ دیں لیکن جب شادی ہوجاتی ہے تو اچانک میکے سے آپ لڑکیوں کو اتنی شدید محبت ہوجاتی ہے کہ دوسرے گھر میں چاہے کوئی کتنی ہی محبت کرے، کتنا ہی ہاتھوں ہاتھ لیا جائے لیکن باپ کا گھر ہی دراصل آپ لوگوں کو اصل گھر لگتا ہے۔ اور میاں کا گھر تو کال کوٹھڑی ہوتا ہے...... ہے ناں......"

احمد کا لہجہ طنزیہ تھا۔

کنول حیرانی سے کھڑی اس شخص کو دیکھ رہی تھی، جو ابھی اس پر دیوانگی کی حد تک وارفتہ ہو رہا تھا جو اس سے محبتوں کا دعویٰ کر رہا تھا۔ اور اب اس وقت......

کچھ نمکین پانی، اس کی آنکھوں کے بجائے دل سے ٹپکا...... وہ خاموش ہوگئی، وہ سمجھ گئی کہ وہ گھر سے ایک مکان میں آئی ہے اور اس مکان کو گھر بنانے کے لیے اسے ایک، ایک اینٹ خود اکٹھی کرنی ہوگی اور آج اس نے پہلی اینٹ رکھنی ہے۔

"چلیں کوئی بات نہیں، ہم نہیں جاتے لیکن احمد یہ تو دیکھیے میں کتنی اچھی لگ رہی ہوں، سچ اتنی محنت سے تیار ہوئی اور آپ منہ بنا کر بیٹھ گئے۔" کنول نے کند چھری سے اپنی انا کو کچل کر بظاہر ہنستے مسکراتے ہوئے شوہر کے قریب بیٹھ کر اسے گدگدایا۔

احمد ایک لمحے کے لیے حیران رہ گیا، وہ سمجھ رہا تھا، وہ غصہ کرے گی، ناراض ہوجائے گی لیکن صورتِ حال اس کی سوچ کے بالکل برعکس تھی۔

اس نے حیران نظروں سے پور، پور مہکتی مسکراتی اپنی نئی نویلی بیوی کو دیکھا اور پھر بے ساختہ مسکرا دیا۔

اس کی فاتحانہ مسکراہٹ کنول کے دل میں خنجر کی طرح پیوست ہوگئی۔ وہ خاموشی سے کپڑے بدلنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔

شادی سے پہلے اسے نہیں معلوم تھا اپنا سینہ اور پشت اس سے بہت چوڑے کرنے ہوں گے جہاں کبھی کیل، کبھی کانٹا اور کبھی خنجر پیوست ہوں گے...... لیکن اب آہستہ، آہستہ اسے سمجھ آرہا تھا کہ ایک عورت کو مکان سے گھر تک کا فاصلہ قبر کی گہرائیوں میں اتر... تک مسلسل طے کرنا ہوتا ہے اور ساری زندگی وہ جس مکان کو گھر بنانے میں لگا دیتی ہے، وہ کسی بھی لمحے واپس مکان بن سکتا ہے، یہ خوف اس کی راتوں کی نیندیں اڑا دیتا ہے اور اس محنت کش شب بیدار عورت کا شاید کوئی گھر نہیں ہوتا۔

"چلو اچھی بات سمجھائی اماں اور آپا نے، واقعی میں اتنا تھکا ہوا تھا...... پھر جا کر سسرال میں مصنوعی قہقہے لگاؤ، توبہ ہے، ویسے بھی اماں کہہ رہی تھیں سسرال میں زیادہ نہیں جانا چاہیے اور صحیح بات ہے جس نے پہلے بلی ماردی وہی جیتا، الحمد للہ میں نے آج بلی ماردی......" احمد نے پہلو میں بے خبر سوئی بیوی کو دیکھتے ہوئے دل ہی دل میں اپنے آپ کو داد دی اور سائیڈ لیمپ بجھا کر آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

"امی...... بس ہم لوگ نکل ہی رہے تھے کہ احمد کی خالہ اپنی فیملی کے ساتھ اچانک بغیر کسی اطلاع کے آگئیں...... اب میں کیسے نکل سکتی ہوں۔"

"لیکن میرا بچہ...... یہاں سب انتظار کر رہے ہیں۔" آمنہ بیگم بیٹی کے فون پر گھبرا سی گئی تھیں۔ "صبح سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔" "تمہارے ابو نے چند قریبی رشتے داروں کو بھی کھانے پر بلایا ہے تاکہ دولھا میاں کا سب سے تعارف بھی ہوجائے...... لیکن بیٹا......"

"امی پلیز...... آپ ہی تو کہتی تھیں پہلے تمہارا سسرال اور تمہارے شوہر اور ہم بعد میں...... لیکن امی مجھے ابو کی فکر ہے، ابو کیا کہیں گے۔"

"میں جانتی ہوں میری پیاری بیٹی تم جھوٹ بول رہی ہو، تم کو نو ماہ میں نے اپنی کوکھ میں رکھا ہے لیکن کوئی بات نہیں۔" آمنہ بیگم محض سوچ کر رہ گئیں۔

"تم اپنے ابو کی فکر مت کرو بیٹا، میں ان سے کہہ دوں گی، بس بیٹا تم اپنا گھر دیکھو، تم اب سسرال میں ہو اور سسرال میں اپنی جگہ بناؤ کیونکہ بیٹا اس گھر میں موجود ہر شخص کی پہلے سے جگہ اور مقام ہے لیکن تم

...ہاں نئی، نئی گئی ہو تمہیں اپنا مقام خود بنانا ہے اور خود یہ طے کرنا ہے کہ تم کہاں بیٹھو گی دہلیز پر یا گاؤ تکیے پر ٹیک لگا کر......" آمنہ بیگم نے اپنے آپ کو سمجھانے کے ساتھ، ساتھ بیٹی کی ہمت بندھائی سچ ہے بیاہی بیٹی کا دوسرا گھر تو ماں ہی بساتی ہے۔

کنول نے اندھیرے کمرے میں آنکھیں کھول کر اپنے پہلو میں بے خبر سوئے اس شخص کو دیکھا جو ایک دن پہلے اس کا کچھ نہیں تھا اور اب سب کچھ ہے۔

تین دستخطوں کی بنیاد پر بننے والا یہ رشتہ دنیا کے ہر رشتے پر بھاری ہوجاتا ہے۔ کتنی جلدی حقدار بدل جاتے ہیں...... اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر اس نے آنکھ سے بہتے آنسوؤں کو روکا نہیں بہنے دیا۔

شکر ہے آنسوؤں کا رنگ نہیں ہوتا ورنہ ہر صبح نہ جانے کتنے لوگوں کے راز کھل جاتے......

☆☆☆

"دیکھو بیٹا، سسرال میں اختلافات، رنجیدگیوں اور دوریوں کا سبب بنتے ہیں بس بیٹا، اگر وہ کہیں کہ ...ف بلی لے گئی تو ہاں جی ہاں جی کہو۔" مرزا صاحب نے پیاری بیٹی، کنول کے ہاتھ سے دودھ کا پیالہ لیتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب......؟ کیا مطلب ابو میں سمجھی نہیں۔" کنول حیران تھی۔

"ارے میری گڑیا...... تم اچھی طرح جانتی ہو کہ بلی اونٹ کو نہیں لے جاسکتی، اب اگر تمہاری سسرال والے اتنی ناممکن بات کریں کہ اونٹ کو بلی لے گئی تو یہ نہیں کہنا کہ ایسا نہیں ہوتا یا ایسا نہیں ہوسکتا بس ان کی ہاں میں ہاں ملانا، اختلاف کرنے کے لیے اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کے لیے ایک عمر گزارنی پڑتی ہے۔" مرزا صاحب نے اپنی مخصوص مسکراہٹ بھرے لہجے میں اسے سمجھایا۔

☆☆☆

"نہیں، میں شادی نہیں کروں گی...... میں ابو کو اور آپ کو چھوڑ کر نہیں جاسکتی۔ امی آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے جو اتنی جلدی مجھے اپنے سے دور کر رہی ہیں۔" کنول نے ماں کے ہاتھ میں مٹھائی کی پلیٹ دیکھتے ہوئے بھری ہوئی آنکھوں اور بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں بیٹا، ایسی باتیں نہیں کرتے، بیٹیاں تو نبیوں نے بھی بیاہی ہیں، ویسے بھی ایک کہاوت ہے مچھلی اور جوان بیٹی کو زیادہ عرصے گھر میں نہیں رکھنا چاہیے، یہ بہت اچھے لوگ ہیں، خوشحال، خاندانی...... لڑکے کا اپنا بزنس ہے، انشاء اللہ تعالیٰ تم بہت خوش رہوگی......" آمنہ بیگم نے افسردہ سی بیٹی کو اپنے سینے سے لگایا تو ایک آنسو اُن کی دائیں آنکھ کے کونے سے نکل کر چہرے پر پھسل گیا...... بیٹیوں کو اتنی محبت سے پال کر کسی کے حوالے کردینا، اللہ کی بہت بڑی آزمائش ہے، ان کے دل نے دہائی دی۔

"اللہ پاک تم کو خوش رکھے تم کبھی ہمارے فیصلے سے اختلاف نہیں کروگی، اسی یقین کے ساتھ تمہارے ابو نے ہاں کردی ہے۔" آمنہ بیگم نے آنسو چھپا کر مسکراتے ہوئے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے جھکے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچ رہی ہو بیٹا؟" کنول جو خیالات کی دنیا میں ہچکولے کھا رہی تھی، محبت کرنے والے باپ کی آواز پر چونک اٹھی۔

"کچھ نہیں ابا......" اس کی مسکراہٹ پھیکی تھی۔

"بیٹا میں سب سمجھتا ہوں، میں سب جانتا ہوں ہر بیٹی کو ایک نہ ایک دن باپ کا گھر چھوڑ کر اپنا گھر بسانے جانا پڑتا ہے۔ لیکن نصیبوں والی ہوتی ہیں وہ بیٹیاں جن کے سروں پر ماں، باپ کی دعاؤں اور رضا کا ہاتھ ہوتا ہے، اللہ پاک تمہیں خوش رکھے۔" مرزا عباد علی بیٹی کے دل میں چھپے وسوسوں کو سمجھتے تھے......

ویسے تو اللہ پاک نے انہیں تین بیٹیاں اور دو بیٹے دیے تھے...... دو بیٹیوں کو وہ بیاہ چکے تھے، دونوں ماشاء اللہ اپنے، اپنے گھروں میں بہت خوش تھیں۔ آج کل وہ اپنے بیٹے عاصم کے لیے لڑکی کی تلاش میں تھے کہ اُن کی

سب سے چھوٹی اور بہت لاڈلی بیٹی جس نے اسی سال ایم ایس سی کیا تھا کا ایک بہت اچھا رشتہ آگیا۔ یوں خیال تھا کسی اور کا اور تیاریاں شروع ہوگئیں کسی اور کی شادی کی......

آمنہ بیگم اور مرزا عباد علی دونوں ہی بہت سمجھدار اور سلجھے ہوئے مزاج کے تھے اور اسی مزاج پر انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت کی تھی۔ رخشندہ کنول چھوٹی ہونے کی وجہ سے سب کی بہت لاڈلی اور خاص کر باپ کی بہت چہیتی تھی...... روز رات کو جب مرزا عباد علی اپنی اسٹڈی میں جاتے تو وہ دودھ کا کپ لے کر چلی آتی اور پھر ڈھیر ساری باتیں سارے دن کی روداد باپ کے ساتھ شیئر کرتی اور وہ جہاں داد دینی ہوتی تو بیٹی کو شاباش دیتے اور جہاں سمجھانا ہوتا وہاں بہت نرمی سے ٹوک بھی دیتے۔ یوں کنول کو باپ کی قربت دیگر بہن، بھائیوں کی نسبت زیادہ حاصل تھی۔

''نہیں ابا...... میں تو یہ سوچ رہی تھی......'' کنول کچھ کہنا ہی چاہتی تھی۔

''نہیں بیٹا کچھ نہیں سوچو، بس اللہ پر چھوڑ دو لیکن ایک بات یاد رکھنا، تم میرا مان ہو، میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں بس بیٹا اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا۔'' ان کا لہجہ خود بخود تحکمانہ ہوگیا۔

''جی......'' اس کے لبوں سے آہستگی سے نکلا...... وہ نہیں جانتی تھی...... یہ آہستگی سے نکلا ہوا ''جی'' اسے کتنی آزمائشوں سے گزارے گا۔

کاش وہ جان سکتی......

لیکن اچھا ہوا نہیں جانتی تھی کہ بعض اوقات آگہی عذاب ہوتی ہے۔ اور جب اسے یہی آگہی ہوئی تو......

☆☆☆

خالد احمد عجیب دھوپ چھاؤں جیسے مزاج کا مرد تھا۔ اس کا بہت خیال رکھتا بعض اوقات محبتوں کا اس شدت سے اظہار کرتا کہ وہ حیران رہ جاتی۔ اور کبھی ایسا اجنبی بن جاتا کہ اس کی روح پیاسی اور دل تڑپ کر رہ جاتا۔

احمد کے گھر والے جو کہتے صحیح یا غلط وہ اس کے لیے حرفِ آخر ہوتا...... لیکن کنول نے بھی کبھی اس سے ضد نہیں کی، بحث نہیں کی۔ اسے اپنی ماں کی ایک نصیحت ہمیشہ یاد رہتی کہ ایک چپ سو کو ہراتی ہے لیکن اس کی چپ ایسی نہیں ہوتی کہ زبردستی ہوئی ہو، وہ ہمیشہ مسکراتی، خوش وخرم رہتی۔ اس نے سسرال کے کسی فرد کو بدلنے کی یا میاں کے کان بھرنے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ وہ خود بدل گئی۔ وہ سسرال والوں کے ماحول اور مزاج میں ڈھل گئی۔ ایک دن سب چیزیں اپنے مرکز پر آجاتی ہیں، اس کی زندگی میں بھی آہستہ، آہستہ توازن آنے لگا۔ احمد کے ماں، باپ اپنے بڑے بیٹے کے پاس لندن شفٹ ہوگئے۔ نند صاحبہ کے میاں کا تبادلہ اسلام آباد ہوگیا...... اور یوں بظاہر اس پر کوئی پابندی نہیں رہی لیکن کیا واقعی اس پر کوئی پابندی نہیں رہی تھی۔

کیا اسے تمام اختیار مل گئے تھے؟ بظاہر تو اسے سارے ہی عیش حاصل تھے لیکن کہیں پر ایک اداسی تھی جو اس کے اندر ڈیرے ڈالے بیٹھی رہتی، ایک چپ تھی جو اس کے اندر روتی رہتی، ایک تنہائی تھی جو اس کے اندر چیختی رہتی، ایک خاموشی تھی جو اس کے اندر بولتی رہتی، ایک دکھ تھا جو اس کے اندر چبھتا رہتا۔

لیکن کیوں؟ ایسا کیوں تھا؟ اللہ نے اسے اولاد بھی دی تھی، نیلی آنکھوں اور گلابی رنگت والی خوبصورت باربی ڈول جیسی بیٹی...... شریف، تعلیم یافتہ منکسر المزاج کاروباری شوہر......

ہاں شوہر! احمد عجیب سے مزاج کا مرد تھا، وہ شریف تھا، کسی عورت کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا، ہر کسی کا خیال رکھتا۔ آفس سے واپس آکر وہ اپنی لاڈلی بیٹی کے ساتھ کھیلتا لیکن نہ جانے کیوں ایک شفیق باپ، ایک ایماندار بزنس مین ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا شوہر کبھی ثابت نہیں ہوا تھا۔

☆☆☆

''بس بیٹا اگر زندگی میں چین اور سکون چاہتے ہو تو ہمیشہ سسرال والوں سے خود بھی دور رہنا اور بیوی کو بھی دور رکھنا۔ اب ہم تو جارہے ہیں، تمہاری بیوی کو

ری آزادی مل جائے گی اور پھر سارے گھر کا نظام درہم برہم ہوجائے گا۔ ہر دوسرے دن یا تو دلہن بیگم اپنے ابا کے گھر بیٹھی ہوں گی یا ان کے بہن، بھائی یہاں خوش گپیاں کررہے ہوں گے۔ اپنے گھر کے ماحول کو بہتر رکھنا ہے تو کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھنا۔''

احمد کی اماں نے لندن جاتے ہوئے ائرپورٹ پر بیٹے کو سینے سے لگاتے ہوئے آہستگی سے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی تھی۔

☆☆☆

''آپ کبھی میرے ساتھ نہیں چلتے، بالکل اچھا نہیں لگتا، سب کے شوہر ساتھ ہوتے ہیں اور جب سب بہنیں، اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ہوتے ہیں تو احمد مجھے لگتا ہے جیسے میں سنگل مدر ہوں، مجھے بہت شرم آتی ہے سب سے وہی گھسے پٹے بہانے کرتے ہوئے۔''

آج کنول کے خالہ زاد بھائی کا ولیمہ تھا، احمد بہت کم ہی سسرال کی کسی دعوت میں جاتا تھا اور جو کبھی گیا بھی جاتا تو جلد ہی لوٹ آتا اور بیوی، بیٹی کو بھی لے آتا۔ سب لوگ اس کا مزاج سمجھ چکے تھے، اس لیے خاموش رہتے اور کنول کے جھوٹے بہانوں کی حقیقت بھی جانتے تھے لیکن کل بارات میں اس کی ساری کزنز نے اس کا بہت مذاق بنایا تھا اور وجہ بھی پوچھی تھی اور برا بھی منایا تھا کہ آخر احمد کیوں نہیں آتے۔

سو آج کنول شوہر سے اصرار کررہی تھی کہ وہ چاہے تھوڑی دیر کے لیے چلے لیکن چلے ضرور......

''تو پھر چل رہے ہیں ناں آپ؟'' کنول نے ملتجی لہجے میں سوچوں میں ڈوبے احمد کا شانہ ہلا کر پوچھا۔

اور احمد جو دل ہی دل میں اپنی ماں سے کیا ہوا وعدہ یاد کررہا تھا ایک دم ہی چونک گیا۔

اس نے سامنے کھڑی بیوی کو دیکھا اور پھر حتمی لہجے میں کہا۔

''نہیں......''

☆☆☆

''بس ابو ضرور آتی ہم سب بالکل تیار تھے، گھر سے نکل ہی رہے تھے کہ احمد کے چاچا جی اپنی فیملی کے ساتھ آگئے۔ پھر میں کیسے آتی۔ حالانکہ احمد تو کہنے بھی لگے تھے کہ تم چلی جاؤ لیکن میں کیسے اکیلی آتی، اس لیے نہیں آسکی۔''

کنول نے اپنی بڑی بہن کی بیٹی کی چوڑی مہندی میں نہ آنے کی وجہ باپ کے گوش گزار کی۔

''رہنے دو، تمہارا تو ساری زندگی ہی مسئلہ رہا، تم تو خالہ جان کے ہاں ولیمے میں بھی نہیں آئیں۔ کم از کم یہی سوچ لیتیں کہ اُن کے چھوٹے بیٹے سے میری بیٹی کی منگنی ہوئی ہے، اب وہ صرف ہماری خالہ کا گھر ہی نہیں میری بیٹی کی سسرال بھی ہے۔'' کنول کی بڑی بہن نے اسے کھری، کھری سنادیں...... وہ خاموش رہی...... خاموشی کے علاوہ...... اس کے پاس تھا ہی کیا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا، تم نے اچھا کیا جو نہیں آئیں، یہ سلسلے تو ماشاء اللہ چلتے ہی رہیں گے...... تمہاری سسرال پہلے ہے...... بس تم اپنے گھر میں خوش رہو...... ہمارے لیے یہی کافی ہے بیٹا۔'' ابو نے اسے مشکل سے نکالا۔

اس نے تشکر سے اپنے شفیق باپ کی طرف دیکھا اور پھر ماں سے آنکھیں چراتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی کہ جلدی گھر جانا تھا ویسے تو وہ گھر سے کم ہی نکلتی اور جو کبھی مہینے دو مہینے میں میکے کا چکر لگاتی بھی تو بس گھنٹے دو گھنٹے کے لیے...... اور یہ گھنٹے دو گھنٹے وہ سب کی شکایتیں ہی سنتی رہتی اور اس کے اپنے دل کی حکایتیں......

وہ اپنے دل کی کس سے کہتی......؟ اکثر وہ اپنے آپ سے پوچھتی۔

☆☆☆

وہ ایک ایسی بلبل تھی جو سونے کے پنجرے میں قید کردی گئی تھی جسے پھڑ پھڑانے کی بھی اجازت نہیں تھی۔

اس کا دل، اس کی خواہشات، اس کے جذبات اس کے احساسات کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

وہ سارا دن گھر کے کاموں میں مصروف رہتی

باہر کے بھی سارے کام کرتی، تیزی سے بڑی ہوتی بیٹی پر بھی اس کی ایک نگاہ رہتی لوگوں سے بھی تعلقات اچھے رکھتی کہ کل کو بیٹی کو بھی بیاہنا تھا۔ احمد کہتے دن تو وہ دن کہتی۔ احمد کہتے رات تو وہ رات کہتی...... اس لیے نہیں کہ احمد ہر بات صحیح کرتے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ گھر میں سکون کی فضا قائم رکھنا چاہتی تھی۔ شادی کو ایک طویل عرصہ گزر گیا تھا اس کے سارے شوق اور خواہشات بابل کی دہلیز پر ہی رہ گئے تھے، وہ اکثر سوچتی میرے مالک زندگی میری تھی، گزاری کسی اور نے...... زندگی ایک بار ملتی ہے تو اپنی مرضی سے گزارنے کا حق بھی ملنا چاہیے ناں......؟

☆☆☆

”میں رخشندہ کنول...... خالد احمد، مجھ کو بھی میرے باپ نے بہت محبت سے پالا تھا، وہ محبت دی تھی جس کے بارے میں آپ سوچ بھی نہیں سکتے، سچ کہا ہے کسی نے عورت کا پہلا محبوب اس کا باپ ہوتا ہے، وہ جو کہتے ہیں ناں عورت اپنی پہلی محبت کبھی نہیں بھولتی وہ شاید اس کے باپ کی محبت ہوتی ہے۔ پھر زندگی میں آنے والے ہر مرد میں وہ اپنے باپ کی ہی محبت ڈھونڈتی ہے لیکن محبت کی تلاش میں وہ یہ بات بھول جاتی ہے کہ ہر لڑکی اپنے باپ کے لیے ملکہ ہوتی ہے لیکن ہر شوہر کے لیے نہیں......

سب ”خالد احمد“ سارے باپ اتنی ہی محبت سے اپنی بیٹیوں کی پرورش کرتے ہیں اور پھر بعض اوقات تقدیر انہیں نہ جانے کہاں، کہاں پٹخ دیتی ہے۔“ محبت سے بیٹی کے لاڈ اٹھاتے خالد کو دیکھ کر اس نے اپنے آپ سے کہا۔

”میری بیٹی میری شہزادی ہے۔“ خالد احمد نے محبت سے ہوم ورک کرتی بیٹی کو دیکھتے ہوئے رخشندہ کنول سے کہا۔

”سب کی بیٹیاں ہوتی ہیں، سب اتنی ہی محبت سے ان کی پرورش کرتے ہیں میرے باپ نے بھی کی تھی۔“ وہ ہمیشہ کی طرح صرف سوچ کر رہ گئی۔

☆☆☆

”میرے پاک پروردگار میں آپ کی بہت ممنون اور مشکور ہوں، آپ نے مجھے دنیا کی ہر نعمت دی ہے......لیکن......“

اس کی زندگی میں سب کچھ تھا...... نہیں اس کی زندگی میں کچھ نہیں تھا، آپ بھی سوچ رہے ہوں گے یہ میں کیا لکھ رہی ہوں؟ ہاں میں صحیح کہہ رہی ہوں اس کے بھرے ہوئے ہاتھوں میں کشکول تھا...... ہاں کشکول......

کبھی، کبھی وہ سوچتی شکر ہے سانس لینا اللہ کے اختیار میں ہے ورنہ شاید سانسیں لینے پر بھی پابندی لگ جاتی۔ مکان کو گھر بنانے کی کوشش میں رخشندہ کنول سے اس کا سارا خاندان ہی چھوٹ گیا۔ بہن، بھائی اکٹھے ہوتے، وہ نرمی سے معذرت کر لیتی، کوئی رشتے دار، کنبے دار بیمار ہوتا، اس کا دل چاہتا خیریت پوچھ کر آئے، عیادت کو جائے لیکن وہ دل مسوس کر رہ جاتی، وہ محبت سے گندھی محبت کرنے والی لڑکی تھی۔ وہ ہر ایک سے محبت کرتی سب اسے چاہتے اس کے مزاج میں بہت سمجھوتا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ زندگی اس سے اتنے سمجھوتے کروائے گی......

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو میکے کے بلی کے بچوں کو بھی یاد کرتی ہیں لیکن خالد احمد اس کی میکے سے اتنی وابستگی کو پسند نہیں کرتے تھے تو وہ دل مسوس کر رہ جاتی...... لیکن کبھی ان سے ضد نہیں کرتی اکثر جب وہ میکے کی کسی تقریب میں شوہر کے بغیر جاتی تو اس کا دل بے انتہا سج دھج کے باوجود بجھا رہتا، اس کا بھی دل چاہتا وہ محفل میں ساڑی کا پلو سنبھالے تو اس کا شوہر اسے...... محبت بھری شرارتی نظروں سے دیکھے، وہ تنبیہی نظروں سے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں منع کرے لیکن وہ نہ مانے......

لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا...... وقت کے ساتھ، ساتھ کئی رشتے زندگی سے الگ ہو گئے اور وہ مکان کو گھر بناتی رہی......

☆☆☆

خالد احمد کو اپنی لاڈلی اکلوتی بیٹی سے بہت پیار

تھا، وہ ان کے لیے آکسیجن تھی، خالد جو کبھی بازار نہیں گئے، جنہیں کبھی شادی کی سالگرہ بھی یاد نہیں رہتی تھی۔ بیٹی کا ہر اسپیشل ایونٹ یاد رکھتے، اس کے لیے تحائف لاتے، نت نئے رنگ برنگے کپڑے خریدتے پھرتے۔

مدیحہ کو نرسری سے لے کر یونیورسٹی تک خود پک اینڈ ڈراپ دیتے۔ وہ جو کبھی ضرورت سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے، بیٹی کی بے تکی باتوں پر بھی قہقہہ لگاتے۔

رخشندہ کنول حیرت سے خالد احمد کو دیکھتیں جن کے ساتھ ایک گھر میں انہوں نے ستائیس سال گزار دیے جن کے دل میں آج بھی بہت ساری باتیں تھیں جو وہ خالد احمد سے کرنا چاہتی تھیں لیکن کبھی شوہر کے پاس ان کے لیے وقت ہی نہیں بچا۔

انہوں نے مکان کو گھر بنانے کے لیے اپنے دل جذبات، احساسات کے گارے سے گوندھ کر ایک، ایک اینٹ رکھی، سارے رشتے اس گارے مٹی میں رُل گئے۔ اور ان کے ہاتھ میں خالی کشکول رہ گیا۔

”ہر عورت اپنی خواہشات کو روند کر گھر بناتی ہے اور بیٹا بند مٹھی لاکھ کی، کھل گئی تو خاک کی...... اچھا برا وقت تو گزر ہی جاتا ہے، اچھے وقت کو بُرد باری اور برے وقت کو برداشت اور صبر سے جھیل جانا چاہیے کیونکہ بیٹا جب صبر اور برداشت سے وقت نہیں گزارو گی تو کل تمہارے اچھے وقت میں برا وقت تمہارے لیے طعنہ بن جائے گا۔“ اور اس نے ہمیشہ مٹھی بند رکھی، یہ الگ بات ہے کہ اس بند مٹھی نے اس کے اپنے وجود کو ریزہ، ریزہ کر دیا۔

”صرف آپ ہی نہیں خالد صاحب ہر باپ اپنی بیٹیوں سے ایسی ہی محبت کرتا ہے اور اسی طرح محبت سے پالتا ہے، میں بھی کسی کی بیٹی ہوں مجھے بھی میرے ماں، باپ نے پھولوں کی طرح رکھا۔ اپنی بیٹی پر جان نچھاور کرتے وقت آپ کو دوسرے کی بیٹی کا خیال نہیں آتا، جو صرف تین لفظوں کے اقرار اور تین دستخطوں کی مہر سے ساری زندگی آپ کے ساتھ گزار رہی ہے۔ اپنی بیٹی سے محبت کرتے ہو تو دوسرے باپ کے بارے میں بھی تو سوچو...... تمہارے گھر دوسرے کی بیٹی رُل گئی۔“

مدیحہ سے اس کی دوستوں کے قصے بہت دلچسپی سے سنتے خالد کو دیکھ کر اس کے دل نے دہائی دی۔

یہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ وہ اپنی لاڈلی بیٹی سے کوئی جیلسی فیل کرتی تھی، وہ تو اس کا دل تھی، اس کی جان تھی لیکن خالد جیسے مردوں کے دُہرے معیار پر اس کا دل کڑھتا ضرور تھا۔

☆☆☆

وقت بند مٹھی میں سے ریت کی طرح بہت تیزی سے گزرا اور آج مدیحہ خالد کا رشتہ ایک بہت اعلیٰ خاندان میں طے ہو گیا۔

”اللہ میری بچی کو ہمیشہ خوش رکھے۔“ رخشندہ کنول نے مٹھائی کی پلیٹ شوہر کے آگے سرکاتے ہوئے مطمئن سے لہجے میں کہا۔

آج ان کی بیٹی کی بات پکی ہوئی تھی...... علی، خالد کے ایک بہت قریبی دوست کا بیٹا تھا۔ ماشاء اللہ ڈاکٹر تھا اور امریکا سے پڑھ کر آیا تھا بہت بڑی کاروباری فیملی تھی۔ چند ہفتے پہلے ایک تقریب میں خالد احمد کی ملاقات اپنے دیرینہ دوست سے ہوئی تھی، جہاں رضا ہمدانی کی پوری فیملی تھی، مدیحہ نے اسی سال بی ایس سی کیا تھا عموماً وہ تقریبات میں بہت ہی کم جاتی تھی لیکن کہتے ہیں ناں کہ جو کام ہونے والا ہوتا ہے اس کے لیے راستے خود بخود نکلتے چلے جاتے ہیں۔ اور آج ماں، باپ کے ساتھ مدیحہ بھی بوریت سے گھبرا کر چلی آئی اور علی نے جب اسے دیکھا تو پہلی ہی نظر میں گھٹنے ٹیک دیے۔

اگر علی کا دل اس کی جھیل جیسی آنکھوں میں ڈوبا تو اس کا دل بھی علی کی خوب صورت پرسنالٹی کے سحر میں گرفتار ہو کر زور، زور سے دھڑکنے لگا۔

اور یوں دنیا کے چند خوش نصیبوں کی طرح...... ان دونوں کو اپنی محبت حاصل کرنے کے لیے کوئی مشکل نہ اٹھانی پڑی...... مدیحہ نے مسکراتی نظروں سے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں جگمگاتی ڈائمنڈ کی خوب صورت

انگوٹھی کو دیکھتے ہوئے سوچا......اور مسکراتے ہوئے تکیے پر سر رکھ دیا کہ خوب صورت خوابوں کو دیکھنے کے لیے سونا بھی ضروری تھا۔

☆☆☆

''رات کو سونا چاہیے اور یہ تم، تم چھلانگیں مارتی پھر رہی ہو۔'' آمنہ بیگم نے کنول کو گھر کا...... جو ابھی ابھی گھر میں داخل ہوئی تھی۔

''امی، تائی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی ناں...... میں نے سوچا تھوڑا سا ان کے لیے دلیہ پکالوں بس وہی دینے گئی تھی۔'' رخشندہ کنول نے آہستگی سے ماں سے کہا اور فون ملانے لگی۔

''اب یہ رات کے دس بجے کس کو فون کیا جارہا ہے؟''

''مامی جان کو۔'' وہ زور سے ہنسی...... کیونکہ وہ جانتی تھی کہ چھوٹی مامی سے، اس کی امی کتنا چڑتی تھیں۔

وہ بہت سوشل تھی، ملنا جلنا، ہر ایک کا خیال رکھنا، ہر کسی سے بے لوث محبت، ہر کسی کے کام آنا اپنے ہم عمر تو اس کے دوست تھے ہی خاندان کے وہ عمر رسیدہ لوگ جن کے غصے اور دبدبے کے سامنے کوئی نہیں بول سکتا تھا یہ ان کی بھی لاڈلی تھی۔

خاندان کا کون سا گھر تھا جس نے اس کی خواہش کا اظہار نہیں کیا، اس کے لیے دامن نہیں پھیلایا لیکن جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں، زمین پر تو صرف ایک رسم ادا کی جاتی ہے اور وہ بھی خالد احمد کے ساتھ بیاہ دی گئی۔ آہستہ، آہستہ سارے دوست احباب، رشتے دار چھوٹتے چلے گئے، بہن بھائیوں سے بھی سال چھ مہینوں میں ملاقات ہوتی، ابا بیمار ہوئے تو......

''کیا ہوا...... کیا پرابلم ہے؟'' خالد احمد نے اس کے روئے، روئے چہرے کو دیکھا تو پوچھا۔

''ابا کی طبیعت بہت خراب ہے خالد......'' وہ رو دینے کو تھی۔

''تو آپ صبح اسپتال ہو کر تو آئی ہیں۔''

''اتنی سی دیر سے کیا ہوتا ہے، ابا چند دن اسپتال میں رہیں گے۔'' اس کے ابا کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ دوپہر کو انجیو گرافی ہوئی تھی اور دو دن بعد انجیو پلاسٹی ہونی تھی۔

''میں وہیں اسپتال میں ابا کے پاس رک جاؤں؟'' اس کا لہجہ ملتجیانہ تھا۔

''کیوں؟ کوئی اور نہیں ہے آپ کے گھر میں؟'' خالد کا لہجہ سرد تھا۔

''ویسے بھی یہ آپ کے بھائیوں کی ذمے داری ہے، آپ کی شادی ہو چکی ہے یہ بات آپ اور آپ کے گھر والے کیوں بھول جاتے ہیں۔''

اس کے ابا آئی سی یو میں تھے اور خالد کا لہجہ اتنا سرد...... اسے لگا اس کا وجود پتھر کا ہو گیا ہے...... خالد کے لہجے کی برف سارے گھر میں پھیل گئی تھی صوفہ، ٹی وی، کارپٹ، ڈریسنگ ٹیبل...سب جیسے برف میں چھپ گئے، منوں برف نے گھر کے سامان کے ساتھ اس کے وجود کو بھی ڈھانپ لیا، سفید برف نے ساری دنیا کو ڈھانپ لیا، اس کے ابا کو بھی...... پھر ایک گرم آنسو اس کی دائیں آنکھ سے نکل کر اسے احساس دلانے لگا کہ وہ زندہ ہے......وہ زندہ ہے۔ اس نے حیران ہو کر آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر نظر ڈالتے ہوئے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''پتا نہیں...... وہ زندہ ہے؟'' وہ اکثر اپنے آپ سے سوال کرتی...... لیکن جواب ملتا ہی نہیں...... وہ جانتی تھی جواب کیا ہے؟

لیکن وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی......

اور جو وہ سوچ لیتی......

نہیں، نہیں...... ہر سوال کا جواب نہیں ہوتا، کچھ سوال بغیر جواب کے ہی مکمل ہوتے ہیں، جیسے اس کا سوال......

☆☆☆

''میری پیاری سہیلی، تمہیں پتا ہے میری امی......میری امی وہ عورت ہیں جن کی زندگی دوسروں نے گزاری، شادی سے پہلے انہوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ ان کی بھی کوئی خواہش ہے، مرضی ہے، پسند ناپسند

ہے بس وہ ہر وہ کام کرتی تھیں، جس سے سب خوش ہوتے اور پھر ان کی شادی میرے ابا سے ہو گئی، میرے ابا ایک بہت اچھے بہت نفیس اور شفیق باپ تو ہیں لیکن شاید وہ ایک اچھے شوہر نہیں ہیں۔

پیسہ، دولت، بنگلا، گاڑی، قیمتی زیورات یہ سب تو میری امی کے ابا کے گھر میں بھی تھا، ایک عورت دوسرے گھر میں مرد کی محبت کی امید پر آتی ہے، اگر اس کے ساتھ اس کے شوہر کی محبت ہو تو وہ زندگی کی ہر تکلیف اور راستے کا ہر دکھ خوش اسلوبی سے سہہ جاتی ہے لیکن میری امی کو وہ نہیں ملا، وہ سکھ کبھی نہیں ملا۔

قیمتی زیورات اور نفیس ملبوسات میں چمکتی دمکتی امی کی جب میں بجھی، بجھی سی آنکھیں دیکھتی تو میرا دل بہت دکھتا جیسے، جیسے عمر کی منزلیں طے کیں امی کے دکھ سمجھ میں آنے لگے۔ میری امی کی جڑیں یا شاید ہر لڑکی کی جڑیں اس کے میکے میں پیوست ہوتی ہیں اور جب انہیں وہاں سے اکھاڑا جاتا ہے تو بظاہر سرسبز لیکن اندر سے وہ لڑکیاں کھوکھلی ہو جاتی ہیں، میرے خیال سے اگر کوئی مرد اپنی بیوی سے محبت کرتا ہے تو اسے اپنی بیوی کی زندگی کے ابتدائی رشتوں کا خیال رکھنا چاہیے، اس مرد کو جو اس کا شوہر بن جاتا ہے، بیوی کی پیوستہ جڑوں کو محبت کا پانی دینا چاہیے، مجھے یقین ہے جو مرد اس بات کا خیال رکھتے ہیں انہیں ایک مکمل عورت ملتی ہے۔

جو جھوٹی ہنسی نہیں ہنستی...... جو تکیوں میں منہ چھپا کر نہیں روتی جو باپ، بھائی کی محبتوں کو حسرت سے نہیں دیکھتی، جو بے ساختہ نکل آنے والے آنسوؤں کو بے دردی سے نہیں رگڑتی۔

جس عورت کی اپنی زندگی رشتوں کے توازن کے ساتھ گزرتی ہے، وہ ایک متوازن گھر بناتی ہے وہ ایک، ایک اینٹ جوڑ کر جب مکان کو گھر بناتی ہے تو اس میں دروازے کی چوکھٹ کو خوفزدہ نظروں سے نہیں دیکھتی بلکہ ایک ملکہ کی طرح رہتی ہے۔

ہاں میری امی اور میری امی جیسی ہزاروں عورتیں...... میں سوچتی ہوں زندگی ایک نعمت ہے، عطیۂ خداوندی ہے لیکن ہر شخص اپنی زندگی کا خود مالک ہے لیکن ان عورتوں کی زندگی تو کسی اور نے گزاری...... تو ان کٹھ پتلی عورتوں سے کس زندگی کا حساب لیا جائے گا۔

عورت ہمارے معاشرے کا سب سے کمزور طبقہ ہے اور سارے طاقتور لوگ اپنی عزتوں کی گٹھڑیاں انہی کے سروں پر رکھ دیتے ہیں، عزت، خاندانی وقار، ناموس، اتنا وزن...... پھر وہ عورت سر اٹھا ہی نہیں پاتی......اس کا سر جھکتا چلا جاتا ہے، جھکتا چلا جاتا ہے۔

لیکن میں مدیحہ خالد احمد، چند دنوں بعد رخصت ہو کر پیا دیس چلی جاؤں گی۔ میں اپنی زندگی بھرپور گزارنا چاہتی ہوں، کیا میں اپنی زندگی اپنے مطابق گزار سکوں گی؟''

وہ جو کچن سے فارغ ہو کر مدیحہ کے کمرے میں کھڑی بستر کی چادریں بدلوا رہی تھی۔ یونہی وقت گزاری کے لیے وہ اس کے بک شیلف میں سجی کتابیں دیکھنے لگی اور پھر اس کے ہاتھ مدیحہ کی ڈائری لگ گئی...... چند صفحوں کے بعد اس میں کچھ پڑھنے کی سکت نہیں تھی۔

اسے لگا سارا کمرا نمکین پانی سے بھر گیا ہو، وہ سمجھتی تھی وہ کمال ہوشیاری سے ہر بات، ہر دکھ، ہر غم چھپا جاتی ہے لیکن احساس ہوا اپنی بیٹی کے لیے تو وہ ایک کھلی کتاب تھی اس کی بیٹی......اس کی لاڈلی، بظاہر بہت بے پروا سی مدیحہ.... اسے ورق، ورق پڑھتی رہی ہے۔ یہ وہ رشتہ تھا جو اس کا درد بغیر کہے سہہ رہا تھا۔ رخشندہ کنول کرسی پر ڈھے سی گئی۔ اب اس کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ بس مدیحہ جلدی سے آجائے اور پھر وہ اس کے سینے میں منہ چھپا کر پھوٹ، پھوٹ کر روئے وہ تمام آنسو جو وہ پیتی رہی، آج سارے بہادے اور پھر......

''یا اللہ میری بیٹی کو اس کی زندگی کی ہر خوشی دینا۔'' اس نے صدقِ دل سے بے ساختہ دعا کی۔

''رخشندہ، رخشندہ......کنول......کہاں ہیں آپ۔'' خالد احمد کی تیز آواز اسے حقیقت کی دنیا میں لے آئی جلدی سے آنسو پونچھتی کمرے سے باہر نکلی۔

''خیریت......! کیا ہوا؟''

رخشندہ کنول نے شوہر کے ہاتھ میں سیل فون اور ہوائیوں اڑاتے ان کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرا کر پوچھا۔

”دیکھیے، خود بات کیجیے...... بیٹی کیا کہہ رہی ہے۔“ خالد احمد نے عجیب سے لہجے میں کہتے ہوئے سیل فون اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”ہیلو......“ رخشندہ کا لہجہ بے تاب سا تھا۔

”بس امی ہم لوگ نکل ہی رہے تھے کہ علی کی خالہ کی فیملی آ گئی بالکل اچانک، بغیر کسی اطلاع کے...... اب میں کیسے آ سکتی ہوں، آپ خود ہی تو کہتی تھیں ناں کہ پہلے سسرال بعد میں سب کچھ۔“

مدیحہ بولے جا رہی تھی لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے کان شائیں، شائیں کر رہے تھے، تیز ہواؤں کے جھکڑ اس کے چاروں طرف چل رہے تھے۔

”خالد احمد میں نے تو تم کو کبھی بددعا بھی نہیں دی تھی پھر تمہارا کیا تمہاری بیٹی کے آگے کیوں آیا، وہ میری بھی تو بیٹی ہے۔“ وہ ساکت نظروں سے خالد احمد کو دیکھتی ہوئی بے جان سی وہیں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی۔

فون کب کا بند ہو چکا تھا، وہ سمجھ رہی تھی زندگی کے دکھوں اور سمجھوتوں کی کتاب مکمل ہو گئی...... اس نے کتاب کو بند کر کے گہرے کنویں میں پھینک دیا تھا لیکن وہ نہیں جانتی اس کتاب کو ورق ورق اسے پھر پڑھنا تھا بلکہ مرتے دم تک پڑھنا تھا۔

وہ کیوں بھول گئی تھی کہ روزِ جزا کے علاوہ کچھ حساب اللہ پاک دنیا میں بھی کرتا ہے...... مدیحہ، خالد احمد کی اکلوتی بیٹی تھی اور خالد احمد نے...... وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی لیکن ہاں وہ یہ ضرور جانتی تھی آگے کیا ہوگا؟

کچن سے انواع و اقسام کے کھانوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں اس نے ساکت نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا...... چند لمحوں میں ان کے کندھے جھک گئے تھے، ان کی تنی ہوئی گردن پر بہت ساری جھریاں پڑ گئی تھیں، وہ خالد احمد نہیں ایک شکستہ باپ تھے...... ان کے چہرے پر گزرے وقت کی پشیمانیاں تھیں، تاسف تھا۔

بعض لوگ اتنے بدنصیب ہوتے ہیں کہ دوسروں کا دکھ انہیں اس وقت سمجھ میں آتا ہے جب وہ دکھ اللہ کی لاٹھی کی طرح ان کی کمر پر پڑتا ہے، اللہ کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے...... لیکن جب پڑتی ہے تو روح تک کو زخمی کر دیتی ہے، خالد کی روح بلبلا اٹھی۔

”چلو رخشندہ...... آج تمہارے ابا سے ملنے چلتے ہیں۔“ خالد کی آواز اسے دور کھائیوں سے آتی محسوس ہوئی۔ رخشندہ نے نظر اٹھا کر شوہر کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے اُن کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

اس نے خالد احمد کی آنکھوں میں بے بسی سے چمکتے آنسو دیکھے اور پھر اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر چند لمحوں تک انتہائی سرد انداز میں شوہر کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

”میرے ابا کے انتقال کو برسوں بیت گئے خالد...... برسوں۔“ اور پھر وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔

جس کتاب کو اس نے ساری زندگی اپنے خون دل سے لکھا تھا جسے وہ کبھی پڑھنا نہیں چاہتی تھی اب وہی کتاب اسے ورق، ورق روز پڑھنا ہوگی۔

ساری زندگی مردانگی کے نشے میں چور وہ یہ بھول گیا تھا کہ وہ بھی تو کسی باپ کی بیٹی لے کر آیا ہے، ساری زندگی بوئے کانٹے اب اس کی بیٹی کے راستے میں بچھ گئے تھے، جن پر اب خود اسے اور اس کی لاڈلی بیٹی کو ساری زندگی چلنا تھا۔

”ساری زندگی......؟“ ایک سرد لہر خالد احمد کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔

اور پھر وہ ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ، پھوٹ کر رو دیا...... مرد نہیں روتے...... اس کی اماں ہمیشہ کہتی تھیں۔

لیکن اس وقت صرف ایک مرد نہیں ایک باپ رہ رہا تھا۔

وقت کے سسکتے ہاتھوں سے پھسلنے کے بعد اس باپ کو ساری زندگی رونا تھا۔

▲▲▲

ادھوری عورت

ارجمند عقیل

ملک سے باہر کی پوسٹنگ نپٹا کر بلال صاحب واپس آ چکے تھے۔ ان کی بیگم رعنا بلال کو آتے ہی اُن کے پرانے اسکول والوں نے پھر اپنی خدمات آفر کرنے کی پیشکش کر دی تھی۔ بچے واپس اپنے پرانے ٹیچر کے اسکول میں داخل ہو چکے تھے، راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ بلال صاحب اپنے دفتر کے چکروں میں سرتاپا الجھے ہوئے اور ان کی مسز بچوں، گھر اور پڑھانے کی مصروفیات میں مصروف، اتنے سال بعد اپنے مانوس ماحول میں آ کر کچھ اچھی اور کچھ بری باتوں سے واسطہ تو پڑنا ہی تھا کہ اچانک رعنا کو اطلاع ملی کہ ان کی بہت پیاری سہیلی رخسانہ گزر گئی، بس اچانک برین ہیمرج ہوا اور دس روز اسپتال میں رہ کر چل بسی۔ رعنا پر اس ناگہانی خبر کا بہت برا اثر ہوا اور ایک دن وہ اچانک شام کی واک کرتے ہوئے بہت زور سے منہ کے بل گریں...... انہیں لگا کہ اُن کے گھٹنے میں چوٹ



آئی ہے اور شکر کیا کہ ہڈی بچ گئی مگر پندرہ منٹ کے اندر، اندر انہیں تیز بخار چڑھا اور سینے پر دائیں طرف سوجن ہونے لگی۔ اسپتال گئیں تو ڈاکٹر نے فوری طور پر ٹیسٹ وغیرہ اور الٹرا ساؤنڈ کا مشورہ دیا، غرض دو چار دن کے بعد پتا لگا کہ کوئی عجیب سی بیماری انہیں ہوگئی ہے فوری طور پر اسپتال میں ایڈمٹ ہوئیں اور علاج شروع ہوا، روز ہی ایک دو ٹیسٹ ہوتے اور اسی چھان بین میں ایک ایسی بات ڈاکٹر نے بتائی کہ رعنا اور بلال صاحب دونوں کے جیسے ہوش اڑ گئے۔

ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق رعنا کو چھاتی کا کینسر تھا اور موجودہ بیماری کی تفتیش کے دوران یہ بات سامنے آئی اور ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ ابھی وہ ٹھیک ہوجائیں تو انہیں کینسر کے اسپتال جانا چاہیے اور وہاں صحیح علاج کرانا چاہیے۔

اُدھر گھر پر جب بچوں کو بتایا گیا تو وہ الگ پریشان اور خود رعنا کی تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ ذہن اتنا پریشان تھا کہ سمجھ میں نہیں آتا تھا وہ اس سچویشن سے کیسے ڈیل کریں گی، چھوٹی بیٹی محض سات سال کی تھی باقی بچے ذرا بڑے تھے لیکن ظاہر ہے یہ بہت غیر متوقع اور پریشان کن خبر تھی۔ اِدھر بلال صاحب پتا کر رہے تھے کہ بائیوپسی کب کرائی جائے اور اس کے بعد کیا پروسیجر ہوگا۔ رعنا کی پوری کوشش تھی کہ جب تک علاج شروع نہیں ہوتا گھر اور بچے بالکل ڈسٹرب نہ ہوں، سب کام نارمل ہوتے رہیں لیکن جیسے ہی فراغت کے چند لمحات ملتے وہ پریشانی اور فکروں میں ڈوب جاتیں۔ آنکھ سے آنسوؤں کی لڑی بہنے لگتی، چھوٹی بیٹی بار بار پوچھتی ”امی آپ رو کیوں رہی ہیں۔“ ان سے کوئی جواب بن نہیں پڑتا، بس نہ چل رہا ہوتا کہ کسی طرح اسے چھپالیں اور آنے والے دکھ سے بچالیں۔

بالآخر کینسر اسپتال میں ڈاکٹر کو دکھایا biopsy کی گئی اور پتا لگا کہ بائیں طرف گٹھلی ہے۔ سرجن کا خیال تھا کہ آپریشن ضروری ہے اور احتیاطاً دونوں چھاتیوں کو ہی remove کردینا بہتر ہوگا مگر یہاں رعنا کی ریسرچ کام آئی جو وہ اتنے دنوں سے اس سلسلے میں کر رہی تھیں اور انہوں نے صاف انکار کردیا کہ میں سرجری صرف اسی سائڈ کی کراؤں گی جو متاثر ہے oncologist (ماہر امراض کینسر)، رعنا کو ذرا نہ بھائی اور اس کا رویّہ بھی خاصا سفاکانہ تھا مگر سرجن نے رعنا اور بلال صاحب کی بات سے اتفاق کیا اور طے پایا کہ جلد از جلد آپریشن کردیا جائے۔

ہفتے بھر بعد کی تاریخ مقرر ہوئی، سارے خاندان میں جیسے پریشانی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔

سرجری خیر سے ہوگئی۔ بائیں طرف کی اور تین چار دن کے بعد ڈاکٹر نے گھر جانے کی اجازت بھی دے دی رعنا کو ظاہر ہے ابھی آرام کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا لیکن ہفتہ بھر بعد ہی انہوں نے محسوس کیا کہ اگر وہ خود کو بیمار سمجھتی رہیں تو رشتے دار اور آنے جانے والے جو بظاہر تو مزاج پُرسی کو آتے تھے مگر جستجو کی شدت ان کے درپے تھی۔ ایک صاحبہ نے تو.... یہ تک پوچھ لیا کہ کون سا کاٹا ہے یا دونوں ہی کٹ گئے۔“ اس پر تو جیسے لگا کہ زخم پر کسی نے نمک، چھڑک دیا ہو لیکن کیا کیا جاسکتا تھا علاوہ اس کے اپنے کو مضبوط ظاہر کیا جائے تاکہ ایسے تکلیف دہ اور پُرحماقت سوالوں سے بچا جاسکے۔

اسکول جانا بھی شروع کردیا تھا انہوں نے، ہر چند کہ تھکن بہت ہوجاتی تھی مگر مصروفیت میں ڈپریشن کا مقابلہ اچھا ہوجاتا تھا۔

اسی اثنا میں رعنا کی سالگرہ آگئی، بچوں نے چپکے چپکے بہت اہتمام کیا اور سب نے امی سے کیک کٹوایا اور تھوڑی دیر کو لگا کہ جیسے پرانے دن واپس آگئے۔ پھر بچوں کی فرمائش پر تحفے کھولے تو پتا لگا کہ اور چیزوں کے علاوہ ایک بہت خوب صورت سوٹ بھی تھا۔ بچوں کا اصرار تھا کہ بس اسے جلدی سے سلوالیں اور پہن لیں۔ اگلے روز ہی درزی کو سوٹ دے دیا گیا اور تین چار دن بعد وہ سل کر بھی آگیا۔

رعنا نے بظاہر تو خوشی کا اظہار کیا لیکن اندر ہی اندر دل رو رہا تھا، اپنی محرومی کا احساس کسے دکھاتیں اور کس سے کہتیں، بس بلال صاحب کے سامنے زبان سے بے ساختہ یہ لفظ نکل ہی گئے۔

”ادھوری عورت۔“ بلال صاحب نے جیسے ان کا ذہن پڑھ لیا تھا وہ تسلیاں دینے لگے۔

”نہیں، تم پریشان کیوں ہوتی ہو میرے لیے تو تم اب بھی مکمل ہو، بس اللہ کا شکر کریں ہم دونوں کہ اللہ پاک نے بچوں کی دعائیں سن لیں اور تمہیں نئی زندگی دے دی۔“ رعنا ان کی تسلی وتشفی پر صبر کر گئیں مگر دل پر جو گزرتی تھی روز وہ صرف وہی جانتی تھیں۔

دو، تین ماہ گزر گئے اب گھر کا باہر کا سب کام نارمل ہونے لگا، سب کے چہروں پر اطمینان کے سائے اللہ کی مہربانی سے نظر آنے لگے۔ چھ ماہ کے بعد اونکالوجسٹ کے مشورے کے مطابق رعنا کو نس میں ایک انجکشن لگوانا تھا جس کا فائدہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق یہ تھا کہ وہ اوسٹیوپروسس سے محفوظ رکھتا جسم کی ہڈیوں کو۔ بلال صاحب نے گھر پر ہی کمپاؤنڈر کو بلالیا لیکن اس سے کچھ پوچھا کچھا نہیں اس کے تجربے کے بارے میں۔ اِدھر یہ دونوں میاں، بیوی ڈاکٹر کی ہدایت بالکل فراموش کر بیٹھے کہ بائیں بازو اور ہاتھ کو بالکل اس طرح treat کیا جائے گا جیسے نوزائدہ بچے کو کرتے ہیں۔ کمپاؤنڈر بدبخت نے بائیں بازو میں ہی خوب سوئیاں چبھوئیں alcohol کا پھایا بھی استعمال نہیں کیا۔ (یہ ساری باتیں بعد میں رعنا کے دھیان میں آئیں) نس تو نہ ملی اس اندھے نے بایاں بازو اور ہاتھ چھید کر رکھ دیا۔ آخر رعنا نے رو کر اسے کہا کہ مجھے یہ انجکشن نہیں لگوانا۔ وہ تو چلا گیا آدھی دوا بھی بے وقوف گرا گیا تھا، دوسرے بندے کو دو ہی دن کے بعد بلایا گیا اور اس نے بچی کھچی دوا دائیں بازو میں انجیکٹ کردی۔

ایک دو دن کے بعد رعنا کو محسوس ہوا کہ ان کا [illegible] گھٹنا سوج رہا ہے، چلنے میں بھی بہت مشکل ہو رہی ہے، اِدھر بلال صاحب دفتر کے کاموں میں بے انتہا مصروف، یہ ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھیں مگر دوپہر تک تو اتنا سوجا کہ ان سے ہلا نہ جائے اور تکلیف کی شدت سے چیخیں نکلیں...... آخر بیٹے نے ایمبولینس بلائی اور فوری طور پر ایمرجنسی میں لے جائی گئیں، شام [illegible] وہیں سے فون کر کے بلال صاحب کو اطلاع دی وہ سیدھے وہیں پہنچے۔ صبح تک یہ ایمرجنسی میں رہیں۔ اسپتال کے پروسیجرز کے مطابق، آخر اگلی شام کو پھر ٹانگ کا آپریشن تجویز ہوا۔ سوال جواب کرنے پر معلوم ہوا کہ اس ناہنجار کمپاؤنڈر کے احتیاط نہ کرنے کی وجہ سے انفیکشن ہوا، خون میں جراثیم شامل ہو کر گھٹنے تک پہنچے اور نتیجے میں گھٹنے اور اس کے قریب ساری ٹانگ میں بری طرح انفیکشن پھیل گیا۔

دو گھنٹے سرجری میں رہنے کے بعد special recovery میں رکھا گیا اور پھر icu میں 24 گھنٹے کے بعد وہاں سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کیا گیا۔ آٹھ دن اسپتال میں گزارنے کے بعد جب رعنا کو گھر لایا گیا تو ان کے لیے چلنا محال تھا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پہلی والی سرجری کے بعد وہ تین دن میں ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں کہ نہیں مجھے کچھ نہیں ہوا، میں ٹھیک ہوں لیکن اس بار تو لگتا تھا کہ ہمت ٹوٹ گئی ایک تو چلنا، بیٹھنا مشکل، اوپر سے درد کی شدت اور پھر بار، بار اسپتال جا کر ڈاکٹر سے ہدایت کے مطابق چیک اپ کرانا اور انتظار اور آنے جانے کی تکلیف برداشت کرنا، پہلی بار جب وہ چیک کرانے گئیں تو ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ وہ جس ٹیبل پر لیٹی ہوئی تھیں اسی پر اکڑوں بیٹھنے کی کوشش کریں، یہ اس لیے ضروری ہے کہ اگر ابھی عادت نہ پڑی تو وہ پھر ٹانگ موڑ نہ سکیں گی، رعنا کی تو چیخیں نکل گئیں، بلال صاحب گھبرا گئے۔ بڑی بیٹی ساتھ گئی ہوئی تھی وہ ماں کی تکلیف دیکھ کر زاروقطار آنسو بہانے لگی۔ لیکن اس سب کے بعد جب بلال، ڈاکٹر صاحب سے بات کر رہے تھے تو وہ سن رہی تھیں، ڈاکٹر کا ایک جملہ ان کے ذہن میں جیسے ہتھوڑا بن کر لگا۔

”شکر کریں ٹانگ بچ گئی اگر خدانخواستہ کاٹنی پڑجاتی تو۔“

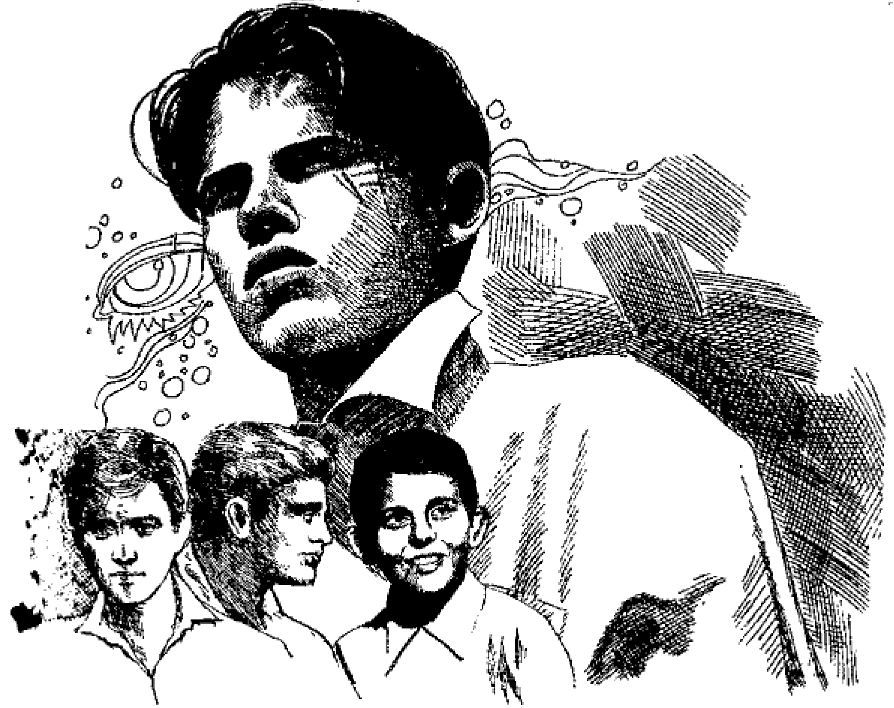
رعنا کے ذہن میں بار، بار اپنے وہ الفاظ گھومتے جو انہوں نے پہلی بار سرجری کے بعد رو کر بلال صاحب سے کہے تھے۔

”ادھوری عورت۔“ پتا نہیں کتنی بار چپکے، چپکے انہوں نے اللہ سے معافی مانگی، توبہ کے دروازے کھلے ہونے کی امید پر، کسی قدر ناشکری تھیں وہ اور ان کا رب کس قدر کریم......

ناولٹ

گھوڑی آ کے چڑھیا

اسما قادری



گھڑی کی سوئیوں نے جیسے ہی ساڑھے سات بجنے کا اعلان کیا ظہیر بابر مغل نے ڈائننگ روم میں قدم رنجا فرما دیا اور یہ دیکھتے ہی ان کی جبیں پر بل پڑ گئے کہ ڈائننگ ٹیبل کسی بیوہ کی مانگ کی طرح خالی پڑی ہے اور اشیائے خورونوش کا دور، دور تک کوئی نام ونشان نہیں ہے اگر میز پر برتن سجے ہوتے تو یہ امید رکھی جاسکتی تھی کہ لوازمات ناشتا کا نزول بھی ہو ہی جائے گا لیکن یہاں ایسے کوئی آثار موجود نہیں تھے۔ گو کہ انہیں لگ بھگ ڈیڑھ سو سال قبل چھن جانے والی بادشاہت کی خوشبو بھی سونگھنے کو نہیں ملی تھی لیکن نام کے ساتھ مغل تو بہر حال آتا تھا سو ماضی بعید کے شاہی خون نے جوش مارا اور لہجے میں کسی مغل فرماں رواں کا سا جلال سمو کر وہ بہ آواز بلند گرجے۔

''کہاں مر گئے نالائقو! آج کس کی ناشتا بنانے کی باری تھی؟'' ان کا یہ جملہ دو سو گز کے رقبے پر واقع تین بیڈ رومز پر مشتمل گھر کے ہر کمرے میں بخوبی سنا گیا



اور نتیجتاً جو نالائق جس حال میں تھا اسی حال میں ڈائننگ روم کی طرف دوڑا جہاں صورتِ حال سچ مچ گمبھیر تھی۔

''آج ناشتا بنانے کی باری کس کی تھی؟'' انہوں نے شو پالش اور برش ہاتھ میں پکڑے غوری، ٹائی کی ادھوری ناٹ کے ساتھ گلے پر ہاتھ رکھے بلبن اور طرف بنیان اور پینٹ میں ملبوس ٹیپو کی طرف جلالی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوال داغا۔ ویسے سوال کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اپنے حاضر نہ ہونے والے چوتھے سپوت شیخو کی غیر موجودگی نے ہی ہیں بتا دیا تھا کہ آج اسے ناشتا تیار کرنا تھا۔

''میں چیک کر کے بتاتا ہوں ابا......'' سب سے سے غوری نے مستعدی کا مظاہرہ کیا۔ اور دیوار پر لگے اس مستطیل چارٹ تک پہنچا جس پر ہفتے کے ساتوں دن کے لیے چاروں بھائیوں کے لیے کاموں کی تقسیم درج تھی۔

''شیخو......'' غوری چارٹ پر بنے ٹائم ٹیبل میں سے دیکھ کر مجرم کے نام کا اعلان کرتا اس سے قبل ہی ظہیر بابر مغل یوں گرجے جیسے ان کے اجداد میں سے جلال الدین اکبر، شہزادہ سلیم کے انارکلی کے عشق میں مبتلا ہونے کا سن کر گرجا ہوگا۔ اکبر کا شیخو یعنی شہزادہ سلیم تو ایک ناہنجار بیٹا تھا جو ایک کنیز کی خاطر باپ کے مقابل کھڑا ہو گیا تھا لیکن ظہیر بابر مغل کے بیٹوں میں اتنی تاب نہیں تھی کہ ان کی پکار پر خدمتِ عالیہ میں حاضر نہ ہوں۔ شیخو بھی ان کی پہلی دھاڑ پر ڈائننگ روم کی طرف دوڑ، تو پڑا تھا لیکن یہ خیال آتے ہی کہ یہ سنگین جرم اس سے ہی سرزد ہوا ہے باہر ہی رک گیا تھا لیکن اب براہِ راست پکارے جانے پر اسے لرزتے کانپتے ابا کے روبرو حاضر ہونا ہی پڑا۔

''کیوں برخوردار! گھڑی دیکھی ہے آپ نے؟

ساڑھے سات سے اوپر کا وقت ہو چلا ہے اور یہاں ناشتے کا نام و نشان ہی نہیں ہے۔ آج کیا سب خالی پیٹ گھر سے نکلیں گے۔'' انہوں نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے باز پرس کا سلسلہ شروع کیا۔

''وہ......وہ ابا! آج میرا فزکس کا ٹیسٹ ہے۔ اسی کی تیاری کے لیے رات بہت دیر تک جاگتا رہا اسی لیے صبح جلدی آنکھ نہیں کھل سکی۔'' شیخو نے ہکلاتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

''وہ نہیں اٹھا تھا تو تم اسے جگا دیتے۔'' اب کی بار انہوں نے ٹیپو کی طرف روئے سخن کیا۔

''میں تو خود ابھی پانچ منٹ پہلے ہی جاگا ہوں ابا......ویسے بھی مجھے کیا معلوم کہ آج شیخو کے ناشتا بنانے کی باری ہے۔ میں صرف اپنی باری یاد رکھتا ہوں۔''

''اور عین اپنی باری والے دن پیٹ پکڑ کر بستر پر لیٹ جاتا ہوں' ڈرامے باز......''

ٹیپو کا جواب سن کر اس کے برابر میں کھڑا ببلن دھیمی آواز میں بڑبڑایا۔ آج اسے کلاس میں پریزنٹیشن دینی تھی اس لیے خصوصی تیاری کے ساتھ یونیورسٹی سدھارنا چاہتا تھا لیکن یہاں وہ ٹائی کی ادھوری ناٹ کے ساتھ لائن حاضر ہوا کھڑا تھا اور یہ فکر دامن گیر تھی کہ روانگی سے قبل ڈھنگ سے تیار ہونے کا وقت اب مل بھی سکے گا یا نہیں۔

''خدا ایسی ناخلف اولاد کسی کو نہ دے جو بوڑھے باپ کو دو لقمے بھی نہ کھلا سکے۔ ہائے الفت......تمہارے جانے سے مجھے اس گھر میں کیا، کیا دن دیکھنے پڑ رہے ہیں، تم تھیں تو مجھے اس گھر میں کبھی ہل کر پانی بھی نہیں پینا پڑتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ ایک، ایک نوالے کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔'' ظہیر بابر مغل جلالی موڈ سے نکل کر اچانک ہی دکھی موڈ میں چلے گئے تھے اور چند ماہ قبل مرحوم ہونے والی زوجہ کو یاد کرتے ہوئے آہیں بھرنے لگے تھے۔ ان کا یہ موڈ جلالی موڈ سے زیادہ خطرناک ہوتا تھا اور اگر وہ بری طرح اس موڈ میں ڈوب جاتے تو چاروں بیٹوں کو ناک سے لکیریں کھینچتے ہی بنتی تھی چنانچہ انہیں اسے موڈ کی طرف جاتے دیکھ کر چاروں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ابا، ابا کرتے چاروں نے پہلے انہیں تسلی دلاسے دیے اور پھر متحد ہو کر ناشتے کی تیاری میں جت گئے۔ یہ اور بات کہ ہاتھوں سے زیادہ رفتار سے ان کی زبانیں چل رہی تھیں اور ہر ایک حسبِ توفیق شیخو کو اس کی نااہلی پر باتیں سنا رہا تھا۔

☆☆☆

ظہیر بابر مغل کا گھرانا ایک خوشحال گھرانا تھا۔ مین مارکیٹ میں ان کی کپڑوں کی خوب چلتی ہوئی دکان تھی۔ وہ محنت اور ایمانداری سے کماتے تھے اور ان کی بیگم الفت محبت اور خوش خلقی سے گھر کا انتظام سنبھالتی تھیں یوں ان کے چاروں بیٹوں (جن کے وقتِ پیدائش باپ ہی کی طرح بھاری بھرکم نام رکھے گئے تھے لیکن اسکول و کالج کے علاوہ ہر جگہ اپنے نک نیم سے ہی پکارے اور پہچانے جاتے تھے) کی زندگیوں میں راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ چین کی بانسری بجا... ان ہونہاروں سپوتوں کی زندگی میں ماں کی مختصر علالت کے بعد وفات کی صورت میں طوفان آ گیا۔

دنوں تو وہ ماں کی جدائی کے صدمے سے ہی نہیں سنبھل سکے لیکن جیسا کہ قانون قدرت ہے کہ مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرا کرتا۔ آہستہ آہستہ معمولاتِ زندگی شروع ہو جاتے ہیں اور آتے آتے صبر بھی آ ہی جاتا ہے تو ایسا ہی ان کے ساتھ بھی ہوا لیکن مسائل کی یورش نے پانچوں باپ، بیٹوں کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ زندگی تو نئے سرے سے رواں ہو گئی لیکن امورِ خانہ داری کی انجام دہی روز بروز گمبھیر مسئلہ بنتی چلی گئی۔ الفت بیگم کے دسویں تک تو رشتے دار خواتین نے گھر سنبھال لیا تھا لیکن آہستہ، آہستہ سب اپنے گھروں کو واپس چلے گئے اور ان باپ بیٹوں کے لیے پریشانی کے دور کا آغاز ہوا سب سے پہلی اندوہناک...... اطلاع یہ سننے کو ملی کہ الفت بیگم کی زندگی میں صفائی ستھرائی اور کپڑوں کی دھلائی کے لیے آنے والی ماسی چھمیا اپنا استعفیٰ پیش کر گئی ہے۔ عورت کے

وجود سے خالی، چھڑے چھانٹ مردوں کے گھر آ کر کام کرنے میں اسے کئی تحفظات تھے۔ اس کے ان تحفظات پر چاروں بیٹوں سمیت ظہیر بابر مغل نے بھی خوب منہ بنائے۔ کالی، کلوٹی، سوکھی سڑی، میلی، کچیلی چھمیا کو لاحق خدشات جان کر انہیں اپنے ذوق کی سخت توہین محسوس ہوئی تھی۔ (اونہہ لو بھلا بتاؤ کچھ ایسا ویسا کرنے کے لیے وہ کلورانی چھمیا ہی رہ گئی تھی کیا) چھمیا کے استعفیٰ سے الجھن تو ہوئی لیکن جلد اس کی متبادل کا انتظام ہو جانے کی امید پر چاروں بھائیوں نے عارضی طور پر اس کی ذمے داریاں سنبھال لیں۔

چھمیا کے استعفیٰ کے تیسرے دن ہی انکشاف ہوا کہ وہ جو ان کی اکلوتی پھپو اپنے گھر روانہ ہوتے وقت کئی قسم کے کھانے بنا کر فریز کر گئی تھیں وہ سارے کھانے وہ باپ بیٹے چٹ کر چکے ہیں چنانچہ اب اگر پیٹ بھرنا ہے تو ہوٹل کا رخ کرنا پڑے گا۔ بھوکا رہنا ممکن نہیں تھا اور اکلوتی پھپو صاحبہ بھی حیدر آباد میں مقیم تھیں اس لیے چاروناچار ہوٹل سے کھانا آنے لگا جس کے نتائج بھی ہفتہ بھر کے اندر ہی سامنے آنا شروع ہو گئے۔ ساری زندگی ماں کے ہاتھ کے صاف ستھرے کھانے، کھانے والوں کے معدوں کو ہوٹل کے کھانے ہضم کرنا مشکل ہو گیا۔ پہلے شیخو کے پیٹ میں درد اٹھا پھر ببلن کو الٹیاں لگ گئیں۔ مغل صاحب بھی سینے میں جلن کی شکایت کرنے لگے تو فیصلہ ہوا کہ ہوٹل بازی چھوڑنا ہوگی اور اپنے ہی ہاتھوں سے گھر پر کچھ دال، دلیہ تیار کرنا ہوگا۔

ابا جی کو کوئی ذمے داری سونپنا خلافِ ادب تھا سو چاروں بھائیوں نے ہی آپس میں ذمے داریاں بانٹ لیں اور یوں کتابوں اور کمپیوٹر کی دنیا میں گم رہنے والے بھی چولھے کی فکر میں غلطاں رہنے لگے۔ امیدوں کے برخلاف چھمیا کی کسی نعم البدل کا انتظام بھی نہ ہو سکا۔ اس کی قبیل کی کئی خواتین نے تو اسی والا عذر پیش کر کے ان کے گھر کام کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک ملازمہ نے دو دن کے لیے یہ ذمے داری سنبھالی لیکن تیسرے دن ادھر کا رخ نہیں کیا کہ اس کا کہنا تھا کہ اتنے بدسلیقہ مردوں کے گھر میں صفائی کا کام کرنے میں اسے جتنی دیر لگ جاتی ہے اتنی دیر میں تو وہ تین گھروں کا کام نمٹا سکتی ہے۔ اس کے اس الزام پر چاروں بھائیوں نے بڑی ناک بھوں چڑھائیں کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ماں کے بعد انہوں نے نہایت سلیقہ مندی سے سارا گھر سنبھال رکھا تھا اس لیے ایک معمولی کنیز (یعنی ملازمہ) کو قطعی حق حاصل نہیں تھا کہ ان کی شان میں ایسے گستاخانہ خیالات کا اظہار کرے۔ اس ملازمہ کے استعفیٰ کے چند دن بعد دوسری ملازمہ کا بندوبست ہو گیا لیکن چند دن میں ہی اندازہ ہو گیا کہ ان محترمہ کو گھر کی صفائی سے زیادہ ''صفایا'' کرنے میں دلچسپی ہے۔ آئے دن کسی نہ کسی کی کوئی نہ کوئی شے غائب ہونے لگی تو مجبوراً اس دوسری ملازمہ کو از خود پروانۂ برطرفی سے نوازنا پڑا۔ دھوبی کو کپڑے دھونے بھیجنے کا تجربہ بھی زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہوا۔ کسی کی قمیص پھٹ گئی، کسی کی پینٹ کا رنگ اڑ گیا، کسی کی ٹی شرٹ پر دوسرا رنگ چڑھ گیا اور کسی کا ٹراؤزر ہی غائب ہو گیا۔

اتنا سب کچھ ہونے پر انہیں فیصلہ کرنا پڑا کہ اب تن بہ تقدیر ہونا ہی پڑے گا اور جملہ امورِ خانہ از خود ہی سنبھالنے ہوں گے۔ چنانچہ ڈائننگ ٹیبل پر ایک اجلاس منعقد کر کے فیصلہ کیا گیا کہ ان گمبھیر حالات میں گھر کے جملہ مکینوں کا ہی طریقے سے گھر سنبھالنا ناگزیر ہو چکا ہے اس لیے بہتر ہے کہ باقاعدہ ٹائم ٹیبل بنا کر کاموں کی تقسیم کر لی جائے۔

اس اجلاس کی صدارت ظہیر بابر مغل خود کر رہے تھے۔ گتے کی سفید شیٹ پر ان کے زیرِ نگرانی و ہدایت شیڈول ترتیب دیا گیا۔ اس شیڈول میں ان کا اپنا نام درج نہیں تھا۔ سب سے چھوٹے شیخو نے جو اوروں کے نسبت ذرا لاڈلا تھا ڈرتے، ڈرتے پوچھ ہی لیا کہ ''ابا حضور آپ کے لیے کیا ذمے داری تجویز کی جائے؟'' جواب میں انہوں نے شاہانہ بے نیازی سے اعلان کیا کہ وہ ہنوز اپنی سابقہ ذمے داریاں انجام دیتے رہیں

گے۔ ان کی ذمّے داریوں میں مالی امور سنبھالنا، مشاورت، ہنگامی حالات میں بیچ بچاؤ کروانا، تمام امور کی وقت پر انجام دہی کو یقینی بنانا اور شعبۂ تنقید سنبھالنا وغیرہ شامل تھے اور ان کا ہر بیٹا گواہ تھا کہ انہوں نے اپنی یہ ساری ذمّے داریاں بڑی جانفشانی سے سنبھال رکھی ہیں۔ مالی امور پر ایسی کڑی نظر رکھتے تھے کہ چاروں کو دانتوں تلے پسینہ آجاتا تھا۔ گھی، تیل، مسالا جات سے لے کر صابن، سرف اور فینائل تک ہر چیز کا حساب دینا پڑتا تھا کہ یہ اشیا تمہاری جنت مکانی ماں کے دور سے زیادہ کیونکر خرچ ہوئیں حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان کے انتقال کے باعث گھر کا ایک فرد کم ہوجانے پر اشیائے صرف کا استعمال بھی کم ہوجاتا۔ مشیر بھی وہ بڑے اچھے تھے جس روز جس بیٹے کے کھانا پکانے کی باری ہوتی اسے بڑے رعب سے مشورہ (جو کہ اصل میں حکم ہوتا تھا) دے جاتے تھے کہ آج فلاں چیز پکالینا۔ یوٹیوب سے فلمیں ڈاؤن لوڈ کرکے دیکھنے والوں کو اب کھانوں کی ترکیبیں ڈاؤن لوڈ کرنی پڑتی تھیں اور گوگل پر گھر سنبھالنے، سنوارنے کے طریقے سرچ کرتے ہوئے پائے جاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی سپاہی اس کڑی مشقت سے جان چھڑانے کے لیے بیماری وغیرہ کے بہانے کی آڑ لینے کی کوشش کرتا تھا تو ابا جی... اسے ایسا آڑے ہاتھوں لیتے تھے کہ اس کے ہاتھوں کے طوطے تو کیا مینا، فاختائیں وغیرہ سب اڑ جاتی تھیں اور تیر کی طرح سیدھا ہوکر اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوجاتا تھا۔ تنقید نگار وہ اتنے زبردست تھے کہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے پہلے لقمے سے لے کر آخری لقمے تک کھانے کی شان میں کوئی نہ کوئی نکتہ اٹھاتے ہی رہتے تھے۔ اس وقت ان کی زبان کی فصاحت و بلاغت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ٹی وی چینلز پر بیٹھے چیڑ، چیڑ کرتے سارے اینکرز ہیچ نظر آتے تھے اور وہ دل ہی دل میں غور کیا کرتے تھے کہ اگر ابا اپنی کپڑوں کی دکان بند کرکے اس شعبے میں قسمت آزمائیں تو یقیناً زیادہ کامیاب رہیں گے لیکن افسوس......زبان سے

انہیں یہ مشورہ دینے کی تاب کسی میں موجود نہیں تھی ویسے بھی یہ ساری باتیں اپنی جگہ، ابا آخر ابا تھے اور ماں کے بعد پہلے سے بھی زیادہ پیارے ہوگئے تھے۔ اس لیے ان سے ہزار اختلافات کے باوجود کسی کے دل میں ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا کا خیال تک نہیں آتا تھا۔ پھر ایسے ابا سے بغاوت کرتا بھی کون جو بے شک گھریلو بجٹ پر کڑی نگاہ رکھتے تھے لیکن جیب خرچ دل کھول کر دیتے تھے۔ فیسوں کی ادائیگی سے لے کر بہترین کپڑوں، جوتوں تک کی فراہمی میں ابا نے کبھی ذرا بخل سے کام نہ لیا تھا۔ دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح اور ان کی گھر میں آمد و رفت پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ تو یوں تھا کہ مغل ہاؤس کے مکین زمانے کے سرد و گرم سہتے کسی نہ کسی طور اپنے شب و روز گزار رہے تھے۔

☆☆☆

"یہ گھر ہے یا دھوبی گھاٹ اور میں مغل خاندان کا چشم و چراغ ہوں یا کسی دھوبی کا سپوت...... جو تم لوگ کپڑوں کی گٹھریاں لا، لا کر میرے سامنے ڈھیر کرتے جارہے ہو؟" آج اتوار تھا اور ہفتے وار کپڑوں کی دھلائی کی باری غوری کی تھی۔ پچھلے مختصر عرصے میں واشنگ مشین لگائے وہ صابن و سرف سے نبرد آزما تھا کہ شینو اور ٹیپو کو اپنے، اپنے کپڑوں کی گٹھریاں لا کر ڈھیر کرتے دیکھ کر چراغ پا ہوا۔

"ایسے کئی سوالات تو ہمارے دماغ میں بھی ہیں بڑے بھیا لیکن افسوس کہ ہمارے پاس ان سوالات کے جواب ڈھونڈنے کی فرصت نہیں ہے۔ آج ہمیں گھر کی مکمل صفائی کرنی ہے جس سے فارغ ہونے کے بعد شینو اپنے ٹیسٹ کی تیاری کرے گا اور میں کرکٹ کھیلنے کے لیے جاسکوں گا۔" ٹیپو نے بڑی دلسوزی سے غوری کی بات کا جواب دیا اور بغلی دیوار کے ساتھ رکھے چھوٹے سے تخت پر بیٹھ کر پیاز چھیلتے بلبن کی طرف رخ کرکے اس سے پوچھنے لگا۔

"دو بجے تک کھانا ریڈی ہوجائے گا نا، چھوٹے بھائی؟ کھانے کے فوراً بعد مجھے نکلنا ہے۔ ... بجے کا وقت طے ہے۔"

"ہوجائے گا یار...... بکرے کے پائے ہیں گلنے میں زیادہ وقت تھوڑی لگتا ہے۔ میں نے ناشتے کے فوراً بعد چڑھا بھی دیے تھے۔ مسالا تیار کرکے تندور سے روٹیاں لاؤں گا تب تک ریڈی ہوجائیں گے۔" بلبن نے اسے تسلی دی لیکن پلٹ کر وہاں سے واپس جاتے شینو کے کان کھڑے ہوگئے۔

"کیا کہا آپ نے بکرے کے پائے...... لیکن ابا نے تو آپ سے بڑے کے پائے پکانے کو کہا تھا؟"

"ہاں تو بڑے بکرے کے ہی پائے پکا رہا ہوں۔" پیاز کاٹنے کے نتیجے میں آنکھوں سے جاری ہونے والے آنسوؤں کو آستین سے صاف کرتے ہوئے بلبن نے بیک وقت ڈھٹائی اور بے نیازی کا مظاہرہ کیا لیکن حقیقتاً وہ اندر ہی اندر خاصا تاؤ کھایا ہوا تھا اور ابا کے ساتھ پائے پکانے کے سلسلے میں ہونے والا مکالمہ اسے ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ ابا نے کل رات اس کے پسندیدہ ٹی وی شو کے دوران یہ تذکرہ چھیڑا تھا۔

"ہاں تو میاں کل پھر پائے پکا رہے ہو ناں......؟" انہوں نے اسے پوچھا تھا۔

"جی ابا......" نہایت تابعداری سے جواب دیتے ہوئے اس کی ساری توجہ ٹی وی اسکرین پر تھی۔

"ذرا ڈھنگ کے پکانا کہیں ڈبے کے مسالوں سے پکا کر ریڑھ مت مار دینا۔ اللہ بخشے تمہاری ماں نے کبھی ان مسالوں سے تیار کردہ کھانے نہیں کھلائے۔ وہ تو ٹی وی پر کمرشل دیکھ کر بھی سخت تنقید کرتی تھیں کہ یہ موئی مسالوں کی کمپنیاں عورتوں کو کام سے پھوہڑ بناتی جارہی ہیں اور عورتیں ہی آسانی کی خاطر گھر والوں کی صحت سے کھیلتی رہتی ہیں۔" ابا کے ارشادِ بہ آواز بلند نے اسے اینکر کے مہمان سے کیے گئے سوال کا جواب نہ سننے دیا تو ناچار... ان کی طرف رخ کرکے ان کی تسلی کروانے کی کوشش کی اور

"فکر نہیں کریں ابا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ امی

ڈبوں کے مسالوں کی کتنی مخالف تھیں اور انہیں صحت کے لیے مضر قرار دیتی تھیں، اس لیے میں نے کبھی ان مسالوں کا استعمال نہیں کیا۔ پچھلی بار بھی جب پائے بنائے تھے تو نیٹ پر سے ترکیب ڈاؤن لوڈ کی تھی۔"

اس کا لہجہ ذرا فخریہ سا تھا کہ یقین تھا ابا نے دوسری بار بھی پائے پکانے کی ذمّے داری اسے اس لیے سونپی ہے کہ پچھلی بار اس نے بہت ذائقے دار بنائے تھے لیکن اللہ بھلا کرے ابا کا انہوں نے پل میں اس کا سارا فخر و غرور پاش، پاش کردیا اور ذرا رعونت سے بولے۔

"ٹھیک ہے اس بار کسی دوسرے ڈھنگ کے شیف کی ترکیب ڈاؤن لوڈ کرنا۔ پچھلی بار تم نے جو پائے پکائے تھے انہیں کھا کر دو دن تک منہ کا ذائقہ ٹھیک نہیں ہوا تھا اور چار دن مسلسل غدود انِ معدہ میں خانہ جنگی کی سی کیفیت طاری رہی تھی۔" ابا کے اس تبصرے پر اسے چار سو چالیس والٹ کا کرنٹ لگا پھر بھی اچھلنے کے بجائے کمالِ ضبط سے صوفے پر جما بیٹھا رہا کسی قسم کا ری ایکشن حالات کو مزید ناساز گار کرسکتا تھا۔ ابا کے حضور کلمۂ حق بلند کرنا بھی اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف تھا کہ ابھی اسے اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ پاکستان ٹور پر جانے کے لیے ان سے خطیر رقم اینٹھنی تھی ورنہ سچ تو یہ تھا کہ وہ ابا کو جتانا چاہتا تھا کہ انہوں نے اس کا بنایا پائے کا سالن پورے دو دن تک سڑپ، سڑپ کرکے کھایا بلکہ پیا تھا جس کے نتیجے میں اگلے چار دن باتھ روم کے چکر لگاتے ہوئے گزری تھی۔

"ٹھیک ہے ابا میں کسی اچھے شیف کی ریسپی سرچ کرنے کی کوشش کروں گا۔" اختلاف میں نقصان تھا اس لیے اس نے دل پر جبر کرتے ہوئے تابعداری کے سلسلے کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

"شاباش! کوشش اور محنت کرتے رہو۔ اللہ نے چاہا تو کبھی نہ کبھی پکانا سیکھ ہی لوگے۔ میں یہ ڈش ہر بار اس لیے تمہارے ذمّے لگا رہا ہوں کہ تجربات کر، کر کے ایک نہ ایک دن تو تمہیں کامیابی نصیب ہو ہی

جائے گی اور تم ذائقے دار پائے پکانا سیکھ لو گے۔'' ابا نے بڑے مشفقانہ لہجے میں اسے اپنی حکمت سے آگاہ کیا تو وہ جزبز ہو کر رہ گیا اور دل میں خیال آیا کہ ابا سے پوچھے کہ کیا وہ مستقبل میں ذائقہ ہاؤس کے نام سے کوئی پکوان سینٹر کھولنے والے ہیں جو اپنے بیٹوں کو اس فن میں طاق دیکھنا چاہتے ہیں لیکن ہائے افسوس کہ اپنی مجبوری اسے ایسا کوئی گستاخانہ سوال کرنے کی اجازت نہ دیتی تھی چنانچہ دل میں سخت خفا ہونے کے باوجود آج صبح سے چولھے پر پائے کا بڑا سا دیگچہ چڑھا رکھا تھا اور نئی ڈاؤن لوڈ کردہ ریسیپی کی روشنی میں مسالا جات کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ وقت کی تھوڑی سی بچت کی خاطر اتنی ڈنڈی البتہ ماری تھی کہ بڑے کے پائے کے بجائے... بکرے کے پائے پکا رہا تھا اور اس عمل میں خود کو بالکل حق بجانب محسوس کرتا تھا اس لیے شینو کے اعتراض کو چٹکیوں میں اڑا دینا ہی مناسب تھا۔

''کدھر چلے......اِدھر میری بات سن کر جاؤ۔''

شینو اس کے بڑے بکرے کے پائے والی بات سن کر خاموشی سے جانے ہی لگا تھا کہ اس کے اندر خطرے کا الارم سا بجا گھر کے زیادہ تر چھوٹوں کی طرح شینو کو بھی بڑے بھائیوں کی چغلیاں لگانے کی عادت تھی سو بروقت اسے لگام ڈالنا ضروری تھا۔

''جی چھوٹے بھائی......'' اس کے لہجے کی سختی کو محسوس کر کے شینو بھی فوراً بیبا بچہ بن گیا۔

''ابا سے لگائی بجھائی کی کوشش کی تو یاد رکھنا کہ میں بھی انہیں بتا دوں گا کہ پچھلے سنڈے کو تم کوچنگ میں ایکسٹرا کلاسز کا بہانا بنا کر میچ کھیلنے گئے ہوئے تھے۔ پھر تم میرے پکائے پائے کے بجائے ابا کی اعلیٰ پائے کی ڈانٹ کھاتے رہنا۔''

''میں کب کچھ کہہ رہا ہوں۔'' اس کی دھمکی سن کر شینو منمنایا۔

''اچھی بات ہے، ویسے بھی دنیا کے سارے فلسفیوں، دانشوروں اور حکما نے منہ بند کر کے رکھنے میں ہی آدمی کی نجات بتائی ہے۔'' شینو کی فوری پسپائی نے بلبن کو مطمئن کر دیا تھا۔ اس لیے لہجے میں نرمی سمو لینے میں کوئی حرج نہیں سمجھا۔

☆☆☆

''میں کہتا ہوں بہت ہو گئی یہ امورِ خانہ داری۔ اس جھنجٹ میں پڑ کر تو زندگی کا سارا حسن ہی غارت ہو گیا ہے۔ نہ کسی آنے والی نئی فلم کا پتا چلتا ہے، نہ ٹک کر ٹی وی دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور نہ ہی دوستوں سے ملاقات کی فرصت ملتی ہے۔ میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس جبر کے خلاف متحد ہو جائیں اور مزید اس بیگار کو اٹھانے سے انکار کر دیں۔'' یہ ہفتے کی رات تھی۔ ابا اپنے کسی دوست کے بیٹے کے ولیمے میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ پھر بھی لاؤنج وغیرہ کا انتخاب کر کے کوئی خطرہ مول لینے کے بجائے غوری نے اس اہم اجلاس کو اپنے اور بلبن کے مشترکہ کمرے میں طلب کیا تھا اور اب شرکا اجلاس کے سامنے پُرجوش تقریر کر رہا تھا۔

''آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے، بڑے بھیا تنگ تو ہم بھی آ گئے ہیں اس مف لائف سے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ پکائیں گے نہیں تو بھوکوں مریں گے یا پھر ہوٹلوں کے کھانے کھا کر اسپتالوں کے چکر لگاتے رہیں گے۔ صفائی اور دوسرے کاموں کے لیے ڈھنگ کی ملازمہ کے انتظام میں ہم پہلے ہی بری طرح ناکام ہو چکے ہیں اس لیے اپنے نصف ایمان کی حفاظت کے لیے صفائی کرنا بھی ہماری مجبوری ہے۔ ویسے آپ نے ابا کا وہ ارشادِ عالیہ بھی سنا ہو گا کہ کتا بھی کہیں بیٹھتا ہے تو اپنی دم سے جگہ صاف کر کے بیٹھتا ہے چنانچہ اگر ہم صفائی نہیں کرتے ہیں تو ہماری کتے سے بھی نچلے درجے پر تنزلی ہو جائے گی اور ہم بہر حال یہ ذلت نہیں سہہ سکتے۔ کپڑوں کی دھلائی کے لیے البتہ ایک بار پھر دھوبی کو آزمایا جا سکتا ہے لیکن پھر پیدا ہونے والے مسائل کو برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہنا ہو گا بالفاظ دیگر مسائل اور پریشانیاں ہماری قسمت میں لکھ دی گئی ہیں اس لیے ہم

ان سے فرار ہو کر کہیں نہیں جا سکتے۔'' غوری کی پُرجوش تقریر کے جواب میں ٹیپو نے دکھی سے لہجے میں جو حقیقت پسندانہ تقریر کی اس نے حاضرین کو زیادہ متاثر کیا اور سب مایوسانہ سر کو تائیدی جنبش دینے لگے۔

''ایسی باتیں مت کرو میرے بھائی...... مایوسی کفر ہے۔ دنیا میں آج تک ایسا کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا جس کا حل موجود نہ ہو۔ ہمارے مسائل کا بھی ضرور کوئی نہ کوئی حل موجود ہو گا۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ ہم اس حل کو تلاش کریں۔'' بھائیوں کے مایوسانہ ردِعمل کے باوجود غوری کا جوش ماند نہ پڑا اور اس نے ان کے اندر اپنی باتوں سے ایک نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کا اتنا نتیجہ بہر حال نکلا کہ سب اپنی، اپنی جگہ سوچوں میں ڈوب گئے۔ آخر کار سب سے پہلے شینو نے مراقبے سے سر اٹھایا اور سنجیدہ تاثرات کے ساتھ بولا۔

''ہمارے ان مسائل کا ایک ہی حل ہے اور وہ ہے اس گھر میں ایک عدد خاتون کی موجودگی، ہمیں اس گھر کے لیے ایک خاتون کا بندوبست کرنا ہو گا۔''

''یہ تم نے کون سی نئی بات بتائی ہے۔ یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ لیکن مسئلہ وہی ہے کہ خاتون آئے کہاں سے؟ کوئی جوان جہان عورت اس گھر میں ملازمت کے لیے راضی نہیں ہوتی اور بڈھی ٹھڈھی... ملازمہ کے بس کا روگ نہیں کہ پانچ، پانچ مردوں والے گھر کا کام سنبھال سکے۔'' بلبن نے فوراً ہی منہ بنا کر اس کی تجویز کو رد کیا۔

''آپ کی سوچ کی پرواز صرف ملازمہ تک جاتی ہے۔ کیا ضروری ہے کہ اس گھر میں خاتون ملازمہ کی صورت میں ہی آئے۔ ہم اس کے بجائے ایک عدد بھابی بھی تو لا سکتے ہیں۔'' شینو نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے جو تجویز پیش کی اس پر سب سے زیادہ غوری گڑبڑایا اور سٹپٹا کر بولا۔

''بھابی...... کس کی بھابی؟''

''آپ کی نہیں، ہم تینوں کی بھابی۔'' شینو نے اطمینان سے جواب دیا تو جہاں غوری کی آنکھیں پھٹیں

قابلِ غور

☆ زندگی میں خود کو کبھی کسی انسان کا عادی مت بناؤ کیونکہ انسان بہت خود غرض ہے۔ جب آپ کو پسند کرتا ہے تو آپ کی برائی بھول جاتا ہے جب آپ سے نفرت کرتا ہے تو آپ کی اچھائی بھول جاتا ہے۔

☆ زندگی کے حسین لمحات واپس نہیں آتے لیکن اچھے لوگوں سے تعلقات اور ان سے وابستہ اچھی یادیں ہمیشہ دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔

از: حرا قریشی، ملتان

ذرا سی نیکی

ٹوٹے ہوئے دلوں کو بھی جوڑ کر تو دیکھ
نیکی یہ مختصر ہے مگر حج سے کم نہیں

انتخاب: فضہ بتول، بہارہ کہو

کچھ باتیں میری اپنی

☆ کبھی کبھی یک طرفہ محبت انسان کو غموں اور دکھوں کے علاوہ کچھ نہیں دیتی۔

☆ کسی کے صبر کا امتحان اتنا لو کہ وہ اس پر پورا بھی اتر سکتا ہو اتنا نہ لو کہ کسی مشکل کا سامنا ہو اور وہ پورا نہ اتر سکے۔

☆ اس دوست کا کوئی فائدہ نہیں جو صرف دولت کی وجہ سے ملتا ہو ایسے دوست سے بچو کیونکہ وہ تمہیں کسی بھی وقت نقصان پہنچا سکتا ہے۔

☆ کبھی، کبھی انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے لیکن خداوندِ عالم انسان کے لیے جو بہتر چاہتا ہے وہی کرتا ہے۔ بے شک خداوندِ عالم اپنے بندوں سے بہت محبت کرنے والا ہے۔

☆ ہمیشہ دوسروں کے لیے اچھی سوچ رکھو، تم خود بھی پُرسکون رہو گے۔

از قلم خود، ایمان زہرا شیرازی، ڈھڈیال، چکوال

وہیں دوسروں کے چہرے بھی کھل اٹھے۔
''یہ تو واقعی بڑی زبردست ترکیب سوجھی چھوٹو کو...... سچ سچ اس گھر کو ایک عدد بھابی کی ضرورت ہے۔ میں آج ہی ابا کے سامنے مطالبہ پیش کر دیتا ہوں کہ وقت کی مجبوری ہے بھابی بڑی ضروری ہے۔'' شیخو کی تجویز کی سب سے پہلے بلبن نے حمایت کی۔
''کیسی باتیں کر رہے ہو یار...... ابھی تو میری تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی۔ اس کے بعد جاب کی تلاش کا مسئلہ ہوگا۔ ایسے میں بھلا کون مجھے اپنی بیٹی کا ہاتھ تھمائے گا۔'' شرمائے، شرمائے سے غوری نے دبے، دبے سے لہجے میں اعتراضات پیش کیے۔ شادی کا ذکر سن کر دل میں جو لڈو پھوٹ رہے تھے اُن کی وجہ سے زیادہ پُرزور اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ڈر تھا کہ کہیں بھائی لوگ اپنے دل سے یہ خیال نکال ہی نہیں دیں۔
''یہ کوئی خاص مسائل نہیں ہے۔ چار چھ مہینے میں آپ کا فائنل ہونے والا ہے۔ اتنا عرصہ تو لڑکی کی تلاش اور شادی کی تیاری میں بھی لگ ہی جائے گا، رہی ملازمت کی بات تو اپنا کاروبار ہوتے ہوئے اس کے لیے زیادہ کیا پریشان ہونا۔'' ٹیپو نے اس کے اعتراضات کو رد کر دیا لیکن کپڑے کی دکان کا ذکر آنے پر غوری کو سچ مچ اعتراض ہوا اور شدید صدمے کی کیفیت میں بولا۔
''اپنا کاروبار...... مطلب کیا ہے تمہارا؟ کیا میں ایم بی اے کر کے ابا کی کپڑے کی دکان پر بیٹھوں گا۔''
''دکان پر بیٹھنے کے لیے کس نے کہا ہے...... مقصد یہ ہے کہ لڑکی والوں کو بتایا جا سکتا ہے کہ ہمارے گھر میں ان کی بیٹی کو کسی تنگی ترشی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ بعد میں آپ اپنی قابلیت کے مطابق ملازمت کی تلاش کرتے رہیے گا۔'' بلبن نے فوراً اسے کول ڈاؤن کرنے کے لیے بات بنائی۔
''چلو ٹھیک ہے لیکن شادی کے لیے لڑکی کہاں سے آئے گی۔'' غوری نے فوراً اس فوراً آفر کو قبول کر لیا اور دوسرا اہم نکتہ اٹھایا۔
''لڑکی تو ظاہر ہے تلاش کرنی پڑے گی۔ اگر آپ کو کوئی پسند ہو تو بتائیں۔ کوئی کلاس فیلو وغیرہ اچھی تو لگتی ہوگی۔'' ٹیپو نے اسے ٹٹولنے کی کوشش کی، اُدھر اس کے اپنے ذہن میں ساری ہم جماعت لڑکیوں کی شکلیں گھوم گئیں۔ مونا، ثوبیہ، شہزا، ثمن، شیبا، عالیہ...... ایک لمحے میں اس نے سب کو یاد کیا اور پھر ایک زوردار جھرجھری لی۔
''نہیں یار...... میری کلاس فیلوز میں سے کوئی لڑکی اس گھر کے لیے مناسب نہیں رہے گی۔ وہ سب کی سب بڑی سخت پڑھاکو قسم کی لڑکیاں ہیں اور پڑھائی سے جو وقت بچ جاتا ہوگا...... اسے اپنی ٹپ ٹاپ میں لگا دیتی ہوں گی۔ ان میں سے کسی سے تو مجھے یہ امید بھی نہیں ہے کہ ڈھنگ کا آملیٹ بنانا جانتی ہوں گی پورے گھر کی ذمے داری سنبھالنا تو بہت مشکل بات ہے۔ وہ ساری ایم بی اے کر کے کیریئر بنانے کا خواب دیکھنے والی لڑکیاں ہیں انہیں اس خارزار میں گھسیٹنے کا سوچنا بھی ٹھیک نہیں۔''
جو خود پر اتنی کڑی نہ گزری ہوتی تو غوری کو ہرگز خیال نہیں آتا کہ گھر داری کتنا مشکل کام ہے لیکن اس وقت تو اپنی ہم جماعت لڑکیوں کے لیے ہمدردی کے چشمے پھوٹ پڑے تھے۔
''چلو پھر خاندان کی لڑکیوں پر غور کر لیتے ہیں۔'' بلبن نے نئی راہ دکھائی۔
''خاندان میں کون ہے؟ بڑے ماموں کی دونوں بیٹیوں کی شادی ہو چکی ہے۔ منجھلے ماموں کی اکلوتی دختر نیک اختر کے نخرے سہنے کی تاب میں خود میں نہیں پاتا۔ ویسے بھی اس سے گھر سنبھالنے کی امید رکھنا بیکار ہے۔ یاد نہیں ہے کہ نانی، منجھلی مامی سے کتنی خفا رہتی تھیں کہ ہر چار دن بعد آٹھ دن کے لیے میکے رہنے چلی جاتی ہے۔ ان کی بیٹی بھی یقیناً ان کے نقشِ قدم پر ہی چلے گی سو شادی کا اصل مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ رہے چھوٹے ماموں تو ان کی دونوں بیٹیاں تو اپنے شنو سے بھی چھوٹی ہیں اس لیے ان کے بارے میں تو

سوچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' غوری نے منٹوں میں اس تجویز کو رد کر دیا۔
''پھپھو کی انجم آپی بھی تو ہیں۔'' اس بار شیخو نے زبان کھولی۔
''انجم...... وہ پھینی ناک والی جو اپنی ناک سے ...ی موٹا چشمہ لگاتی ہے تم اسے اپنی بھابی بنانے کا سوچ رہے ہو؟'' ایشوریا، کترینہ یا کم از کم بھی انوشکا جیسی لائف پارٹنر کے خواب دیکھنے والا غوری اس تجویز پر بلبلا گیا۔ پھپھو بہت اچھی تھیں اور انہوں نے اپنی بیٹی کو بھی ...ا سا سلیقہ مند بنا رکھا تھا لیکن اس سے شادی...... تو نیور......
''پھینی ناک اور موٹے چشمے سے کیا ہوتا ہے ...ائی۔ انجم آپی اتنے مزے کا کھانا پکاتی ہیں اور گھر کے ...ی کام بھی انہیں بہت اچھی طرح آتے ہیں۔ ان کے ...ی گھر میں آنے سے ہماری ساری پریشانیاں دور ...ہو جائیں گی۔ میکا دور ہونے کی وجہ سے وہ روز، روز ...اں جا بھی نہیں سکیں گی۔'' شیخو نے اپنی تجویز کے حق ...ں دلائل دیے۔
''اسے سمجھاؤ یار...... بیوی سے صرف گھر کے ...م نہیں کروانے ہوتے، اس کو دیکھنا بھی ہوتا ہے، تم ...لوں کی پریشانیاں دور کرنے کے چکر میں کیا میں ...اری زندگی پھینی ناک دیکھتا رہوں گا۔'' اس بار غوری ...نے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے بلبن کو مخاطب کیا۔
...ی کا موڈ دیکھتے ہوئے بلبن نے شیخو کو اشارہ کیا کہ ...وہ انجم کے حق میں کچھ نہ بولے اور خود غوری کی ...طرف رخ کر کے سنجیدگی سے بولا۔
''میرے ایک دوست کی بڑی بہن کا میرج ...ورو ہے، میں ان سے اس سلسلے میں بات کروں گا۔ ...کی ڈیمانڈ کے مطابق وہ جو لڑکیاں دکھائیں ان ...میں سے آپ اپنی پسند کی لڑکی سلیکٹ کر لینا۔''
''ٹھیک ہے جیسا تم لوگ مناسب سمجھو......''
...ن کو اندازہ ہو رہا تھا کہ انجم کو اس طرح رد کیا جانا ...ان کو پسند نہیں آیا ہے لیکن نظر انداز کر کے سنجیدگی سے بلبن کی بات کا جواب دیا اور یوں نہایت جوش و خروش سے شروع ہونے والا اجلاس قدرے بدمزگی سے اپنے اختتام کو پہنچا۔ ٹیپو اور شیخو اجلاس کے اختتام پر اپنے مشترکہ کمرے میں واپس لوٹ گئے جبکہ بلبن جو غوری کے ساتھ ہی کمرا شیئر کرتا تھا کرسی پر بیٹھا کسی فلسفی کی طرح سنجیدہ شکل بنائے... غوری کی شکل تکنے لگا۔ کچھ دیر تو غوری نے اس کی یہ حرکت برداشت کی لیکن کب تک کرتا آخر جھنجلا کر پوچھ بیٹھا۔
''میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں کیا جو ایسے مجھے گھور، گھور کر دیکھ رہے ہو؟''
''سینگ نہیں، نہیں آپ کی چندھی، چندھی آنکھوں پر غور کر رہا تھا جنہیں ہرچند کہیں کہ ہے پر نہیں ہے والا معاملہ ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر آپ کو کوئی حسینہ پسند آ گئی لیکن اسے آپ کی یہ چندھی آنکھیں نہ بھائیں تو ہمارے لیے تو ایک عدد بھابی کی آمد ناممکنات میں سے ہو جائیں گی۔'' بلبن اپنے تئیں اسے بھگو، بھگو کر لگا رہا تھا لیکن غوری نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور یوں کتاب کھول کر بیٹھ گیا جیسے اس کے کانوں پر جوں بھی نہ رینگی ہو۔ تھوڑی دیر بعد کتاب بند کی اور سنجیدگی سے بلبن کی طرف رخ کر کے بولا۔
''ذرا سوچو کہ اگر میں تم لوگوں کی فرمائش مانتے ہوئے انجم سے شادی کر لیتا ہوں تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟''
''کیا نکلے گا؟'' بلبن نے ہونق پن سے پوچھا۔
''چند سالوں بعد تم لوگ چندھی آنکھوں اور پھینی ناک والے بھتیجا، بھتیجی گودوں میں لیے گھوم رہے ہو گے اور ذرا سوچو کہ ایسے بھتیجا، بھتیجی کے ساتھ لی ہوئی سیلفیز پوسٹ کرنے پر تمہیں کتنے لائکس ملیں گے؟'' اس نے واقعی اہم نکتہ اٹھایا تھا۔ بلبن سوچ میں پڑ گیا۔ چندھی آنکھوں اور پھینی ناک والے بھتیجا، بھتیجی کا خیال اس کے دل کو بھی زیادہ نہیں بھایا۔
''ٹھیک ہے، میں کل ہی دوست کی بہن سے ملنے جاتا ہوں۔'' اس کے مری، مری آواز میں کہنے پر

غوری کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆☆☆

آج پھر ان چاروں کا اجلاس تھا اور یہ اجلاس بلبن نے بلایا تھا۔ مسئلہ تھا، غوری کے رشتے کا سلسلہ کیسے چلایا جائے؟ دوست کی بہن کی فراہم کردہ تصویروں کی مدد سے وہ اپنے تئیں ایک لڑکی کا انتخاب کر چکے تھے۔ کھلتی رنگت اور تیکھے نقوش والی لڑکی غوری کے دل کو بھی بھائی تھی اور اس کے جملہ کوائف سے بھی وہ لوگ مطمئن تھے سنا تھا کہ محترمہ گھریلو امور میں طاق، خوش اخلاق اور پابند صوم صلوٰۃ ہیں۔ ایسے دُرِ نایاب کے اپنے گھر آجانے کے خیال سے ہی وہ چاروں ہی بے حد مسرور تھے لیکن اس راہ میں کچھ مشکلات بھی درپیش تھیں۔ سب سے پہلا مسئلہ یہ آن کھڑا ہوا تھا کہ رواج کے مطابق ان کے ہاں سے کسی کو رشتہ لے کر لڑکی والوں کے گھر جانا تھا اور اس ''کسی'' کے طور پر یقیناً چار عدد چھڑے چھانٹ لڑکے قابلِ قبول نہیں تھے۔ عام طور پر یہ معاملات عورتیں ہی سنبھالتی ہیں اور یہاں کوئی عورت ہوتی تو غوری میاں کی شادی کا معاملہ ہی قبل از وقت کیونکر اٹھتا۔ بہرحال کسی نہ کسی خاتون کا بندوبست کرنا تھا اور اس سلسلے میں خاندان کی چیدہ، چیدہ خواتین پر غور کرنے کے بعد یہ ہی فیصلہ ہوا تھا کہ ممانیوں میں سے تو کوئی اس کام کے لیے موزوں نہیں ہے اس لیے پھپو سے رجوع کیا جائے۔ پھپو ہی وہ ہستی تھیں جو ابا کو اس معاملے میں قائل کر سکتی تھیں اور ظاہر ہے کہ مغل ہاؤس کے کسی سپوت کی شادی کے لیے ان کا قائل ہونا از حد ضروری تھا۔ اس اجلاس میں غور کیا جا رہا تھا کہ فون پر پھپو کو اصل صورتِ حال بتا کر کراچی آنے کی دعوت دی جائے یا پھر کسی اور بہانے سے بلانے کے بعد آمنے سامنے بیٹھ کر سارا مسئلہ ڈسکس کیا جائے۔ ان کا یہ غور و خوض جاری تھا کہ باہر سے ابا کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی اور پھر وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔

''یہ چوکڑی یہاں کیوں جمی ہوئی ہے؟'' چاروں کو ایک جگہ جمع پا کر ان کا ماتھا ٹھنکا۔

''کچھ نہیں ابا..... بس شیخو کو امی کی یاد زیا... آ رہی تھی تو ہم سب اس کا دل بہلا رہے تھے۔'' بلبن نے جھٹ بہانا بنایا۔

''ہوں.....'' اس جواب کو سن کر ابا نے پُر خیال انداز میں ایک ہنکارا بھرا پھر غوری کی طرف رخ کر کے بولے۔

''کل تمہاری پھپو آ رہی ہیں، دوپہر کے کھا... پر بریانی بنا لینا۔'' عام حالات میں اگر غوری کو یہ حکم ملتا تو وہ اپنا چھٹی کا دن برباد ہو جانے کے خیال سے جز بز ہوتا لیکن اس وقت تو مانو دل کی کلی کھل اٹھی... جھٹ بولا۔

''ٹھیک ہے ابا! میں بریانی بنا لوں گا... بتائیں کہ چکن بریانی بناؤں یا مٹن یا بیف.....''

''جو آپ کا دل چاہے بنا لیجیے گا برخوردار... میں بڑے کے پائے کے نام پر بڑے بکرے کے... کھا سکتا ہوں تو چکن، مٹن یا بیف بریانی سے... فرق پڑتا ہے۔'' ان کے لہجے میں خفگی در آئی۔ ... بلبن کی طرف سے انجام دیا گیا کارنامہ انہیں ... نہیں بھولا تھا اس لیے موقع ملتے ہی طنز فرما... چوکے۔ ان کے اس طنز پر جہاں بلبن کھسیاہٹ ... ہوا وہیں غوری کو تابعداری جھاڑنے کا موقع مل ... بڑے ادب سے بولا۔

''میں ایسا گستاخ نہیں ہوں ابا..... ! ... طرف سے آپ پورا اطمینان رکھیے، میں آپ ... عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''جیتے رہو برخوردار! تمہاری بات نے ... خوش کر دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ تم لوگوں کو گھر ... الجھنوں میں پھنسا دیکھ کر مجھے خود بھی اچھا نہیں لگ... سارے عورتوں کے کام ہیں اور ان ہی کو ... بیچارے مرد بچے بھی جتنا کر لیتے ہو وہ بھی ... اب اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی تو اس وقت میں ا... بجت سے کوفتوں کی بریانی بنانے کی فرمائش کرتا۔''

ابا مغموم سے تاثرات کے ساتھ بولے تو غوری ... سانس سینے میں اٹک گئی۔ کوفتوں کی بریانی...... ... عام بریانی بنانا ہی کون سا آسان تھا جو ابا اشاروں ... زبان میں کوفتوں کی بریانی کی فرمائش کر بیٹھے تھے۔ ... اس کو نگوں کی کیفیت سے بلبن کے ٹھوکے نے نکالا ... خیال آیا کہ ابا کے دل میں جگہ بنانے کے لیے یہ ... مناسب موقع تھا سو دل کڑا کر کے بولا۔

''آپ کا کوفتوں کی بریانی کھانے کا دل چاہ رہا ... تو یہی سہی..... آپ کی خاطر میں یہ بھی کر لوں گا۔''

''بہت خوب! تم لوگوں کی یہی محبت تو ہے جو ... تمہاری ماں کے بعد بھی جی رہا ہوں ورنہ اس بیشتن ... مجھے کیسی محبت تھی اس کا ایک زمانہ گواہ ہے۔ تم ... اس کی نشانیاں ہو اور تمہاری خاطر میں کڑوے ... کڑوا گھونٹ بھی پی سکتا ہوں۔'' ظہیر بابر مغل کا لہجہ ... رقت آمیز ہو گیا جس سے بیٹوں کا دل بھی ... ہوا اور سب باہم مل کر انہیں یقین دلانے لگے کہ ... ان سے بے حد محبت کرتے ہیں اور اپنے ہر عمل ... ان کی رضا کو ضروری جانتے ہیں۔ یہ جذباتی منظر ... ہوا اور ابا خیر سے اپنے کمرے کو سدھارے تو ... نے اطمینان بھری سانس لی اور ٹیپو، غوری کو ... کر کے بولا۔

''لیجیے بڑے بھیا..... یہ مٹی تو پہلے ہی خاصی نرم ... پھپو کی از خود آمد سے بھی اچھے اشارے مل رہے ہیں، ... ابا کو راضی کرنے کے لیے زیادہ پاپڑ نہیں ... پڑیں گے اور آسانی سے نیا پار ہو جائے گی۔''

''نیا تو جب پار ہو گی تب ہو گی لیکن یہ کوفتوں کی ... بنانے کا معرکہ میں کیسے سر کروں گا؟'' غوری درد ... انداز میں کراہا تو جیسا کہ دنیا کا دستور ہے ... کے دکھ پر خوش ہوتی ہے اس کے بھائی بھی ... کر ہنسنے لگے۔

☆☆☆

... پھپو دوسرے دن حسبِ پروگرام دوپہر کے ... سے قبل ان کے گھر پہنچ گئیں۔ غوری لنچ میں اتنی بری طرح الجھا ہوا تھا کہ باہر نکل کر ان سے ملاقات بھی نہیں کر سکا۔ کام نمٹا کر فارغ ہونے تک اس کا حلیہ اتنا بگڑ چکا تھا کہ پھپو کے سامنے جانے سے قبل حلیے کی درستگی ضروری جانی اور شیخو کو کھانا میز پر لگانے کی ذمے داری سونپ کر خود غسل خانے میں گھس گیا۔ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے تو اپنا آپ بہتر لگا اور آوازوں سے سب کی ڈائننگ روم میں موجودگی کا اندازہ لگاتے ہوئے اُدھر کا رخ کیا۔ اندر داخل ہوتے ہی پھپو پھر ان کے ساتھ بیٹھی ہستی پر نظر پڑی۔ ناک میں ہیرے کی لشکارے مارتی لونگ پہنے مسکرا، مسکرا کر سب سے بات کرتی وہ لڑکی کچھ شناسا سا تو لگ رہی تھی لیکن مکمل طور پر پہچان نہیں پا رہا تھا۔

''السلام علیکم پھپو......'' شناسا اجنبی حسینہ پر سے نظریں ہٹا کر اپنے شریف ہونے کا ثبوت دیا اور پھپو کو ادب سے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام......فریش ہو گئے تم......تمہارے انتظار میں ہم نے بھی ابھی کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ جس نے اتنی محنت سے کھانا بنایا ہے اس کے بغیر کھانا کھاتے ہوئے بھلا کیا اچھا لگتا۔'' پھپو نے بڑی محبت سے کہا تو وہ مسکراتا ہوا ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا اور ایک چور نظر پھپو کے برابر بیٹھی لڑکی پر ڈالی۔

''چلو انجم سب سے پہلے اپنے ماموں جان کی پلیٹ میں کھانا ڈالو۔'' پھپو نے اپنے برابر بیٹھی لڑکی کو مخاطب کیا تو اسے جھٹکا لگا۔

''ہائیں تو یہ انجم ہے۔'' حیرت کے مارے زبان بھی پھسل گئی۔

''ارے تم پہچانے نہیں؟ بھئی ذرا سی ناک کی پلاسٹک سرجری کروائی ہے اور چشمہ ہٹا کر کانٹیکٹ لینس لگوائے ہیں، ایک سہیلی نے مشورہ دیا تھا کہ ان معمولی عیبوں کی وجہ سے اچھی بھلی لڑکی کے لیے رشتوں کا مسئلہ ہو جائے گا۔ اس کی باتیں میرے دل کو لگیں اس لیے تمہارے پھوپا کو قائل کر کے انجم کی ناک کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ اور چشمہ بھی ہٹوا دیا اور

واقعی اس سے بڑا فرق پڑا۔ بہت اچھے گھر میں اس کا رشتہ ہوگیا ہے۔ باقاعدہ منگنی کروں گی تو تم سب کو بھی بلواؤں گی۔'' پھپھو بتا رہی تھیں اور غوری کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ پھینی ناک والی چشماٹو انجم ذراسی تبدیلی کے بعد ایسی حسین لگے گی۔ اب معلوم ہوا تھا تو چڑیا کھیت چگ گئی تھیں۔

''مصنوعی حسن سے کیا ہوتا ہے۔ جہیز میں سے پھینی ناک تھوڑی نکلے گی۔ جب پھینی ناک والے بچوں کی لائن لگے گی تو دیکھوں گا۔ نس، کس کی پلاسٹک سرجری کرواتی ہیں محترمہ......'' جلے دل پر پھایا رکھنے کو خود ہی اپنے آپ کو تسلی دے رہا تھا کہ نظریں ابا پر چلی گئیں۔ وہ بریانی کی ڈش کا ڈھکن اٹھائے اس میں موجود ملغوبے کا جائزہ لے رہے تھے۔ کوفتوں کے نام پر اس میں ٹیڑھی میڑھی کچھ، کچھ کالی سی چیزیں بچی ہوئی تھیں اور چاولوں کا غالباً بالکل ہی دم نکل چکا تھا جو ایک بھی دانہ دوسرے سے جدا ہونے کو تیار نہیں تھا۔

''بس، یہی کچھ ہے جسے کھا، کھا کر اب تو میرا معدہ جواب دینے لگا ہے۔'' اس کی گھنٹوں کی محنت پر ابا کا کیا گیا تبصرہ پانی بلکہ بحرِ اوقیانوس پھیر گیا۔

''یہ سب لڑکوں کے بس کا ہے بھی کہاں بھائی جان...... بیچارے اپنی پڑھائیوں پر دھیان دیں یا گھر داری کے جھمیلے نمٹائیں۔'' پھپھو نے بھتیجوں سے محبت جھاڑی۔

''دنیا کے سارے اچھے شیف مرد ہی ہوتے ہیں امی......'' انجم نے دخل در معقولات کرتے ہوئے جو بات کہی اس پر چاروں بھائیوں کا مشترکہ طور پر اس کا گلا دبا دینے کو دل چاہا۔

''اس لیے کہ وہ شیف ہوتے ہیں اور انہوں نے اسی کام کی تربیت حاصل کی ہوتی ہے۔ ہم چاروں بزنس...... میڈیکل اور کمپیوٹر سائنس کے اسٹوڈنٹ ہیں۔'' ٹیپو نے دانت کچکچا کر جواب دیتے ہوئے چاروں بھائیوں کے دلی جذبات کی ترجمانی کی۔

''بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے ٹیپو...... یہ بیچارے بچے اپنی اتنی مشکل پڑھائیاں کرنے میں ہی ہلکان ہو جاتے ہوں گے' ایسے میں گھر داری کرنا بڑا عذاب ہے۔ ویسے بھی یہ تو بس عورت کا ہی دم ہوتا ہے کہ تنہا گھر کے ہزاروں جھمیلے نمٹا لیتی ہے اور زبان سے اُف نہیں کرتی۔'' ٹیپو کی حمایت کر کے پھپھو نے انجم کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور لگے ہاتھوں اپنی صنف کے قصیدے بھی پڑھ ڈالے۔

''بالکل صحیح پھپھو، واقعی عورت کے وجود سے ہی گھر کا انتظام چلتا ہے۔ اپنے علامہ اقبال نے بھی کہا ہے کہ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ... اور ہمارا گھر وجودِ زن کی عدم موجودگی کی وجہ سے بالکل بلیک اینڈ وائٹ ہوگیا ہے۔''

وہ پھپھو سے جس موضوع پر بات کرنا چاہتے تھے اس کے لیے خود بخود ہی فضا سازگار ہوتی جا رہی تھی اس لیے تنہائی میں پھپھو سے مسئلہ ڈسکس کرنے کا ارادہ تھا؛ کر بلبن نے موقع پر ہی ڈول ڈال دینا مناسب سمجھا۔

''تو بھئی اس تصویر کو دوبارہ رنگین کرنے کا انتظام کیے دیتے ہیں۔'' پھپھو کا جواب اور مسکراہٹ دونوں معنی خیز تھیں۔

''سچ پھپھو...... کیا سچ مچ ہمارے گھر کی تصویر دوبارہ رنگین ہو سکتی ہے۔'' خوشی میں شیخو کا لہجہ زیادہ جذباتی ہوگیا۔

''اس میں جھوٹ کی کیا بات ہے بیٹا! میں تو پہلے دن سے ہی اس بات کو سمجھتی ہوں کہ عورت کے بغیر گھر نہیں چل سکتا لیکن ظاہر ہے بھابی کا غم تازہ تھا اس لیے فوری طور پر ایسی بات نہیں چھیڑی جا سکتی تھی۔ بھائی جان کو راضی کرنے میں بھی مجھے وقت لگا، میں روزانہ فون کر کے انہیں سمجھاتی تھی کہ عورت کے بغیر گھر کا انتظام چلانا ممکن نہیں ہے تب جا کر یہ مشکل سے قائل ہوئے ہیں۔'' اب پھپھو خاصے سنجیدہ تاثرات کے ساتھ گفتگو کر رہی تھیں۔ ہمہ تن گوش پھپھو کی طرف متوجہ ان چاروں میں سے کوئی بھی نہیں دیکھ سکا تھا کہ ابا کی آنکھیں کیوں جھک گئی ہیں اور وہ کیوں ذرا شرمائے شرمائے سے نظر آنے لگے ہیں۔

سنگ سنگ چلیں پاکیزہ کے

وقت کا پہیا اپنی مخصوص رفتار سے رواں دواں ہے...... کبھی معلوم ہوتا ہے یہ پہیا رک گیا ہے اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تیز بہت تیز گھومتا چلا جا رہا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کا گھومنا سب کو اپنے، اپنے حساب سے کم، زیادہ لگا کرتا ہے۔ انسانی زندگی کے پانچ دور بچپن، نوعمری، جوانی، ادھیڑ عمری اور بڑھاپا ویسے عام طور پر تو لوگ چار دور ہی شمار کرتے ہیں خیر جانے دیجیے۔ ہمیں تو اپنے پاکیزہ ساتھیوں سے ان کا بچپن، نوعمری، جوانی اور ادھیڑ عمری کے تجربات، واقعات، مشاہدات سننے ہیں تو پھر تیار ہو جائیں۔ تمام پاکیزہ پڑھنے والوں کو انشاء اللہ ان سالگرہ نمبروں پر جو ماہ اپریل اور مئی کے شمارے ہوں گے بہت کچھ نیا پُرلطف اور دلچسپ پڑھنے کو ملے گا۔ خصوصیت سے وہ تمام بہنیں جو اول دنوں سے ماہنامہ پاکیزہ کے ساتھ ہیں اس سلسلے میں ضرور حصہ لیں۔ اگر پرانا ترین رسالہ ابھی تک موجود ہے تو اس کے سرورق کی واضح تصویر بھی بھیج سکتی ہیں۔ اس کے لیے یہ سوالات مرتب کیے ہیں۔

1۔ ماہنامہ پاکیزہ سے تعارف کی مختصر کہانی اپنے الفاظ میں......؟

2۔ اس پورے عرصے میں پانچ ایسی نمایاں باتیں جو پاکیزہ سے ناتا جوڑے رہیں۔ مثلاً کہانیاں، سلسلے، مصنفات یا کچھ اور......؟

3۔ ماہنامہ پاکیزہ کس طرح آپ کا دوست، رہنما اور ناصح ثابت ہوا؟

ٹ: بہنیں اپنے جوابات کے ساتھ چاہیں تو اپنی نئی اور بہت پرانی تصویر بھی بھیج سکتی ہیں

"میرے محلے ہی کی ایک لڑکی ہے، شکل واجبی سی ہے اور بیچاری کے والدین اس کی نوعمری میں انتقال کر گئے تھے۔ بھابیوں کو مفت کی نوکرانی ملی ہوئی تھی سو اس کی شادی کے لیے کوشش نہیں کی اور وہ کنواری بیٹھی رہ گئی۔ اب یہی کوئی چالیس، بیالیس سال کی ہوچکی ہے۔ نیک اور اچھے اطوار کی مالک سگھڑ لڑکی ہے۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ ایسی اچھی لڑکی کا گھر بسا کر مجھے بھی ثواب مل جائے گا اور تم لوگوں کے مسائل بھی حل ہوجائیں گے۔ اس لیے آج تم لوگوں سے اس کے سلسلے میں بات کرنے آئی تھی۔" پھپو سنجیدگی سے بتارہی تھیں لیکن ان چاروں کی سوئی تو واجبی سی شکل اور چالیس، بیالیس سال کی لڑکی میں ہی اٹک گئی تھی۔ کچھ، کچھ پھپو کی دماغی حالت پر بھی شبہ ہورہا تھا کہ وہ اپنے نوجوانوں بھتیجے کے لیے ایسا رشتہ لے کر آئی ہیں، سب سے بری حالت غوری کی تھی اور چہرے پر تیزی سے رنگ آجارہے تھے۔

"چالیس، بیالیس سال کی لڑکی...... یہ زیادہ ہی ایج ڈفرینس نہیں ہوجائے گا پھپو......" آخر بلبن نے ہی بھائی کی ہمدردی میں سب سے پہلے آواز اٹھائی۔

"اے ہٹاؤ...... ایسا بھی کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ لوگوں کی تو بیس، بیس سال کے فرق سے بھی شادیاں ہوجاتی ہیں۔ شریعت نے بھی کوئی پابندی نہیں لگائی ہے کہ زوجین کے درمیان عمروں کا اتنا یا اتنا فرق ہونا چاہیے۔" پھپو نے بے نیازی سے جواب دیا تو غوری کا دل مزید ڈوبنے لگا اور یقین ہوگیا کہ ابھی پھپو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہہ کی مثال دے کر سب کو لاجواب کردیں گی۔ اتنی اعلیٰ ہستیوں کی مثال کے بعد بھلا اعتراض کی گنجائش بھی کہاں نکل سکتی تھی۔

"پھپو تو لگتا ہے اپنی طرف سے اس رشتے کو پکا ہی کرچکی ہیں۔" پھپو کے انداز پر ٹیپو نے ہنس کر تبصرہ کیا لیکن اس کی ہنسی میں بھی خوف جھلک رہا تھا۔

"لیکن پھپو چالیس، بیالیس سال کی خاتون کے ساتھ تو صحت کے مسائل بھی شروع ہوجاتے ہیں۔ ہمارے گھر کے اتنے بہت سے کام کرنے میں تو وہ بیچاری تھک جائیں گی۔" شینو نے بھی بھائی کی ہمدردی میں ایک عذر تراشنے کی کوشش کی۔

"کچھ خوفِ خدا کرو میرے بچے...... چالیس، بیالیس سال ہی عمر ہے اس بیچاری کی۔ کوئی ساٹھ، ستر سال کی نہیں ہوگئی کہ بستر پر پڑی ہائے، وائے کرتی رہے۔ تمہاری امی بھی تو آخر پچاس سال سے اوپر کی تھیں اور کیسے پھرتی سے سارے گھر کا کام سنبھالتی تھیں۔ وہ تو بس بیماری ہی ایسی لگی کہ دنوں میں بیچاری چٹ پٹ ہوگئیں۔" بھتیجے کو گھورتے ہوئے وہ مرحومہ بھاوج کو یاد کرتے ہوئے آبدیدہ ہوئیں۔

"کاش امی زندہ ہوتیں تو آج یہ فریضہ وہ ہی انجام دے رہی ہوتیں۔" بہت دیر سے خاموش بیٹھے غوری نے بھی آخرکار زبان کھولی اور ایک سرد آہ بھر کر تبصرہ کیا۔ (امی ہوتیں تو اپنے ولی عہد کے لیے لال چندے آفتاب و چندے ماہتاب دلہن تلاش کرتیں پھپو کی طرح واجبی سی شکل کی چالیس، بیالیس سالہ لڑکی کا رشتہ لے کر تھوڑی آجاتیں)

"کیا باؤلی باتیں کررہے ہو بیٹا! تمہاری امی زندہ ہوتیں تو بھلا ایسی نوبت ہی کیوں آتی۔ آج تک ... نے کبھی کسی عورت کو اپنے لیے سوتن تلاش کرتے ... ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ بھائی جان بھابی مرحومہ سے ... محبت کرتے تھے اور ان کے ہوتے کبھی کسی ... عورت کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اب بھی کہ ... حالات اور میرے اصرار پر مجبور ہوکر عقدِ ثانی ... ہامی بھری ہے......" پھپو نہ جانے کیا، کیا تقریر ... تھیں وہ چاروں تو شرمائے، لجائے سے ... باندھے دیکھ رہے تھے اور یاد آرہا تھا کہ کل ... جوش سے گھوڑی چڑھیانی ویر میرا گھوڑی چڑھیا کا ... رہے تھے لیکن آج کا سچ یہ تھا کہ ویر نہیں ابا ... چڑھنے والے تھے۔

▲▲▲



جانے کو ہے بہار

تحسین اختر

"یار تم دونوں وہی ہو ناں جو چائے کی ایک ... طوفان اٹھا دیا کرتے تھے۔ ہم سب تھک ہار ... تھے، بور ہوجاتے تھے مگر تم دونوں کسی نہ کسی ... پر اس طرح بولتے تھے کہ پھر گھنٹوں تم لوگوں کو ... نہیں کرواسکتا تھا۔ جب تک کہ اس موضوع ... تک اُدھیڑ نہ ڈالتے مگر اب تم دونوں کو کیا ہوگیا ... تم دونوں نے اتنے اہم معاملے پر چپ ... ہے۔ کیوں اپنی، اپنی زندگی کے دشمن بن گئے ہو، کیا اب تم دونوں کے پاس دلائل ختم ہوگئے ہیں کہ ایک معمولی سا مسئلہ تم لوگوں سے حل نہیں ہو پارہا ہے۔" اشعر میرا اور طیبہ دونوں کا مشترکہ کلاس فیلو، بہت اچھا دوست اور اہم ساتھی تھا۔ اور آج مجھے گھیر گھار کر اس ریسٹورنٹ میں لے آیا تھا جہاں پچھلے کئی منٹوں سے وہ بول رہا تھا اور میں اس کو سن رہا تھا۔

"اب بولو بھی ناں...کیا تمہارے پاس لفظ ختم ہوگئے ہیں یا طیبہ درانی سے وہ آفاقی محبت جس نے

تمہیں یوں گنگ کر دیا ہے۔"

"نہ میرے پاس لفظ ختم ہوئے ہیں اور نہ ہی طیبہ درانی سے وہ آفاقی محبت کم ہوسکی ہے۔ مگر یار ان چھوٹے، موٹے گھریلو جھگڑوں نے میری سوچ ضرور زنگ آلود کر دی ہے کہ میں اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا بھی چاہوں تو نکال نہیں پاتا...... ایک طرف ماں ہے، وہ ماں جس نے بیوگی کے قیمتی سال میرے لیے وقف کر دیے، دن رات مجھے اپنی زندگی کا مدار بنائے رکھا۔ وہ روئی تو میرے لیے، وہ خوش ہوئی تو میری خاطر...... اور دوسری طرف وہ لڑکی جسے تم سب جانتے ہو کہ اس نے کیسے مجھے ٹوٹ کر چاہا۔ اپنی زندگی کا ہر لمحہ میری خاطر رکھ چھوڑا۔ اس کا اور میرا کوئی جوڑ نہیں تھا مگر اس نے ایک زمانے سے ٹکر لے کر مجھ سے شادی کی اور اب میری حالت ایسی ہے کہ جس طرح چکی کے دو پاٹوں کے بیچ گیہوں پستا ہے میں ان دونوں کے بیچ ایسے ہی پس رہا ہوں۔" میری خاموشی ٹوٹی تو پھر ٹوٹتی ہی چلی گئی۔

"اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل تو ہوگا ناں......" وہ میرا دوست تھا اور کسی نہ کسی طرح سے وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

"چلو جلدی سے یہ چائے ختم کرو...... پھر اس ریسٹورنٹ سے باہر نکل کر کچھ سوچتے ہیں۔" میں نے اس کی بچوں کی سی ضد دیکھ کر بات کا رخ بدلا تھا۔ اور خواہ مخواہ ہی ہنس پڑا تھا۔

"تم کیوں اپنی زندگی کو مذاق بنا رہے ہو" میں نے اپنی ہنسی اڑائی تھی اور اسے بے حد برا لگا تھا۔

"تو پھر کیا کروں...... ماں کو چھوڑ دوں یا طیبہ کو؟ تم ہی بتا دو، مجھے تو اس مسئلے کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اصل میں دونوں مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہیں اور محبت ماں کی ہو یا بیوی کی اس میں شراکت کوئی بھی برداشت نہیں کرتا۔ ماں پل، پل میرا خیال رکھتی ہے تو طیبہ سے برداشت نہیں ہوتا اور اگر طیبہ میرے اردگرد پروانے کی طرح منڈلاتی ہے تو ماں کے دل کی دھڑکن رک جاتی ہے۔" وہ سنجیدہ تھا مجھے بھی ایک بار پھر سنجیدہ ہونا پڑا تھا۔

"اچھا میرے پاس اس مسئلے کا ایک حل ہے۔"

"وہ کیا؟" اس نے سرگوشی کی تھی اور میرا روال روال کان بن گیا تھا۔ پھر چائے کی پیالیوں پر بالائی کی موٹی تہ جم گئی تھی اور میں اس کی بات سنتا چلا گیا تھا۔

☆☆☆

آج میری تیاری قابلِ دید تھی۔ بلیک تھری پیس سوٹ، جیل سے جمے ہوئے سلجھے ہوئے بال، چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ اور خوشبوئیں اڑاتا میرا وجود، جی ہاں آج میں اپنی شریکِ حیات اپنی محبت طیبہ کو واپس لانے جا رہا ہوں۔ ماں جی بھی بہت خوش ہیں اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے کچن میں کھانا تیار کر رہی ہیں۔ اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ معجزہ کیسے ہوگیا۔ اس معجزے کا گر مجھے میرے دوست ... نے بتایا تھا اور میں اس کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے پریشانی اور ڈپریشن سے نکال کر روشنی میں ... کیا۔ اس نے مجھے ایک ہی بات سمجھائی تھی کہ ماں ... اور مطمئن دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی بیوی کے ساتھ ... کمپرومائز کرو، اس کو تم معتبر کرو گے تو وہ تم سے ... رشتے کو عزیز رکھے گی۔ میں بھی انا پرست تھا ... بھی...... وہ مجھ سے بہل جاتی تھی اور میں اس ... لیکن اس بار میں نے اپنی انا کو چھوڑ کر خود پہل کی ... اس کا نتیجہ بہت شاندار نکلا تھا۔ اس نے خود ماں ... فون کر کے ان سے معافی مانگی تھی اور ماں جی ... دیکھ کر موم کی طرح پگھل گئی تھیں۔ انہوں نے ... کہا تھا کہ میں طیبہ کو گھر لے آؤں۔ اور میں تو ... جان سے تیار تھا اسے گھر لانے میں کیونکہ ... ہی اس نے میرے سیل فون پر لکھ بھیجا تھا۔

جانے کو ہے بہار کہ اب آبھی جایئے
ہاتھوں میں سوکھ جائے نہ گجرا گلاب کا

اور مجھے بہار کے جانے سے پہلے، پہلے ... کے پاس پہنچنا تھا کہ خوشبوؤں اور گلابوں کا ... ساتھ بتانے کا وعدہ تو ہمارا بہت پرانا تھا۔

"نی کلثوم تو یہ بھاگ، بھاگ کر مختاراں مائی کے گھر کیوں جاتی ہے...؟ جبکہ اُس کے پتر نے تجھے ٹھکرا دیا۔ نی تیرا وی کوئی دل ہے کہ نہیں، جھلی نہ ہووے تاں۔ اتنا مہان بننا وی چنگی گل نہیں۔" سکینہ نے آم کی ڈلیاں دھوپ میں رکھتے ہوئے کلثوم کو باتیں سنائی تھیں۔

"بس سکینہ تو نہیں سمجھے گی اگر اس نے مجھے ٹھکرایا تھا تو وہ غلط نہیں تھا۔ مجھ میں رکھا ہی کیا ہے، اچھی شکل

دِل اک اَدھورا چاند

ثمر کاظمی



نہ رنگ ......ایک معمولی لڑکی کا اس سے کیا جوڑ۔''
کلثوم دھاگے کو انگلی پر خواہ مخواہ لپیٹ رہی تھی۔

''وہ مرن جوگا تجھے پہچان نہ پایا ورنہ کلثوم کا دل سونے جیسا ہے اور یہی بات تجھے سمجھاتی ہوں کہ جب تیرا اس سے کوئی ناتا نہیں تو کیوں اپنی جان کی دشمن بنی ہے، مت جایا کر اُن کے گھر۔'' سکینہ کے لہجے میں خلوص تھا۔

''یہ میرے بس کی بات نہیں ہے سکینہ، عشق کی سمجھ اسی انسان کو آتی ہے جو عشق سمجھے۔ میرا عشق چاند اور چکور کی نسبت ہے اور علمدار میری رگ، رگ میں سما چکا ہے۔ خیر تو وی کیا باتیں لے کر بیٹھ گئی، جلدی ختم کر نہیں تو اماں نے آ کر میری کلاس لے لینی ہے۔'' وہ بات بدل گئی تو سکینہ نے ٹھنڈی سانس بھری اور زیرِ لب بڑبڑائی۔

''سیانے ٹھیک کیندے نے 'جیہڑا عشق کرے اور جھلیا ہووے......'' ☆☆☆

کلثوم کو احمد شبیر نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے گود لیا تھا۔ اس کا بچپن بڑے لاڈ میں گزرا تھا۔ احمد شبیر اور غزالہ بی بی نے اس کی ہر خواہش پوری کی تھی لیکن اس وقت ہر خواہش، ہر چیز ختم...... آنکھوں میں جیسے وحشت کے رنگ اتر آتے، جب محلے کی ہر دوسری عورت غزالہ بی بی سے دبی، دبی آواز میں کہتیں۔

''پرائی اولاد پال رہی ہو، چلو اپنی اولاد نہیں ہو رہی تھی تو کسی بہن بھائی کا بچہ لے لیتیں، یہ کیا معمولی شکل کی لڑکی ہے اور ناز اس کے شہزادیوں جیسے اٹھا رہی ہو۔''

''آپا شکلوں میں کیا رکھا ہے اور بہن بھائیوں کی تو بات نہ کریں جب ہم نے کلثوم کو گود لیا تھا تب احمد رکشا چلاتے تھے اور کسی نے ہمیں بچہ دینا گوارا نہ کیا اور انکار کر دیا تھا۔ ہماری کلثوم بڑی بختاں والی ہے جس دن سے اس کے قدم ہمارے گھر میں پڑے ہیں، ہمارے حالات ہی بدل گئے ہیں ورنہ کھٹارا رکشے سے گاڑیاں ہماری قسمت میں کہاں تھیں۔'' غزالہ بی بی محبت سے کہتیں۔

بچپن گڑیاں کھیلتے گزرا لیکن کلثوم کے مقدر کا سکہ کھوٹا ہی نکلا۔ معمولی سی شکل صورت، سانولی رنگت...... بس ایک چیز تھی جو اسے پُرکشش بناتی اور وہ تھا۔ اس کے چہرے کا تل جو عین ٹھوڑی پر تھا۔

وقت جتنی تیزی سے گزرتا ہے اتنی ہی لڑکیوں کو بیاہنے کی ماں باپ کی فکر بڑھتی جاتی ہے۔ جوان بیٹی سینے پر دھری سل کے مانند ہوتی ہے۔ غزالہ بی بی اور احمد شبیر کی بھی راتوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ کلثوم کے رشتے تو بہت آئے مگر صرف دولت پانے کی چاہ میں۔

''ہماری کلثوم کا کیا ہوگا غزالہ......؟'' احمد شبیر فکر مندی سے کہتے۔

''رب سوہنا خیر کرے گا، آپ پریشان مت ہوں۔'' وہ تسلی کے دو حرف تھماتی۔

''واقعی ہم کیوں اللہ کی رحمت سے مایوس ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بندوں کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا۔'' وہ مسکراتے۔

اندھیرے کی سیاہی بڑی ہولناک ہوتی ہے اور اس کا پتا تب ہی چلتا ہے جب یہ آپ کے آنگن کی روشنی کھا جائے، احمد شبیر کی ہارٹ اٹیک سے ہونے والی موت سے غزالہ بی بی کے آنگن میں اندھیرے کی چادر جیسے پر پھیلا کر اتر آئی۔ ہر اندھیرے کو کاٹنے کے لیے روشنی کی ایک کرن کافی ہوتی اور اس وقت کلثوم نے [illegible] معنوں میں بیٹی ہونے کا حق ادا کیا۔ اس نے اپنے آنسو ضبط کے دامن میں چھپائے اور ماں کی ہمت بندھا کر کھڑی ہو گئی۔ احمد شبیر کے بعد غزالہ بی بی زیادہ عبادت میں مصروف رہتی اور کلثوم نے وقت گزاری کے لیے مختاراں مائی کے گھر سلائی سیکھنے کی ٹھانی اور اس کی زندگی کے نئے دور کا باب شروع ہوا۔ مختاراں مائی کا [illegible] علمدار جسے وہ پیار سے گڈو کہتی تھی، کلثوم کو وہ اچھا لگا [illegible] پھر یوں ہوا یہ پسندیدگی، محبت میں ڈھل گئی اور [illegible] کہتے ہیں عشق و مشک چھپائے نہیں چھپتے۔

''کلثوم تجھے ڈر نہیں لگتا۔'' سکینہ اس کی [illegible] سہیلی اس کی باتیں سن کر گھبرا جاتی۔

''لگتا ہے ڈر مگر رسوائی سے نہیں اسے کھو [illegible] ڈر لگتا ہے سکینہ۔'' اور جب اس عشق کی خبر علمدار کو [illegible]

تو وہ انجان بنا رہا کیونکہ اس کی ڈکشنری میں محبت کی گنجائش نہیں تھی، اس کے خواب تھے۔ اس چھ مرلے کے گھر سے بڑے گھر میں نقل مکانی کرنا، وہ باپ کو کریانے کی دکان سے کسی اچھے مکان میں آرام دہ زندگی دینا چاہتا تھا۔ وہ پنجاب یونیورسٹی سے ایم فل کر رہا تھا اور کلثوم کیا تھی صرف میٹرک پاس......

''تو اس سے کہہ کر تو دیکھ کہ تجھے اس سے محبت ہے۔'' مائی مختاراں کو دیکھ کر سکینہ سرگوشی میں بولتی۔

''وہ انجان نہیں ہے۔'' کلثوم یقین سے کہتی۔

''پھر بھی بے نیاز بنا پھرتا ہے۔'' سکینہ حیرت سے کہتی۔

''کیونکہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا اور محبت خراج نہیں مانگتی، مجھے اس بات پر قطعاً حیرت نہیں کہ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔'' کلثوم کے اس طرح کہنے پر سکینہ جھلا جاتی۔

''پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہے تو، مجھے شاکر ایک دن نہ دیکھے یا بات نہ کرے تو مجھ سے کھانا ہضم نہیں ہوتا۔''

اس نے اپنے منگیتر کا نام لیا اور کلثوم ہنس دی۔ ایک دن جب سکینہ، شاکر کی ٹانگ ٹوٹنے پر اس کی مزاج پُرسی کے لیے گئی تو کلثوم کو اکیلے ہی آنا پڑا۔ مائی مختاراں بھی اس دن کسی کام سے چھوٹے بازار گئی ہوئی تھی۔ علمدار، بان کی چارپائی پر لیٹا کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا، آہٹ پر چونک کر کتاب سے نظریں ہٹائیں اور سیدھی کلثوم پر جا پڑیں۔ ایک لمحے کے لیے کلثوم کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ علمدار کا یوں اسے تکے جانا وہ گھبرا گئی اور منڈیر پر دانے چگتی چڑیاں چہچہا کر اڑی تھیں گویا محبت کی فتح پر جشن منا رہی ہو......

کہتے ہیں مرد کو اپنے تاثرات پر قابو پانے میں کمال ہوتا ہے۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی علمدار نے ایک دم بے تاثر لہجے میں کہا۔ ''اماں گھر پر نہیں ہیں۔'' اور پھر سے کتاب میں گم ہو گیا۔ کلثوم نے حسرت سے مڑ کر اس کی

طرف دیکھا اور اس وقت اسے سکینہ کی باتیں یاد آئیں۔ واقعی محبوب کی توجہ پانا کسی جنت سے کم نہیں ہوتا۔

غزالہ بی بی زیادہ دن تک بے خبر نہ رہ سکی۔ انہیں بیٹی کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو چکا تھا۔ ان کے درمیان روایتی ماں، بیٹی کا تعلق نہیں تھا۔ وہ دونوں اچھی دوست بھی تھیں۔

''اماں کیا عشق میں ہر کوئی مل جاتا ہے؟'' وہ غزالہ بی بی کی گود میں سر رکھے لیٹی پوچھ رہی تھی۔

''عشق سچا ہو تو منزل مل ہی جاتی ہے۔'' انہوں نے محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ غزالہ بی بی نے بیٹی کا رشتہ خود جا کر مختاراں مائی کو دیا۔ اور کیا، کیا نہ باتیں سننا پڑی انہیں۔

''کیا زمانہ آ گیا ہے خود رشتہ دے آئی، بیٹی کو اتنا گرا دیا۔ خیر اس کی کون سا سگی بیٹی ہے۔'' ایسی باتیں ان کے کانوں میں پڑتیں تو کلیجا منہ کو آ جاتا پر انہیں بیٹی کی خوشیاں عزیز تھیں۔

اور مختاراں مائی کے گھر سے انکار ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ وہ بھی احمد شبیر کی طرح بیٹی بیاہنے کی حسرت دل میں لیے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اس وقت کلثوم پر جیسے سکتہ طاری تھا۔ کوئی کہتا علمدار کے انکار کی وجہ سے اور کوئی کہتا ماں کے بچھڑنے کا غم اور کلثوم بیچاری چپ......

اس واقعے کے بعد علمدار ماں، باپ کو لے کر لاہور شفٹ ہو گیا اور کلثوم نے جان لیوا تنہائی سے گھبرا کر گھر میں ہی چھوٹا سا اسکول کھول لیا جہاں وہ پانچویں جماعت تک کے بچوں کو پڑھاتی۔

وقت دبے پاؤں گزرتا گیا، زخم سلتے گئے پر کچھ زخم ناسور بن جاتے ہیں۔ وہ علمدار کو نہیں بھول پائی تھی اور بھولا تو علمدار بھی نہیں تھا۔

ہاں وہ بھی کلثوم کے عشق میں مبتلا تھا پھر اس نے انکار کیوں کیا تھا؟ سوچنے کی بات تھی اور اس سے زیادہ سوچنے کی بات تھی کہ جاتے سے اپنے گھر کی چابیاں مائی مختاراں نے کلثوم کو تھمائی تھیں اور وہ باقاعدگی سے ان کے گھر جاتی تھی...... واقعی عشق جو کرتا ہے وہ جھلا ہوتا ہے۔

☆☆☆

غمزدہ سا جینے سے
زہرِ عشق پینے سے
سانس لگتی ہے دشوار
مجھ کو اب تو جینے سے
کچھ پرانے خط نکلے
عشق کے دفینے سے

''یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ میں نے انکار کیوں کیا تھا۔ سو تمہیں بھی یہ بات پتا ہونی چاہیے اس لیے کہ تم بہت خاص ہو۔'' وہ اس کے سامنے بیٹھا کہہ رہا تھا اور کلثوم سن رہی تھی۔

''میں خود تمہارا ہاتھ مانگنے تمہارے گھر آتا جب میں کچھ بن جاتا۔ کسی قابل ہو جاتا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی یہ سمجھے کہ تمہاری دولت کی خاطر میں نے تمہیں اپنایا۔ کیونکہ لوگوں کو یہی لگتا کہ ہمارا جوڑ نہیں اور میں نے تم سے شادی دولت کی خاطر کی۔ مجھے تو اس وقت سے تم سے محبت ہو گئی تھی جب میں نے تمہارا یہ تل دیکھا تھا۔'' اس نے خوامخواہ چائے کی پیالی منہ سے لگائی جبکہ چائے تو کب کی ختم ہو چکی تھی۔ کلثوم مسکرائی۔

''اور ہاں تم بہت خاص ہو مجھے تم سے محبت ہے گو کہ اس بات کو کہنے میں تین سال لگ گئے پر تم بات کہنے میں اتنے سال مت لگا دینا ورنہ منہ میں نقلی دانت ہوں گے اور اس وقت ہم شادی کرتے ہوئے اچھے نہیں لگیں گے۔'' اس نے اپنے ہاتھ کلثوم کی طرف بڑھائے اور کلثوم نے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ دل کے ادھورے چاند کو پورا ہو جاتا۔ خاکستری رنگ کی چڑیاں شور مچاتی آنگن میں اتریں اور دل کا ادھورا چاند جیسے پورا ہو کر چمکنے لگا۔

''اماں سچ کہتی تھیں عشق سچا ہو تو منزل ضرور ملتی ہے۔'' کلثوم نے مسکرا کر سوچا اور شرم سے سر جھکا لیا۔

ت سے تکون

افسر سلطانہ



ہوا میں خنکی سرِ شام ہی بڑھ گئی تھی نمو کو یہ موسم بہت پسند تھا...... موسم سے بڑا منصف اس کی زندگی میں آیا ہی کب تھا...... جتنا امیر کو فیضیاب کرتا تھا اتنا ہی نمو مزے اٹھاتی تھی، وہی پتلی سی قمیص ......وہی اُدھڑا سا سوئٹر جو کبھی اس کی ماں پہنتی تھی......اب اس کا ہو گیا تھا۔ اب اس کی ماں، بیگم صاحبہ کی دی ہوئی بد رنگی شال کو اوڑھ کر کام پر جاتی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کو پرے ہٹا نمو تیز، تیز ہاتھوں سے گھر کا سارا کام سمیٹ

کر ٹاٹ کے پردے سے اُس پار جھانکنے لگی۔ سڑک کے دوسری طرف بڑی چہل پہل تھی...... اُدھر خوب صورت کوٹھیاں اور اِدھر جھونپڑیاں...... اُدھر امارت ڈولتی تھی...... اِدھر غربت ادھیڑتی تھی...... وہاں عیاشیاں یہاں مایوسیاں...... بالکل سامنے کی نیلی کوٹھی میں اس کی ماں صبح سات بجے سے شام چھ بجے تک کام کرتی تھی۔ بیگم صاحبہ کے مہمانوں کی آمد اس کے بوڑھے وجود میں حرارتیں اور توانائیاں اتار ڈالتی تھی۔ یہ اوور ٹائم ہوتا تھا جو اسے اچھے کھانے کی صورت میں مل جاتا تھا۔ اس کی بیگم صاحبہ آتے وقت بہت سا کھانا فریزر میں رکھوا کر اسے بھی دے ڈالتی تھی۔ واپسی میں وہ یہ کھانا نمو کو پکڑاتے پکڑاتے بیٹے کی یاد ضرور دلا دیتی اس تاکید کے ساتھ کے سب کچھ بیٹے کے لیے رکھ چھوڑ۔ اس کے بیٹے کو دال سبزی سے نفرت تھی۔ وہ گوشت اور بہترین کھانے کا شوقین تھا جسے پورا کرنے کے لیے اس بوڑھے اور کمزور وجود کو صبح سے شام تک محنت کرنا پڑتی تھی۔ نمو ماں کی اس تفریق پر جھنجلا جاتی...... جھگڑ پڑتی پر بھائی تھا اور محبتوں میں بہنوں کا کوئی ثانی نہیں ہوتا...... وہ بے دریغ بانٹتی ہیں، بلاشبہ سب کچھ لٹانے کو تیار رہتی ہیں لیکن محبت میں بھی برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ بھائی سے بے انتہا پیار تو اسے بھی تھا...... چاہتی تو وہ بھی بہت تھی...... اس لیے جہاں تنقید کرتی وہاں خاموش بھی ہو جاتی تھی۔

وہ پردہ سرکا کے دیکھتی چلی گئی...... عجیب سی رونق کے ساتھ...... کہیں، کہیں چراغاں بھی تھا...... اور تو اور اماں جس کوٹھی میں کام کرتی تھی وہاں دیے بھی جل رہے تھے۔ ٹمٹماتے جھلملاتے دیے جو کانپتے، کانپتے پھر بھڑک اٹھتے تھے...... نمو کو محسوس ہوا یہ روشن، روشن دیے اس کے کمزور وجود میں اترتے جا رہے ہیں...... اس کی بے رونق زندگی میں نور بھر رہے ہیں، وہ اپنی دنیا سے بے خبر ہو گئی۔ کسی اور ہی جگہ...... کسی اور ہی جہاں میں...... جہاں سکھ چین دائمی قلبی سکون اس کا منتظر تھا۔

''اب کیا تانک جھانک میں لگی ہے نمو......''

ماں نے ایک نہیں کئی آوازیں دیں پر نمو اپنی دنیا کی کہکشاں میں ایسی گم ہوئی کہ کچھ سنائی ہی نہیں دیا۔

''نمو کان بند ہیں کیا؟ خواہ مخواہ جھانک رہی ہے...... اِدھر آ جا...... میں تھک گئی۔ لفافے بنانے میں آمد دکر......'' ماں کے تقریباً چیخنے پر وہ پلٹ آئی

''اماں......'' وہ قدرے دور بیٹھتے ہوئے عادتاً مسکرائی۔

''تمہاری بیگم والی کوٹھی میں جلتے دیے بہت اچھے لگ رہے ہیں...... پوچھنا کس لیے جلائے تھے۔'' اس نے گوند کا پیالہ اپنی طرف کھسکایا۔

''پوچھنا کیا، مجھے معلوم ہے......'' ماں نے انداز میں بیٹی کو دیکھا...... ''سارے دیوں میں تیل ہی ڈال کر آئی تھی۔''

''بیگم صاحبہ کی سالگرہ ہو گی۔'' اس نے اندازہ لگایا۔ لفافے کو سختی سے بند کیا اور ماں کی طرف کے سے انداز میں پھینکا۔

''نہ......'' ماں کو نمو کا یہ انداز پسند تو نہ آیا مگر ضبط کر گئی...... نمو بہت کام کی لڑکی تھی...... البتہ پھٹکار کے بعد ایک آدھ گھنٹا کام کا وقفہ ضرور ہوتا تھی اور اس وقت ماں یہ رکاوٹ برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

''نہ......'' ماں مسکرائی۔ ''بیگم صاحبہ بتا رہی تھیں اس دن آزادی کا فیصلہ ہوا تھا۔''

''کیسی آزادی اماں؟'' اس نے لفافوں میں مزید گوند چپکایا۔

''آزادی کا پیچھا چھوڑ...... لفافے ختم کر بھائی کے لیے گرم روٹیاں ڈال دے...... آ کر بھوک لگ جاتی ہے، مجال ہے جو دو منٹ بھی رک لے...... چیخیں مارنے لگتا ہے۔'' ممتا کے نور سے چہرہ جگمگا اٹھا...... نمو نے اس بات کو اتنی اہمیت نہ دی البتہ پھر آزادی کے بارے میں سوال داغا۔

''اماں یہ کیسی آزادی ہے؟'' وہ لفافے کے ٹین کے ڈبے سے آٹا نکال کر پلٹی۔

''مرد، لڑکیوں کو پڑھنے نہیں دیتے......

کے بھاگ جائے اس کے گھر کی عورتوں کو بے لباس کر گلیوں میں گھماتے ہیں...... کوئی احتجاج نہیں...... نہیں کرسکتا اس لیے کہ اسے بھی اسی محلے رہنا ہے...... لہٰذا وہ خاموشی سے اپنے گھر سدھارتا...... استاد کو نصیحت کرنے پر ہاتھ پیر توڑ کر بستر پر لٹا تا ہے...... اب وہ عمر قید کا مریض بن کر بے کسی کی زندہ لاش بن جائے، اس کے بچے بھوک تڑپیں...... انہیں اسکولوں سے اٹھوا لیں...... کسی کو ں آئے نہ ہمدردی...... اور اماں تمہیں کیا معلوم زاد ملک میں غریب عورتوں کو چوری کے شک دالت میں ڈلوا کر نازک اعضا میں مرچیں بھروا ن سے وہ الزام بھی اقرار کروا لیا جاتا ہے جو نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا...... یہ کیسا آزاد ملک '' وہ تسلسل سے بولتی چلی گئی...... جیسے ایک، ایک بر کرتی رہی ہو۔

اب باری اماں کے گھورنے کی تھی...... وہ چند تک تو حیرت سے اپنی بیٹی کا منہ دیکھتی رہی...... نے کب سوچا تھا، اس کی بیٹی یوں بولے گی اور وہ اتنا کھرا، کھرا سچ کہ غیرت والا تو ڈوب کر ئے...... پھر اچانک ہی وہ غرائی کہ اگر ایسی ں کی زبان کھل جائے تو پھر آہستہ، آہستہ قیامت جاتی ہے......

''چپ چاپ روٹیاں ڈال...... گدی سے زبان کھینچ تیری۔'' وہ تیزی سے ہاتھ چلاتے ہوئے بولی۔

''بڑا منہ کھل گیا ہے تیرا...... بند کر اپنی فرحت کے ہاں جانا...... جب سے تو نے وہاں نوکری کی ں بہت چل پڑی ہے اور زبان بھی تیز ہو گئی ہے۔ ایسی بات کی تو جوتے مار، مار کر حلیہ بگاڑ دوں ماں کے تڑ، تڑ بولنے پر وہ وہاں سے باورچی کی طرف جا بیٹھی۔

''لو پک گئیں روٹیاں اور کوئی حکم......'' نمو دیر تو قدرے روٹھی تھی۔ ''آپ کے شہزادے کے...... مرغی کی تین بوٹیاں تھیں...... سالن بنا دیا ہے، کھا لے گا ناں شوق سے۔''

''بیٹا۔'' ماں کو بھی ترس آ گیا...... یہ ماں بھی کیا چیز ہوتی ہے...... سارا پیار ڈھیر سی شفقت لیے اولاد کو خامیوں سمیت چاہتی ہے...... چاہے اس کی غلطی ہو نہ ہو...... اور نمو تو اس کی بڑی اچھی بیٹی تھی...... کپڑے بھی سیتی تھی اور اب فرحت باجی کے ہاں نوکری کر کے اپنے بھائی کا دوزخ بھی پال رہی تھی۔

''تو ابھی نہیں سمجھے گی نمو......'' ماں نے اسے خود سے قریب کر لیا۔ ''بیٹوں کے لیے یہ سب کرنا پڑتا ہے...... انہیں اپنا بنانا پڑتا ہے بیٹا...... انہیں اہمیت دینا پڑتی ہے...... ان کے ساتھ سختی کرو تو وہ ہم سے دور ہو جاتے ہیں، اپنا بنانے کے لیے دانہ ڈالنا پڑتا ہے...... اگر اسے گوشت پسند ہے بیٹا تو اس کے لیے سالن گوشت کا ہی بنا دیا کر...... خواہ دو بوٹیوں کا ہی ہو...... اور تو...... تو اپنے لیے سالن ختم ہونے پر چٹنی سے روٹی کھاتی ہے کھا لیا کر...... اس میں کوئی نقصان نہیں۔''

''اس سے کوئی فائدہ بھی ہے؟'' وہ اب ماں کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بولی تھی۔

''فائدہ ہے بیٹا......'' ماں کی اندر دھنسی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

''یہ محلے کے گندے غلیظ لوگ...... جن کی آنکھوں میں ہر وقت خباثت ناچتی ہے۔ یہ اوباش غنڈے جہاں دیکھتے ہیں کہ باپ ہے نہ بھائی جینا حرام کر دیتے ہیں، ہم سے اس لیے دبتے ہیں کہ تیرا بھائی ہے ورنہ اور دوسری لڑکیوں کی طرح تیرا جینا اور پھرا کیلے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی بنا دیں۔ شکر کہ وہ تیرا بھائی ہی ہے جس کی وجہ سے ہم گہری اور پُرسکون نیند سوتے ہیں۔ ورنہ رت جگے کرنے پڑیں۔'' ماں کی مصلحتیں نمو کی سمجھ میں مشکل ہی سے آتی تھیں...... ''تو فرحت باجی کی باتوں میں نہ آیا کر۔'' پر ماں نہیں جانتی تھی اس کے شکوے بھی تو بہت تھے، لاتعداد تھے...... بے شمار تھے۔ بھوک کے، کام کے نفرتوں کے، تفریق کے، گھٹن کے، غلامی کے۔ وہ فرحت باجی کی صحبت میں رہ

کر برابری میں الجھ گئی تھی...... ان کا پیار بھرا سلوک، ہمدردی اور محبت نے نمو کو سنوار سا دیا تھا...... پر اس سنوارنے میں نمو خود کہیں کھو سی گئی تھی...... اس کا اپنا حلقہ اور فرحت باجی کی دنیا میں جس طرح زمین آسمان کا فرق تھا اسی طرح نمو کی شخصیت میں عجیب سے اتار چڑھاؤ حلول کر گئے تھے۔

''بتاؤ اماں...... فرحت باجی کیا غلط کہتی ہیں؟'' وہ ماں کا بازو پکڑ کر چھوڑنا بھول گئی۔ اس کی آنکھوں میں آئی نمی ماں سے چھپ نہ سکی۔ ''تم بوڑھی ہو کر کماری ہو، بساط بھر میں بھی کچھ نہ کچھ کر دیتی ہوں...... دو دن میں ایک جوڑا تو ہو ہی جاتا ہے...... فرحت باجی کے پیسے اس کبوتر خانے کا کرایہ ادا کر دیتے ہیں...... ان کے دیے ہوئے کپڑوں سے میں عام ماسی نہیں لگتی۔'' وہ تو اندر سے بڑی تلخ ہو گئی تھی۔ کڑوی بھی کسیلی بھی...... راستے میں کئی دفعہ راہ چلتی عورتوں نے پوچھا۔ ''بیٹی کون سی کلاس میں پڑھتی ہو؟'' اس کی آنکھوں میں بہت سے دیے روشن ہو جاتے۔

''اماں کیا جوان بیٹے کا فرض نہیں کہ وہ بھی کمائے...... کیا مجبوری ہے...... چھ فٹ کا تندرست جوان...... تم نے اس کا پیٹ بھر کر ہڈ حرام بنا دیا ہے...... لگ کر کام نہیں کرتا، اماں کبھی، کبھی مفت میں کسی کا پیٹ بھرنا بھی فائدہ مند نہیں ہوتا...... اصل میں بھائی کو مفت کی روٹیوں کی عادت پڑ گئی ہے...... اور اب تم نہیں دو گی تو وہ شہر میں بٹنے والے کسی دستر خوان پر جا بیٹھے گا......'' اب کی بار نمو...... کی آنکھ کے آنسو اندر نہ رکے...... ضبط کا بند توڑ کر باہر نکل آئے پھر نہ سمجھانے والی ماں کی حیثیت رہی نہ بولنے والی نمو کی......

☆☆☆

کبھی، کبھی بہت کچھ ایسا ہو جاتا ہے کہ باوجود ہماری قربانیوں کے، خدمتوں کے...... سامنے والا پل بھر میں اُدھیڑ کر پچھاڑ کر رکھ دیتا ہے...... سمجھا دیتا ہے کہ ہماری حیثیت کیا تھی اس کے سامنے...... ماں تھی

سہم کر رہ گئی۔ لمحے بھر میں احساس ہوا کہ وہ تو
بے حس بیٹے کی ماں تھی...... جو اس کا ساتھ د...
تھی۔ بیٹی کی تو اس نے قدر ہی نہیں کی اس کو تو
ہی ذلیل وخوار کرتی آئی تھی، ناقدری کرتی ر
ماں کا چہرہ دکھ سے سفید پڑ گیا۔ گزرے دنوں
کے ساتھ سیاہی مائل ہوتا چلا گیا...... بیٹا لا
میں بگڑ کر رہ گیا تھا...... بیروزگاری کے باو
کے لیے اڑ گیا تھا...... ماں تو اس سے یہ بھی
کہ بہن کنواری ہے، جوان ہے، جو جذبات
اس کے ہیں، وہ بھی انہی سے مالا مال ہے
آنکھیں دکھا، دکھا کر غرا، غرا کر جو للکار رہا
زبان کھول ہی نہیں سکی کہ پہلے اپنی بہن کے
کر دے...... بعد میں اپنے سر پہ سہرا سجا لے۔
اور اگر وہ زور زبردستی کرتی بھی تو شبیر
نہیں تھا۔ جلدی سو جلدی بھی لڑکی وا
نہیں تھے۔ چند دن ماں کی تسلی کے لیے
تھے...... کچھ مہلت تو ملی پر وہ تو بھگا لانے کو تیار
لڑکی بھی راضی تھی۔ بھاگنے والی کی گھر کی
ماں ان کے در پر بھکاریوں کی طرح
خدمت کرنے کا وعدہ...... لاڈ اٹھانے کا
بھگوڑی بننے والی کی عزت رہ گئی۔
ہم جن پر احسان کرتے ہیں، جن
انا، عزت، خودداری پسِ پشت ڈال د
ہمیں اگلے لمحوں میں ایسا سبق بھی دے ڈا
عقل قائم رہتی ہے نہ ہوش وحواس...... ماں
بہت یقین، اعتماد کے ساتھ کہ بہو کی خوا
ہے...... بڑی چاہ اور ارمانوں سے بیاہ کر
ویسا ہی بھرپور محبتوں والا رویہ ملے گا......
ہو سکا۔ ہو سکتا تھا اگر بیٹا سمجھدار ہوتا......
رشتوں میں توازن قائم رکھتا...... پر بیوی
کی طرح پہلی بار ہی ملی تھی اور نادان کی
نہیں آئی تھی کہ اگر وہ بہن اور ماں کو
عزت نہیں دے گا تو آنے والی نئی نویلی

میں پہننے میں دیر نہیں لگائے گی۔ یہی ہوا بیٹے کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر اسے اگلے دن ہی پتا چل گیا تھا کہ اس گھر میں بہو بن کر نہیں مالکن بن کر رہنا ہے۔ ساس اور نند کا کلیجا چھلنی کرنا ہے...... ورگت بنانی ہے، چٹکیوں میں مسل ڈالنا ہے۔ ماں نے اب تک کی تمام تکالیف، مصیبتیں، پریشانیاں، دکھ...... غربت میں بہادری کا دامن تھامے رکھا تھا...... وہ مضبوطی سے اپنے مرکز پر جمی ہوئی تھی۔

لیکن بے عزتی نہ سہہ پائی...... بہو کے ساتھ تو بیٹا بھی ساجھے دار تھا۔ جس دن نمو پر ہاتھ اٹھایا ماں حمایت میں بولی تو کچرے کا ڈبا ماں پر ہی دے مارا...... رہی سہی کسر چھری سامنے لا کر پوری کی۔ ماں اس رات بہت سے آنسوؤں سمیت سو تو گئی پر اگلی صبح اٹھی نہیں...... ہاں البتہ چار کندھوں کو خود کو اٹھانے کی اجازت دے دی تھی۔

نمو نے چیخ، چیخ کر اس وقت تو پورا محلہ جمع کر لیا تھا...... سب آ بھی گئے، غریبوں کا محلہ تھا...... پل بھر میں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہی...... پر مستقل اِدھر اُدھر آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں تھا۔ سناٹے، خاموشیاں، تنہائیاں جیسے اس کا مقدر بن گئی تھیں۔ فرحت باجی کی واحد رشتے دار اُن کی پھوپی کا بھی انتقال ہوا تو وہ پندرہ دن پہلے ہی سے لاہور میں تھیں۔ لہٰذا وہ گھر ہی میں قید تھی۔ گھر کے سارے کام کی ذمے داریاں بھابی نے اس پر ڈال دی تھیں۔ نمو نے کچھ کھایا یا نہیں...... رات بیٹھ کر گزارتی ہے یا تمام رات آنکھوں میں کاٹتی ہے، کسی کو واسطہ تھا نہ سروکار...... کوئی بھی تو پوچھنے والا نہیں تھا۔ بھائی بھاوج اپنی دنیا میں مگن تھے، پہلے بھی، اب بھی...... دن تو اس کا کام میں کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتا تھا، وہ ساری رات میں کئی بار اٹھ بیٹھتی...... ٹپ، ٹپ گرنے والے آنسو مستقل اس کا تکیہ بھگوتے رہتے۔

بھابی پلنگ پر بیٹھے، بیٹھے ڈھیروں کام کروا کر بھی خوش نہیں ہوتی تھی...... نمو کو ماں بہت یاد آتی تھی۔ کام تو وہ بھی کرواتی تھی لیکن ہڈی، ہڈی اس کی بھی دکھ جاتی

غزل

بہار آئی ہے تم بھی آؤ گلاب رت ہے
ذرا تم بھی مسکراؤ گلاب رت ہے
میں کب سے بال بنائے بیٹھی منتظر ہوں
گلاب بالوں میں آ سجاؤ گلاب رت ہے
گلاب رت میں تو پھول کھلتے ہیں چاہتوں کے
تم اپنی چاہت کے گل کھلاؤ گلاب رت ہے
کئی دلوں کو خزاں نے تاریک کر دیا ہے
تم ان دلوں میں دیے جلاؤ گلاب رت ہے
خزاں رتوں میں جو پھول شاخوں سے گر گئے ہیں
انہیں بھی اپنے گلے لگاؤ، گلاب رت ہے
ہما کھلاؤ وفا کی کلیاں ہر ایک دل میں
ہر ایک کو ہمنوا بناؤ گلاب رت ہے

شاعرہ: سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا

بچپن نہ مانگو

وہ کچ بچے، وہ بستہ لڑکپن نہ مانگو
وہ کشتی وہ گڑیا وہ بچپن نہ مانگو
زہر سے شہر کی فضا بھر گئی ہے
وہ بارش کا پانی وہ ساون نہ مانگو
سنو نہ تلاشو...... وہ نانی پرانی
کہانی کے سچ کا یوں ضامن نہ مانگو
نہ بڑھیا ملے گی نہ چہرے پہ جھریاں
بہاروں کی رت سے وہ چھاگن نہ مانگو
خزاں کے قہر سے جو اجڑے کھڑے ہیں
پھلوں سے بھریں اُن سے دامن نہ مانگو
ہر اک چشم میں ہیں ہوس کے نظارے
یہاں بھولا بھالا سا ساجن نہ مانگو
بہت ہے بھیانک اب بچپن کا نقشہ
دکھوں سے بھرا چھوٹا آنگن نہ مانگو

شاعرہ: طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی

تھی۔ دونوں ماں، بیٹی مل کر زندگی کی گاڑی دھکیل رہی تھیں۔ پر اب تمام کا تمام بوجھ نمو کے کندھوں پر تھا۔ اب وہ فرحت باجی کو یاد کر رہی تھی جو جانے کب واپس آتیں۔ نمو اندر ہی اندر پگھل کر ختم ہوتی جا رہی تھی...... مدھم، مدھم سلگ رہی تھی۔ کچھ دنوں میں وہ یقیناً دکھ سمیٹتے، سمیٹتے ماں کے پاس پہنچ جاتی اگر فرحت باجی نے اچانک ہی اس دن دروازہ نہ کھٹکھٹا دیا ہوتا، ان کا چھوٹا بیٹا بیمار تھا۔ نہ بڑے بیٹے کو توجہ سے سنبھال پا رہی تھیں نہ گھر کے کام کاج ڈھنگ سے ہو رہے تھے۔ فرحت باجی کے کام پر بھائی نے نہ پہلے احتجاج کیا تھا اور نہ اب اعتراض تھا۔ البتہ بہت خیال رکھنے والی بھابی نے نخرے دکھا کر پانچ ہزار والی تنخواہ سات ہزار کروا کے دم لیا۔ ماں کے مرنے کے بعد شبیر نے ٹھیلا تو لگا لیا تھا لیکن گھر کا خرچ اس کی بیوی کے مطابق تنگ تھا اور سب سے زیادہ خرچ نمو کے برش اور صابن پر ہی آتا تھا بقول اس کے۔

نمو کی پہلی تنخواہ ہی بھاوج نے جہیز کے نام پر ہتھیا لی...... جہیز تو نہ بنانا ہی بننا تھا پھر نجمہ کی بہنوں کی خوب، خوب دعوتیں ہوئیں پکنک منائی گئیں اور نمو کی تنخواہ، خون پسینے کی کمائی یونہی غرق ہوتی رہی۔ نمو نے چپ سادھ لی تھی...... ایک لفظ بھی نہیں نکالتی تھی۔ اس نے خاموش رہنا سیکھ لیا تھا۔ ماں کے سامنے جتنی زبان چلتی تھی اب وہ اتنے ہی لب بند کیے رہتی...... ہاں اگر ایک لفظ بھی نکالتی تو بھائی آگ بگولا ہو کر ایسی مٹی پلید کرتا کہ محلے والے بھی انگشت بدنداں رہ جاتے۔

نمو کو کم از کم فرحت باجی کے ہاں ہر طرح کا سکون تھا اور نہیں تو کم از کم بھابی کے طعنے تشنے اور ہر وقت کی خدمت گزاریوں سے نجات ملی ہوئی تھی۔ فرحت باجی اسے زبردستی کھانا کھلا کر بھیجتی تھیں۔ رات کو وہ تھکی ماندی گھر جاتی...... اگلی صبح پھر وہی منزلیں اور وہی راستے...... زندگی کا وقتی سکون ہمیں مستقبل کے آنے والے بھونچال سے بے خبر رکھتا ہے...... کل کیا ہونے والا ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

کل تو بہت دور آنے والے اگلے لمحے کی خبر نہیں ہوتی اگر ہم اپنی زندگی میں آنے والے لمحوں سے ناشناسائی رکھتے ہیں تو یہ قدرت کی طرف سے ہمارے لیے ایک انعام ہے...... ایک رحمت...... ایک عافیت...... چند لمحوں بعد کیا ہونے والا تھا۔ فرحت باجی کو خبر تھی نہ نمو آشنا......

بخار تو یوں بھی عام ہی ہو جاتا ہے، پر یہ کیسا بخار تھا...... دو سال کے منے کو 104 اور پھر...... کسی طرح کم نہیں ہوا...... فرحت باجی کے ساتھ نمو بھی حیران و پریشان ایک کمرے سے دوسرے میں پھرتی رہی۔ فرحت کے میاں حیدر آباد میں تھے۔

''باجی...... ارشد بھائی کو مطلع کر دیں...... منا تو نڈھال ہو رہا ہے۔'' نمو ٹھنڈے پانی کی پٹیاں تو ساری رات ہی رکھتی رہی تھی۔

''سوچ رہی ہوں دوبارہ فون کروں...... ویسے وہ چل پڑے ہیں۔'' فرحت باجی پریشانی سے پرس میں سے پیسے نکال کر دوبارہ گنتے ہوئے بولیں...... مہینے کا آخر تھا یوں تو اُن کے...... میاں زندگی کے شادی شدہ سالوں میں زبانی بڑی محبتیں جتاتے آئے تھے لیکن اکاؤنٹ کبھی جوائنٹ نہیں رکھا...... پیسے کا لین دین ہمیشہ سے اپنے ہاتھوں میں ہی رکھا...... نہ شادی کے شروع سالوں میں نہ اب دس سال گزرنے کے بعد...... ایک، ایک پیسے کا جب حساب مانگتے تو لگتا کہ سالانہ آڈٹ کی جگہ روزانہ آڈٹ ہو رہا ہے، آفرین تھی فرحت باجی پر صبح سے شام تک ایک، ایک پیسہ کاپی پر لکھ کر روزانہ میاں کے حوالے کرتی رہی تھیں کیونکہ اگر اٹھنی، روپیہ بھی کم پڑ جاتا تو وہ ماں، بہن ایک کرنے کے عادی تھے۔

''میں منے کو سامنے والے اسپتال سے دکھا کر آتی ہوں...... تم جب تک صفائی اور کھانے سے فارغ ہو لو...... فراز ایک بجے تک اسکول سے آ جائے گا...... تب تک میری واپسی بھی ہو جائے گی......'' فرحت باجی نے احتیاطاً جمع کیے ہوئے پیسے گلدان سے

اٹھائے اور رکشا منگوا کر چلی گئیں۔

نمو صفائی کے بعد کپڑے دھونے بیٹھ گئی۔ اب بھی فرحت باجی کا اتا پتا نہیں تھا اور اب جو فون آیا تو اس کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے، منے کو اسپتال میں داخل کر دیا گیا تھا۔

''تم فراز کو کھانا کھلا کر سلا دینا اور دعا بھی کرنا نمو......'' پریشان، پریشان فرحت باجی نے فون رکھ دیا۔

اس نے کپڑے بھی دھو لیے...... روٹیاں بھی پکا لیں، فراز کے آنے میں ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا۔ وہ کپڑے دھو کر خود بھی نہانے چلی گئی۔ فرحت باجی نے ہی اسے صاف ستھرے رہنے کی تربیت دی تھی اور وہ روزانہ ہی گھر کے کام کاج سے فرصت پا کر نہانے چلی جاتی تھی۔ ٹیبل سیٹ کر کے وہ فراز کی آمد کی منتظر تھی۔ فراز کھانا اس کے ہاتھوں سے ہی کھاتا تھا۔ ماں کو تو اب اس نے بالکل ہی نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہر کام میں اسے عادت ہو گئی تھی بس نمو باجی کی طرف ہی دیکھتا تھا۔ نمو بے تحاشا مسکراتی چلی گئی۔ یہ بچے بھی عجیب چیز ہوتے ہیں، لوگ کہتے ہیں سمجھتے ہیں یہ بڑی لاابالی عمر ہوتی ہے، کچھ سمجھنے کی...... سننے کی نہ محسوس کرنے کی...... لیکن یہ سب سچ نہیں...... نفرت اور محبت کی پہچان کرنے میں بچوں کی حس ہی سب سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے، اگر نمو اس سے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی تو وہ بھی تو جان چھڑکنے میں پیش، پیش تھا۔

☆☆☆

دروازے کی گھنٹی نے نمو کی توجہ بانٹ لی...... دوپٹا درست کرتے ہوئے وہ چونک گئی...... فراز نہیں کوئی اور تھا...... اس نے دروازے سے جھانکا...... ارشد بھائی کھڑے تھے۔ فرحت باجی اسپتال میں تھیں...... اب ارشد بھائی بھی آ گئے تھے...... ان کی آمد اس کے لیے بے شک تسلی کا باعث تھی لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ گھر میں فرحت باجی موجود نہیں ہوں اور وہ اور ارشد بھائی گھر میں اکیلے ہوں، عجیب سی ہچکچاہٹ اور تذبذب کا شکار نمو نے دروازہ کھول ہی دیا۔

''بھائی منا اسپتال میں ہے۔'' اس نے اطلاع دی حیرت بھی ہوئی وہ بچے کی بیماری کا جان کر بھی اِدھر ہی چلے آئے تھے۔

''ہاں مجھے فرحت نے بتایا تھا...... کراچی کے قریب تھا سو پیسے لینے گھر چلا آیا۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرا رہے تھے۔ وہ دو سال سے اس گھر میں کام کر رہی تھی۔ ارشد بھائی ہنستے مسکراتے ہی رہتے تھے۔ معصوم نمو اس مسکراہٹ سے کیا نتیجہ اخذ کرتی۔

''تم میری الماری سے میرے کپڑے نکال دو۔ میں منہ ہاتھ دھوتا ہوں۔'' وہ غسل خانے کی طرف چل دیے۔ نمو ان کے کمرے سے کریم کلر کا شلوار قمیص نکال لائی۔

''آپ کے لیے کھانا لگا دوں ارشد بھائی۔''

''ایں......'' وہ اس کے قریب ہو گئے جیسے یہ لفظ ان کے لیے نیا ہو۔ پہلی مرتبہ سنے ہوں۔

''کھانے کے لیے پوچھ رہی تھی ہُ'' وہ تھوڑی پیچھے ہو گئی اور پیچھے......

''تم سے بہت اچھی خوشبو آتی ہے۔'' انہوں نے قمیص شلوار کے بجائے اسے پکڑ لیا...... جکڑ لیا تھا...... نمو نے بہت سے واسطے دیے، اللہ کے رسول کے پر شیطان کو ان سب چیزوں سے غرض ہے نہ واسطہ...... شیطان تو تھا ہی نافرمان...... اب بھی نافرمان ہو گیا تھا۔ اپنی شیطانیت سمیت نمودار ہوا تھا...... نمو کچھ بھی نہ کر پائی۔ ایک نازک کمزور لڑکی اور ایک مضبوط مرد...... وہ بھی جس کی آنکھوں کے ساتھ، ساتھ وجود میں بھی شیطانیت اتر آئی ہو۔

''میں سب کو بتاؤں گی کمینے انسان......'' مجبوری چلائی، چیخی، بے کسی بلبلا دی...... کچھ نہ ہو سکا...... کچھ نہ کر سکی۔ ''فرحت باجی کو بتاؤں گی...... محلے والوں کو بتاؤں گی۔ فرحت باجی کو...... محلے والوں کو......'' وہ گھٹی، گھٹی آواز میں بہ مشکل چیخ رہی تھی، رو رہی تھی، لٹ رہی تھی اور لٹ گئی تھی۔ وہ بے دم بے سدھ ہو گئی۔

وہ فرحت کو بتائے گی، محلے والوں کو بتائے

گی......شیطان جانتا تھا، سمجھتا تھا وہ خاموش ہوجائے گی......آنا چھوڑ دے گی...... زبان بند کرے گی...... ماں تھی نہ باپ...... نہ کوئی آگے نہ پیچھے......لیکن اگر اس نے فرحت کو بتادیا...... محلے والوں کو پتا چل گیا۔ یہ تو سوچا ہی نہیں گیا تھا...... بربریت کو زبان بند کرنے کے طریقے بھی معلوم تھے۔ پچھلے دنوں پٹرول نایاب تھا ......تو وہ ایک کین میں کچھ پٹرول رکھ لیا گیا تھا۔ وقتِ ضرورت کام آنے کے لیے تو اس وقت سے زیادہ ضرورت کون سی ہوسکتی تھی۔

چند لمحوں بعد گھسیٹ کر لائی گئی نمو، بے سدھ نیم مردہ نمو آگ کے شعلوں کی نذر تھی۔

چھیاسی فیصد جلنے والی نمو بیان دینے کے قابل نہیں تھی......فرحت باجی حیران تھیں نمو کیسے جل گئی۔ پٹرول کا ڈبا اسٹور میں تھا، نمو صحن میں جلی تھی۔ اسے کس نے جلایا۔ اس کی سوچ زبان نہ کھول سکی۔ فراز سات سال کا بچہ تھا......اس نے نیلی قمیص میں کسی کو بھاگتے دیکھا تھا۔ نیلی اور کالی دو شرٹس ہی ارشد کے اٹیچی کیس میں فرحت نے خود ہی رکھی تھیں۔

"ہوگا کوئی بیٹا......" مشرقی بیوی کا سب کچھ شوہر ہی ہوتا ہے، دو بچوں کو لے کر وہ کہاں کس در پر جاتی...... بھائی نہ ماں نہ باپ......ساری عمر کہاں گزرتی......کیسے گزرتی اس کے بچوں کا سائبان چھن جاتا۔ سر سے چادر اتر جاتی......اسے کون سہارا دیتا، رہ گئی نمو تو وہ اب ہوش و خرد کی دنیا سے آزاد تھی...... ڈاکٹروں کے مطابق چھیاسی فیصد جلنے والی نمو موت کو شکست نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اب بیان دینا تو در کنار آہ کے قابل بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

"نمو کو اس وقت ہوش تھا، تھوڑا، تھوڑا، درد سے چیختے چیختے بتایا تھا۔ اسے صاحب نے جلایا ہے، ہم پولیس کو بتائیں گے وہ خود ہی اگلوائے گی۔" اس کی بھابی اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔

"ارے وہ تو اتفاق تھا مجھے دس ہزار روپوں کی ضرورت تھی، جو میں وقت پر پہنچ گئی......" وہ آنکھیں مٹکا، مٹکا کر بیان دے رہی تھی۔ فرحت ٹھنڈی پڑ گئی۔

فرحت باجی کے زیور نے نمو کی بھابی کا منہ اتنی جلد کیسے بند کردیا......فرحت باجی تک یقین نہ کر پائیں۔

"آج میرے بیٹے کی سالگرہ ہے، اگر یہ بیان دے، دے تو میں جلد چلی جاؤں۔" یونیفارم میں ملبوس تیسری عورت بار، بار یہی دُہرا رہی تھی۔

بیان دینے والی نے اچانک ہی آنکھیں کھول دی تھیں۔

"بی بی بتائیں کیسے جلیں آپ؟"

لب پھڑ پھڑائے اور بس......

"بتایا ناں باجی کھانا پکاتے میں آگ لگی۔ اگر اپنی فرحت باجی گھر میں نہ ہوتیں تو یہ چولھے کے پاس ہی جل کر کوئلہ ہوجاتی۔" نمو کی بھابی کی درد بھری آواز فرحت باجی کی حمایت میں سنائی دی۔

"میں نے اس بدنصیب کو کئی بار منع بھی کیا تھا کہ دوپٹا پہن کر کچن میں نہ جایا کر۔" فرحت باجی کی آواز میں اس نے کبھی اتنی مصنوعیت نہیں سنی تھی۔

"آگ اتنی تیزی سے بھڑکی کہ میں کچھ نہ کرسکی۔" وہاں صد فیصد افسوس تھا۔

نمو نے کھلی آنکھوں سے بولنا چاہا......زبان تو بے طاقت تھی، مفلوج ہوچکی تھی پھر لرزتی پلکیں بھی ڈوبنے لگیں...... انصاف کی امید نہ ہو تو کہے ہوئے الفاظ بے معنی، بے وزن ہوجاتے ہیں...... یہاں تو آہ کی طاقت بھی سلب ہوگئی تھی۔ فرحت باجی اور اس کی بھابی نے ساتھ، ساتھ آگے بڑھ کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

"نہ بولی نہ بولے گی۔ منٹوں کی مہمان ہے، چلو میں چلتی ہوں، اُدھر بھی حاضری دینی ہے۔"

غریب اور کمزور نمو نے تو پہلے ہی درد سے کراہتے ہوئے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرنے میں عافیت جان لی تھی۔

آخری لمحے

انیلا حمید

رات بھر تیز ہواؤں کے شدید جھکڑ چلتے رہے مگر ابرِ رحمت کا ایک قطرہ بھی پیاسی زمین کے دامن میں نہیں گرا تھا، خشک کٹیلی ہوائیں درختوں سے ٹکرا، ٹکرا کر نوحہ کناں تھیں۔ گرد و غبار کے .... تیز بگولے مجھے یادوں کے نخلستان میں لے گئے۔

خاقان حیات کی ٹوٹی پھوٹی نامکمل سی تحریر کی صورت خط سامنے میز پر پڑا تھا جسے میں نے بار ہا پڑھا مگر تشنگی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ تیز ہوائیں آج بھی خاقان حیات کی التجائیں یاد کروا رہی تھیں۔ اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں، کپکپاتے ہونٹ اور الوداعی نظریں۔

"اُف......تو گویا میں اب تک کچھ نہیں بھولی۔ یا خدایا......" میں نے سسکی دبائی۔ سفید لفافے کو ہاتھ میں لیا ان الفاظ میں چھپی ادھوری خواہشات، اس کی ناکام و نامراد زندگی کی تنہائیاں اور اداسیوں کی داستان رقم تھی۔ میری آنکھوں سے دو آنسو نکل کے چپکے سے خط پر



گر پڑے۔ دور کہیں انجانی سی آواز کی بازگشت ”تم جانتی ہو میں کون ہوں“ میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے خط کو مضبوطی سے پکڑا اور دوبارہ تحریر پر نظر جمائی۔

”بھلا تم سے زیادہ مجھے کون جانتا ہے۔ میں خاقان حیات، عمر حیات کا اکلوتا بیٹا، یہ اس لیے لکھا کہ تمہارے حافظے میں یہ دو نام کہیں گم نہ ہو گئے ہوں۔ وقت بھی تو کتنا گزر گیا۔ اگر تم زندگی کی رعنائیوں میں کھو کر ان ناموں کو بھول چکی ہو تو اس میں تمہارا بھی کیا قصور...... پندرہ سال کا عرصہ بھی تو کچھ کم عرصہ نہیں، وقت بدل گیا، لوگ بدلے، کچھ نئے چہرے سامنے آئے۔ کچھ پرانے ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ گئے۔ ہر چیز جیسے ساکت ہو گئی ہے سوائے اس کم بخت دل کے جو آج بھی اسی مقام اسی جگہ ٹھہر سا گیا ہے۔ زندگی رک گئی عمر کی پونجی بھی عنقریب ختم ہونے والی ہے، آنکھیں تو اسی دن بینائی سے محروم ہو گئی تھیں جب تم نے ساتھ نبھانے کے سارے عہد توڑ ڈالے تھے، نہ جانے آج کیوں اتنے سالوں بعد دل میں دبی خواہش نے چپکے سے انگڑائی لی کہ اوائلِ محبت کی یاد تازہ کروں، یہ میرا تمہارے نام آخری خط ہے مگر اسے ایک بار پڑھنا ضرور...... ہاں صرف ایک بار......“ میں نے خط پر نگاہ ڈالی جسے میں بیسویں بار پڑھ چکی تھی۔ نہ جانے کیوں...... میری نظریں اس سطر پر ٹھہری گئیں۔

”مجھے آج بھی یاد ہے وہ ابر آلود شام، جب استاد جی کے گھر میں نے تمہیں پہلی بار... دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا اگرچہ ہم نے کبھی آپس میں بات نہیں کی مگر آنکھوں ہی آنکھوں میں چاہتوں کے پیغام ایک دوسرے کو پہنچا دیے، میری حالت کسی مجنوں سے کم نہیں تھی...... یوں دل کا حال اماں جی سے بیان کیا اور پھر اماں نے مجھے کتنے گھنٹے سمجھانے میں لگا دیے۔ ذات پات کی اونچ نیچ لوگوں کی چہ مگوئیاں مگر دلِ ناداں کچھ سمجھنے کو تیار ہی نہیں تھا۔ مجبوراً اماں جی کو تمہارے گھر جانا پڑا کیونکہ اماں اپنے اکلوتے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ اوائل مارچ کی سنہری دھوپ سے بچی خوب صورت سی صبح جب ماں جی نے تمہاری دہلیز پر قدم رکھا۔ مجھے معلوم ہے، میری ماں کی آمد کا سن کر تمہاری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، ماں جی کی آمد کا مقصد سن کے تمہاری ماں بھی بہت خوش ہوئی تھیں۔ لیکن چند لمحوں بعد یہ خوشی دلوں کو گھائل کر گئی...... جب انہوں نے اماں جی کو یہ کہہ کر جواب دے دیا۔ ”تمہاری دس دن بعد شادی ہے اور تمہارا جلاد صفت باپ یہ رشتہ کبھی نہیں کرے گا۔“ یہ سن کر میری رگوں میں ابلتا خون لاوا بن گیا۔ مجھے یاد ہے، میرے دوستوں نے مجھے بہت اکسایا کہ کچھ غلط کروں لیکن تم نہیں جانتیں کہ میں نے کیسے خود پر جبر کیا بھلا میں اپنی محبت کی توہین کر سکتا تھا، اسے زمانے کے طعنوں، تشنوں اور ذلت آمیز نگاہوں کے حوالے کیسے کر دیتا، ہرگز نہیں پھر انہی بے کیف دنوں میں تمہاری شادی کا دن آ پہنچا...... تمہارے پڑھے لکھے، انا پرست اور پرانی روایتوں میں جکڑے باپ نے تمہارا نکاح گاؤں کے بوڑھے سے کر دیا تو اس پل میرا دل خون کے آنسو رویا پھر میں نے وہ جگہ، وہ محلہ، وہ شہر ہی چھوڑ دیا جہاں تم بستی تھیں۔ تمہیں کیا پتا کوئی تمہیں آج بھی کتنا چاہتا ہے بس دعا کرنا کہ وقت کی گرد اس دل پر نہ پڑے جس پر تمہارا نام لکھا ہے۔“ میں نے ایک دفعہ پھر خط پڑھا اور اب کے اسے لفافے میں رکھا اور پھوٹ، پھوٹ کر رو دی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

آج ایک طویل مدت بعد دل کا دفتر کھلا تھا اور پھر حساب کتاب کرنے کو دل کیا۔ بہن کی برسوں پرانی کہی بات میرے کانوں میں گونجی......

”باجی، ابا جی گھر پر نہیں ہیں اور اماں جی بھی ساتھ والے گاؤں گئی ہوئی ہیں، آپ چپکے سے نکل جائیں، جلدی کریں۔“ اور اس پل میں نے فیصلہ کر کے دروازے کی طرف قدم بڑھائے مگر نہ جانے کون سی طاقت تھی جس نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

اور اب پچھلے بیس سال سے بے حد اذیت میں مبتلا اس وقت کو کوستی ہوں کہ میں کیوں کر پلٹی، کیوں تم......

پیدا ہوئی۔ میں نے بے حد سر پٹختے ہوئے اذیت سے سوچا۔ اپنی سوچوں پر کسی کو کوئی اختیار نہیں ہوتا جب لامتناہی سوچیں گھیرا ڈال لیں تو انسان اپنے آپ کو ہی قصوروار گردانتا ہے۔ اب میں ہر احساس سے عاری ہو چکی تھی۔ اسی پل دروازہ کھلا فہیم اندر داخل ہوئے مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ میری طرف لپکے، ان کی نیند میری حالت دیکھ کر اڑ چکی تھی، میز پر رکھا پانی کا گلاس فہیم نے میرے ہونٹوں سے لگایا۔ میرے بکھرے بال سمیٹے، شال کندھوں پر پھیلائی اور مجھے لٹا دیا، میں نے ہتھیلی سے آنکھیں صاف کیں اور فہیم کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر پریشانی اور آنکھوں میں اداسی و ویرانی پھیلی تھی۔ میں نے تھک ہار کے تکیے پر سر رکھا اور آنکھیں موند لیں فہیم چند لمحے میری طرف دیکھتے پھر تھکے، تھکے قدموں سے باہر چلے گئے۔ وہ بھی، بھی ہونے والی میری اس کیفیت سے آگاہ تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ مجھے اپنے ماں، باپ کی یاد آ رہی ہے۔ میں نے بے اختیار ہو کے انہیں آواز دے دی، رونے سے من کا بوجھ ہلکا ہو چکا تھا۔ غم کے بادل چھٹ چکے تھے۔ شاید میری دلی کیفیت اُن سے چھپی نہیں رہ سکی۔

”آپ اِدھر ہی سو جائیں فہیم مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ میں نے نرمی سے کروٹ بدلی۔ فہیم کی آنکھیں مسکرا اٹھیں۔

”شاید برف پگھل چکی ہے شاید میرے حسنِ سلوک کی وجہ سے۔“ فہیم نے آسودگی سے سوچا۔

”اور پتا ہے تمہیں خاقان حیات، مجھے کس طاقت نے رکنے پر مجبور کیا۔ آج میں جان چکی ہوں کہ وہ کون سی طاقت تھی جس نے مجھے رسوائی سے بچایا وہ تمہاری پاکیزہ محبت تھی اگر اس دن میں اپنے باپ کی دہلیز پار کر جاتی تو کوئی بھی مجھے احترام کی نظر سے نہ دیکھتا...... بھلا گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کی بھی کوئی عزت ہوتی ہے۔“

ایک بستر پر لیٹے دو مختلف ذہنوں کے لوگ مختلف سوچوں میں الجھے مگر دونوں کے دل میں امید تھی کہ بہت کچھ کھو کے بھی دونوں نے کچھ نہ کچھ پا لیا تھا۔

سنہرے موتی

1۔ کچھ لوگ اتنے غریب ہوتے ہیں کہ ان کے پاس پیسوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

2۔ کسی کو بھی حقیر اور کمزور نہ سمجھو کیونکہ راستے میں پڑا چھوٹا سا پتھر بھی انسان کو منہ کے بل گرا سکتا ہے۔

3۔ اچھے انسان میں بھی ایک برائی ہوتی ہے وہ سب کو اچھا سمجھ لیتا ہے۔

4۔ مجھے ہنسی آتی ہے اُن لوگوں پہ جو اوپر سے میرے ساتھ ہوتے ہیں اور اندر سے میرے خلاف......

5۔ الحمدللہ...... یہ وہ جملہ ہے جو بہت کچھ ایک پل میں بہتر کر دیتا ہے۔

از: مہرین ضیا بنگش، کراچی

خوفناک

اسٹوڈنٹ: سر لوگ اردو اور انگلش میں بات کرتے ہیں؟ میتھس میں بات کیوں نہیں کرتے؟

ٹیچر: زیادہ تین، پانچ نہ کرو اور فوری نو، دو، گیارہ ہو جاؤ ورنہ چھ کے چھتیس نظر آئیں گے اور بتیس کے بتیس باہر آ جائیں گے۔

اسٹوڈنٹ: سر اردو اور انگلش ہی ٹھیک ہیں، میتھ تو بولنے میں بھی بہت خوفناک ہے۔

از: نازنین آفریدی، پشاور

عورت کے نام

زندگی نام ہے موسموں کے آنے اور جانے کا زندگی میں تغیر موسم کی مناسبت سے نہیں علم عمل و افکار کی بنیاد پر آتا ہے ایک عورت اگر مثبت طرزِ فکر اور سوچ کی مالک ہے تو وہ نہ صرف اپنی بلکہ اپنے سے وابستہ تمام رشتوں کی زندگی میں بہار لا سکتی ہے اسی طرح خوشیوں کا بھی کوئی موسم نہیں ہوتا، ہر اچھی خبر خوشی اور کامیابی آپ کی زندگی میں بہاروں کے پھول کھلا سکتی ہے خواہ موسم خزاں کیوں نہ ہو آخر میں خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے ایک چھوٹا سا پیغام......

”مثبت طرزِ عمل اپنائیں خوش رہیں خوش رکھیں یہ ایک عورت کی سب سے بڑی طاقت ہے۔“

از: صائمہ سید، کراچی

ناولٹ

یو آر گریٹ ماما

پروین عذرا تشنہ

”کیا بات ہے فاریہ جان، معلوم ہوتا ہے کہ اتنی بڑی روڈ پر بھی محترمہ فاسٹ ڈرائیونگ کے موڈ میں ہیں۔“ مسز فیض نے دبی مسکراہٹ سے فاریہ خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سچ مسز فیض جی چاہ رہا ہے کہ جلد از جلد آفس پہنچ جاؤں لیکن اُف...... یہ ٹریفک، یہاں تو کسی کو بھی ڈرائیونگ کا سینس ہی نہیں، یہ نہیں کہ اپنی، اپنی لائن پر چلیں، جانے کہاں سے نمودار ہو جاتے ہیں۔“ فاریہ خان نے دو گاڑیوں کے درمیان سے بڑی مہارت سے اپنی گاڑی نکالتے ہوئے کہا۔

''سنو ایک آئیڈیا ہے اگر تم مانو تو ایسا کرو کہ غریب بچوں میں کتابیں، کاپیاں وغیرہ اور غریب عورتوں میں سلائی مشینیں بانٹنے کے ساتھ، ساتھ ایک برانچ ٹریفک کنٹرول کی بھی کھول لو جس کے ذریعے پبلک کی مفت ٹریفک رولز کی ٹریننگ کا انتظام کر دینا پھر جب تم اپنی گاڑی روڈ پر لایا کرو گی تو کوئی ٹینشن، نہ کوئی گھبراہٹ۔ کہو کیسا آئیڈیا ہے۔'' مسز فیض کا قہقہہ زبردست تھا۔

''میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم انجوائے کر رہی ہو۔'' فاریہ نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔

''انجوائے تو میں تھوڑی دیر پہلے بھی تمہاری حالت دیکھ کر کر رہی تھی اور اب بھی کر رہی ہوں، ہی ہی ہی۔'' وہ ہنسیں۔

''تم بس اسی طرح ہنستی رہنا اور میرا گرمی کے مارے دم نکل رہا ہے۔''

''تمہیں کہا کس نے تھا کہ اتنی سڑی دوپہر میں یہ تقریب عجیباں اور غریباں رکھ لو اور اپنے ساتھ، ساتھ میرا ہی کیا اس بیچارے فوٹو گرافر کا بھی تیل نکال دو۔'' انہوں نے ٹشو سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

''تقریب عجیباں اور غریباں نہیں تقریب ہمدردانِ غریباں۔'' فاریہ نے تصحیح کی۔

''چلو یونہی سہی تقریب ہمدردانِ غریب جہاں ہر وقت خوشبوؤں میں بسی رہنے والی فاریہ خان سارے غریبوں کو اکٹھا کر کے تعلیم کے فوائد سے روشناس کرا رہی تھیں، انہیں مفت کتابیں وغیرہ تقسیم کرنے کے ساتھ، ساتھ ہر چھوٹے بڑے گندے سندے کو گلے لگا، لگا کر تصویریں بھی اتروا رہی تھیں۔ یہ اور بات کہ اس وقت بھی تم بار، بار ناک سکیڑ لیتیں تو مجھے ہنسی روکنا مشکل ہو جاتا تھا۔'' وہ اب بھی ہنس رہی تھیں اور فاریہ خان سنجیدگی سے انہیں سمجھا رہی تھیں۔

''یہ سب تو کرنا ہی پڑتا ہے...... لیکن تم دیکھ لینا کل جب اخبار میں یہ تصویریں لگیں گی تو ہمیں کئی جگہ سے فنڈز ملیں گے اور سیٹھ کریم اور سیٹھ ٹوپی والا نے اب بھی کافی بڑے چیک دیے ہیں اور اتنے ہی اور دینے کا بھی وعدہ کیا ہے۔'' فاریہ خان نے مسرور لہجہ میں کہا تو مسز فیض بے اختیار ہنس دیں۔

''ہاں اور تم اس رقم کا زیادہ حصہ اپنے بنگلے کو نئے سرے سے ڈیکوریٹ کرنے میں لگا دو گی۔'' پھر آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولیں۔ ''یا اپنے بینک اکاؤنٹ میں اضافہ کر لو گی اور کچھ رقم غریبوں کے کام بھی آجائے گی۔ بڑی بات ہے بھئی۔'' وہ اب بھی ہنس رہی تھیں۔

''چلو بھئی تمہارا آفس تو قریب آگیا اب خوش۔'' شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''بالکل ان کھدر کے کپڑوں میں تو اب دم گھٹ رہا ہے، میں تو آفس پہنچتے ہی شاور لوں گی اور اپنا نرم، ملائم ڈریس پہنوں گی، ڈھیروں پرفیوم کا اسپرے کروں گی تب یہ سڑاند میرے اندر سے نکلے گی اور ... جانے کے قابل ہوں گی۔ نہ جانے یہ غریب لوگ اتنے بدبودار کیوں ہوتے ہیں۔ غربت یہ تو نہیں کہتی کہ روزانہ نہ نہاؤ اور اتنے گندے رہو، میں تو کہتی ہوں اگر کسی کے پاس دو جوڑے ہیں تو ایک دھو کر ڈالے، ایک نہا کر پہن لے...... لیکن ان لوگوں کو تو نہانے دھونے کی عادت ہی نہیں ہوتی۔'' اس نے آخری ... کاٹتے ہوئے کہا تو مسز فیض کی آنکھوں میں پل ... چنگاریاں چمکیں جس پر انہوں نے پلکوں کی چلمن گراتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں سمجھو گی فاریہ جان، بات یہ ہے کہ ان بیچاروں کو پانی ہی نہیں ملتا کہ روزانہ نہائیں دھوئیں صرف پینے اور کھانا پکانے کے لیے جانے کہاں، کہاں سے تھوڑا بہت پانی ڈھو ڈھو کر لاتے ہیں بیچارے...... ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ اس فنڈ سے غریبوں کی بستیوں میں کچھ نل لگوا دو پھر نل کے قریب کھڑے ہو کر ... تصاویر بھی اتروانا پھر دیکھنا کتنی شہرت اور کتنا فنڈ ملتا ... اور کتنی ترقی کرتی ہے تمہاری این جی او پھر ثواب اور غریبوں کی دعائیں الگ......''

وہ پھر ہنس رہی تھیں اور فاریہ خان خاموشی سے انہیں گھور رہی تھیں۔ پھر جیسے ہی گاڑی رکی مسز فیض اتر کر خدا حافظ کرتی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف بڑھیں تو فاریہ خان نے پکارا۔

''مسز فیض کچھ دیر آرام کر لو بلکہ تم بھی فریش ہو کر اور جوس پی کر ہی جانا۔''

''نو تھینکس، ایک غلطی تو میں پہلے ہی کر چکی ہوں کہ اپنی گاڑی یہاں چھوڑ کر تمہارے ساتھ چل دی اگر اپنی گاڑی لے جاتی تو کب کی اپنے کلینک پہنچ چکی ہوتی، تمہارے راستے میں تو ٹریفک ہی بہت ہے جس کی وجہ سے پہلے ہی لیٹ ہو چکی ہوں، اب بھی اسی ٹریفک سے ہی گزر کر جانا ہوگا دیکھو اب کس وقت پہنچتی ہوں چلو اچھا گڈ بائے۔'' وہ تیزی سے گاڑی نکال لے گئیں۔

☆☆☆

''ماما آپ کہاں رہتی ہیں؟ مجھے تو لگتا ہے اب آپ سے ملاقات کے لیے ٹائم لینا پڑے گا۔'' ماہا نے آج کئی دن بعد ماما کو فری دیکھا تو قریب چلی آئی۔

''نہیں جان، ایسی تو کوئی بات نہیں، بس کچھ دن ذرا زیادہ بزی رہی اس لیے تمہیں ٹائم نہ دے سکی سوری بیٹا۔''

''ایسی کیا مصروفیت ماما کہ آپ کو میری بات بھی یاد نہ رہی۔'' ماہا نے ناز سے اٹھلاتے ہوئے کہا تو انہیں بھی صفائی پیش کرنی ہی پڑی۔

''بس بیٹا، غریبوں کی کچی بستیوں کے چکر لگ رہی تھی، عورتوں کو مشین اور بچوں کو کتابیں، کاپیاں وغیرہ بھی دینی تھیں، بہت محنت کرنی پڑتی ہے انہیں تعلیم کی طرف راغب کرنے کے لیے ورنہ یہ لوگ تو اپنے لیے کچھ سوچتے ہی نہیں۔'' انہوں نے ماہا کو گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی تو بھینی، بھینی مہک انہیں اپنے اندر اترتی محسوس ہوئی۔

''یو آر گریٹ ماما، آپ کو غریبوں کا کس قدر خیال ہے، آپ کتنے عرصے سے ان کا فیوچر برائٹ کرنے میں لگی ہوئی ہیں، آئی ایم پراؤڈ آف یو ماما۔''

اس نے ماما کے سینے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔ اسے یاد آیا کہ چند سال پہلے جب وہ اتنی بڑی نہیں تھی تو ایک مرتبہ بہت ضد کر کے ماما کے ساتھ ایک جلسے میں چلی گئی تھی جہاں بہت ساری غریب عورتیں اور بچے تھے جو اس کی ماما کی بہت عزت کر رہے تھے، کوئی ان کے ہاتھ چومتی اور کوئی روتی ہوئی اُن کے گلے لگ جاتی تھی اور ماما ہر ایک کو چمٹا، چمٹا کر تسلیاں دے رہی تھیں، انہوں نے بچوں کو پیار کرتے ہوئے بہت سی چیزیں بھی دی تھیں، ماما نے بہت لمبی تقریر کی تھی جس کا کچھ حصہ اسے ابھی تک یاد تھا، ماما بڑے جوش و جذبے سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ لوگوں کو اپنی قسمت خود بدلنی ہے اور وہ صرف تعلیم کے ذریعے ہی بدلی جا سکتی ہے، جب آپ کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے باشعور اور معزز شہری بنیں گے تو اچھے عہدوں پر فائز ہوں گے اس طرح وہ ملک و قوم کی خدمت کر سکیں گے اور آپ کا نام روشن کریں گے۔ اپنا مستقبل بھی تابناک بنا سکیں گے پھر ان کی شادیاں بھی معزز گھرانوں میں ہو سکیں گی تو امیری، غریبی کا فرق مٹ جائے گا۔ آپ جانتی ہیں امیر، غریب سب انسان ہیں اور انسان، انسان سے نفرت نہیں کرتا بلکہ یہ نفرت صرف جہالت سے کی جاتی ہے۔ جب آپ کے بچے تعلیم حاصل کریں گے تو انہیں خوب صورتی کے ساتھ جینا آجائے گا اور کوئی انہیں حقارت کی نظر سے نہیں دیکھے گا، ہر جگہ انہیں تعظیم و تکریم ملے گی، اس لیے آج سے آپ اپنا تعلیمی سفر شروع کر دیں، میں اور میرے ساتھی آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم آپ کو پیچھے نہیں چھوڑیں گے بلکہ آپ کے ساتھ قدم ملا کر چلیں گے۔'' پھر تالیوں کی گونج میں ان کی ڈھیروں تصویریں کھینچی گئی تھیں۔ وہ اپنی ماما کو دیکھ، دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اسے اب بھی یاد تھا کہ اس وقت وہ اتنے شاندار گھر میں نہیں رہتے تھے لیکن ماما کی مصروفیت بڑھتی ہی چلی گئی۔ اس دن اسے جب ماما کی مصروفیت کا صحیح طرح علم ہوا تو اسے اپنی ماما بہت اچھی لگنے لگی تھیں جو غریبوں کی اس قدر ہمدرد تھیں کہ ان کی

غربت مٹانے اور معاشرے میں باعزت مقام دلانے کے لیے کس قدر جدو جہد کررہی تھیں تب سے ہی یہ بات اس کے ذہن پر نقش تھی کہ میری ماما غریبوں کی سب سے بڑی ہمدرد ہیں اور جو بھی اپنی محنت سے باعزت مقام پالے گا ماما اس پر فخر کریں گی، اسے عزت سے اپنے پاس بٹھائیں گی۔ وہ بہت دیر سے آنکھیں بند کیے ماما کے سینے سے لگی ہوئی تھی تو انہوں نے اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

''کیا بات ہے جانی، کیا سوچنے لگیں؟''

''کچھ نہیں ماما، میں یہ سوچ رہی تھی کہ آپ اتنے نیک کاموں میں اتنی مصروف رہتی ہیں کہ اپنی بیٹی کی بات بھی یاد نہیں رہی۔'' اس نے پیار سے ماما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کون سی بات چندا......؟ مجھے واقعی یاد نہیں رہی۔'' انہوں نے سوچتے ہوئے تاسف سے کہا۔

''ماما، میں نے آپ کو ڈاکٹر شمس کے بارے میں بتایا تھا ناں؟'' اس نے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

''ہاں، ہاں بتایا تو تھا......پھر؟'' انہیں اچانک ہی یاد آ گیا تھا۔

''ماما وہ اپنی مدر کو آپ سے ملوانا چاہ رہے ہیں، مطلب اُن کی مدر آپ سے ملنا چاہ رہی ہیں۔'' اس نے کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

''شمس کے کہنے پر؟'' ماما نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی۔'' اس نے نظریں جھکائے مختصر جواب دیا۔

''اوہ......یو۔'' ماما نے اسے گدگدایا تو وہ ہنس کر اُن سے لپٹ گئی۔

''اچھا ایسا کرتے ہیں تمہارے پاپا ٹور سے لوٹ آئیں تو ان سے بات کر کے شمس اور اس کی فیملی کو ڈنر پر انوائٹ کر لیتے ہیں۔'' ماما نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''لیکن ماما، پاپا کے آنے میں تو ابھی ایک مہینہ پڑا ہے، اور میں نے انہیں سنڈے انوائٹ کرلیا ہے، پلیز ماما ابھی آپ ڈاکٹر شمس اور ان کی مدر سے تو مل لیں پھر پاپا کے آنے پر ڈنر پر بھی بلالیں گے۔ ماما آئی ہوپ ان کی مدد سے مل کر آپ بے انتہا خوش ہوں گی۔'' اس نے اتنی خوشدلی اور امید بھری نظروں سے ماما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ مسکرادیں۔

''اوکے......ایز یو وش مائی چائلڈ۔'' انہوں نے ماہا کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''یو آر گریٹ ماما۔'' وہ ماما سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

''ہوں، تو کیا آرہی ہو؟'' انہوں نے سی ایل آئی پر مسز فیض کا نمبر دیکھتے ہوئے بڑے مگن سے لہجے میں پوچھا تھا۔

''نہیں، نہیں آ تو نہیں رہی ابھی تو کلینک سے لوٹی ہوں، کچھ دیر بعد تیار ہو کر فیض کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے......اور تم کیا کر رہی ہو؟''

''اس وقت تو میں کافی انجوائے کررہی ہوں اور ساتھ، ساتھ کل ہونے والی میٹنگ پر غور کر رہی ہوں، تم آ جاتیں تو تمہیں بھی شاندار کافی پلواتی، بائی داوے آنا نہیں تھا تو فون کس وجہ سے کیا؟''

''ارے ہاں، تمہیں یہ بتانا تھا کہ وہ جو سوشل ورکر ہیں ناں مسز حلیم، ارے وہی جنہیں تم اپنی حریف کہتی ہو تو یار میں نے انہیں بھی وہی مشورہ دے ڈالا، ٹل والا، وہ تو بھئی فوراً مان گئیں، بڑی سمپل سی ہیں، انہوں نے وعدہ بھی کرلیا کہ دو ماہ تک کچھ بستیوں میں نلکا لگوادیں گی، ویسے بیچاری زیادہ امیر نہیں ہیں حالانکہ تمہاری طرح ہی کافی عرصے سے ایک این جی او چلا رہی ہیں لیکن تمہارے جیسے ٹھاٹھ نہیں ہیں ان کے معلوم ہوتا ہے سارا ہی فنڈ تقسیم کر دیتی ہیں غریبوں اور ناداروں میں، بالکل بے وقوف لگتی ہیں ناں؟'' انہوں نے ہنسی کے دوران کہا تھا۔

''تمہیں بھلا کس نے کہا کہ ہر ایک کو اپنے مشوروں سے نوازتی رہو؟'' لہجہ بہت تلخ تھا، شاید انہیں اپنی سبکی محسوس ہوئی تھی یا مسز حلیم کا نام سنتے ہی کافی کڑوی لگنے لگی تھی۔

''اُفوہ تم جانتی تو ہو کہ وہ ہیں اور ان کی طرح اور

کچھ اور سوشل ورکرز......جن سے میری پرانی شناسائی ہے اور میں غریب، غربا کے مسائل پر انہیں مفت مشورے بھی دیتی رہتی ہوں اور اکثر پر وہ پوری شدومد سے عمل بھی کرتی رہتی ہیں، ہیں ناں پاگل۔'' انہوں نے قہقہہ لگایا۔

''ایک تو میں تمہاری ہر وقت کی ہنسی اور بے تکے قہقہوں سے تنگ ہوں، جانے تمہارے پاس کتنا اسٹاک ہے فضول سی ہنسی کا اور اس وقت تو تمہاری ہنسی بالکل برداشت نہیں کرسکتی، میں تو یہ سوچ رہی ہوں جانے تم اپنے کلینک میں کیا کرتی ہوگی۔ مجھے تو لگتا ہے پیشنٹ تمہیں اپنی ٹینشن بتارہا ہوتا ہوگا، تم سے اپنے دکھ شیئر کرنا چاہتا ہوگا اور تم سب کچھ قہقہوں میں اُڑا دیتی ہوا گی....'' فاریہ خان نے بھی تمسخرانہ انداز میں کہا تو وہ پھر ہنس دیں۔

''نہیں ایسا بالکل نہیں ہے، اپنے ہر پیشنٹ کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت کچھ اور ہوتی ہے اور تمہارے ساتھ کچھ اور ہی ہے، یو نو فاریہ جان۔'' انہوں نے بھرپور قہقہے کے ساتھ فون بند کر دیا تھا۔

فاریہ خان اور مسز فیض کی دوستی کچھ زیادہ پرانی بھی نہیں تھی، البتہ ایک سائیکالوجسٹ مسز فیض کا ذکر کچھ لوگوں کی زبانی وہ کچھ عرصے سے سنتی آرہی تھیں اور تقریباً سال بھر پہلے وہ اپنی ایک عزیزہ کو جو اپنے گھریلو مسائل کی وجہ سے بہت ٹینس رہا کرتی تھیں۔ اُن کے کلینک لے گئی تھیں۔ وہیں دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی، وہ اپنے لیے مسز فیض کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک دیکھ کر چونک سی گئی تھیں لیکن ان کی سنجیدہ اور بردباری شخصیت انہیں اچھی لگی تھی پھر اُن کی دوستی بڑھتی گئی جس کا کریڈٹ مسز فیض کو ہی جاتا ہے کہ وہی فاریہ خان کی طرف کھنچی چلی آئیں، وہ اپنا کلینک تو شام کو صرف تین گھنٹے کے لیے کھولتی تھیں اس لیے اکثر ہی فاریہ خان کے پاس آنے لگیں اور جلد ہی ان کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹانے لگیں، دونوں کی عمروں میں کوئی خاص فرق نہ ہونے کی وجہ سے جلد ہی دوستی

نذرانۂ عقیدت

بلائیں وہ در پہ یہ ان کا کرم ہے
کہاں میں کہاں راہ گزار مدینہ

یہی آرزو ہے یہی ہے تمنا
مرے سامنے ہو دیارِ مدینہ

جہاں بھر میں چرچے ہیں جس نام کے
وہی تو ہیں بس نامدارِ مدینہ

یہ معراج ہے، شب معراج کی
گئے فرش سے تاجدارِ مدینہ

جہاں تک کہ جبرئیل علیہ بھی جا نہ پائیں
ہیں پہنچے وہاں شاہ سوار مدینہ

کاوش: فریدہ افتخار، اسلام آباد

مجھے سمیٹ لو

ٹوٹ کر بکھرا ہوں میں ریزہ ریزہ
میری بکھرتی پوروں کو محبت کی آغوش دے دو
قطرہ قطرہ مجھے انڈیلو خود میں
ریگِ زیست کو محبت کا دریا کردو
تم اب خود کو میرا کردو
تیرے نام پہ سانسوں کی تار ہے
بن تیرے جینا دشوار ہے
تیرے بغیر سانس لینا ہے ستم
اے میرے صنم تیری قسم
بن تیرے جی نہ پائیں گے ہم
ٹوٹ کر بکھرا ہوں میں ذرہ ذرہ
مجھ کو آ کر سمیٹ لو میرے صنم

شاعرہ: نگہت غفار، کراچی

بے تکلفی کی حد تک پہنچ گئی تب ہی سے وہ فاریہ خان پر اپنی ہنسی اور قہقہوں کی بارش کرنے لگیں ورنہ شروع میں تو وہ بہت سنجیدہ لگی تھیں اور اب فاریہ خان کو ان کی بات بے بات ہنسی پر الجھن ہونے لگتی تھی اور کبھی، کبھی تو یوں محسوس ہوتا کہ ان کی آنکھیں ان کے ہنستے چہرے سے بالکل الگ ہیں۔ کبھی، کبھی فاریہ خان ان سے یہ بات کہہ بھی دیتیں تو وہ اس پر پھر قہقہہ لگا دیتیں۔

☆☆☆

آج سنڈے تھا مطلب چھٹی کا دن لیکن آج تو ماہا اور ماما خلافِ معمول صبح ہی سے بہت ایکٹو تھیں۔ ماما نے نوکروں کو طرح، طرح کی ہدایات دیتے، دیتے سارا دن گزار دیا تھا اور خود بھی ان کے ساتھ مصروف رہیں کیونکہ آج بہت خاص مہمان آرہے تھے۔ وہ چاہتی تھیں کہ ہر بات ان کے معیار کے مطابق ہو کہیں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ ایک تو اس قسم کے مہمانوں کو اٹینڈ کرنے کا پہلا موقع تھا پھر خان صاحب بھی موجود نہ تھے۔ اس لیے کچھ نروس بھی تھیں، وہ چاہ رہی تھیں کہ وہ لوگ یہاں سے بہت خوشگوار احساسات لے کر جائیں۔ آج تو وہ اپنی تیاری پر بھی بھرپور توجہ دے رہی تھیں۔ ماہا کے لیے بہت خوب صورت ڈریس اور جیولری تو وہ کل ہی لے آئی تھیں جنہیں پہن کر وہ بالکل پری لگ رہی تھی اور وہ کئی مرتبہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کی نظر اتار چکی تھیں۔ اطلاعی گھنٹی نے مہمانوں کی آمد کی خبر دے دی تھی۔

ماہا ہی گیٹ پر مہمانوں کو ریسیو کرنے گئی تھی اور جب وہ ڈاکٹر شمس کے ساتھ، ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو ماما بے اختیار صوفے سے کھڑی ہوگئیں کہ دونوں ساتھ کھڑے نظر لگ جانے کی حد تک خوب صورت لگ رہے تھے۔ وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھیں، ماہا بھی شرمیلی مسکراہٹ سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

''یو آر ویری...... ہینڈسم ینگ مین۔'' انہوں نے شمس کا ہاتھ اتنے پیار سے اپنے ہاتھوں میں لیا تھا کہ ماہا کے دل میں ڈھیروں سکون اتر آیا۔ اسی لمحے ایک ادھیڑ عمر خاتون ہلکی قیمتی چادر سلیقے سے اوڑھے مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئیں تو انہیں محسوس ہوا جیسے وہ انہیں جانتی ہوں، اسی لیے بغور دیکھ رہی تھیں پھر سلام کی آواز اور انداز سے وہ فوراً پہچان گئیں اور مسکراتے ہوئے سلام کا جواب دیا لیکن اُن کی نظریں دروازے کی سمت ہی تھیں۔

''بیٹا آپ کی مدر نے بھی آنا تھا، وہ نہیں آئیں کیا؟'' وہ حیرانی اور مایوسی سے خالی دروازے کی طرف دیکھتی ہوئی شمس سے مخاطب تھیں۔

''اوہ مجھے تعارف کرانے کا تو خیال ہی نہیں رہا، سوری آنٹی ان سے ملیے یہ میری والدہ ہیں۔'' اس نے تعارف کرایا۔

''کیا کہا...... یہ تمہاری مدر ہیں، یہ...... یہ...... یہ تمہاری ماں؟'' انہوں نے ہذیانی کیفیت میں چیختے ہوئے دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ ان کے سر میں دھماکے ہو رہے تھے انہیں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کا سر درد کی شدت سے پھٹ جائے گا۔

''دیکھو اگر یہ مذاق ہے تو بہت بدصورت...... اور اگر حقیقت ہے تو بہت بھیانک......'' انہوں نے بہت سنجیدگی سے شمس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

''مذاق نہیں ہے، یہ بالکل میری ماں ہیں، کیوں کیا یہ ماں نہیں ہوسکتیں؟'' اس نے اپنی ماں کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا جو قالین پر نظریں گاڑے کھڑی تھی۔

''نہیں، یہ تمہاری ماں نہیں ہوسکتی۔ میں یقین نہیں کرسکتی، رشیدہ تم بتاؤ یہ کون ہے، تمہارا بیٹا تو تاج تھا بہت سانولا سا جو ہر وقت کھیلتا رہتا تھا اور میں نے زبردستی اسے کتابیں لا کر دی تھیں تاکہ وہ کچھ پڑھ لکھ جائے۔ جب سے ہی تو مجھے غریب لوگوں کی تعلیم کا خیال آیا تھا لیکن یہ کون ہے، اتنا گورا چٹا لڑکا تمہیں کہاں سے مل گیا۔ سچ، سچ بتاؤ۔'' وہ غصے سے چیخ رہی تھیں۔

''وہ تو میرے بھائی جان ہیں تاج محمد، وہ اسی شہر میں ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ ہیں اور میری بھابی ایک پرائیویٹ انگلش اسکول چلا رہی ہیں۔'' خاموش کھڑی

رشیدہ کے بجائے شمس نے اس کی بات کا جواب بڑے اعتماد سے دیا تھا لیکن وہ کسی بات کا اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

''رشیدہ میں تم سے پوچھ رہی ہوں آخر تمہیں ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میری بیٹی کا رشتہ مانگنے آنے کی، تمہیں کچھ لحاظ نہ آیا، اپنی اوقات کا خیال بھی نہ آیا، تمہارا کیا خیال تھا، تم آؤ گی اور میں تمہیں اپنی سمدھن بنالوں گی، تمہارے ساتھ رشتے داری جوڑوں گی، آخر کیا سمجھ کر تم نے میرے گھر کی طرف قدم اٹھائے؟ اسی وقت نکل جاؤ میرے گھر سے...... میں تمہیں بالکل برداشت نہیں کرسکتی۔'' انہوں نے خاموش کھڑی خاتون جسے وہ رشیدہ کہہ رہی تھیں... دھکا دیتے ہوئے کہا تو شمس نے انہیں تھام لیا۔

''ان کا کیا قصور ہے آنٹی، یہ تو میرے کہنے پر آئی ہیں، انہیں میں لے کر آیا ہوں، آپ مجھ سے بات کریں، آپ میری بات تو سنیں۔'' شمس بہت اطمینان سے کہہ رہا تھا اور اس کا یہی انداز ماہا کی ماما کے وجود میں چنگاریاں بھر رہا تھا۔

''تم...... تم ہو کون، مجھ سے بات کرنے والے، میں تمہیں نہیں جانتی، تعلیم حاصل کر کے تم لوگ اپنی اوقات ہی بھول گئے ہو، اپنے جامے سے باہر نکل آئے ہو، تم لوگ فریبی ہو، دھوکے باز ہو، اب شریف لوگوں کو دھوکا دینے لگے ہو...... لیکن میں تمہارے دھوکے میں نہیں آؤں گی سن لو تم۔'' وہ غصے میں بپھری بول رہی تھیں اور ان دونوں کو قہر آلود نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

''ماما، کسی نے آپ کو دھوکا نہیں دیا، یہ ڈاکٹر شمس ہیں انہوں نے بھی آپ کو دھوکا نہیں دیا، آپ ان کی بات اس لیے نہیں سن رہیں کہ آپ ہی سالہا سال سے غریبوں کو دھوکا دیتی آئی ہیں، اپنے حسین وعدوں سے اپنے خوب صورت لفظوں سے کہ تم لوگ تعلیم حاصل کر کے معزز شہری بن جاؤ گے تو لوگ تمہیں عزت سے اپنائیں گے۔ ماما میں نے آپ کے انہی خوب صورت جملوں سے آپ کا ایک حسین بت تراش رکھا تھا جو کہ میرے اندر بس رہا تھا۔ لیکن آج آپ نے اپنے... بدصورت رویے سے اس حسین بت کو پاش، پاش کردیا، ماما آپ نے خود اپنا بت توڑ دیا، آپ نے مجھے توڑ دیا۔ مجھے ریزہ، ریزہ کردیا، ماما آپ تو غریبوں کو بدلنے کی بات کرتی تھیں لیکن اپنے آپ کو اندر سے نہ بدل سکیں، آپ نے ڈاکٹر شمس کی ماں کی بہت انسلٹ کی ہے آپ کے اندر وہی طبقاتی اور معاشرتی تفریق اسی طرح موجود ہے۔ پھر آپ وہ سب کچھ کیوں کرتی رہیں؟ کیا صرف شہرت اور دولت کمانے کے لیے؟'' اس کی آواز رندھ گئی تھی وہ ہاتھ میں چہرہ چھپا کر رو پڑی...... اتنی دیر سے خاموش کھڑی ماہا نے پہلی دفعہ لب کشائی کی تو فاریہ کو اچانک اس کی موجودگی کا احساس ہوا وہ اس کی جسارت پر حیران تھیں، ان کی بیٹی تو کتنی بھولی اور معصوم تھی کہ اُن کے سامنے کبھی اس طرح کی کوئی بات نہ کی تھی اور آج؟ آج وہ ان دو ٹکے کے لوگوں کی خاطر اپنی ماما کے سامنے ڈٹ گئی تھی۔ انہیں ان کے ہی کہے ہوئے لفظوں سے زخمی کر رہی تھی۔

''خاموش ہوجاؤ ماہا، یہ رشتے ناتے کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے کہ میں تمہیں تمہاری پسند کا کھلونا دلا دوں، یہ تو ساری زندگی کا سوال ہوتا ہے، جس میں بہت سی باریکیاں دیکھی جاتی ہیں...... اور تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو، تمہارا یہاں کیا کام ہے؟ جاؤ اپنے کمرے میں۔'' انہوں نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا تو پھر ماہا وہاں رکی نہیں، دوڑتی ہوئی چلی گئی۔

''دیکھیے مسز خان، ہم نے آپ کے ساتھ کوئی فراڈ نہیں کیا، میں ایک ڈاکٹر ہوں باعزت پیشے سے منسلک ہوں، ماہا مجھے جانتی ہے اور ماہا کے کہنے پر ہی ہم آپ سے ملنے آئے ہیں۔ آپ ہمیں بات کرنے کا موقع تو دیں آپ کی غلط فہمیاں بھی دور ہوجائیں گی۔'' شمس نے ماحول کی ٹینشن دور کرنا چاہی تھی۔ وہ دھیرے، دھیرے بول رہا تھا۔

''اول تو یہ کہ مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، میں

رشیدہ کو اچھی طرح جانتی ہوں اور یہ تمہاری ماں ہے، میرے لیے یہی کافی ہے آگے میں کچھ نہیں سننا چاہتی، مجھے جو کہنا تھا کہہ دیا اگر تم شریف انسان ہو تو اپنی ماں کو لے کر یہاں سے چلتے بنو اور آئندہ یہاں کا خیال بھی نہیں کرنا...... ماہا تو نادان ہے، بچی ہے، میں اسے سنبھال لوں گی لیکن اب تم لوگ میرا اور وقت ضائع نہ کرو...... اور رشیدہ تمہارے بارے میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تمہیں دیکھ کر مجھے یہی خیال آیا کہ تم اتنے بڑے گھر میں ملازم ہوگی ہو تو ان کے اسٹینڈرڈ کے مطابق تمہارا یہ رکھ رکھاؤ ہوگیا ہے، یہ نہیں پتا تھا کہ تم ہی وہ مہمان ہو جس کی میں منتظر تھی۔ اب دفع ہو جاؤ اپنے بیٹے کو لے کر۔'' انہوں نے انتہائی تضحیک آمیز لہجے میں کہا تھا۔

''اوہ...... سوری، تمہارے ہاں تو مہمان آئے ہوئے ہیں، میں غلط وقت پر آگئی، چلو پھر آجاؤں گی، مائنڈ نہ کرنا فاریہ جان۔'' وہ جس طرح اچانک ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھیں اسی رفتار سے واپسی کے لیے قدم بڑھائے تھے۔

''نہیں، مسز فیض تم بالکل صحیح وقت پر آئی ہو، آؤ ان مہمانوں سے تمہارا تعارف تو کرادوں۔'' انہوں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔

''تم کہتی ہو تو ٹھیک ہے اور اتنے خوب صورت لوگوں سے تعارف حاصل کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوگی۔'' انہوں نے ڈاکٹر شمس کے قریب پہنچ کر ایک آنکھ دبائی تھی اور مسکرائی تھیں لیکن فاریہ خان اس وقت ایسی باتوں پر توجہ دینے کے موڈ میں قطعی نہیں تھیں۔ انہوں نے مسز فیض کو رشیدہ کے سامنے کھڑا کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم اسے جانتی ہو، یہ کون ہے؟'' مسز فیض نے ان کے سوال پر حیرانی سے انہیں دیکھا تو وہ خود ہی بول پڑیں۔

''یہ میری شادی سے کچھ عرصے پہلے کی بات ہے پھر بھی میں اسے پہچان گئی یہ رشیدہ ہے جو ہمارے گھر ملازمہ تھی، ملازمہ اور آج یہ اپنی اوقات سے اتنی بڑی ڈیمانڈ لے کر آئی ہے جو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' فاریہ خان نے رشیدہ کی طرف قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کہا تو مسز فیض کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''اور لگاؤ غریبوں کی بستیوں کے چکر اور ہمدردی کرو ان سے، دیکھا اب غریب تمہارے گھر تک فرمائشیں لے کر پہنچنے لگے ہیں، ویسے کیا مانگ لیا اس نے جو اتنے غصے میں ہو؟'' انہوں نے بڑی رازداری سے پوچھا تھا۔

''میری بیٹی کا ہاتھ......'' فاریہ خان پوری قوت سے چیخی تھیں۔

''ہائیں، صرف ہاتھ؟ کیسے دوگی؟'' مسز فیض نے آنکھیں اچکاتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

''نان سینس، کیا تم ہاتھ مانگنے کا مطلب نہیں سمجھتیں؟ اس نے ماہا کا رشتہ مانگا ہے اپنے اس بیٹے کے لیے۔'' فاریہ خان نے ایک، ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

''اوہ...... آئی سی...... پھر تمہارا کیا ارادہ ہے، لڑکا تو بہت خوب صورت ہے۔'' وہ اسی سنجیدگی سے پوچھ رہی تھیں۔

''کیا مطلب کیا ارادہ ہے، بے شک لڑکا خوب صورت ہے، ڈاکٹر ہے لیکن ہے تو ملازمہ کا بیٹا ناں...... اگر اس کا بیٹا پڑھ لکھ گیا اتفاق سے ڈاکٹر بھی بن گیا تو بھی کیا میں اپنی بیٹی کو ایک ملازمہ کی بہو بنا دوں گی؟'' فاریہ خان نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

''ماہا کہاں ہے؟ کیا اسے ان لوگوں کی آمد کا اور ان کے آنے کے مقصد کا علم نہیں۔'' مسز فیض نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسے علم کیوں نہیں ہے، اسی نے تو ان لوگوں کو بلایا ہے اور آج وہ ان لوگوں کے لیے میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس نے آج مجھ سے بہت بدتمیزی کی بہت بدزبانی کی، جانے یہ لوگ کب سے اسے شیشے میں اتار رہے تھے، وہ تو بچی ہے، نادان ہے، ان کی

ں میں آگئی۔ ان کی پلاننگ تو دیکھو پہلے اسے پکا کیا اس کے ذریعے مجھ تک پہنچ گئے...... لیکن میں کوئی تو نہیں ہوں، میرے پاس یہ لوگ کیا سوچ کر آگئے میں اس کی ماں ہوں، اس کی زندگی داؤ پر نہیں لگا ، ایسے لوگوں میں اس کا رشتہ نہیں کرسکتی، مسز فیض تم سے کہو کہ فوراً یہاں سے چلے جائیں میں اب میں برداشت نہیں کرسکتی میرا دماغ پھٹ جائے گا۔''

رائنگ روم سے جانے کو مڑی تھیں کہ مسز فیض نے ن پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا اور ٹھنڈے پانی کا گلاس لا انہیں پلایا اور خود بھی ان کے قریب بیٹھ گئیں۔

''ریلیکس مائی ڈیئر ریلیکس، جہاں بیری ہوتی وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں، تم اتنی ٹینشن نہ لو کچھ دیر ہیں بند کرلو اور مجھے کچھ بات کرنے دو۔'' مسز فیض ان کا پسینہ ٹشو سے صاف کیا پھر اُن کا ہاتھ اپنے ں میں نرمی سے تھامتے ہوئے بولیں۔

''فاریہ خان!'' پہلی مرتبہ انہوں نے فاریہ خان ان کے صحیح نام سے پکارا تھا اس لیے انہوں نے قریب بیٹھی مسز فیض کو چونک کر دیکھا لیکن پھر ی سے آنکھیں بند کرلیں، شاید وہ چیختے چیختے تھک یں اور مسز فیض کے نرم ہاتھوں کی ٹھنڈک انہیں ت پہنچا رہی تھی، وہ ایسے نڈھال ہوگئی تھیں جیسے اہ رہی ہوں اور مسز فیض دھیرے، دھیرے بول یں اور انہیں خواب سا لگ رہا تھا۔

''میں اس وقت تمہاری وہ باتیں نہیں دُہراؤں تم برسوں سے کہتی چلی آئی ہو...... کیونکہ میں جانتی کہ اس کا ایک، ایک لفظ تمہیں ازبر ہے، میں تو یہ کہنا چاہتی ہوں کہ تم اپنی باتوں، اپنے لفظوں ادو کے اثر سے خود لاعلم ہو، تم جانتی ہی نہیں کہ باتوں کے طلسم نے اگر زیادہ نہیں تو بھی ہم لوگوں کی زندگی یکسر بدل کر رکھ دی۔''

''کیا مطلب تم جیسوں کی؟'' فاریہ خان میں ہی بول پڑی تھیں گویا انہیں کرنٹ لگا ہو۔

''مطلب یہ کہ میرا تعلق بھی تو ایک گاؤں سے

ہے۔'' مسز فیض نے مسکرا کر کہا تو انہوں نے دوبارہ صوفے کی پشت سے سر لگا کر آنکھیں موند لیں، ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ مسز فیض نے ڈاکٹر شمس اور رشیدہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ دونوں خاموشی سے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے تو مسز فیض نے اسی لہجے میں اپنی بات دوبارہ شروع کی۔

''ہاں! میں بھی ایک پسماندہ گاؤں کی رہنے والی ہوں، ایک مرتبہ وہاں بھی کچھ سوشل ورکرز آئی تھیں وہ بھی بالکل ایسی ہی باتیں کر رہی تھیں جیسی تم کرتی ہو۔ وہ اپنی باتوں سے میرے ننھے سے ذہن میں علم کا دیا روشن کر گئیں اور میں اسی روشنی میں آگے بڑھنے لگی پھر......... میں نے کچھ تعلیم گاؤں میں اور باقی اس روشنیوں کے شہر میں اپنے بھائی، بھابی کے پاس آ کر حاصل کی اور اس سفر میں، میں .... نے جو صعوبتیں برداشت کیں، وہ الگ ایک طویل داستان ہے جو پھر کبھی سناؤں گی۔ مختصر یہ کہ مجھے میری لگن، انتھک محنت اور جدوجہد کا پھل مل گیا اور آج میں تمہارے سامنے ایک کامیاب سائیکالوجسٹ کی حیثیت سے ہوں۔ میرے ساتھ، ساتھ میرا بھتیجا تاج بھی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ میری بھابی نے کچھ عرصہ تو مجبوراً لوگوں کے گھروں میں کام کیا پھر ایک سلائی اسکول میں سلائی کٹائی سیکھی اور اس کام میں اس قدر محنت کی کہ بہت جلد ڈیزائنر بن گئیں اور آج ایک بہت بڑا مشہور بوتیک چلا رہی ہیں، عروسہ بوتیک کا نام تو سنا ہوگا تم نے؟'' انہوں نے فاریہ خان کا ردِعمل دیکھنے کے لیے خاموشی اختیار کی۔

''عروسہ بوتیک، جہاں کے ڈریس بہت پسند کیے جاتے ہیں؟ میں بھی وہاں سے لیتی ہوں۔'' فاریہ خان کی آنکھیں کھل گئیں انہیں دوسرا جھٹکا لگا تھا۔

''ہاں وہی، وہ میری بھابی کا بوتیک ہے جہاں کی لڑکیاں ان کے انڈر کام کرتی ہیں اور جہاں میری بھابی ملازمہ رشیدہ نہیں بلکہ بڑی عزت سے میڈم رشیدہ کہلاتی ہیں۔''

''کیا......؟'' فاریہ خان جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھیں اور تینوں کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

''فاریہ خان، اس میں اتنی حیرانی کی کیا با ہے، اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو رائگاں نہیں جانے اگر کوئی غریب بھی محنت کرے تو اسے بھی معاشرے میں اعلیٰ مقام ملتا ہے، شرط صرف پور خلوص اور ایمانداری کی ہے فاریہ خان، گاؤں سیدھے سادے لوگ بہت محنتی ہوتے ہیں، انہیں صحیح راستہ دکھانے والا ہو تو یہ ہر معرکہ سر ہیں لیکن افسوس کہ اس معاشرے میں ان کی قدر والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس لیے انتھک محنت کر کے بھی ناکام رہتے ہیں اور ہو جاتے ہیں اور بڑی، بڑی پوسٹوں پر بیٹھے اقربا پروری کے نئے ریکارڈ قائم کرنے میں ہیں، خیر چھوڑو...... پھر یہ ہوا کہ ایک تقر فیضیاب نے مجھے دیکھا اور پسند کر لیا۔ وہ کچھ پہلے باہر سے بزنس ایڈمنسٹریشن کا کورس کر تھے۔ ان کے بابا جان جو بہت بڑے مل اونر کی بے جان کچھ دن بعد ہی میرے چھوٹے سے گھر میں میرے لیے رشتہ لے کر حالانکہ میں نے تو اپنا بیک گراؤنڈ فیضیاب ایمانداری سے بتا دیا تھا اور ہمارا لائف اسٹ ان کے سامنے ہی تھا لیکن وہ اتنے بڑے سچے اور مخلص تھے کہ کسی بات کو بھی اپنی انا نہیں بنایا اور اپنے بیٹے کی پسند کو بہت پیار بیاہ کر لے گئے اور ان کے پیار میں ہمیشہ اللہ رہا۔ ارباب انڈسٹری کے مالک ارباب کے والد جنہیں دنیا جانتی ہے اور اب تو فیض کے ہر کام کو انجام دیتے ہیں تاکہ اس عمر آرام مل سکے۔'' فاریہ خان حیرانی سے کبھی صورت تکنے لگتیں اور کبھی سر جھکا لیتیں پھر کہ آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ، بہہ کر بھگونے لگے۔ مسز فیض نے مطمئن نظروں طرف دیکھا اور پھر بولنے لگیں۔

''اور میرا بھتیجا تاج بھی آج ایک اچھی پوسٹ زہے، اس نے بھی ایک پوش علاقے میں اپنا گھر ہے اور اس کے والدین بھی اس کے ساتھ رہتے ایک معزز گھرانے نے اپنی بیٹی کو میری اسی بھابی بہو بنایا ہے جسے تم اپنی بیٹی کی ساس بنانے میں محسوس کر رہی ہو، وہ اس لیے کہ تم میں اعتماد کی دکی ہے۔ تم نے اپنی باتوں کو خود کبھی سچا نہیں سمجھا لیے کبھی سوچا بھی نہیں کہ کبھی کوئی غریب بھی اہم حیثیت بن کر تمہارے سامنے آ کھڑا ہوگا۔ تم لوگ غریبوں کی ترقی کی باتیں تو خوب بڑی، بڑی تے ہیں لیکن دل سے کبھی کسی غریب کی ترقی کو نت نہیں کر سکتے۔ میں جانتی ہوں کہ چند بہت بڑی این جی اوز ہیں جو واقعی پوری سچائی اور نیت سے اپنے مشن پر ڈٹی ہوئی ہیں اور لوگوں کی و بہبود کے لیے بہت سرگرم عمل ہیں لیکن ان کی بہت کم ہے اور میں انہیں بھی جانتی ہوں جنہوں تمہاری طرح صرف پیسہ کمانے کے لیے چھوٹی، ڈھیروں این جی اوز کھول رکھی ہیں جو کہ نفع نے کے بجائے الٹا نقصان پہنچا رہی ہیں، واقعی تم ک جتنا پیسہ فلاحی کاموں کے نام پر بٹورتے ہو اس میں سے آدھا بھی کسی اچھے کام پر لگا دیا تو آج اس قوم کے کتنے مسائل حل ہو چکے ۔ اگر کچھ گاؤں میں صرف عورت کے لیے ہی صحت اور روزگار کا انتظام کر دیتے تو وہاں کی شہر میں آ کر ملازمہ نہ کہلاتی وہ وہیں عزت کے پنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پال رہی ہوتی، میں ہوں کہ کبھی کوئی ایسا آئے گا جو اس دیرینہ خواب کر سکے گا، بتاؤ کیا کوئی ایسا کر سکتا ہے، کیا تم ایسا ہو؟'' مسز فیض نے فاریہ خان کے کندھے پر تے ہوئے بڑے دکھ سے کہا تھا۔ آج نہ جانے اندر سے کب کا بھرا ہوا غبار نکل رہا تھا۔

میں کروں گی! ہاں اب میں بالکل ایسا ہی ی جیسا کہ تم کہہ رہی ہو، تم نے میری آنکھیں ی ہیں، میرا ضمیر جگا دیا ہے، میں وعدہ کرتی

غزل

وہ کہہ رہے تھے مجھ سے ہستی مری مٹا کے
پھر سے گلے لگا لو ظلم و ستم بھلا کے

دیتے ہیں لوگ دھوکا نزدیک اپنے لا کے
یاں خاک ہوتے دیکھے ہم نے سبق وفا کے

بھیجا پیام ماں کو ہے ہاتھ سے ہوا کے
بس اک نظر تو دیکھو اس لاڈلی کو آ کے

تم کو ملے گا کیا ماں یوں مجھ کو آزما کے
رو، رو کے تھک گئی ہوں تم کو بلا بلا کے

میں سوچتی ہوں اکثر یہ اِک سوال الجھا
دنیا نہیں ہے تھکتی کیوں میرا دل جلا کے

کیسے بدل گئے ہیں سب جاں نثار میرے
کرتے ہیں مجھ سے باتیں آنکھیں دکھا دکھا کے

کہتی ہے بس شگفتہ اپنا مسیحا اس کو
ہاں زندگی ملی تھی شہرِ سخن میں جا کے

کلام: شگفتہ شفیق، کراچی

ہوں مسز فیض کہ اب میں پوری ایمانداری سے مستحق لوگوں تک ان کا حق پہنچاؤں گی، میری گزشتہ غلطیوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے، مجھے تو آج اس بات کا ادراک ہوا کہ جب ہماری کھوکھلی باتوں اور جھوٹے وعدوں کا لوگوں پر اس قدر اثر ہوتا ہے تو پُر خلوص جذبوں سے کی گئی باتوں اور کاموں کا کتنا اثر نہ ہوگا، مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے گویا میں آج پہلی مرتبہ اپنے آپ سے مل رہی ہوں، مسز فیض تمہاری آج کی باتوں نے مجھے میرے اندر سے روشناس کرایا ہے مجھے میری حقیقت سے آگاہی دی ہے، میں تمہاری بہت مشکور ہوں۔'' وہ خواب کی سی کیفیت میں بولے جا رہی تھیں، مسز فیض نے ان کے ہاتھوں کو پیار سے تھام لیا۔

''بس، اب جب تمہیں اپنی تمام گزشتہ غلطیوں کا احساس ہوگیا ہے اور تم نے اتنا نیک ارادہ کرلیا ہے تو فاریہ خان، تم مجھے اپنے سے الگ نہ سمجھنا، میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ، ساتھ ہوں گی۔'' مسز فیض نے ان کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''فاریہ خان میری دعا ہے کہ تم اپنے اس وعدے میں پوری طرح کامیاب رہو.....'' خوشی ان کے چہرے پر پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''مسز فیض میں تم سے ہی نہیں اپنے آپ سے بھی وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی تمام غلطیوں کا ازالہ کروں گی۔'' فاریہ نے یک لخت آبدیدہ لہجے میں کہا تو ان کے لبوں پر گہری مسکراہٹ آگئی۔

''فاریہ خان تم نے اپنے آپ سے بھی وعدہ کرلیا ہے تو ضرور کامیاب رہو گی کیونکہ اپنے آپ سے کیا گیا وعدہ بہت سچا، پکا اور اہم ہوتا ہے۔ بہت عرصہ پہلے میں نے بھی اپنے آپ سے ایک وعدہ کیا تھا اور تب سے آج تک اسے پورا کرنے کی تگ و دو میں لگی ہوئی تھی اور آج میں بے انتہا خوش ہوں کہ اللہ کے فضل و کرم سے آج میں اپنا وعدہ پورا کرنے میں سرخرو ہوئی اور آج میں اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی ہوں۔'' بے اختیار فاریہ خان کی متجسس نظریں ان کی طرف اٹھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں۔

''یہ بہت پرانی بات ہے جب تم اسٹوڈنٹ تھیں اور میں بھی...... وہ چھٹی کا دن تمہیں تو یاد بھی نہ ہوگا لیکن میں وہ دن آج تک نہیں بھول پائی...... اس دن میری بھابی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو انہوں نے اپنی جگہ مجھے تمہارے گھر بھیج دیا تھا جب میں تمہارے کمرے کی ڈسٹنگ کر رہی تھی تو کتابوں کے شیلف میں رکھے انگلش ناول پر میری نظر پڑی تو میں نے اسے بے اختیار اٹھالیا، ابھی میں بڑی دلچسپی سے اس کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہی تھی کہ اچانک تم چند فرینڈز کے ساتھ ہنستی کھلکھلاتی کمرے میں داخل ہوئیں اور مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئیں...... کون ہو تم؟'' تم نے قریب آکر پوچھا تھا۔

''ناہید ہوں آج بھابی کی رشیدہ کی طبیعت خراب تھی تو میں کام کرنے آگئی۔''

''لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' تم نے کھردرے لہجے میں پوچھا تھا۔

''ڈسٹنگ کر رہی تھی اور آپ کی کتابوں کو ترتیب دے رہی تھی۔'' میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

''تم جاہل گنوار لڑکی، تمہیں کیا معلوم کتابوں کی ترتیب کے بارے میں، میں نے تمام سبجیکٹ الگ، الگ سیٹ بنا کر رکھے تھے اور تم بیڑا غرق کر آگئیں، چلو دفع ہوجاؤ یہاں سے۔'' تم نے غصے سے چلا کر کہا تھا میں سر جھکائے وہاں سے چل دی۔

''ارے اس لڑکی کی تو اردو تو بالکل صاف ہے۔''

''ڈریس اور چال ڈھال سے بھی ملازمہ نہیں لگ رہی۔'' تمہاری سہیلیاں بہ آواز بلند مجھ پر رائے زنی کر رہی تھیں۔

''ارے بھئی گھاٹ، گھاٹ کا پانی پیے ہوتی ہیں اور پھر ہمارے، تمہارے جیسے گھروں میں کام کرکے سارے ہی طور طریقے سیکھ لیتی ہیں، گنوں کی پوری ہوتی ہیں یہ...'' تم نے سہیلیوں کے جواب میں نہایت تحقیر آمیز لہجے میں کہا تھا اور پھر تمہارے گھر سے پہلے میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ

دن تمہیں تمہارے اندر سے بدلوں گی اور تمہیں انسانوں کی عزت کرنا سکھا دوں گی اور اس کا یعنی اپنے قریب آنے کا موقع تم نے خود مجھے فراہم کیا، میں تو اپنے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے کب سے کوشاں تھی، اللہ کا شکر ہے کہ آج میں اپنے مشن میں کامیاب ہوگئی ہوں۔'' مسز فیض نے ہنستے ہوئے کہا، فاریہ خان نے محسوس کیا آج پہلی مرتبہ ان کی آنکھیں بھی ان کی ہنسی کا ساتھ دے رہی ہیں۔

''مسز فیض، ریئلی میں اپنی ہر بات پر سخت شرمندہ ہوں، خدا کے لیے مجھے اور شرمندہ نہ کرو، اب تو میں ڈاکٹر شمس سے ماہا کا رشتہ کرنے کو بھی بخوشی تیار ہوں۔'' انہوں نے سر جھکا کر اتنی معصومیت سے کہا کہ مسز فیض نے انہیں بانہوں میں بھرلیا۔

''اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم ملازمہ رشیدہ کو اپنی سمدھن بنا رہی ہو یا میڈم رشیدہ کو؟'' ان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''بس، اب تم جو بھی سمجھ لو اور اب میں تمہاری بھابی سے بھی اپنے کچھ دیر پہلے کے رویے کی معافی مانگتی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں تو رشیدہ بھی ہاتھ جوڑے اُن کی طرف بڑھیں۔

''معافی تو مجھے آپ سے مانگنی ہے، یہاں آکر مجھے احساس ہوا کہ واقعی بغیر سوچے سمجھے مجھے آپ کے پاس نہیں آنا چاہیے تھا، بڑی بھول ہوئی مجھ سے۔'' رشیدہ بری طرح رو رہی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' فاریہ خان نے ان کے جڑے ہاتھوں کو علیحدہ کرتے ہوئے گلے لگالیا اور ساتھ لے کر بھی بیٹھ گئیں۔

''فاریہ خان، جب اتنا کچھ ہوگیا تو ایک آخری بات جو رہ گئی ہے وہ بھی ہوجائے۔'' مسز فیض نے اس منظر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے شوخ سے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے، اب جو آخری بات رہ گئی ہے یا تمہیں یاد آگئی ہے وہ بھی جلدی سے کہہ ڈالو۔ معلوم نہیں ابھی تم میرے اور کتنے جرم گنواؤ گی؟'' ان کا انداز کچھ ایسا تھا کہ مسز فیض کو ہنسی آگئی۔

''نہیں، نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ اب تو میں ایک اعتراف کرنا چاہ رہی ہوں امید ہے تم مجھے معاف کردو گی۔'' ان کی بات پر ڈاکٹر شمس نے..... بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ رشیدہ کی بھی پوری توجہ ان کی طرف ہوگئی تھی جو معلوم ہو رہا تھا مناسب الفاظ ڈھونڈ رہی ہیں، چند لمحے بعد بولیں۔

''فاریہ خان یقین جانو آج میں تم سے کچھ بات کرنے آئی تھی، تم سے کچھ مانگنے آئی تھی لیکن یہاں کی سچویشن نے مجھے کچھ نہ کہنے دیا۔'' انہوں نے شمس کی طرف بڑے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں تو اپنے بیٹے شمس حبیب اور ماہا کے رشتے کی بات کرنے آئی تھی۔''

''کیا کہا؟ شمس کیا تمہارا بیٹا ہے؟'' وہ کچھ حیران اور کچھ خوش تھیں جیسے یقین اور بے یقینی کی درمیانی کیفیت میں ہوں۔ ''لیکن تم نے کبھی اپنے بیٹے کا ذکر نہیں کیا۔'' انہوں نے شمس کی طرف دیکھا۔

''ہاں اتفاق سے شمس کا ذکر کبھی ہماری باتوں میں نہیں آیا، بھابی نے اسے اتنا پیار دیا کہ یہ شروع سے ہی انہیں ماں مجھے مدر اور اپنی دادی جان کو ماما کہتا ہے، یہ بات ماہا کو بھی معلوم ہے لیکن تم نے تو کسی کو کیا، اسے بھی بولنے کا موقع نہیں دیا، دراصل ماہا نے آج شمس کو اور مجھے ہی انوائٹ کیا تھا لیکن میں نے اس سے آنے کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا حالانکہ وہ بہت بضد تھی، میں نے تو دونوں کو سمجھایا بھی تھا کہ پہلے میں خود سے تم سے اکیلے میں بات کروں گی تمہارا عندیہ لوں گی تمہیں سمجھاؤں گی پھر باقاعدہ رشتہ ڈالوں گی، ضرور شمس نے اس سے وعدہ کرلیا ہوگا اور جب میں ہاتھ نہ لگی تو اپنی ماں کو لے کر پہنچ گیا، دراصل ان بچوں کو ان ساری باتوں کا علم ہی کہاں تھا جو آج ان کے سامنے آئیں اور اتنا خطرناک رخ اختیار کر گئیں لیکن میں تو تمہیں اور اپنے آپ کو جانتی تھی اسی لیے مجھے یہی ڈر تھا کہ جانے تم یہ رشتہ قبول کرتی ہو یا نہیں۔ ظاہر ہے بھابی کے

بارے میں تمہیں پتا چلنا ہی تھا اسی لیے میں تم سے پہلے اکیلے میں بات کرنا چاہتی تھی۔“

”بقول تمہارے اگر ماہا اور شمس اس حقیقت سے نا آشنا تھے تو ماہا نے مجھ سے ایسی باتیں کیسے کہیں اور شمس میری باتوں پر اتنے مطمئن کیسے تھا، ان باتوں سے تو ظاہر ہوتا ہے سب کچھ دونوں کے علم میں تھا؟“ فاریہ خان کے اس قدر معقول سوال پر مسز فیض بھی چونک گئی تھیں پھر دفعتاً ان کی نظریں اپنی بھابی کی شرمندہ نظروں سے ملیں۔

”یہ سب باتیں میں نے ان دونوں کو سمجھانے کے لیے بتائی تھیں، میں نے بہت سمجھایا کہ میرا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے، میں یہاں آنے کو بالکل راضی نہیں تھی لیکن ان دونوں کا یہی کہنا تھا کہ اتنے عرصے بعد پہچان لینے کا کوئی خدشہ نہیں ہے جبکہ آپ پہلے سے کافی بدل چکی ہو اگر ایسا ہوا بھی تو ہم دونوں سنبھال لیں گے اور ماہا بیٹی کو تو اپنی ماما سے بہت امید تھی کہ وہ مجھ سے میری موجودہ حیثیت میں مل کر بہت خوش ہوں گی بس شمس مجھے زبردستی لے آیا۔“ وہ احساسِ شرمندگی سے روہانسی ہو رہی تھی۔

”اچھا تو تم سے مل کر یہ کھچڑی جانے کب سے پکا رہے تھے اور مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی۔“ فاریہ خان بہت خفا تھیں۔

”نہیں فاریہ خان ایسا نہیں ہے، شمس نے کئی مرتبہ مجھے اپنی پسند کی لڑکی سے ملنے کو کہا تھا۔ لیکن مجھے فرصت ہی نہیں ملی ابھی چند روز بیشتر ہی شمس نے مجھ سے ملوایا تھا تو میرے علم میں آیا کہ وہ اور کوئی نہیں اور اپنی ماہا ہے اور جب سے ہی میں ان دونوں کو ٹالتی رہی اور پہلے تم سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ خیر جو کچھ ہوا شاید اسی میں ہماری بہتری ہو اور اب تو ہمارے چاند سورج کی جوڑی مکمل ہو جائے گی، میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی کیا بات ہو سکتی ہے؟“ انہیں واقعی.... بے انتہا خوشی تھی۔

”میں ماہا کو دیکھ کر آتی ہوں، اب تک تو رو، رو کر اس نے اپنی جانے کیا حالت کر لی ہوگی۔“ سکون سے ہی فاریہ خان کو بیٹی کے خیال نے تڑپا دیا تھا۔

”تم بےفکر رہو، وہ بالکل ٹھیک ہے، تمہیں معلوم ہی نہیں کہ اتفاقاً ان دونوں کے پیچھے میں بھی آ پہنچی تھی اور خاموشی سے دروازے سے لگ کر سب کچھ سنتی رہی تھی اور پھر اس کے جاتے ہی اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ مجھے دیکھ کر اس کی کافی ہمت بندھی تھی اور میں اسے اچھی طرح سمجھا آئی تھی کہ اسے فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اللہ سب بہتر کرے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا اور یہ کہ اس کی ماما کو دو چار جھٹکے لگ... پڑیں گے تو ان کا بہت پرانا مرض جاتا رہے گا۔ کیا... جائے نفسیاتی علاج میں بعض اوقات یہ جھٹکے دینے بہت ضروری ہو جاتے ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

”اچھا، تو کیا میں نفسیاتی مریضہ ہوں؟“ فاریہ خان نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

”نہیں، اب نہیں ہو...... لیکن اس وقت تھیں، اب تم بالکل ٹھیک ہو اس لیے علاج ختم۔“ ان کے لہجے میں شرارت تھی۔

”تم سچ کہہ رہی ہو...... کیونکہ تمہاری باتوں... بعد میں نے شمس کو رشیدہ کا بیٹا سمجھتے ہوئے ہی رشتہ قبول کر لیا تھا۔“ فاریہ خان اعتراف کر رہی تھیں۔ کچھ عرصے بعد ہی دلہن بنی ماہا رخصتی کے وقت اپنی ماں سے لپٹ گئی۔

”یو آر گریٹ ماما۔“ کہہ کر وہ رو پڑی۔

”پگلی!“ ماما، فاریہ خان نے ہنستے ہوئے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ کچھ دور کھڑے فیض حبیب اور... خان وہ زمانہ یاد کر کے ہنس رہے تھے جب دونوں کلاس فیلوز ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس کے بعد کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ کتنا زمانہ بیت گیا تھا کہ وہ پرانی یادیں... ذہن سے محو ہو چکی تھیں اور آج برسوں بعد ان کے بچوں نے انہیں کتنی خوب صورت زنجیر سے باندھ دیا تھا۔ ... حسین اتفاق تھا یہ جس پر دونوں متفق اور خوش تھے۔

جاں سے گزر گئے

اُم ارفع

آج پھر اس کی آنکھ شور سے کھلی۔

”اب کیا ہو گیا؟“ اس نے کوفت سے سوچا کسلمندی سے اٹھ کر چپل پہنی اور منہ پر پانی کے چھپاکے مار کر کچن میں ماں کے پاس آ بیٹھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ کچھ دیر یکلخت ماں کا غمزدہ چہرہ دیکھتی رہی پھر آہستگی سے سوال کیا۔

”کچھ نہیں بیٹا تم خواہ مخواہ پریشان مت ہو۔“ ماں نے توے سے روٹی اتار کر چنگیر میں اس کے سامنے رکھتے ہوئے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ماں کی آنکھوں کی نمی دیکھ کر اس کا دل مغموم ہو گیا۔ باوجود کوشش کے وہ دو تین نوالوں سے زیادہ حلق سے نیچے نہ اتار سکی تو خاموشی سے چائے کا کپ لے کر کمرے میں آ گئی۔ فرحانہ کمرے میں بستر وغیرہ تہ کر کے رکھ رہی تھی۔

”کیا ہو گیا تھا آج پھر......؟“ بستر پر بیٹھتے ہوئے اس نے بہن سے سوال کیا۔

”تمہاری وجہ سے ہوا ہے سب کچھ۔“ فرحانہ غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔



''میری وجہ سے؟'' وہ حیران رہ گئی۔
''ہاں کتنی بار تو تمہیں سمجھا چکی ہیں امی بھی اور میں بھی کہ دادی کو اچھا نہیں لگتا تھا تمہارا صبح کے وقت سونا، ختم کر دو اب اپنی یہ عادت۔''
''اچھا تو یہ ہے وجہ اس سب ہنگامے کی، جب قصور میرا ہے تو مجھے کہتیں دادی، امی سے کیوں خواہ مخواہ جھگڑا کیا صبح سویرے۔''
''آہستہ بولو، خدا کے لیے دادی پھر سن لیں گی۔'' اس کی تیز آواز سن کر فرحانہ نے سہم کر اسے ٹوکا اور وہ ہونہہ کہہ کر رہ گئی۔

☆☆☆

''دادی آپ کتنی اچھی ہیں ناں......'' فرحانہ اپنی صلح جو طبیعت کی وجہ سے مجبور تھی جب بھی گھر میں کوئی تلخی ہوتی تو وہ پریشان ہو جاتی۔ اب بھی دادی کو باہر برآمدے میں لیٹے دیکھا تو پاس آ بیٹھی اور آہستہ، آہستہ دادی کی ٹانگیں دبانے لگی۔
''امی بھی اچھی ہیں اور آپ بھی......تو پھر کیا وجہ ہے کہ آپ کو اتنا غصہ آجاتا ہے۔'' اپنی تعریف سن کر دادی کے چہرے پر جو شادابی آئی تھی اس نے ماں کی تعریف کی تو پل بھر میں غائب ہو گئی۔
''تمہاری ماں اچھی ہے؟ ہرگز نہیں، میں تو کوستی ہوں اس دن کو جب میں تمہاری ماں کا رشتہ لینے گئی تھی۔ ساری زندگی کے لیے اپنے بیٹے کے لیے اپنے ہاتھوں سے بے سکونی مول لے آئی۔ سجاد کا ایک وارث تک نہ پیدا کر سکی تمہاری ماں، ہاں تمہارے دادا کی نسل ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی، کہتی ہوں سجاد کو دوسری شادی کر لو مگر کم بخت یہ ادلے بدلے کا رشتہ نہ ہوتا تو ناں......اِدھر سجاد دوسری شادی کا نام لیتا ہے اُدھر زینت کے گھر میں بھونچال آجاتا ہے۔ میری آنکھیں ترس گئیں پوتا دیکھنے کو اور سجاد بھی بیٹے کی آس دل میں ہی لیے دنیا سے چلا جائے گا۔'' اب ان کی آواز رندھ گئی تھی۔
''ابا کی کون سی دولت لٹ رہی ہے کہ جس کا وارث ہونا ضروری ہے، مشکل سے تو دو وقت کی ہماری روٹی پوری کرتے ہیں۔'' فرحانہ دادی کی باتیں سن کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی، باوجود کوشش کے وہ اپنے لہجے کی مصنوعی نرمی اور شگفتگی کو تا دیر قائم نہ رکھ سکی تو تلخی سے بولی۔
''ہاں بھئی، عفت کی اولاد سے میں ایسے ہی رویے کی توقع رکھتی ہوں چلی جاؤ یہاں سے۔'' نرم لہجے میں کہی گئی سخت بات دادی کو سخت گراں گزری۔ اس کے ٹانگیں دباتے ہاتھوں کو وہ پرے جھٹکتے ہوئے بولیں۔ فرحانہ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے خاموشی سے اٹھ گئی۔
''کیا ضرورت تھی تمہیں دادی کے پاس جانے کی......'' ریحانہ اس کی اور دادی کی باتیں سن رہی تھی اور اب فرحانہ کو روتے ہوئے واپس آتے دیکھا تو غصے سے بولی۔
''تمہیں افسوس نہیں ہوتا گھر میں ہر وقت کے لڑائی جھگڑے دیکھ کر......لوگوں کے گھروں میں سکون دیکھتی ہوں اور پھر اپنے گھر کی بے سکونی تو بے چین ہو جاتی ہوں۔ میں نے سوچا شاید ان تمام جھگڑوں کا کوئی حل نکل آئے مگر......''
''اب تو سن لیا ہے ناں تم نے خود اپنے کانوں سے دادی کا مسئلہ......ان کا مسئلہ درحقیقت ایک پوتا ہے اور اس عمر میں اب یقیناً ان کی خواہش پوری ہونے کے کوئی چانس نہیں اس لیے سوچ لو اور ذہن بنا لو کہ گھر میں ہر وقت یونہی لڑائی جھگڑے ہی رہیں گے۔ جب انسان کسی بات کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار ہو تو اس کا سامنا کرنے میں مشکل اور دشواری پیش نہیں آتی۔'' ان کے گھر میں ہمیشہ یونہی لڑائی جھگڑے رہتے تھے۔ نور فاطمہ بہت سخت گیر اور تند مزاج عورت تھیں، سجاد ان کا اکلوتا بیٹا تھا بیٹے کی شادی کے بعد انہیں ہر دم یہ فکر رہنے لگی کہ کہیں ان کی بہو ان سے ان کے بیٹے کو نہ چھین لے، اس لیے شروع ہی سے انہوں نے اپنی بہو عفت کو دبا کر رکھا۔ عفت ایک صلح جو اور امن پسند عورت تھی، لڑائی جھگڑے سے وہ ہمیشہ دور بھاگتی اس کے اس رویے نے نور فاطمہ کو ہمیشہ حوصلہ دیا اب ان کی عادت بن گئی تھی

...ات بے بات عفت کو زچ کرنے کی، عفت کی دو ...یاں ہوئیں ریحانہ اور فرحانہ ایک بیٹا بھی ہوا تھا مگر وہ ...پن میں ہی انتقال کر گیا تھا فرحانہ اور ریحانہ جب کچھ ...ی ہوئیں تو گھر میں موجود تلخیوں کا انہیں بھی احساس ...نے لگا۔ جب وہ دادی کو خواہ مخواہ ماں سے جھگڑتا ...کھتیں تو دلی طور پر دادی سے خفا رہتیں مگر منہ سے کچھ نہ ...ہتیں۔ اب ریحانہ اور فرحان نویں اور دسویں کلاس ...ں آ چکی تھیں، ہفتے کے چھ دن وہ صبح اسکول جاتیں تو ...وپہر کو واپس آتیں گھر کے جھگڑوں سے وہ بے خبر رہتیں ...گر اتوار کے دن......آج ریحانہ نمازِ فجر کے بعد تھوڑی ...یر سو گئی، چھٹی تھی اس لیے زیادہ دیر سو گئی کہ دادی کی ...آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔

☆☆☆

''سجاد تمہیں پتا ہے رات کو میں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔'' صبح، ہی صبح ریحانہ اسکول جانے کی تیاری کر رہی تھی جب اس نے دادی کی آواز سنی۔
''کیوں اماں جی......؟'' ابو نے سرسری سے ...نداز میں ان سے پوچھا۔
''تمہیں فرصت ہو تو ماں کا خیال رکھو، ماں سے ...کچھ حال احوال پوچھو، میں مروں یا جیوں میرے بیٹے ...کو اس بات کی کوئی فکر نہیں۔'' دادی اب باقاعدہ روتے ...ہوئے کہہ رہی تھیں۔
''عفت!'' ابو نے غصے سے آواز دی۔
''جی......'' عفت بیگم، شوہر کی آواز سنتے ہی ...دوڑی چلی آئیں۔
''اماں نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا اور تم نے ...مجھے بتایا تک نہیں۔'' وہ غصے سے دہاڑے۔
''مگر اماں کو تو میں ریحانہ کے ہاتھوں کمرے میں ...کھانا بھیجا تھا۔ اماں نے صرف دودھ کا گلاس مانگا تو میں خود ...پوچھنے آئی تھی ان سے کہ آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا۔''
''اچھا ٹھیک ہے آئندہ سے اماں کو کھانا میں خود ...دوں گا۔'' بیوی کی وضاحت سن کر سجاد کچھ نرم پڑ گئے۔
''اماں مجھ سے غلطی ہو گئی آئندہ کوشش کروں گا کہ اس قسم کی کوتاہی نہ ہو۔'' ماں کے پاس بیٹھ کر وہ شرمندگی سے کہنے لگے۔

☆☆☆

''نہ جانے کیا چاہتی ہیں یہ، کیوں سمجھ نہیں آتی ابو کو، گلا گھونٹ کر مار دیں ہمیں، روز کے مارنے سے تو بہتر ہے ناں۔'' ریحانہ روتے ہوئے غصے سے چیخ رہی تھی۔
''آہستہ بولو۔'' امی دہل کر بولیں۔
''ابو نے یا دادی نے سن لیا تو پھر پتا ہے ناں کیا ہوگا۔'' فرحانہ نے ناگواری سے بہن کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''جان سے ماردیں گے ناں، میں بھی یہی چاہتی ہوں گلا گھونٹ دیں وہ ہمارا۔''
''خدا کے لیے چپ ہو جاؤ۔'' فرحانہ غصے سے بولی۔
ریحانہ کی آج صبح ہی شامت آگئی تھی۔ دادی کا حکم تھا کہ جب ان کی بیٹی گھر آجائے تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر ان کی خاطر مدارات میں لگ جاؤ۔ ریحانہ سے آج یہی غلطی تو ہو گئی۔ بائیولوجی کا پیپر تھا اور وہ کمرا بند کیے پڑھ رہی تھی کہ اس کی پھپو آگئیں، پھپو کی آواز سن کر وہ باہر آئی سلام کر کے وہ تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھی پھر وہ پڑھنے کے لیے دوبارہ کمرے میں آگئی۔
''فرحانہ میری پیاری بہنا، میرا بہت مشکل پرچا ہے اور مجھے کچھ نہیں یاد......پلیز مجھے پڑھنے دینا اور تم خود پھپو کے لیے چائے وغیرہ بنا دو۔''
''ٹھیک ہے میری بہن تم آرام سے پڑھو نو ٹینشن میں سب سنبھال لوں گی۔'' فرحانہ نے بہن سے کہا۔
''میری اچھی بہنا میری پیاری بہنا۔'' فرحانہ کے مان جانے پر ریحانہ خوش ہو گئی۔
''اچھا، اچھا اب پڑھنا ہے تو پڑھو، زیادہ مکھن مت لگاؤ۔'' فرحانہ ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئی اور پھر پھپو کو چائے دے کر وہ ان کے لیے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔

☆☆☆

''کیا فائدہ لڑکیوں کو پڑھانے کا سجاد......'' سجاد گھر میں داخل ہوئے تو دادی پھٹ پڑیں۔

"کیوں، کیا ہوا اماں؟" سجاد حیران رہ گئے۔

"ارے سنا تھا تعلیم شعور دیتی ہے، انسانیت سکھلاتی ہے مگر یہاں تو سب اس کے الٹ ہے۔"

"ارے مگر ہو کیا گیا اماں؟" سجاد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ بولے۔

"ارے میری بیٹی اتنے دنوں بعد میکے آئی اور ریحانہ کمرا بند کر کے بیٹھ گئی۔ زینت جاتے ہوئے کہہ رہی تھی اماں آپ خود ہی ملنے آجایا کریں، آپ کی پوتیوں کو شاید میرا آنا اچھا نہیں لگتا۔"

دادی کہتے ہوئے زارو قطار رونے لگیں۔

سجاد وہیں بیٹھ کر ماں کو چپ کروانے لگے۔

"کل سے کوئی اسکول نہیں جائے گا۔" انہوں نے وہیں بیٹھے، بیٹھے غصے سے اونچی آواز میں کہا۔

☆☆☆

"آپ سمجھ کیوں نہیں رہے کہ بچیوں کے لیے تعلیم کتنی ضروری ہے، بچی ہے غلطی ہوگئی پھر معافی بھی مانگ رہی ہے اماں سے بھی اس نے معافی مانگ لی ہے۔ آپ بھی اپنی ضد چھوڑ دیں۔" عفت نے جب دو دن سے مسلسل روتی ریحانہ کو دیکھا تو مجبوراً شوہر کو منانے کی کوشش کرنے لگیں۔

"بس خاموش ہو جاؤ، جب اماں نے کہہ دیا نہیں پڑھنا تو بس نہیں پڑھنا۔" سجاد ہاتھوں کے اشارے سے بیگم کو چپ کرواتے ہوئے بولے۔

"میں نے آج تک اپنے کسی حق کا سوال نہیں کیا جو مرضی ہوا میں خاموش رہی مگر اب میں مجبور ہوں، بچی کے مستقبل کا سوال ہے آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔"

"ہاں یہی تو فائدہ ہوا ہے ناں اس کی تعلیم کا ہمیں...... خود تو جو بولتی ہے سو بولتی ہے تمہیں بھی حقوق کی جنگ کرنا سکھا دی ہے اس نے، تم جو آج تک کبھی نہیں بولی تھیں تمہارے منہ میں بھی زبان دے دی ہے اس نے، نہیں چاہیے مجھے ایسی تعلیم۔"

"سجاد خدا کے لیے بچی بہت دلبرداشتہ ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ خود کو نہ کوئی نقصان پہنچا دے۔" عفت بیگم، ریحانہ کی خود سر ضدی طبیعت سے واقف تھیں۔

"کر دے جو کرنا ہے، اسکول جانے کی اجازت اسے کسی صورت نہیں مل سکتی۔" سجاد نے سنگ دلی سے کہا۔

ریحانہ جو دیوار سے کان لگائے ماں، باپ کے درمیان ہوتی گفتگو سن رہی تھی آہستگی سے پلٹ آئی۔

☆☆☆

"امی، امی آئیں دیکھیں ریحانہ.... کو کیا ہو گیا ہے۔" فرحانہ نے جب ریحانہ کو کمرے میں آڑے ترچھا گرے دیکھا تو روتی ہوئی ماں کے پاس بھاگی۔

"کیا ہوا میری بچی کو۔" عفت دہل گئی، بھاگ کر کمرے میں پہنچی بیٹی کو یوں گرا۔ دیکھا تو اس کا سر گود۔ میں لیا۔

"فرحانہ پانی لے آؤ...... خدا کے لیے کوئی میری بچی کو بچاؤ۔" وہ اس کے ٹھنڈے وجود سے لپٹے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"امی اب ریحانہ کو کسی کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔"

"ارے ایسا نہیں کہو، میری بچی کو اسپتال لے جاؤ، دیکھو اس کی سانسیں آ رہی ہیں۔" دونوں ماں، بیٹیاں دھاڑیں مار، مار کر رو رہی تھیں۔ کمرے کے دروازے پر سجاد اور نور فاطمہ کھڑے حیرانی سے تمام ماجرا دیکھ رہے تھے۔ یکایک سجاد آگے بڑھے اور بچی کو گود میں اٹھا کر نزدیکی اسپتال لے گئے۔ چیک اپ کے بعد پتا چلا اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے، اسے کسی بڑے اسپتال لے جانا ہوگا۔

سجاد ایمبولینس میں روتی ہوئی عفت بیگم کے ساتھ ریحانہ کو اسپتال لے کر جا رہے تھے اور گھر میں نور فاطمہ فرحانہ کو گلے سے لگائے روئے چلی جا رہی تھیں اور دعا مانگ رہی تھیں کہ ان کے بیٹے کا گھر آباد رہے۔ فرحانہ، دادی کا یہ روپ دیکھ کر روتے، روتے سوچ رہی تھی کہ کیا کسی کی سوچ بدلنے کے لیے اپنی جان پر کھیل جانا بھی پڑتا ہے۔

ہوش کے ناخن

طیبہ عنصر مغل



"اِک قیامت کے آثار ہیں۔" آمنہ نے چادر اتار کر ایک طرف رکھی اور کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی تو سدرہ نے پانی کا گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"ارے ہم نے بھی تو گورنمنٹ اسکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے وہاں تو اس طرح کی بے شرمی نہیں سکھائی جاتی تھی جس طرح آج کل کے ان موئے انگریزی اسکولوں میں سکھائی جا رہی ہے۔ اور جا کر بات کرو کہ یہ سب باتیں معصوم سے بچوں کو کیوں بتا رہے ہو تو بحث الگ کہ حالات بدل گئے ہیں، بچوں کو اپنے تحفظ کے لیے شعور دینا پڑتا ہے کہ اگر کوئی جسم کی حساس جگہ چھوئے تو کیسے ردِ عمل دینا ہے۔ اور اوپر سے وہ چارٹ بنا، بنا کر بتا اور دکھا بھی رہے ہیں، استغفار!" آمنہ نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"ارے آپا! یہ تو بہت ضروری ہے سچ پوچھیں تو

میں بھی اس بات کے حق میں ہوں اور تھوڑا، تھوڑا تو ہم والدین کو بھی بچوں کو ڈھکے چھپے الفاظ میں بتا دینا چاہیے۔'' سدرہ نے تحمل سے جیٹھانی کی ساری بات سن کر جواب دیا۔

''سدرہ اب تم بھی ویسی ہی باتیں کررہی ہو جیسی وہ ٹیچر مجھے سمجھانے بیٹھ گئی تھی۔ ارے یہ تو نری... بے حیائی ہے، وقت کے ساتھ، ساتھ بچوں کو خود ہی سب پتا چل جاتا ہے، کیا ضروری ہے کہ ان کے دماغوں میں ایسی باتیں ڈال کر ان کے تجسس کو ہوا دیں۔ جن باتوں کا ان کو سرے سے پتا نہ ہو وہ بھی ان کو بتاؤ تاکہ وہ اس بات کو پورا جاننے کو ہماری جان کھائیں۔ ماہم نے تو میری جان ہی جلادی تھی، جب کل مجھے ٹیچر کی بتائی ہوئی باتیں بتا کر مزید جاننے کے لیے ضد کی۔ ارے اسی لیے تو اسکول جانا پڑا۔ میں تو نہیں پڑھانے کی ان انگریزی اسکولوں میں۔ آج امجد آئیں تو بات کرتی ہوں۔ سرکاری اسکول میں داخل کروادیں، ہاں نہیں تو......''

''آپ کی مرضی ہے آپا...... میں تو مطمئن ہوں، میں تو حماد کو اسی اسکول میں ہی پڑھاؤں گی۔'' سدرہ نے سبزی کی ٹوکری اٹھائی اور کچن کی جانب چل دی۔

''ہاں تمہارا تو صرف بیٹا ہے، میری تو بیٹی کا مسئلہ ہے بھیا! میں تو نہیں اس جگہ پڑھانے کی، تمہارا معاملہ تم اور ساجد جانو۔'' آمنہ نے اس کی پشت کو گھورتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔ اب ان کے سونے کا وقت ہوگیا تھا۔ عصر سے پہلے کہاں جاگنا تھا انہوں نے......

آمنہ اور سدرہ دونوں آپس میں خالہ زاد تھیں اور اپنے ہی کزنز کے ساتھ یعنی ماموں کے بیٹوں کے ساتھ ان کی شادیاں ہوئی تھیں دونوں اگر آپس میں شیر و شکر نہ تھیں تو لڑائی جھگڑے بھی نہیں ہوتے تھے۔ جس میں زیادہ دخل سدرہ کی سلجھی ہوئی شخصیت کا تھا۔ آمنہ ویسے بھی عمر اور مرتبے میں بڑی تھیں اور گھر میں ساس، سسر کا وجود نہ ہونے کی وجہ سے آمنہ اور امجد کی شخصیت و کردار گھر میں بڑوں کا سا ہی ہوگیا تھا۔

آمنہ کی دو بیٹیاں اور دو بیٹے تھے جبکہ سدرہ کا ایک ہی بیٹا تھا، حماد...... آمنہ کی بڑی بیٹی تو آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی اس کا نام سحرش تھا، دوسرے نمبر پر سال کے ہی وقفے سے حامد تھا اور پھر دس سالہ ماہم تھی اور اس کے بعد آٹھ سال کا زاہد...... بچے ایک ہی گھر میں مل جل کر رہتے تھے اور خوب رونق لگا رہتے تھے۔ آمنہ اور سدرہ دونوں ہی بچوں کے کام مل جل کر کرتی تھیں۔ کبھی تیرے میرے کی نوبت نہیں آئی تھی سدرہ ہی کی معاملہ فہمی کی وجہ سے۔ سحرش کی طرف سے بارھویں سال میں قدم رکھتے ہی آمنہ کو جو دھڑکا لگا رہتا تھا کہ انجان ہے کہیں اسکول کے دوران اسے نسوانیت کے پہلے پل میں قدم نہ رکھنا پڑ جائے آمنہ دعا مانگتی رہتی تھی کہ ایسے وقت میں وہ گھر میں ہی ہو کیونکہ وہ ذرا بڑے کچے دل کی تھی کوئی الگ طرح کی بات اس کے ساتھ ہو جاتی تو اس نے تو شور مچا کے پورے اسکول کو اکٹھا کرلینا تھا۔ وہ پریشان رہتی تھی اور دعا کرتی تھی کہ جوانی کی اس پہلی سیڑھی پر قدم وہ گھر میں ہی رکھے۔

لیکن سدرہ سے وہ بہت بے تکلف تھی۔ سدرہ سے ہی ٹی وی پر مختلف اشتہارات میں چلتے مختلف کمپنیوں کے پروڈکٹس کے بارے میں پوچھا جن میں صرف لڑکیوں اور وہ بھی اسکول کی لڑکیوں کو دکھاتے تھے اور اس میں ''نہ داغ نہ ڈر......'' والی باتیں کرتے تھے۔ سدرہ نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس کو بتا دیا تھا کہ یہ وقت ہر لڑکی پر آتا ہے، اس نے حفاظتی اقدام اور تدابیر بھی بتادی تھیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ہراساں ہونے اور گھبرانے سے بچ گئی اور پھر نا اسکول میں وہ حفاظتی سامان سدرہ کے کہنے پر بیگ میں لے کر جاتی تھی جو کہ سدرہ نے ہی اسے دیا تھا تو وہ سکون سے ہی اس مرحلے سے گزر گئی۔

اِدھر آمنہ بیگم کو پتا چلا کہ اسکول میں اس کے ساتھ یہ ہوا ہے تو وہ دھک سے رہ گئی تھیں لیکن سدرہ کا نام لینے کے بجائے اس نے ماں کو یہی بتایا کہ اسکول کی

...س ٹیچر نے بہت مدد کی۔ آمنہ نے شکرانے کے نوافل ...ڑھے کہ وہ تو اس قسم کے اشتہارات بھی سحرش کو نہ دیکھنے دیتی تھیں کجا کہ معلومات دینا۔

آمنہ نے اپنے شوہر امجد سے بات کی اور بالآخر ...س بات کا قائل کر کے ہی دم لیا کہ بچے گورنمنٹ کے اسکولز میں ہی پڑھیں گے۔ اور یوں آمنہ کے بچوں کا داخلہ گرلز اور بوائز کے الگ، الگ اسکولز میں کروا دیا گیا۔

سب ایک ہی خاندان سے تھے اس لیے مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے اس لیے اوپر کا پورشن جو پہلے کرایے پر دیا ہوا تھا اسے خالی کروا دیا گیا کہ بچوں کو بھی الگ کمروں کی ضرورت تھی۔ ...وں سدرہ اپنے شوہر اور بچے حماد کو لے کر اوپر کی منزل ...یں شفٹ ہوگئی۔ اب چاہ کر بھی سدرہ جیٹھ کے بچوں کے ساتھ اس طرح وقت نہیں گزار سکتی تھی جیسے وہ پہلے گزارہ کرتی تھی۔ اور آج کل تو وہ امید سے بھی تھی۔

☆☆☆

''امی مجھے اسکول نہیں جانا ہے۔'' گول مٹول ...ی ماہم اپنا منہ بسور، بسور کر ماں کو کہہ رہی تھی۔

''نہیں، فٹافٹ اٹھو، تم بہت ہی بہانے باز ہوگئی ہو ماہم، جب سے سحرش ہائی اسکول والی برانچ میں گئی ہے، تم روز نئے بہانے بناتی ہو اسکول نہ جانے کے، پہلے کیا سحرش تمہیں گود میں بٹھائے رکھتی تھی اسکول میں، چلو اٹھو فوراً تیار ہو، مجھے ناشتا دینا ہے سب کو۔'' آمنہ نے اس کے سر پر چپت لگائی تو ماہم منہ بنا کر آنکھوں میں موٹے، موٹے آنسو لیے اٹھنے لگی۔

''ماہم کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے، اسکول میں دل ہی نہیں لگتا اس کا...... میں تو روزانہ اس کو منتیں کر کے اسکول بھیج، بھیج کر تھک چکی ہوں سدرہ۔'' آمنہ دھلے کپڑوں کو چھت پر پھیلا کر آئی تو سدرہ کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

''ہوتا ہے آمنہ آپا...... کبھی، کبھی بچوں کو اسکول ...بیا ہو جاتا ہے۔'' سدرہ نے سلائی مشین روک کر جیٹھانی کو دیکھا۔

''ہاں لیکن میرے باقی بچے تو بہت ذوق و شوق سے اسکول جاتے ہیں، کبھی تنگ نہیں کیا۔'' آمنہ نے فخر سے کہا۔

''بس آپا یہ فطری سی بات ہے سارے بچے ایک جیسی طبیعت کے مالک کب ہوتے ہیں اور آپ پتا کریں شاید اسے کوئی مسئلہ ہو...... یا کوئی ٹیچر زیادہ سختی کا مظاہرہ کرتی ہوں جس کی وجہ سے وہ اسکول جانا نہ چاہتی ہو یا نئے اسکول میں ابھی سیٹ نہ ہوئی ہو۔'' سدرہ نے قمیص پر ترپائی کرتے ہوئے کہا۔

''اوں ہوں، ٹھیک کہہ رہی ہو، میں کسی دن اسکول جا کر معلوم کرتی ہوں کہ ماہم کی ٹیچر کیسی ہیں؟'' آمنہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ سدرہ نے اٹھ کر پیروں میں چپل اُڑسی اور کچن کی طرف چل دی۔

''ارے، اب تم کہاں چل دیں۔'' آمنہ نے منہ بنا کر کہا حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ چائے بنانے جارہی ہے۔

"ارے بھابی چائے بنانے لگی ہوں۔" سدرہ مسکرائی۔

"چلو پھر ٹھیک ہے کچھ کباب وغیرہ ہوں تو لیتی آنا کپڑے دھوئے ہیں تو بھوک لگ گئی ہے۔ اب نیچے جا کر کچھ نہیں ہو پائے گا مجھ سے۔" وہ تخت پر پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی اور سدرہ کی رکھی قمیص کو اٹھا کر ترپائی مکمل کرنے لگیں۔

☆☆☆

گھر بھر میں سب بہت خوش تھے۔ سدرہ کے ہاں حماد کے سات سال بعد گڑیا جیسی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔ حرا نام رکھا تھا۔ سحرش تو چاہتی تھی ہر وقت وہ حرا کے ساتھ لگی رہے۔ اور سدرہ کی تو دنیا مکمل ہو گئی تھی۔ سب میکے والوں اور سسرال والوں نے تحائف بھی دیے اور مبارک باد بھی...... سدرہ کی امی کچھ دن اس کے پاس رکیں لیکن پھر بہو کی ڈیلیوری کی وجہ سے انہیں جانا پڑا۔ اب تو سدرہ بھی کافی سنبھل چکی تھی اور جیٹھانی بھی بہت سارے کام سمیٹ دیتی تھیں اور سحرش بھی کافی مدد کر دیتی تھی۔

سارا گھر صاف ستھرا تھا۔ سدرہ نے حرا کو نہلا کر بستر پر لٹایا اور خود بھی اس کے پاس ہی لیٹ گئی۔ رات کو حرا جگاتی تھی سدرہ سو نہیں پاتی تھی۔ نہ جانے کب وہ بھی نیند کی میٹھی وادی میں اتر گئی پتا بھی نہیں چلا۔ اس کی آنکھ ہلکی سی کھٹ پٹ سے کھلی جو چھت سے آ رہی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو عصر کے بعد کا وقت تھا۔ نیچے بالکل خاموشی تھی اسے پتا تھا آمنہ آپا کے بچے اور حماد ٹیوشن جا چکے ہوں گے وہ بال سمیٹتی باہر آئی تو اسے نیچے صحن والے واش روم کی لائٹ آن نظر آئی اور پانی گرنے کی آواز سے وہ سمجھ گئی کہ آمنہ آپی کو اسی وقت نہانے کی عادت تھی پوری فراغت سے۔

ایک دم اسے کچھ گھٹی، گھٹی آواز چھت سے آئی تو وہ چونک اٹھی اس وقت چھت پر کون ہو سکتا ہے۔ وہ شاید ایک دم اوپر جانے کی ہمت نہیں کر پاتی لیکن اسے ایسے لگا جیسے ماہم نے ہلکا سا امی کہا ہو، اس کی چھٹی حس نے الارم بجایا تو وہ سائڈ پر پڑا لوہے کا پائپ لے کر دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

اوپر پہنچ کر جو منظر اس نے دیکھا اس کو لگا اس نے بجلی کے ننگے تاروں کو چھو لیا ہو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ امجد اور ساجد کے جواں سال چچا زاد بھائی جو [illegible] میں ہی رہتے تھے کی کمر پر لوہے کے پائپ سے تابڑ توڑ حملہ کر دیا۔ دو ضربوں میں ہی وہ درندہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اس نے نڈھال اور بے حال پڑی ماہم کو بہ مشکل اٹھایا اور سیڑھیوں کی جانب بھاگی اور سیڑھیوں کے دروازے کو لاک لگا کر ماہم کو تقریباً گھسیٹتی ہوئی اپنے پورشن تک لائی جو اب تقریباً بے ہوش ہونے والی تھی۔ جو اس نے دیکھا وہ ناقابل فراموش تکلیف دہ حقیقت تھی لیکن شکر بجا لائی کہ بچی لٹنے سے بچ گئی تھی۔ اس نے ساجد کو فون کیا اور جلد گھر آنے کے لیے کہا۔ وہ گارمنٹس کا بزنس کرتا تھا عام حالات میں دیر سے گھر آتا تھا لیکن اسے مناسب یہی لگا کہ وہ امجد بھائی کے بجائے ساجد کو پہلے بلائے۔ حواس بحال ہوتے ہی اس نے آمنہ آپی کو اوپر بلایا جو خود اندر باہر ماہم کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ اب وہ سر جھکائے سدرہ کے سامنے بیٹھی تھیں۔ امجد بھائی اور ساجد نے چچا زاد اعظم کو پولیس کے حوالے کیا۔ بچی کا طبی معائنہ ہوا وہ کسی بڑے نقصان سے تو بچ گئی تھی لیکن اس کے چہرے کی مسکراہٹ چھن گئی تھی۔ گیارہ سال کی عمر میں وہ جس [illegible] اور گندی غلاظت بھری حقیقت کو نزدیک سے دیکھ چکی تھی اس نے اس کا بچپن چھین لیا تھا۔

سدرہ تو کچھ دن پہلے حماد کے شکایت کرنے پر شوہر سے بات کرنے ہی والی تھی کہ وہ اعظم کا گھر میں داخلہ بند کر دیں۔ حماد نے اسے بتایا تھا کہ اعظم انکل اسے غلط جگہ ٹچ کرتے ہیں۔ اوپر تو ویسے بھی اعظم [illegible] آتا تھا۔ سدرہ کی چونکی طبیعت سے سب واقف تھے لیکن حماد بھی اعظم کی موجودگی اب نیچے کیوں نہیں [illegible] تھا اسے علم ہو گیا تھا۔ وہ آمنہ آپی کو آج یہ بات بتانے ہی والی تھی کہ اس سے پہلے یہ واقعہ ہو گیا۔

"ماہم!" کمرے کی خاموشی کو سدرہ کی آواز نے توڑا۔ اور ماہم جو ماں کے بجائے سدرہ سے چپکی ہوئی تھی۔ سر نیچے کیے آہستگی سے بولی۔

"جی چچی۔"

"بیٹا آپ اس دن چھت پر کیسے پہنچ گئے تھے۔"

ماہم نے گھبرا کر منہ اور اندر گھسیڑ لیا۔ اس نے مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

"سدرہ رہنے دو، جو ہوا وہ واپس نہیں آ سکتا نہ اس دن میں اعظم کی موجودگی میں ... نہانے گھستی اس کو تنہا چھوڑ کے اور نہ یہ ہوتا۔ اب اس سے پوچھ کے [illegible]ے، چھوٹوں کی جھجک ختم ہو جائے گی۔" آمنہ نے شکستہ لہجے میں کہہ کر افسوس سے ہنکارا بھرا۔

"نہیں آپا...... آج میں آپ کی بات نہیں سنوں گی اس بچی کے اندر کی گھٹن کو باہر آنے دیں۔ جب ہم اپنے ہی بچوں کو اپنا دوست نہیں بناتے۔ ان سے دوری اختیار کرتے ہیں تو اس کا انجام یہی ہوتا ہے جو ہوا۔ اور جب تک ماہم اپنے اندر کی گھٹن کو کھول نہیں دے گی یہ لوگوں سے گھبراتی رہے گی اور یہ ایک بڑا نفسیاتی مسئلہ بھی بن سکتا ہے۔" وہ پھر سے ماہم کی طرف متوجہ ہوئی اس کے گال پر ہاتھ پھیرا اس کے ہاتھ کو چوما اور بولی۔

"اپنی چاچی کو بھی نہیں بتاؤ گی تو چاچی، حرا کو آپ کی گود میں نہیں دیں گی۔"

"نہیں چاچی میں ضرور بتاؤں گی، اعظم انکل کتنے گندے ہیں مجھے نہیں پتا تھا۔ وہ تو بہت پیار کرتے تھے بالکل ویسے جیسے ہمارے اسکول کے پیون (چپڑاسی) انکل وہ بھی مجھے چاکلیٹ دیتے تھے اور ویسے ہی پیار کرتے تھے جیسے اعظم انکل...... وہ ہمارے اسکول کے پچھلے باغ میں لے جاتے تھے اور پھر......" وہ جوں، جوں بتاتی جا رہی تھی سدرہ اور آمنہ کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے، جب وہ بتا چکی تو سدرہ نے اسے رسانیت سے بتایا کہ کہاں، کہاں ٹچ کرنا گندے انکل کا کام ہوتا ہے، دوسروں سے چیز نہیں لیتے۔ کوئی جتنا بھی لالچ دے۔

"تو آپا اس سے تو ہمیں بھی سبق سیکھنا چاہیے کہ غیر ہی نہیں رشتے داروں سے بھی فاصلہ رکھنا ضروری ہے۔ گھر میں کھلے عام آنا اور بچوں کو کسی کے ساتھ تنہا چھوڑنا یا باہر بھیجنا سب غلط ہے۔ اس سے پہلے کہ بچوں تک کسی برے نتیجے کے طور پر یہ سب آگہی پہنچے کیوں نہ ہم خود ان کو کچھ بنیادی حفاظتی تدابیر بتا دیں۔ بچوں کے دوست بن کر بات کریں اگر یہ سب ماہم کو بھی پتا ہوتا تو حماد کی طرح یہ بھی آپ کو پہلے ہی یہ باتیں بتا چکی ہوتی جو خطرے کی گھنٹی ہوتی ہیں۔"

"تم درست کہہ رہی ہو سدرہ...... جبھی تو یہ اسکول جانے سے ڈرنے لگی تھی، ہائے میں ایک ناکام ماں ثابت ہوئی ہوں۔" وہ سسکنے لگیں۔

"میری بچی پتا نہیں کیسے اس حادثے کو بھلائے گی، یہ راتوں کو سوتی نہیں ہے۔ ڈر کر اٹھ جاتی ہے، کاش میں نے ان کا اسکول ہی نہ بدلا ہوتا تو اس کی ٹیچرز ہی ان کو سمجھا دیتیں۔" وہ بولتے، بولتے رونے لگی تھیں۔

"آپا! اللہ تعالیٰ نے ہماری ماہم کو نقصان سے بچا لیا ہے، بات زیادہ پھیلی بھی نہیں اور ہم ماہم کو کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس ایک دو سٹنگ کروائیں گے تو یہ ٹھیک ہو جائے گی انشاء اللہ......! اب آپ مجھے بتائیں باقی آنے والے وقت میں ..." نہ داغ نہ ڈر......" اس کے بارے میں بھی سحرش کی طرح مجھے ہی ماہم کو بتانا پڑے گا یا اس بار میری آمنہ آپا، ماہم کی دوست بنیں گی۔" سدرہ نے ماحول کو خوشگوار بنایا تو آمنہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

"تو وہ تم تھیں جس کی وجہ سے سحرش اتنی آسانی سے اس مرحلے سے گزر گئی میں سمجھی ٹیچر......"

"جی آپا...... بچے سب کے سانجھے ہوتے ہیں اور ایک گھر میں رہنے والے تو زیادہ ایک دوسرے کے نزدیک ہوتے ہیں۔"

"ہاں سدرہ، اللہ پاک کا شکر ہے کہ مجھے بروقت عقل آ گئی۔" کہتے ہوئے دونوں نے بیک وقت ماہم کو گلے سے لگا لیا تھا۔



مکمل ناول

خوب صورت موڑ

آصفہ ضیا احمد

پروفیسر صولت حسین اور ان کی بیگم کشور جہاں کو خطرے کی گھنٹی بجتی اس وقت محسوس ہوئی جب خاندان میں ان کی بیٹیوں کی ہم عمر لڑکیاں بیاہ کر سسرال چلی گئی تھیں اور اب سارے کنبے میں ان سے کہیں چھوٹی اور کم عمر لڑکیوں کی شادیوں کا نیا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ حالانکہ ان کی تینوں بیٹیاں شکلاً اور عقلاً اپنی مثال آپ تھیں۔ خاص طور سے ان کی بڑی بیٹی تہمین جسے دیکھ تو یہی بات ذہن میں آتی تھی کہ سو بار بنا کر مالک ...

سو بار مٹایا ہوگا تب جا کر اس حسنِ مجسم کو اس عالم آب و گِل میں اتارا ہوگا۔ تہمین سے چھوٹی دو بہنیں تمکین اور تحسین تھیں۔ وہ دونوں بھی نہایت جاذب نظر اور پُرکشش شخصیت کی حامل تھیں لیکن جو بات تہمین میں تھی وہ ان دونوں میں عنقا تھی۔ اسی لیے صولت حسین کی بڑی بہن محسنہ خاتون برسوں سے اپنے بیٹے احمد کمال کے لیے آس لگائے بیٹھی تھیں۔ احمد کمال ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں سیلز منیجر کے عہدے پر فائز تھے۔ انتہائی خوبرو، تعلیم یافتہ اور بارعب شخصیت کے مالک...... بذاتِ خود صولت حسین بھانجے کو بے حد پسند کرتے تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ احمد کمال ان کا داماد بنے۔ صولت حسین نے کشور جہاں کے ذریعے جب بھی اس رشتے کی بات بیٹی کے کانوں تک پہنچائی جواب ہمیشہ انکار میں ملا لیکن اس بار جب محسنہ خاتون باقاعدہ طور پر رشتہ لے کر بھائی کے گھر سوالی بن کر آئیں تو صولت حسین نے فیصلہ کیا کہ انہیں خود بیٹی سے دو بدو بات کرنی چاہیے۔

اسی سلسلے میں آج انہوں نے تہمین کو اپنے کمرے میں طلب کیا تھا۔ تہمین آنکھیں جھکائے خاموش ان کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک اضطراری کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ وہ بار، بار اپنی کلائیوں میں پڑی چوڑیوں کو گھما رہی تھی۔ قریب ہی صوفے پر پروفیسر صاحب اور ان کی بیگم براجمان تھے۔ کمرے میں سناٹا اور خاموشی طاری تھی۔ اس سناٹے کو پروفیسر صولت کی آواز نے توڑ دیا۔ بیٹی کو زمانے کی اونچ نیچ نرم گرم سمجھاتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''تہمین بیٹا عنقریب میری ریٹائرمنٹ ہے، تم تینوں بہنوں کے فرائض سے مجھے اب تک سبکدوش ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی ہم لوگ اس معاملے میں کافی تاخیر کا شکار ہو چکے ہیں، بہرحال احمد کمال کے بارے میں تمہاری کیا مرضی ہے، تمہاری پھپو جان جواب طلب کر رہی ہیں اور میں اب مزید تاخیر کا متحمل نہیں ہو سکتا کیونکہ تمہاری شادی کے فوراً بعد مجھے تمکین اور تحسین کی فکر کرنی ہے۔'' تہمین کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ بار، بار چہرے سے پسینہ صاف کر رہی تھی۔ بالآخر اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے مرتعش لہجے میں کہا۔

''ابو احمد کمال کے علاوہ آپ جو بھی رشتہ میرے لیے پسند کریں گے، وہ میرے لیے قابلِ قبول ہوگا۔''

''اس رشتے کو مسترد کرنے کی کوئی معقول وجہ؟'' بیٹی کی بات پر صولت حسین نے تیز و تند لہجے میں کہا۔

''میں وجہ بتانے سے قاصر ہوں، بہرحال آپ پھپو جان کو خالی نہ لوٹائیں۔ یہ رشتہ میرے بجائے تمکین کے لیے قبول کر لیجیے۔'' تہمین نے جواباً آہستہ سے کہا۔

''بس، بس مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے کیا نہیں، یہ میرا دردِ سر ہے، اب تم جا سکتی ہو۔'' صولت حسین نے ہاتھ اٹھا کر مشتعل لہجے میں کہا۔

تہمین لرزیدہ قدموں سے اٹھی اور فوراً کمرے سے نکل گئی۔ اس کے تھکے قدم من بھر کے ہو رہے تھے۔ لیکن فوراً اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور باہر نکل کر دونوں بہنوں کے ساتھ یوں گھل مل کر باتیں کرنے لگی جیسے کچھ ہوا نہیں۔ تمکین اور تحسین کو پتا ہی نہیں چلا کہ کمرے میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ تہمین کے جاتے ہی کشور جہاں نے شوہر کو مخاطب کیا۔

''پروفیسر صاحب اگر آپ ٹھنڈے دل سے غور کریں تو تہمین کا مشورہ غلط نہیں ہے۔ احمد کمال جیسے لڑکے آسانی سے نہیں ملتے، اسی لیے تہمین نہ سہی تمکین کے لیے ہمیں یہ رشتہ قبول کر لینا چاہیے۔ رہی تہمین تو اللہ کے کرم سے رشتے ہمارے یہاں ساون کی پھوار کی طرح برس رہے ہیں، کوئی بہتر رشتہ دیکھ کر اس کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں گے۔ آپ میری مانیں تو تمکین سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

بیوی کے سمجھانے بجھانے پر صولت حسین نے چھوٹی بیٹی تمکین کو طلب کیا اس نے کمرے میں آ کر

استفسارانہ نظروں سے ماں، باپ کی طرف دیکھا اور پھر کرسی پر ٹک گئی۔ صولت حسین نے کھنکھار کر اپنا گلا صاف کیا اور پھر بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تمکین قاعدے کی رو سے تو اس گھر سے پہلے تہمین کی ڈولی رخصت ہونی چاہیے لیکن چونکہ وہ مسلسل انکار کر رہی ہے اس لیے میں نے اور تمہاری ماں نے فیصلہ کیا ہے کہ تہمین کو اس کے حال پر چھوڑ کر احمد کمال کا رشتہ تمہارے لیے قبول کر لینا چاہیے، تمہارا کیا عندیہ ہے؟ یا تو ابھی بتا دو یا اگر مہلت چاہتی ہو فیصلہ کرنے کے لیے تو مجھے دو چار دن بعد جواب دو۔'' باپ کی زبان سے احمد کمال کا نام سن کر تمکین کا چہرہ خوشی سے تمتما گیا۔ خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ بغیر کسی حیل و حجت کے اس نے فوراً کہا۔

''ابو آپ کی اور امی کی مرضی میرے سر آنکھوں پر۔'' یہ کہہ کر اس نے سعادت مندانہ انداز میں سر جھکا لیا۔

''اللہ تمہیں خوش رکھے۔'' صولت حسین یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے اور بیٹی کے سر پر دستِ شفقت رکھ دیا۔ تمکین کمرے سے نکلی تو خوشی کے مارے قدم زمین پر نہیں ٹک رہے تھے لیکن بہنوں کے روبرو جاتے ہی وہ سراپا حزن و ملال بن گئی۔

''باجی آپ کو کیا ہو گیا۔ یہ چہرے پر بارہ کیوں بج رہے ہیں۔'' تحسین نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''ہوتا کیا، آپا کی ہر ٹھکرائی ہوئی چیز میرے حصے میں آتی ہے...... ہر اترن، ہر جھوٹن کی حقدار میں ہی بنتی ہوں۔ بس آج بھی وہی کہانی دُہرائی گئی۔ احمد کمال کے رشتے کو آپا تو ٹھوکر مار کر چلی آئیں۔ ابو، امی اور پھپو جان کا دل رکھنے کے لیے مجھے ہاں کرنی پڑی۔ اب تمہیں کیا بتاؤں میرے دل پر کیا گزری۔'' تمکین نے روہانسی آواز میں کہا۔

''میری رد کی ہوئی چیز اگر تمہارے من نہیں بھا رہی ہے تو ایسا کرتے ہیں ہم دونوں مل کر تحسین کو راضی کرتے ہیں۔ بس اتنا ہوگا پھپو جان کی بہو تحسین بن جائے گی۔ بس تھوڑا ایج ڈیفرنس کا مسئلہ رہے گا۔'' تہمین نے ایک استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپا...... نہیں، نہیں میرا یہ مطلب قطعی نہیں، مجھے تو احمد کمال بہت پسند ہیں، آپ خدا کے لیے امی، ابو سے کچھ مت کہیے گا۔'' یہ بات سنتے ہی تمکین کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں ہکلاتے ہوئے کہا۔

اس کی حواس باختگی دیکھ کر دونوں بہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ ''باجی تم بھی بس ایک نمبر کی گھامڑ ہو، تم سے اعتراف محبت کروانے کے لیے باجی نے یہ ترپ کی چال چلی ہے۔ ورنہ تمہیں معلوم ہے کمال بھائی مجھے اپنی سگی بہن سمجھتے ہیں۔ بہرحال رنگے ہاتھوں تمہاری چوری پکڑی گئی۔'' تحسین نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

تمکین اپنی حماقت پر دانت پیس کر رہ گئی۔ دونوں بہنوں نے بڑی آسانی سے سب کچھ اگلوا لیا تھا۔

☆☆☆

مانگے ملے نہ بھیک بن مانگے موتی کے مصداق اس وقت تمکین مائیوں کا پیلا جوڑا پہنے اپنی قسمت پر ناز کر رہی تھی اور اس کی سہیلیاں ڈھولکی پر لہک، لہک کر گیت گا رہی تھیں۔

''اتنی جلدی کیا ہے گوری ساجن کے گھر جانے کی
سکھیوں کے سنگ بیٹھ ذرا کچھ باتیں ہیں سمجھانے کی''

گھر میں شادی کا ہنگامہ اور گہما گہمی اپنے عروج پر تھی۔ تہمین اور تحسین شادی کے انتظامات میں مصروف تھیں۔ بلکہ شادی کی ساری ذمّے داری ہی تہمین کے سر تھی اور وہ تمام کام بحسن و خوبی انجام دے رہی تھی۔ جہیز کی شاپنگ سے لے کر رخصتی کی الوداعی گھڑی تک اس کے پیر کو قرار نہیں تھا۔ ماں، باپ کو اس نے احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ ان کا کوئی بیٹا نہیں ہے، شادی نہایت خوب صورت طریقے سے انجام پائی اور تمکین والدین کی دعاؤں کے سائے تلے سسرال سدھاری۔ ادھر صولت حسین اور کشور جہاں نے سکون

کی سانس لی لیکن ابھی تہمین اور تحسین دو بیٹیوں کے بوجھ سے اُن کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔

☆☆☆

تینوں بہنیں مل کر اس وقت شادی کا فوٹو البم دیکھ رہی تھیں۔ تمکین نے شرماتے ہوئے لجائے ہوئے لہجے میں آہستہ سے تحسین کے کان میں سرگوشی کی۔

''تحسین، میری اور کمال کی جوڑی کیسی لگ رہی ہے؟''

''باجی آپ کو اور کمال بھائی کو ایک ساتھ دیکھ کر میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب تھی......'' تحسین نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم اللہ تعالیٰ سے کیا کہہ رہی تھیں؟'' تمکین نے اشتیاق آمیز لہجے میں استفسار کیا۔

''میں کہہ رہی تھی عجب تیری قدرت عجب تیرا کھیل چھچھوندر کے سر میں چنبیلی کا تیل......'' یہ سن کر غصے کے مارے تمکین اچھل پڑی۔ اس نے اشتعال انگیز لہجے میں کہا۔

''آپا سن رہی ہیں آپ، یہ مجھے چھچھوندر کہہ رہی ہے۔'' تہمین نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''ارے تمہاری سمجھ کا پھیر ہے وہ تمہیں نہیں بلکہ احمد کمال کو چھچھوندر کہہ رہی ہے۔ تم تو دراصل چنبیلی کا تیل ہو۔'' تہمین نے عقل سے کام لیتے ہوئے فوراً بات ختم کردی ورنہ آج تمکین کے ہاتھوں تحسین کی ضرور شامت آجاتی اور تمکین حقیقت میں اپنے آپ کو چنبیلی کا تیل سمجھ کر خوش ہوگئی جبکہ تحسین منہ دبا کر ہنس رہی تھی اور تہمین غصیلی آنکھوں سے اسے گھورے جا رہی تھی۔

☆☆☆

تمکین کی شادی کے بعد پھر وہی لیل و نہار تھے۔ صولت حسین ریٹائرمنٹ کے بعد زیادہ تر گھر میں ہی رہتے تھے۔ تحسین کالج چلی جاتی اور تہمین گھر کے کاموں میں مصروف ہوجاتی۔ حالانکہ وہ گریجویشن کرچکی تھی لیکن چاہتے ہوئے بھی وہ ملازمت نہیں کرسکتی تھی کیونکہ گھر کی ذمے داریوں کے علاوہ ماں کی تیمارداری اور دیکھ ریکھ بھی اس کے فرائض میں شامل تھی کیونکہ کشور جہاں کو ایک نہیں کئی بیماریوں نے گھیر رکھا تھا۔ دواؤں پر ہی ان کا گزارہ تھا۔ اس کے علاوہ تہمین کی شادی کی فکر انہیں مارے ڈال رہی تھی۔ ان کی شناسا خاتون نے ایک رشتہ تہمین کے لیے دکھایا تو کشور جہاں نے فوراً شوہر اور بیٹی پر دباؤ ڈالنا شروع کردیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ اپنی زندگی میں ہی وہ دونوں بیٹیوں کو اپنے گھر بار کا کردیں۔ بیوی کے کہنے میں آکر صولت حسین نے بھی چھان پھٹک کیے بغیر کسی تحقیق کے بغیر اس رشتے کے لیے ہامی بھرلی۔ تہمین نے جب دیکھا کہ والدین اس رشتے کے حق میں ہیں تو بہتر ہی ہوگا حالانکہ اس کی چھٹی حس اسے خبردار کررہی تھی کہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے لیکن چونکہ وہ احمد کمال کے رشتے کو مسترد کرچکی تھی اور صولت حسین کی ناراضی دیکھ چکی تھی اس لیے اس بار اس نے باپ کے سامنے لب کشائی نہیں کی ہلکی پھلکی مشاورت کے بعد رشتہ طے پاگیا۔ تہمین کی بدنصیبی دور کھڑی مسکراتی رہی اور تہمین صولت، تہمین اظہر الدین بن کر بابل کا انگنا چھوڑ کر سسرال کی دہلیز پر آن کھڑی ہوئی۔ تمکین کی شادی میں جتنا شور شرابا اور ہلا گلا تھا تہمین کی شادی اس کے بالکل برعکس نہایت سادگی سے انجام پائی۔ شادی میں کسی قسم کا کوئی تام جھام یا ہنگامہ آرائی نہیں تھی۔

☆☆☆

تہمین نے جیسے ہی گھونگٹ اٹھایا تو اسے محسوس ہوا کہ سات دن کے دلہناپے کے بعد سات جنم کی غلامی کا آغاز ہوچکا ہے کیونکہ اظہر الدین کا تعلق کثیر العیال خاندان سے تھا۔ اور گھر کے سارے افراد ہڈ حرامی، آرام طلبی اور بے عملی کے چلتے پھرتے اشتہارات تھے۔ اظہر الدین کے علاوہ سارے ہی بہن، بھائی کنوارے اور بیروزگار تھے۔ تہمین نے پہلے ہی دن لفافہ دیکھ کر سارا مضمون بھانپ لیا۔ کھانے کی میز پر بوٹی نیا تلا شوربہ دیکھ کر سسرال کے معاشی حالات سمجھنے میں اسے دشواری پیش نہیں آئی۔ اظہر الدین کے

خاندان کا واحد ذریعۂ معاش ایک اوسط درجے کا کلاتھ اسٹور تھا۔ جس پر اظہر الدین کے والد اور اظہر الدین بیٹھتے اور اپنے ہر ملنے والے کے سامنے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے کہ وہ ایک وسیع ترین کاروبار کے مالک ہیں اس لیے مصروفیت بہت زیادہ ہوتی ہے اور فرصت نام کی چیز اُن کے پاس نہیں ہے جبکہ نہایت قلیل عرصے میں تہمین نے اندازہ لگالیا کہ دکان پکوڑوں کی اور باتیں کروڑوں کی والا حساب ہے۔ جھوٹ بولنا اظہر الدین کے خاندان کا جزو لازم تھا۔ سسرال کے حالات دیکھ کر اس کے پسینے چھوٹ گئے لیکن باہمت، تعلیم یافتہ اور مستقل مزاج لڑکی تھی۔ صولت حسین اور کشور جہاں نے ہر لحاظ سے بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا تھا۔ حتیٰ الامکان اس نے سکون سے صبر سے کام لیا بجائے سارے خاندان میں واویلا مچانے کے اس نے فیصلے کیا کہ آہستہ، آہستہ تمام دشواریوں پر قابو پا کر وہ اپنے مسائل سسرال میں خود حل کرے گی۔ اسی لیے اس نے میکے میں بھی کسی کو ان باتوں کی ہوا نہیں لگنے دی۔ وہ بتیس دانتوں میں زبان بن کر سسرال میں رہ رہی تھی۔ اظہر الدین کی والدہ نے کچن کا چارج بہو کے ہینڈ اوور کرتے ہوئے بظاہر پیار و محبت کے ساتھ لیکن تحکمانہ انداز میں کہا۔

''دلہن آج سے گھر کے ہر فرد کی ذمے داری تمہارے کندھوں پر ہے کیونکہ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم خم نہیں کہ گھر داری اور گھر سمیٹتی رہوں۔ تمہاری مدد کے لیے ہم نے ایک ملازمہ کا بندوبست کرلیا ہے، وہ صبح سے شام تک کام انجام دے گی لیکن تمہیں ہر کام پر نظر رکھنی ہوگی۔'' تہمین نے فوراً اڑتی چڑیا کے پر گن لیے اس کی سمجھ میں سب کچھ آگیا کہ کولہو کی بیل کی طرح سب کچھ اسے ہی کرنا ہے۔ کیونکہ ملازم تو صرف نام کے ہی ہوتے ہیں لیکن ملازمہ سے ملنے کے بعد اسے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ کیونکہ وہ بوڑھی، نحیف اور کمزور ضرور تھی لیکن محنتی اور صفائی پسند تھی۔ بلکہ بعض اوقات تہمین کے ہاتھوں کا کام چھین کر بھی خود ہی کرلیتی اور کہتی۔

''ہائے بی بی جی سوہنے رب نے میدے اور دودھ سے گوندھ کر آپ کو بنایا ہے لیکن آپ کے اماں، باوا نے آپ کو کیسے ناقدروں کے حوالے کردیا۔''

ملازمہ کی زبان سے وقتاً فوقتاً ایسے جملے سن کر تہمین کے کان کھڑے ہوئے۔ سسرالی ویسے ہی اس کے لیے اسرائیلی بنے ہوئے تھے۔ یہ بات تو اچھی طرح اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ یہ لوگ وہ نہیں تھے جو نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے ظاہر و باطن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک دن کام کے دوران اس نے آہستہ سے ملازمہ سے استفسار کیا۔

''بوا آپ پہلے بھی یہاں کام کرچکی ہیں؟''

''جی بی بی جی، میں بہت زمانے سے ان کے یہاں کام کررہی ہوں۔'' ملازمہ فوراً بولی۔ ''لیکن کچھ دن پہلے کام چھوڑ کر اپنے گاؤں چلی گئی تھی۔ اب پھر پائی پیسے کی ضرور پڑی تو چلی آئی۔''

تہمین نے بڑھیا کو اور کریدنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹال گئی اور بات آئی گئی ہوگئی۔

☆☆☆

سسرال کے تلخ و ترش حالات کو تہمین بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کررہی تھی۔ ایک دن اظہر الدین اس کے سامنے بڑھتی مہنگائی، منہ پھاڑے اخراجات اور معاشی مسائل کا رونا لے کر بیٹھا تو تہمین نے موقع غنیمت جان کر فوراً اس کی بات پکڑلی اور کہا۔

''اظہر ضروری نہیں کہ گھر کے تمام مسائل کا بوجھ آپ تن تنہا اٹھائیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے مسائل میں بھی شیئر کرسکتی ہوں۔''

''وہ کس طرح......؟'' اظہر الدین نے فوراً سوال کیا۔ اس کے لہجے میں استعجاب تھا۔

''اگر آپ کی والدہ اور بہنیں بھی گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹائیں تو میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔'' تہمین نے پُرسکون انداز میں کہا۔ ''میں نے سائنس میں گریجویشن کیا ہے، مجھے کہیں بھی ملازمت مل سکتی

ہے، گھر میں آمدنی کے ذرائع میں اضافہ ہوگا تو مسائل اگر ختم نہ بھی ہوئے تو کم ضرور ہو جائیں گے۔‘‘

اظہر الدین نے ایک لمبا سا ہنکارا بھرا اور آہستہ سے کہا.....’’میں اماں سے بات کروں گا...اس سلسلے میں‘‘ اور سونے کی ایکٹنگ کرنے لگا حالانکہ وہ جاگ رہا تھا۔ تہمین سمجھ گئی کہ اس نے بڑی خوب صورتی سے اسے ٹالا ہے کیونکہ اس کی ساس نندیں جگہ سے ہلنا بھی عار سمجھتی تھیں۔ صبر کا ایک کڑوا گھونٹ لے کر اس نے سر تکیے سے ٹکا دیا جبکہ اس کے اندر ایک جنگ جاری تھی جس کا مقابلہ وہ تنہا کر رہی تھی۔ بہت عرصے سے اس نے میکے جانا بھی کم کر دیا تھا۔ صولت حسین اور کشور جہاں کو جب بیٹی کی یاد بہت ستاتی تو وہ تحسین سے فون کروا دیتے اور تہمین جا کر والدین سے مل آتی۔ وہ اس بات سے ہمیشہ خوفزدہ رہتی تھی کہ ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں جو اس کے وجود کو لہولہان کر رہی تھیں، دکھوں کی وہ تحریریں جو اس کے چہرے پر رقم ہو چکی تھیں کہیں جان نچھاور کرنے والے والدین وہ نہ پڑھ لیں۔ ہر پریشانی، ہر دکھ کو اس نے صرف اپنی ذات تک محدود رکھا تھا۔ اسی اثنا میں اس نے یہ خوشخبری سنی کہ خیر سے تمکین ایک عدد بیٹے کی ماں بن گئی ہے۔ اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہی وہ سارا دن چشمِ تصور سے بھانجے کو دیکھتی رہی اسے چومتی رہی۔ حسبِ معمول جب اظہر الدین رات گئے گھر آیا تو اس نے خوشی، خوشی اظہر کو یہ خوشخبری سنائی۔

’’اظہر کل آپ اور میں تمکین کے گھر مٹھائی لے کر جائیں گے۔ اس کے یہاں بیٹا ہوا ہے۔‘‘ اظہر الدین نے حسبِ سابق وقت کی کمی اور کام کی زیادتی کا رونا روتے ہوئے اپنی جان چھڑانی چاہی۔ صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔ بالآخر آج تہمین پھٹ پڑی تھی۔

’’آپ رات دن اپنے بزنس میں مصروف رہتے ہیں اس کے باوجود خود بھی پائی، پائی کے لیے تنگ رہتے ہیں اور میں...... میں نے تو اپنے ہونٹ ہی سی لیے۔ ابھی تک امی کی دی ہوئی رقم سے ہی کام چلا رہی ہوں۔ اس طرح بھی کہیں زندگی گزرتی ہے۔‘‘

پچھلے کئی دنوں سے دونوں میاں، بیوی میں جو سرد جنگ چل رہی تھی آج وہ گرمی پاتے ہی بھڑک اٹھی۔ تلخ حالات کے بگولے کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئے۔ کہتے ہیں چیونٹی بھی پیروں تلے دب کر کاٹ لیتی ہے یہی حال تہمین کا ہوا۔ اس کی برداشت اور تحمل اب جواب دے گیا تھا۔

☆☆☆

تہمین جب تمکین کے گھر پہنچی تو اس کے انگ، انگ سے خوشی چھلک رہی تھی۔ ننھے منے بھانجے کو دیکھنے کے لیے وہ بری طرح بے تاب تھی لیکن تمکین کے گھر میں قدم رکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ اسے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ احمد کمال تو گھر میں ہی موجود نہیں تھے۔ تہمین کے سلام اور کلام کے باوجود پھوپی اور تمکین کے رویّے سے سرد مہری اور لاتعلقی کا اظہار ہو رہا تھا۔

تمکین کے گل تھوتھنے سے بچے کو لے کر اس نے دل بھر کر پیار کیا۔ آج اس کے دل میں بھی ممتا کی تڑپ جاگ اٹھی۔ دل ہی دل میں اس نے بھی بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگی کہ جلدی سے اس کے گلستانِ حیات میں بھی ایسا پھول کھل جائے تاکہ اظہر الدین اپنی اولاد کی خاطر ہی اس پر بھی التفات اور لطف و کرم کی نظر ڈالے۔ گھر سے ہی وہ دل شکستہ آئی تھی لیکن یہاں آ کر پھوپی اور بہن کا بیگانہ رویّہ دیکھ کر وہ ٹوٹ کر بکھر گئی۔ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اظہر الدین اس کے ساتھ نہیں آیا ورنہ اپنی توہین کا اسے اور زیادہ احساس ہوتا۔ واپس ہوتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گی۔

☆☆☆

تہمین نے شاید دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی تھی یا وہ وقت ہی قبولیت کا تھا۔ جلد ہی اسے اپنے اندر جسمانی تبدیلی کا احساس ہوا لیکن اس نے کسی کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اپنی ہر بات وہ سب سے پہلا

ماں سے شیئر کرتی تھی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ کسی طرح ایک دن کے لیے میکے ہو آئے لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

آج گھر میں کوئی نہیں تھا۔ وہ ملازمہ کے ساتھ گھر کی صفائی ستھرائی میں مشغول تھی کہ اچانک اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کا سر بھی چکرا رہا تھا اور بہت زیادہ نقاہت بھی محسوس ہو رہی تھی۔ بدقتِ تمام وہ کرسی پر بیٹھی اور ملازمہ کو آواز دی۔ اس نے دوڑ کر اسے سنبھالا اور لے جا کر بیڈ پر لٹا دیا۔ تہمین پسینے میں شرابور تھی۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول کر اس نے ملازمہ سے استفسار کیا۔

’’بوا مجھے کیا ہو گیا تھا۔‘‘ ملازمہ جہاندیدہ اور تجربہ کار تھی۔ اس نے معنی خیز لہجے میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

’’بی بی اللہ مبارک کرے میرا تو تجربہ کہتا ہے خیر سے دن چڑھ گئے ہیں۔‘‘ پھر سرگوشیانہ انداز میں آہستہ سے کہا۔

’’بی بی جی آپ کا پیر بھاری ہے۔ اس کی بھنک بھی آپ اپنے سسرال والوں کو مت لگنے دینا۔ ورنہ یہ قصائی کلیجے کے لوگ آپ کے ساتھ بھی وہی کریں گے جو پہلی بہو کے ساتھ کیا تھا۔‘‘ تہمین نے چونک کر کہا۔

’’پہلی بہو؟ کون پہلی بہو...... کیا اظہر الدین سے بڑا بھی کوئی بھائی ہے؟‘‘ ملازمہ نے اس کی حیرت کو ادا س نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

’’ارے بی بی جی اظہر الدین کی پہلی بیوی کی بات کر رہی ہوں۔‘‘ تہمین، ملازمہ کی بات سن کر بھونچکا رہ گئی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔

’’بوا آپ بہت دنوں سے پہلیاں بجھوا رہی ہیں، آج آپ کو کھل کر بتانا ہی ہوگا۔‘‘ ملازمہ ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ پھر اس نے ہمت مجتمع کی۔ ’’بیٹا میں تو تمہیں سب بتا دوں لیکن اگر راز کھل گیا تو یہ لوگ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔‘‘

’’نہیں بوا چاہے میری جان چلی جائے میں آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گی۔ آپ بلاخوف و خطر مجھے سب کچھ بتا سکتی ہیں۔‘‘ تہمین نے ملازمہ کو کلی طور پر اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

ملازمہ نے عقابی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر بولتی چلی گئی۔

’’جی بی بی تمہاری ساس نندوں نے پتا نہیں اس غریب لڑکی کو کس طرح پھانسا تھا۔ حمنیٰ نام تھا اس کا، نین نقش اس کے بھی بڑے پیارے تھے۔ ماں، باپ تو تھے نہیں، خالہ خالو نے پرورش کی تھی۔ اس غریب کو بیاہ کر لائے اور آتے ہی چولہا چکی تھی۔ سارا دن غریب کام کرتی رہتی۔ مزاج تو بالکل آپ ہی کی طرح تھا جیسے ہی اس کا پیر بھاری ہوا ماں، بیٹے کے درمیان کیا غٹرغوں ہوئی پتا نہیں تمہاری ساس حمنیٰ کو ایک ڈاکٹرنی کے پاس لے گئی۔ اور پھر......‘‘

’’بوا اس لیڈی ڈاکٹر کا نام کیا ہے‘‘ تہمین نے فوراً قطع کلامی کرتے ہوئے استفسار کیا، ملازمہ نے کچھ سوچتے ہوئے آنکھیں بند کیں اور پھر فوراً کہا۔

’’ہاں، یاد آیا جی بی بی اس ڈاکٹرنی کا نام سلطنت ہے، ڈاکٹر سلطنت کہتے ہیں اسے۔ ایک بار پولیس کا چھاپا بھی وہاں پڑ چکا ہے۔ الٹے سیدھے کام جو کرتی تھی۔ لیکن اس نے لے دے کر سارا معاملہ دبا دیا تھا۔ جی بی جی سنا ہے الٹے سیدھے کیس کے منہ مانگے پیسے لیتی ہے۔ خوب پیسہ بنایا ہے۔ تمہاری ساس بھی حمنیٰ کو وہیں لے گئی تھیں۔ بس اس غریب پر اسی دن سے پھر کام کاج کا بوجھ لاد دیا تھا۔ وہ بیچاری لڑکی بہت کمزور ہو گئی تھی بالآخر جان سے گئی۔ خالہ، خالو آئے تو روتے دھوتے چلے گئے۔ اس کے بعد بی بی آپ ان کے ہاتھ لگ گئیں۔ یہ آپ کے سسرال والے ہیں ناں، یہ نہیں چاہتے کہ بہو بچہ پیدا کرے۔ اظہر الدین بھی کاٹھ کا الو ہے جو ماں کہتی ہے وہی کرتا ہے۔‘‘ تہمین آنسو بھری آنکھوں سے ملازمہ کو دیکھتے ہوئے ساری داستان سن رہی تھی۔ اس کے خاموش ہوتے ہی وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو پڑی۔ ملازمہ نے

بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر اسے خاموش کروایا۔ لمحاتی توقف کے بعد تہمین نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''بس بوا میں نے سوچ لیا ہے کہ کسی طرح اس چوہے دان سے مجھے فرار حاصل کرنا ہے۔ ورنہ یہ شقی القلب لوگ مجھے اور میرے بچے کو ختم کر کے ہی دم لیں گے۔''

''بی بی جی اگر آپ یہاں سے گئیں تو ان لوگوں کا سب سے پہلے شک مجھ پر ہی جائے گا اور پھر یہ لوگ مجھے پاتال میں نہیں چھوڑیں گے۔'' ملازمہ نے ذرا کی ذرا گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''بوا کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں اگر تم چلی جاؤ تو ان لوگوں کو تمہارا پتا نہیں چلے۔'' تہمین بھی سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ سوچ کر ملازمہ نے کہا۔

''ہاں پنجاب میں میرے کچھ رشتے دار ہیں، وہ مجھے بلا رہے ہیں لیکن کرایہ بھاڑا مسئلہ بنا ہوا ہے۔'' تہمین نے فوراً اپنے پرس سے کچھ رقم دیتے ہوئے کہا۔

''بس بوا اب کل سے یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں بھی کل تک یہ گھر چھوڑ دوں گی۔'' رہائی کے لیے وہ پرتول چکی تھی۔

رات میں جب تہمین نے اظہر الدین کو یہ خبر سنائی کہ عنقریب وہ باپ بننے والا ہے تو وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ پھر اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ کا خول چڑھاتے ہوئے کہا۔

''تہمین ابھی ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے۔ اولاد کی اتنی جلدی کیا ہے میرے خیال میں تو......'' وہ کچھ کہتے، کہتے رک گیا تھا اور وہ سوچ رہی تھی بوڑھی ملازمہ کی باتیں حقیقت پر مبنی تھیں۔

''اظہر ہماری یہ پہلی اولاد ہے اور آپ کو خوشی نہیں ہوئی۔'' اپنے چہرے پر بناوٹی مسکراہٹ لاتے ہوئے اس نے کہا۔ اظہر الدین کی آنکھوں میں سفاکی تھی اس نے کرخت لہجے میں کہا۔

''تہمین دنیا میں بچہ ایک آتا ہے لیکن مسائل ہزاروں لاتا ہے۔ اور فی الحال تو میں اپنے ابا کی اولاد پال رہا ہوں، اپنی اولاد پالنے کے لیے میرے پاس وقت ہے نہ پیسہ......'' ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

''تو پھر شادی کیوں کی تھی۔'' اس کی بات پر اظہر الدین تنتنا کر کمرے سے نکل گیا۔ اور تہمین کٹی پتنگ کی طرح بستر پر گر گئی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

☆☆☆

اطلاعی گھنٹی کی آواز سن کر تحسین نے دروازہ کھولا تو غیر متوقع طور پر بڑی بہن کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ بہن کے چہرے کی اڑی، اڑی رنگت اور خالی، خالی نظریں دیکھ کر اس نے اندازہ لگا لیا کہ تہمین خالی از علت نہیں آئی ہے اور جب کشور جہاں نے اپنے بازوؤں کے حصار میں اسے لیا تو وہ بلک، بلک کر رو پڑی۔ والدین اور بہن کے استفسار پر ساری کہانی بلا کم و کاست اس نے ان کے گوش گزار کر دی۔ صولت حسین نے اپنا شفقت آمیز ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور تھرتھراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''بیٹا صبر و استقلال سے کام لو۔ دنیا والے اپنی چالیں چلتے ہیں اور اللہ بہتر تدبیر کرنے والا ہے۔'' کشور جہاں کے پاس تو اسے حوصلہ دینے کے لیے تسلی و تشفی کے الفاظ ہی نہیں تھے۔ وہ خود ہی حوصلہ ہار گئی تھیں جبکہ تحسین بہن کے رخساروں پر گرنے والے آنسوؤں کو اپنے ہاتھوں سے سمیٹ رہی تھی۔ اسی اثنا میں تمکین بھی آ گئی۔ وہ ماں کی مزاج پرسی کے لیے ایک دو روز کے وقفے سے آتی رہتی تھی۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے، یہ کاہے کو رونا دھونا ہے؟'' سب کے اداس اور روتے چہرے دیکھ کر اس نے پُر استعجاب لہجے میں سوال کیا۔ تحسین نے کتر بریدکر کے نہایت مختصر طور پر تہمین پر گزرنے والی بپتا سنائی۔ تمکین نے ناک سکیڑ کر بھویں اچکائیں۔

''آپا اللہ، اللہ کر کے امی، ابو کے ذرا سے کندھے ہلکے ہوئے تھے، تم پھر ان کے سر پر آن موجود ہوئی۔ بیاہی بیٹی کا گزارہ بھی کہیں میکے میں ہوا ہے۔ میری تو رائے ہے اپنی سسرال میں رہ کر ہی حالات کا

مقابلہ کریں۔'' کشور جہاں، تمکین کے یہ جملے سن کر بھڑک اٹھیں۔ ابھی تک وہ خاموش بے آواز روئے جا رہی تھیں۔

''اتنا کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد بھی میں اپنی بیٹی کو ان موذیوں کے حوالے کر دوں تاکہ تمنی کی طرح یہ بھی بھری جوانی میں زمین کا پیوند بن جائے......نہیں، نہیں میں ماں ہوں نو مہینے پیٹ میں رکھا تو کیا گھر میں نہیں رکھوں گی۔ اور برائے مہربانی تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھو۔ میری بیٹی تمہارے گھر نہیں آئے گی۔ روٹیاں توڑنے۔'' وہ تمکین کی باتوں پر چراغ پا ہو گئیں۔

ماں کی زبان سے کھری، کھری سن کر تمکین بری طرح بھنا گئی۔ اپنا پرس اور بچے کو سنبھالتے ہوئے وہ الٹے پیروں واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

تحسین کے چہرے پر ایک استہزائیہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اسے تمکین کی شادی کے بعد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تمکین کو احمد کمال سے وہ پیار نہیں مل سکا تھا جو ایک بیوی کا حق ہوتا ہے اور وہ اپنے دل کا سارا غبار سارا غصہ کسی نہ کسی بہانے تہمین پر اتار کر اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرتی تھی۔

☆☆☆

ماں، باپ کی شفقت و محبت کا چھتنار درخت بھی کسی نعمت سے کم نہیں ہوتا۔ تہمین کو بھی ان بوڑھے اشجار کے سائے میں آ کر تحفظ، سکون اور طمانیت کا احساس ہوا۔ والدین اور بہن ہر طرح سے اس کی دلجوئی کرتے تاکہ وہ اپنے کربناک ماضی کو بھول کر خوش رہنے کی کوشش کرے۔ شہر کی بہترین.... گائناکولوجسٹ کے پاس اس کا کیس تھا اور اس نے بھی خاص ہدایت کی تھی کہ وہ اسٹریس سے دور رہے۔ ان ہی دنوں تحسین کی شادی قرار پائی اور تہمین نے اپنے آپ کو شادی کی گہما گہمی اور مصروفیات میں اس طرح غرق کر لیا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

تحسین کی شادی کے کچھ دنوں بعد ہی اس کی زندگی میں تخلیق کا وہ خوشگوار لمحہ بھی آ گیا۔ جس کا وہ.... بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ دودھ کی طرح سفید اور روئی کے گالوں کی طرح نرم و گداز ایک ننھی سی گڑیا اس کی گود میں آئی تو وہ اپنے سارے دکھ سارے غم بھول گئی۔ آج اسے بے ساختہ اظہر الدین یاد آیا۔ اسے لگا جیسے بیٹی کی پیدائش کی خبر سن کر وہ دوڑا چلا آئے گا اور اپنی بیٹی کو گلے لگا کر کہے گا......میرے گھر آئی ایک ننھی پری......لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا بلکہ بیٹی کی پیدائش کے فوراً بعد ہی اس نے طلاق نامہ بھیج کر رہے سہے تعلقات بھی ختم کر لیے۔ تہمین زندہ درگور ہو گئی لیکن والدین اور بیٹی کی خاطر اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی۔ ہمت و حوصلے کے ساتھ خار دار راہوں پر چلنا اس نے اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔

☆☆☆

ننھی تعبیر نانا، نانی کی آنکھوں کا تارا تھی۔ وہ دونوں اسے دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کے سونے اور ویران گھر میں تعبیر کی قلقاریوں سے زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ صولت حسین اور کشور جہاں کافی حد تک اپنی بیماریوں کو بھول گئے تھے۔ خود تہمین کی بھی زندگی کا مرکز بھی تعبیر کا معصوم وجود تھا۔ وہ اپنے المناک ماضی اور مخدوش حال اور مستقبل کو تعبیر کی ننھی منی شرارتوں میں بھولے ہوئے تھی۔ ہر غم، ہر پریشانی اور تمام تفکرات کو اس نے پسِ پشت ڈال دیا تھا۔ شب و روز کی گردش جاری و ساری تھی۔ اسی درمیان کشور جہاں کی بیماریوں نے مزید طول پکڑ لیا۔ اب وہ مکمل بیڈ ریسٹ پر تھیں۔ اور پھر ایک دن حملۂ قلب کا شکار ہو کر خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ قیامت تو تینوں بہنوں پر ٹوٹی لیکن تہمین نے ماں کی موت کا سب سے زیادہ اثر لیا۔

صولت حسین اور تعبیر اس کی زندگی میں نہ ہوتے تو اسے سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتی۔ تحسین بھی بہن کی خاطر اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ آتی جاتی رہتی لیکن تمکین بہن سے بہت زیادہ متنفر رہنے لگی تھی۔ شاذ و نادر ہی بہن سے بات کرتی۔ بس باپ کے پاس بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے سسرال کی راہ لیتی۔ احمد کمال بھی

کبھی کبھی آکر ماموں کی خیریت دریافت کر لیتے۔

کشور جہاں کی موت کے بعد جب گھر کا سوگوار ماحول ختم ہو گیا اور زندگی اپنے معمول پر آ گئی تو صولت حسین نے بیٹی کی بے رنگ اور ویران زندگی پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور سنجیدگی کے ساتھ اسے سمجھایا کہ وہ نکاحِ ثانی کے لیے تیار ہو جائے۔ تعبیر بھی اب کافی سمجھدار ہو چکی تھی۔ اور اسی وجہ سے تہمین دوسری شادی کے لیے تیار نہیں ہو رہی تھی حالانکہ کئی نکاح کے خواہش مند حضرات صولت حسین تک اپنا پیغام پہنچا چکے تھے۔ لیکن تہمین کی 'نہ' ہاں میں تبدیل نہیں ہو رہی تھی کیونکہ تعبیر کی ساری دنیا ماں اور نانا کے گرد گھومتی تھی۔ دونوں خالائیں مع فیملی کے آجاتیں تو اس کی خوشی دیدنی ہوتی۔ خاص طور سے تمکین کے بچوں کے ساتھ اس کی خوب گھُٹتی کیونکہ وہ بھی اس کی عمر کے تھے۔ شاداب اور فاطمہ اس کے بہت اچھے دوست تھے لیکن تمکین کا رویہ نہ صرف تہمین کے ساتھ کڑوا کسیلا تھا بلکہ بھانجی کو بھی وہ ہمیشہ یہ باور کروانے کی کوشش کرتی کہ باپ ہوتے ہوئے بھی تم یتیمی کی زندگی گزار رہی ہو۔

''تعبیر ماشاء اللہ خیر سے اب بارہ سال کی ہو چکی تھی۔ ہواؤں کا رخ کس سمت ہے وہ اچھی طرح جان گئی تھی۔ اسی لیے جب بھی تمکین اور اس کے بچے نانا کے گھر آتے، وہ اپنے کمرے تک محدود رہتی۔ احمد کمال اور ان کے دونوں بچے شاداب اور فاطمہ اکثر اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے لیکن تعبیر بڑی خوب صورتی سے انہیں ٹال دیتی۔ خود تہمین بھی اپنے آپ سے کیا ہوا وعدہ نبھا رہی تھی۔ شاداب کی پیدائش کے بعد اس نے بھی بہن کے گھر قدم نہیں رکھا تھا۔ جب شاداب اور فاطمہ اصرار کر کے اسے بلاتے تو تمکین فوراً دونوں بچوں کو ایک گھُرکی دیتی۔ ''کیا ضرورت ہے خوشامد کرنے کی آتے تو ویلکم نہیں آتے تو بھیڑ کم......'' دونوں ماں، بیٹیاں یہ جملہ سننے کے بعد اچھی طرح سمجھ گئی تھیں کہ تمکین انہیں کیسی نظروں سے دیکھتی ہے اور انہیں اپنے گھر نہیں بلانا چاہتی ہے۔

☆☆☆

وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا۔ صولت حسین اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ جو بیماریاں انہیں چمٹ گئی ہیں یہ بڑی وفادار ہیں، انہیں لے جائے بغیر نہیں مانیں گی۔ تہمین اور تعبیر کی فکر انہیں دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ آج صبح سے ہی وہ بہت پریشان اور فکر مند تھے اور تفکر اور تردد چہرے سے عیاں تھا۔ اپنی سوچوں میں غلطاں و پیچاں وہ کبھی صوفے پر بیٹھ جاتے کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتے۔ آخر تھک ہار کر انہوں نے تہمین کو آواز دی۔ وہ سارے کام چھوڑ کر فوراً باپ کے پاس پہنچی اور استفسارانہ... نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔ صولت حسین نے اسے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا اور خود بھی اپنی نشست پر بیٹھ گئے۔

چند ثانیے توقف کے بعد انہوں نے پُر خیال انداز میں کہا۔

''تہمین تمہاری ماں تو سدھار گئی ہے اور آنے والا کل یقیناً میری موت کا پیغام بھی لائے گا۔ کیونکہ یہ برحق ہے اور یہی قانونِ قدرت ہے۔ اللہ کا سہارا تو بہت بڑا سہارا ہے لیکن پھر بھی اس دنیا میں رہ کر ہم انسانی رشتوں اور رابطوں کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ میرے بعد تم اور تعبیر یک و تنہا رہ جاؤ گی۔ یہی خوف و خدشات مجھے کھائے جا رہے ہیں، یقین کرو میری راتوں کی نیندیں اُڑ گئی ہیں۔ میں چاہتا ہوں میری آنکھیں بند ہونے سے پہلے تمہیں کوئی مضبوط سائبان اور کوئی سایہ دار پناہ گاہ مل جائے۔ ورنہ تو قبر میں میری پشت نہ ٹک سکے گی۔'' باپ کی باتیں سن کر تہمین کے چہرے پر تفکرات کے سائے لرزنے لگے۔ لیکن باپ کی کسی بات کی نفی بھی نہیں کر سکتی تھی کیونکہ لاکھ تلخ سہی لیکن ان کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات ایک ٹھوس حقیقت تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد پروفیسر صاحب پھر گویا ہوئے۔ ''کل تمہاری غیر موجودگی میں جہانگیر اور ان کی بیگم آئے تھے۔ جہانگیر کو تم جانتی ہوناں؟'' انہوں نے بیٹی سے استفسار کیا۔

''جی اچھی طرح... جہانگیر بھائی آپ کے

اسٹوڈنٹ بھی رہ چکے ہیں۔ ان کی بیگم بھی اکثر امی کے پاس آتی رہتی تھیں۔''

''ہوں......'' پروفیسر صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور پھر بات آگے بڑھائی۔ ''جہانگیر کے ایک دوست انعام الرحمٰن ہیں الرحمٰن کنسٹرکشن کے مالک۔ سرکاری ٹھیکے بھی لیتے ہیں، وسیع و عریض کاروبار کے مالک ہیں۔ انعام بھی کسی زمانے میں میرے شاگرد رہ چکے ہیں بلکہ میرے ہونہار شاگردوں میں ان کا شمار تھا۔ اس لیے کل جب جہانگیر نے ان کا ذکر کیا تو مجھے فوراً یاد آ گیا۔ وہ اور جہانگیر کلاس فیلو تھے۔ مالی پوزیشن کافی مستحکم اور مضبوط ہے۔ شادی بیاہ کے جھمیلے سے ابھی تک دور ہے، بقول جہانگیر کے دوست احباب نے زور دیا تو اب رضامند ہوئے ہیں، کل دونوں میاں، بیوی اسی سلسلے میں آئے تھے لیکن تم باہر گئی ہوئی تھیں۔'' تہمین کے دل و دماغ میں تلاطم برپا تھا۔ سانسوں کا زیر و بم تیز ہو گیا تھا۔ کیونکہ تعبیر کی پیدائش کے بعد تو وہ یہ بات سوچنا بھی گناہ تصور کرتی تھی۔ لیکن باپ کی پریشانی اور بیچارگی بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ صولت حسین جواب طلب نظروں سے بیٹی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک آس ایک امید تھی اور تہمین باپ کی آنکھوں کو پڑھنا اچھی طرح جانتی تھی۔ ''بیٹی میں تمہارے جواب کا منتظر ہوں۔'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے پھر کہا۔

''ابو مسئلہ نہایت نازک نوعیت کا ہے، آگے چل کر میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ میں اب ایک بیٹی کی ماں ہوں جو باشعور اور سمجھدار ہو چکی ہے۔ نہ وہ سوتیلے باپ کو قبول کرے گی اور نہ شاید انعام الرحمٰن اسے برداشت کریں گے۔'' صولت حسین نے اس کی بات پوری سنجیدگی کے ساتھ سنی اور کہا۔

''جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، انعام الرحمٰن نہایت با اخلاق اور وسیع القلب انسان ہیں، وہ تعبیر کو بحیثیت بیٹی ضرور اپنائیں گے۔ میری بچی منفی خیالات کو ذہن سے نکال کر مثبت انداز میں سوچو، اللہ سے اچھے کی امید رکھو۔ اگر اللہ نہ کرے یہ وقت نکل گیا تو ہمارے پاس سوائے پچھتانے کے کچھ نہیں رہ جائے گا۔'' باپ کے لہجے کا ارتعاش، ان کی عاجزانہ درخواست، ان کے چہرے پر لرزتے تفکرات تہمین دیکھ رہی تھی اور محسوس بھی کر رہی تھی۔ اس لیے اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا کیونکہ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر اس نے ہٹ دھرمی دکھائی تو اس کا بوڑھا باپ کل مرنے کے بجائے آج ہی ختم ہو جائے گا۔

نانا اور ماں کے درمیان ہونے والی خفیہ میٹنگ کی تھوڑی بہت سن گن تعبیر کو بھی مل چکی تھی لیکن ابھی تک کوئی بات کھل کر سامنے نہیں آئی تھی۔ بالآخر تہمین نے تحسین کے ذریعے ساری بات بیٹی کے گوش گزار کر دی۔ تحسین کے الفاظ کھُلے ہوئے سیسے کی طرح تعبیر کی سماعت سے ٹکرائے۔ اس نے نہ صرف بھوک ہڑتال کر دی بلکہ اسکول کا بھی بائیکاٹ کر دیا۔ تہمین کے لیے یہ لمحۂ فکریہ تھا لیکن صولت حسین نے بحسن و خوبی اپنی حکمت سے سارا معاملہ نمٹا دیا۔ اس کی ایک نہیں مانی اور اپنی منوالی۔ تعبیر نے اس بات پر سمجھوتا کر لیا کہ وہ ساری زندگی صولت حسین کے پاس رہے گی۔ انعام الرحمٰن کی دہلیز پر کبھی قدم نہیں رکھے گی۔ اور تہمین اس سے ملنے کے لیے گاہے بہ گاہے خود آئے گی۔ انعام الرحمٰن ساتھ نہیں ہوں گے۔ دو طرفہ ڈیل طے پا گئی تھی۔ لیکن یہ فیصلہ تہمین کے دل کو لہولہان کر گیا۔ کیونکہ وہ اس کے وجود کا ایک حصہ تھی۔ اس سے جدا ہونے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ صولت حسین نے نہایت خوب صورتی سے بیٹی کی شکایت بھی دور کر دی۔ انہوں نے نہایت واضح الفاظ میں تہمین سے کہا۔

''میں چراغِ سحری ہوں، جب تک سانسوں کی ڈور ہے تمہیں نظر آ رہا ہوں، کل کلاں کو میں نہیں رہوں گا تو وہ اتنے بڑے گھر میں تن تنہا تو نہیں رہ سکتی۔ بالآخر اسے تمہارے ساتھ جانا ہی ہوگا اور اس طرح یہ معاہدہ خود بخود ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔'' تہمین

خاموش اور مجبور نگاہوں سے باپ کی طرف دیکھتی رہی۔ نہ کوئی احتجاج نہ شکایت نہ شکوہ' پتھر کا بت بنی ہوئی وہ ہر بات سنتی اور سر جھکا دیتی۔ تعبیر نے بھی چپ رہ کر اپنے انداز و اطوار سے ظاہر کر دیا تھا کہ وہ تہمین سے سخت خفا ہے۔ پہلے تو ضرورتاً بات کر لیتی تھی لیکن اب تو اس نے اپنے کمرے سے نکلنا بھی بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

احمد کمال اور تمکین خیر خیریت دریافت کرنے صولت حسین کے پاس آئے ہوئے تھے۔ صولت حسین نے سارا معاملہ جب ان دونوں کو بتایا تو احمد کمال نے خوش دلی کے ساتھ کہا۔

''میں آپ سے متفق ہوں، آپ نے تہمین کے لیے جو بھی سوچا ہے بہتر ہی سوچا ہے۔ تعبیر بچی ہے اس نئے رشتے سے منحرف ضرور ہے لیکن انشاء اللہ حالات سازگار ہونے پر خود ہی اس رشتے کو برضا و رغبت قبول کر لے گی۔'' باپ اور شوہر کے مکالمے سن کر تمکین کے تلوؤں سے لگی اس نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''جب ایک گھر میں نہیں ہوا تو دوسرے گھر میں کیا گزارہ ہوگا اور ابو اس بڑھاپے میں آپ کہاں کورٹ کچہری کے چکر لگائیں گے۔ میرے خیال میں تو آپ اس معاملے کو یہیں ختم کر دیجیے۔ اور یہ تعبیر ہے ناں یہ کوئی فساد نہ کھڑا کر دے...... کیونکہ یہ ماں سے بھی دو قدم زیادہ ہے، میں تو حق بات کہوں گی دیگ سے زیادہ چمچہ گرم ہے۔'' احمد کمال، بیوی کی بکواس سن کر بھڑک اٹھے۔

''تمکین زندگی میں کس پل کس موڑ پر ہمارے ساتھ کیا ہونے والا ہے ہمیں کچھ پتا نہیں، تہمین کی زندگی گرتی ہوئی دیوار کی طرح ہے اور اسے ٹھوکریں مار، مار کر تم اور ریزہ، ریزہ کر رہی ہو۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھنے کے بجائے نمک پاشی کر رہی ہو۔ مکافاتِ عمل بھی کوئی چیز ہے۔ اگر منصفِ حقیقی کی گرفت میں آ گئی ناں تو زمین تنگ ہو جائے گی تم پر۔'' شوہر کی باتوں پر تمکین مزید سیخ پا ہو گئی۔

''سارے زمانے کے سامنے ٹھکرایا ہے آپ کو لیکن اس کی سائڈ لینے سے باز نہیں آتے۔ ہمیشہ اس کا ہی گانا گاتے ہیں۔'' اس نے جیسے انگارے چبائے۔

صولت حسین دونوں میاں، بیوی کے درمیان ہونے والی تلخ کلامی سننے کے باوجود بھی خاموش تھے۔ لیکن چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ تمکین کی باتوں سے انہیں سخت دھچکا لگا ہے جبکہ احمد کمال کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انہوں نے مشفقانہ انداز میں تھپتھپایا جیسے ان کی ہر بات کی تائید کر رہے ہوں۔

☆☆☆

تمام ضروری باتیں طے پانے کے بعد ایک مبارک ساعت دیکھ کر عقد کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ مختصر سے مہمانوں پر مشتمل یہ سادہ سی تقریب تھی جو صولت حسین کے گھر ہی انجام پائی۔ تحسین نے بہن کا ہلکا پھلکا میک اپ کر کے اسے تیار کر دیا تھا۔ لیکن عروسی جوڑا زیب تن کرنے کے بعد یہ معمولی میک اپ بھی غضب ڈھا رہا تھا۔ اس پر نظر ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔

''آپا اظہر الدین بڑا بدقسمت تھا۔ خوش قسمت تو دراصل انعام الرحمٰن ہیں۔'' تحسین نے بہن کو بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے سرگوشی کی۔

تہمین کے چہرے پر ایک سوگوار سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے آہستہ سے تعبیر کا پوچھا۔ تحسین نے بتایا کہ ''وہ صبح سے اپنے کمرے میں مقید ہے۔ ناشتا کیا ہے اور نہ کھانا کھایا ہے؟'' تہمین بے جان نظروں سے بہن کو تکنے لگی اور تھرتھراتی آواز میں کہا۔

''تحسین میری تابی کا خیال رکھنا، میں اپنی جان، اپنی روح تمہارے پاس چھوڑے جا رہی ہوں۔ میری رخصتی کے بعد تم اور ابو اسے زبردستی کچھ کھلا پلا دینا۔ بھوک کی تو اسے بالکل برداشت نہیں ہے، پتا نہیں آج کیا ہو گیا۔'' وقتِ رخصتی تحسین زبردستی تعبیر کو بازو... پکڑ کر ماں کے پاس لے آئی۔ دونوں ماں، بیٹی ایک دوسرے کے روبرو گم صم کھڑی تھیں۔ دونوں کی زبانیں گنگ تھیں کسی کے پاس تسلی تشفی کے الفاظ تھے نہ کسی کی

زبان نے ساتھ دیا۔ دونوں جانب جمود طاری تھا۔ اچانک ممتا جوش میں آئی اور تہمین نے بے ساختہ بیٹی کو اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے کر اس کی جلتی ہوئی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے لیکن تعبیر نے ایک سرکش جھٹکے کے ساتھ بانہوں کا یہ حصار توڑا اور زار و قطار روتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

صورتِ حال اتنی سنگین اور رقت آمیز تھی کہ مہمان خواتین بھی اپنے آنسو نہ روک سکیں۔ صولت حسین اور تحسین کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ گھر سے دلہن کی ڈولی نہیں بلکہ جنازہ رخصت کیا جا رہا ہے۔

☆☆☆

انعام الرحمٰن کی وسیع کوٹھی میں ان کے علاوہ ان کی مرحوم بہن کا سولہ سالہ بیٹا سروش خوش بخت بھی رہائش پزیر تھا۔ سروش کے والدین ایک کار ایکسیڈنٹ میں اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ انعام الرحمٰن نے ہی ماں، باپ بن کر اس کی پرورش کی تھی۔

اتنی بڑی کوٹھی میں ان دونوں کے علاوہ ملازمین کی اچھی خاصی فوج تھی۔ فی الفور تو شادی کی وجہ سے قریب و دور دراز کے عزیز و اقارب اور دوست احباب آئے ہوئے تھے، اس لیے کوٹھی میں بڑی رونق اور گہما گہمی کا عالم تھا۔ اور جب تہمین نے یہاں قدم رکھا تو جیسے قوسِ قزح کے رنگ بکھر گئے۔ انعام الرحمٰن کو آج احساس ہوا کہ عورت کے دم سے ہی زندگی کی رنگینیاں قائم و دائم ہیں۔

انعام الرحمٰن کا حلقۂ احباب کافی وسیع تھا اس لیے ولیمہ نہایت شاندار طریقے سے منعقد کیا گیا۔ تہمین کے میکے سے اس تقریب میں کسی نے شرکت نہیں کی تھی، اس لیے تہمین کی بے چینی اور بے قراری عروج پر تھی۔ جب دل کی خلش ناقابلِ برداشت ہو گئی تو اس نے تحسین کے موبائل پر کال کی لیکن کسی نے اٹھانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اس کے بعد صولت حسین سے بات کرنے کی کوشش لیکن وہاں بھی خاموشی کا راج تھا اب تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ جیسے ہی سارے مہمان رخصت ہوئے اس نے حالِ دل کھول کر شوہر کے سامنے رکھ دیا۔

'' انعام صاحب میرا دل بہت گھبرا رہا ہے' مجھے میری بیٹی بہت یاد آ رہی ہے۔'' انعام الرحمٰن نے محبت پاش نظروں سے بیوی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہمت اور حوصلے سے کام لو۔ اللہ سب بہتر کرے گا لیکن مجھے تم سے ایک شکایت ہے۔ تعبیر کو تم میری بیٹی کیوں کہہ رہی ہو۔ آج سے وہ ہم دونوں کی بیٹی ہے، تم تو خیر ماں ہو لیکن مجھے بھی وہ بہت عزیز ہے۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گی تم نے اسے وہاں کیوں چھوڑ رکھا ہے۔ رات زیادہ ہو گئی ہے لیکن کوئی مضائقہ نہیں، ہم دونوں جا کر اسے لے آتے ہیں۔'' اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ وہ لوگ وہاں گھر پہنچے تو علاوہ تمکین کے سارا کنبہ تعبیر کے گرد جمع تھا۔ تحسین نے تفصیل کے ساتھ اسے سب کچھ بتاتے ہوئے کہا۔

''آپا آپ کے جانے کے بعد یہ اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ میرے میاں اور کمال بھائی اسے فوری ڈاکٹر کے پاس لے گئے، کچھ گھنٹوں کے لیے ڈاکٹر نے اسے اسپتال میں ہی رکھا۔ اب حالت بہتر ہونے پر ہم لوگ ابھی، ابھی اسے لے کر آئے۔ بس اسی افراتفری میں ہم لوگ ریسپشن بھی اٹینڈ نہیں کر سکے۔ انعام بھائی سے بھی معذرت کرنی ہے۔'' تہمین بیٹی پر سے واری صدقے ہو رہی تھی۔ طبیعت تو تعبیر کی قدرے بہتر تھی لیکن نقاہت اور کمزوری حد سے زیادہ تھی۔ اب بھی نیم بے ہوشی کی سی کیفیت تھی اور انعام الرحمٰن اسی حالت میں اسے لے جانے پر بضد تھے۔ کار کی عقبی سیٹ پر انہوں نے تہمین اور تعبیر کو بٹھایا اور خود ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے۔ اور وہاں سے روانہ ہوئے۔ راستہ کیسے کٹا، کب منزل آئی تعبیر کو کچھ پتا نہیں۔ اور تہمین بھی راستے بھر یہی سوچتی رہی کہ ابھی تک اس کے ساتھ جو کچھ بھی گزرا ہے وہ ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ صحرا کی تیز تپتی ہوئی دھوپ تھی جس میں وہ

ایک عرصے تک چلتی رہی ہے۔ لیکن اب اس کی زندگی میں انعام الرحمٰن کی آمد سے ہوا کا ایک ایسا خوشگوار جھونکا آیا تھا جو اس کے وجود پر بہار بن کر چھا گیا تھا۔ وہ پہلی رات شوہر کے شائستہ اندازِ گفتگو اور ان کی..... منکسر المزاجی سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔ مردوں کے خلاف دل و دماغ میں پیدا ہونے والے وسوسے ہوا میں تحلیل ہو کر بکھر چکے تھے۔ لاشعوری طور پر اسے ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا تھا۔

☆☆☆

تعبیر نے کسمسا کر آنکھ کھولی تو کمرے کی تزئین و آرائش اور قیمتی ساز و سامان دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ اس کے نانا کا گھر نہیں بلکہ اس کے سوتیلے باپ کی پُرتعیش کوٹھی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی اسے سب کچھ یاد آگیا۔ تہمین اس کے سرہانے بیڈ پر بیٹھی جبکہ انعام الرحمٰن اور ان کا بھانجا صوفے پر براجمان تھے۔ سب کے چہروں پر فکر و تشویش کے آثار تھے۔ جیسے ہی اس نے آنکھ کھولی سب نے اطمینان کی سانس لی۔ تعبیر کی نظر جیسے انعام الرحمٰن پر پڑی اس کے حلق تک کڑواہٹ گھل گئی۔ اس کے چہرے پر نفرت ہی نفرت تھی۔ اپنے چہرے کے تاثرات وہ چھپا نہیں سکی۔ خود انعام الرحمٰن نے بھی یہ بات واضح طور پر محسوس کی پھر بھی انہوں نے نہایت مہذب اور مشفق انداز میں اس کی خیریت دریافت کی جس کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''تابی تمہیں اللہ نے نئی زندگی دے کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے ورنہ......'' تہمین نے اپنی بانہیں اس کے گلے میں حمائل کرتے ہوئے کہا۔

''کاش اللہ ایسا نہ کرتا۔'' تعبیر نے فوراً جملہ اچک لیا اور کاٹ دار لہجے میں کہا۔

آواز اتنی صاف تھی کہ کمرے میں موجود ہر شخص نے سنی بلکہ تعبیر نے ڈاکٹر اور نرس کی بھی پروا نہیں کی۔ اس کی اس بدتمیزی پر تہمین کے چہرے پر ندامت اور شرمندگی کے آثار تھے۔ انعام الرحمٰن نرس کو ہدایت دیتے ہوئے سروش کے ساتھ باہر چلے گئے۔

☆☆☆

تہمین کمرے میں داخل ہوئی اور بڑے پیار سے پکارا۔

''تابی چلو بیٹا ناشتے پر سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔'' تعبیر نے معنی خیز انداز میں ماں کو دیکھا۔

''سب کون؟'' وہ طنزیہ بولی۔

''تمہارے پاپا کہہ رہے ہیں جب تک ہماری بیٹی نہیں آئے گی ہم ناشتا نہیں کریں گے۔'' تہمین نے اس کے لہجے کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑی مٹھاس سے کہا۔ تعبیر نے کندھے اچکاتے ہوئے مشتعل لہجے میں کہا۔

''میں ناشتا اسی کمرے میں کروں گی اور آپ کو بھی میرے ساتھ ہی ناشتا کرنا ہوگا۔'' اس کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ماں سے اب تک خفا ہے۔ ''اس کے بعد میں نانا ابو کے پاس چلی جاؤں گی۔ آپ کی مرضی آپ جہاں رہنا چاہیں۔'' تہمین کی آنکھوں میں بیکراں اداسی اور اشکوں کی نمی تھی۔

''تعبیر میری جان، میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔'' تہمین کا لہجہ گلوگیر تھا۔ ''تم میری ذمّے داری ہوں، نانا کی حالت تم دیکھ رہی ہو، کب داغِ مفارقت دے جائیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

''آپ نے تو جو میری ذمّے داری نبھائی ہے ناں اس کے لیے میں آپ کی شکر گزار ہوں۔'' تعبیر نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ماں کو دیکھا۔ اسی دوران انعام الرحمٰن کمرے میں داخل ہوئے۔ دونوں ماں، بیٹی کے چہروں کو دیکھ کر ہی انہیں صورتِ حال کا اندازہ ہوگیا۔ انہوں نے ناشتے کی میز تک چلنے کے لیے دونوں سے اصرار نہیں کیا بلکہ ملازم کو کمرے میں ہی ناشتا لگانے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی اپنے بھانجے سروش کو بھی آواز دی۔ سب نے مل کر کمرے میں ہی ناشتا کیا لیکن کمرے کا ماحول اتنا کشیدہ... اور تناؤ سے بھرپور تھا کہ سب زبردستی زہر مار کر رہے تھے۔ دورانِ ناشتا انعام

الرحمٰن، تعبیر سے اس کی صحت، تعلیم اور دیگر مشاغل کے بارے میں باتیں کرتے رہے، اپنے دل پر جبر کر کے اور ماں کی گھورتی ہوئی قہر آلود نظروں کو دیکھتے ہوئے اس نے نہایت تلخ و ترش لہجے میں جوابات تو دیے لیکن لہجے میں بدتمیزی اور بداخلاقی کا عنصر نمایاں تھا۔ اور تہمین کا دل چاہ رہا تھا کہ زمین شق ہو جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ ناشتے کے بعد انعام الرحمٰن اور سروش کمرے سے نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی تہمین بیٹی پر برس پڑی۔ لیکن تعبیر نے بھی تمام ادب و آداب و لحاظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے اعتنائی اور خودسری کا... بھرپور مظاہرہ کیا۔

''آج تو میں آپ کی وجہ سے ان صاحب کے ساتھ ناشتا کرلیا ہے لیکن اب میں انہیں نہیں برداشت کرسکتی۔ اب آپ کے ساتھ میرا گزارہ مشکل ہے کیونکہ آپ ان کے بغیر نہیں رہ سکتیں اور میں ان کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی۔ اس سونے کے پنجرے میں میرا دم گھٹ جائے گا۔ اور آپ انعام الرحمٰن صاحب کو وارن کردیجیے کہ آئندہ مجھے بیٹی کہہ کر نہ مخاطب کریں، کوئی میں ان کی لختِ جگر نہیں ہوں، میرے اور ان کے درمیان کوئی رشتہ نہیں ہے، ان سے کہیے گا کہ وہ میرے کسی ذاتی معاملے پر مجھ سے کوئی گفتگو نہ کریں۔ اور وہ جو اُن کا بھانجا ہے ناں کیا نام ہے اس کا بدبخت یا کم بخت...... ایسا ہی کچھ بتایا تھا اس نے مجھ سے کہہ رہا تھا آپ میری کزن ہیں، میری ماموں زاد ہیں، مائی فٹ...... میں کہاں سے اس کی ماموں زاد بن گئی۔ قریب آنے کے بہانے ڈھونڈ رہا ہے۔'' تہمین زخمی نگاہوں سے کمال صبر کے ساتھ بیٹی کی اناپ شناپ سنتی رہی۔ جو ابھی پندرہ سال کی تھی، بیٹی کو کس طرح راہِ راست پر لائے اسے سمجھ نہیں آرہا تھا بس وہ آنکھیں پھاڑے اسے تک رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ تعبیر بول رہی ہے، وہ ابھی تک اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ اس کی بیٹی ننھی، نادان اور کمسن ہے لیکن آج جب اس کی دلی کیفیات سے روشناس ہونے کا موقع ملا تو اسے حیرت اور تاسف کا ایک بڑا جھٹکا لگا اسے احساس ہوا کہ اس کے اور اظہر الدین کے درمیان پڑنے والی دراڑ نے اس کی شخصیت کو بری طرح متاثر کیا ہے، کچا ذہن اور الٹی سیدھی سوچوں میں ہچکولے کھاتی ہوئی تعبیر کے سامنے جب انعام الرحمٰن باپ کی حیثیت سے سامنے آئے تو ان کی پیشانی پر سوتیلے باپ کا لیبل چسپاں تھا۔ اور اس کا ذہن یہ قبول نہیں کرسکا۔ ذہنی انتشار اتنا بڑھا کہ وہ ٹوٹ کر بکھر گئی۔ بیٹی کی اس حالت کا ذمّے دار وہ اپنے آپ کو سمجھ رہی تھی۔ تعبیر کو بجائے کوئی نصیحت کرنے کے اس نے خاموش رہنے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

تہمین اور انعام الرحمٰن کا آغازِ سفر انتہائی خوشگوار انداز میں ہوا۔ دونوں کی محبت میں ایک دوسرے کے لیے ہم آہنگی، خلوص، رواداری اور یکجائی کا عنصر نمایاں تھا۔ دونوں کے درمیان ایک دوسرے کے لیے چاہے جانے کا ایسا جذبہ تھا جس میں سارے جہاں کی رنگینیاں اور خوب صورتی شامل تھی۔ تعبیر کبھی ماں سے یا کبھی ان سے الجھنے کی کوشش کرتی تو وہ اس کی برنا تجھی اور سرکشی کو کمال سنجیدگی سے نظر انداز کردیتے بلکہ تہمین کو ہمیشہ یہی کہتے ''بچی ہے وقت آنے پر خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔'' تہمین کی دلی خواہش تھی بلکہ انعام الرحمٰن کے دل میں بھی یہ چاہ موجود تھی کہ تعبیر انہیں ''پاپا'' یا ''ابو'' کہہ کر مخاطب کرے لیکن اس کے برعکس تعبیر جب بھی بولنے کے لیے منہ کھولتی تو ایسے زہریلے تیروں کی برسات کرتی کہ انعام الرحمٰن چپ سادھ لیتے اور تہمین خجالت و شرمندگی کے مارے سر نہ اٹھا پاتی۔ دونوں ماں، بیٹی کے درمیان کئی مرتبہ تلخ تکرار کی نوبت آچکی تھی لیکن کبھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا۔ سروش خوش بخت بھی اپنی کزن سمجھ کر اکثر اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن پھر اس کی خودسری اور اکھڑ پن دیکھ کر خود ہی ٹھٹک جاتا حالانکہ وہ نہایت خوبرو، خوش شکل اور خوش لباس نوجوان تھا بلکہ فطرتاً بھی نہایت ہنس مکھ

اور زندہ دل تھا جو بھی اس کی صحبت میں بیٹھتا تھوڑی دیر کے لیے اپنے رنج و غم بھول جاتا تھا لیکن تعبیر نے ابھی تک اسے منہ نہیں لگایا تھا۔ اس نے کئی بار اسے طرح، طرح کے لطیفے سنا کر ہنسانے کی کوشش کی سروش کے لطیفے سن کر وہ اس طرح برا سا منہ بناتی جیسے اسے کوئی کڑوی دوا پلائی گئی ہے مگر سروش بھی ایک ڈھیٹ تھا وقتاً فوقتاً اپنی شوخ اور شرارتی حرکتوں سے اسے خوش رہنے کی ترغیب دیتا لیکن پتھر کی مورتی میں ذرا سی بھی دراڑ نہ آئی۔ جیسے، جیسے وہ تعلیمی مدارج طے کرتی رہی اس کی کامیابیوں پر اس کی برتھ ڈیز پر انعام الرحمٰن اس کے لیے قیمتی تحفوں کے ڈھیر لگاتے رہے۔ لیکن اس نے برتنا تو درکنار آج تک ان سے گفٹ پیپرز بھی نہیں ہٹائے تھے۔ ہر چیز ہر تحفہ الماری کی زینت بن جاتا۔ قیمتی ملبوسات کا ڈھیر ہوتا لیکن وہ انتہائی سادہ اور کم قیمت کپڑے پہن کر اپنی ہی دنیا میں گم رہتی۔ خاموش، خاموش، بیزار، بیزار......

وقت سرعت کے ساتھ گزر رہا تھا۔ انعام الرحمٰن اور تہمینہ کی شادی کو سات سال گزر چکے تھے۔ اسی اثنا میں ان کے گلستانِ حیات میں دو پھولوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا عزم الرحمٰن اور ایک بیٹی آمنہ الرحمٰن، دونوں کے لیے خوشیاں ٹوٹ کر برسی تھیں۔ حتیٰ کہ دامن تنگ پڑ رہا تھا ہر طرف رنگوں کی بہار تھی، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے۔ دونوں بچوں کی آمد کے بعد بھی تعبیر کے لاڈ پیار میں دونوں میاں، بیوی نے کوئی کمی نہیں آنے دی تھی۔ اس کے ناز نخرے اسی طرح اٹھائے جاتے۔ لیکن اس کا ذہن بدلنے میں دونوں ناکام رہے تھے۔ بھائی، بہن سے وہ ہمیشہ اسی لیے دور رہتی کہ وہ انعام الرحمٰن کی اولاد ہے۔ آمنہ سے تو اسے تھوڑی بہت انسیت تھی لیکن چھوٹے بھائی کو تو بالکل نہ دیکھتی۔ انعام الرحمٰن اپنے بچوں کے ساتھ اس کا تلخ اور ناروا رویہ دیکھتے لیکن انتہائی صبر و استقامت کے ساتھ سب کچھ برداشت کر رہے تھے بلکہ ہر طرح سے اس کا بڑھ کر خیال رکھتے اور تہمینہ کو بھی تاکید کرتے کہ اسے خوش رکھنے کی کوشش کی جائے ان ہی دنوں صولت حسین بھی ایک طویل بیماری کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کی موت کے بعد تعبیر کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ دنیا میں اکیلی رہ گئی ہو۔ نانا کے دم سے اسے بہت ڈھارس تھی۔

☆☆☆

نئی عمر کی نئی فصل اپنے جوبن پر تھی۔ تعبیر ماسٹرز کر رہی تھی۔ شاداب کا انجینیئرنگ کا فائنل تھا۔ سروش ایم بی اے کر چکا تھا اور انعام الرحمٰن کے ساتھ دفتری امور میں ہاتھ بٹا رہا تھا۔ عزم الرحمٰن اور آمنہ کا بچپن کا دور تھا۔ وہ دونوں ابھی اسکول جاتے تھے، دن رات کے پیچھے اور رات، دن کے پیچھے تعاقب میں بھاگ رہے تھے۔ بہت کچھ بدل چکا تھا لیکن تبدیلی نہیں آئی تھی تو تعبیر کے مزاج میں...... وہی رفتار بے ڈھنگی جو پہلے تھی وہ اب بھی تھی۔

اس وقت سروش خوش بخت اور تعبیر ناشتے کی میز پر اکیلے تھے کیونکہ گھر کے سارے افراد ناشتے سے فارغ ہو چکے تھے۔ تعبیر کی خاص ملازمہ جمیلہ بوا جلدی، جلدی ناشتے کی میز سجا رہی تھی۔ جمیلہ بوا انعام الرحمٰن کے حکم پر صرف تعبیر کے کاموں کے لیے ہی مخصوص تھی۔ تعبیر کی آنکھ کے اشارے پر تیر کی طرح دوڑی چلی آتی۔ بلکہ باہر بھی وہ کسی کام سے آتی جاتی تو جمیلہ بوا اس کے ساتھ ہوتی۔ چونکہ سروش کسی نہ کسی بہانے تعبیر کے گرد منڈلاتا رہتا تھا اس لیے جمیلہ بوا خونخوار نظروں سے اسے گھورتی رہتی تھیں اور سروش انہیں پریشان کرنے کے لیے ناشتے سے لے کر ڈنر تک تعبیر کے ساتھ کرتا...... بڑی بی کو چڑانے میں اسے مزہ آنے لگا تھا۔ اس وقت بھی انگلیوں سے میز بجاتے ہوئے اس نے جمیلہ بوا کو پکارا۔

''جی...... ی...... ی...... لہ بوا......'' اس کے اس طرح پکارنے پر تعبیر نے زہر خند لہجے میں کہا۔

''یہ آپ میری بوا کے نام کی اتنی کھینچا تانی کیوں کرتے ہیں۔''

''ارے تعبیر صاحبہ آپ کو نہیں معلوم دنیا میں سب سے زیادہ طویل ترین نام آپ کی بوا ہی کا تو ہے۔'' سروش نے اس کی طرف شرارت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ کس طرح؟'' تعبیر نے بھویں اچکائیں۔

سروش نے چائے کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''ج اور ہ کے درمیان مکمل میل کا فاصلہ ہے اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ اپنی بوا کے نام کے ہجے ملاحظہ فرمائیے۔'' قریب کھڑی جمیلہ بوا کے سر پر سے تو ساری بات نکل گئی لیکن تعبیر کو اپنی ہنسی روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ اپنے چہرے پر مصنوعی خفگی کا ماسک چڑھاتے ہوئے اس نے تیز آواز میں کہا۔

''معذرت کے ساتھ عرض کر رہی ہوں، یہ جو آپ کا سر نیم ہے ناں اس کی ادائیگی کرتے وقت میرے ذہن میں کچھ اور آتا ہے۔''

''کم بخت یا بد بخت...... چلیں آپ یہی کہہ کر مخاطب کر لیا کریں کم از کم تعلق تو بنا رہے گا۔'' سروش نے فوراً کہا۔

''کیا مطلب کیسا تعلق......؟ جب تعارف ہی نہیں ہے تو تعلق کیا معنی...... ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے آج بھی اجنبی ہیں۔'' تعبیر نے آنکھیں نکالیں۔

''تعبیر صاحبہ آپ نے تو دل کے ٹکڑے، ٹکڑے کر دیے جبکہ میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ عنقریب شیطان مردود کو دھاڑیں، مار، مار کر روتے پر مجبور کر دوں گا۔''

تعبیر نے حیران کن نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہاں اس وقت شیطان کا کیا ذکر میں کچھ سمجھی نہیں؟'' وہ حیرت سے پوچھنے لگی۔

سروش نے ایک گہری سانس لی اور جواباً کہا۔

''ارے محترمہ ایک تو ہر بات آپ کو مع سیاق و سباق سمجھانا پڑتی ہے۔ چلیے کوئی بات نہیں، میں تشریح کیے دیتا ہوں۔ دراصل جب کسی مومن مرد کا مومن عورت کے ساتھ نکاح ہوتا ہے تو ابلیس زار و قطار روتا ہے، اب آپ سوال کریں گی کہ کیوں روتا ہے؟ اس لیے نہیں کہ اسے شادی کی دعوت نہیں دی جاتی ہے بلکہ اس لیے کہ نکاح سنت ہے، اس لیے میں نے بھی مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ ہم دونوں بھی انشاء اللہ آئندہ سال تک اسے ایسا رلائیں گے کہ سارا زمانہ دیکھے گا۔''

تعبیر اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ سروش نے بلا خوف و خطر اس کے روبرو دل کی بات کہہ دی تھی۔ جمیلہ بوا کی سمجھ میں خاک بھی نہیں آیا تھا مگر وہ اتنا سمجھ گئی تھی کہ سروش نے تعبیر کے مزاج کے خلاف کچھ کہہ دیا ہے اس لیے وہ تعبیر کو سمجھا بجھا کر وہاں سے لے گئی۔ اپنی بڑبڑاہٹ میں وہ سروش کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ اور سروش شوخ نظروں سے تعبیر کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔

''یہ غصے میں اور پیاری لگتی ہے اور جمیلہ بوا غصے میں اور کھوسٹ لگتی ہے، شادی کے بعد تعبیر کے ساتھ، ساتھ انہیں بھی برداشت کرنا ہوگا۔'' میز سے اٹھتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔

''چلو میاں پھولوں کی مہک کے ساتھ کانٹوں کی چبھن تو ہوتی ہی ہے، بھگتنا تو پڑے گا۔'' جمیلہ بوا تعبیر کا ہاتھ پکڑ کر کمرے تک لائیں کیونکہ وہ سخت غصے میں تھی۔ کمرے کے دروازے پر پہنچ کر تعبیر نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑایا۔

''بس بوا آپ اپنا کام کیجیے اور مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیجیے۔'' کہہ کر ہی اس نے دروازہ بند کیا اور اپنے بیڈ پر گر کر ہنسی سے دوہری ہو گئی۔ اس کا غصہ، گھن گرج اور طنطنہ پل کی پل میں غائب ہو چکا تھا۔ سروش کی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی تو وہ ایک عرصے سے قائل تھی لیکن اس وقت ہنسی ہی ہنسی میں جس خوب صورت انداز سے اس نے اس سے اظہارِ محبت کیا تھا وہ ایسا من موہنا اور دلکش تھا کہ آنکھوں کے راستے سیدھا دل میں اتر گیا۔ چہرہ شرم و حیا سے گلنار تھا اور دل کی دھڑکنیں گنگنا رہی تھیں۔ کچھ سوچ کر وہ بیڈ سے

اٹھی اور آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ غور سے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا تو اپنی آنکھیں دیکھ کر خود ہی سہم گئی کیونکہ ان آنکھوں میں سروش کی تصویریں تیر رہی تھیں۔ وہ خوف زدہ ہو کر آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اسے خیال آیا سروش اس کے دشمنِ خاص کا سگا بھانجا ہے۔ انعام الرحمٰن اس کے ایسے دشمن تھے جنہوں نے اس سے اس کی ماں کا پیار چھین لیا تھا۔ اسے ایسا لگتا جیسے اس کی ماں خطۂ کشمیر ہے جس پر انعام الرحمٰن، عزم الرحمٰن اور آمنہ نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ دشمن کیمپ میں وہ ایک مجبوری کے تحت رہ تو رہی تھی لیکن انعام الرحمٰن اور ان کے بچوں سے وہ سخت نفرت کرتی تھی اور سروش سے بھی متنفر ہونے کی خاص وجہ یہی تھی۔ یکلخت اس کے حسین اور لطیف جذبات پر اوس پڑ گئی تھی خوشیوں سے تمتمائے ہوئے چہرے پر اب اداسی اور پژمردگی کا راج تھا۔ اب وہ پھر پہلی والی تعبیر تھی زندگی سے دل چرانے والی، اکتائی ہوئی، ناخوش اور الجھنوں میں گھری ہوئی، آدم بیزار سی......

☆☆☆

احمد کمال اور ان کا بیٹا شاداب دونوں اس وقت کسی سنجیدہ موضوع پر محوِ گفتگو تھے تمکین اور فاطمہ اس وقت گھر پر نہیں تھے۔ اس لیے دونوں بے فکری سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ شاداب باپ سے ملتجیانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

”پاپا آپ مما سے بات کیجیے ناں...... میری تو وہ سنتی ہی نہیں ہیں۔“

”تمہاری نہیں سن رہی ہیں تو کیا میری سن لیں گی۔“ احمد کمال نے اپنے مخصوص میٹھے لہجے میں کہا۔

”شاداب تم سائے کا تعاقب کر رہے ہو۔ تمہاری ماں کسی قیمت پر تعبیر کو بہو کے روپ میں قبول نہیں کرے گی اور تہمینہ اور تعبیر بھی شاید اس رشتے کے لیے تیار نہ ہوں کیونکہ تمکین کو شاید وہ دونوں اپنے خوابوں میں بھی دیکھ کر ڈر جاتی ہوں گی۔“ شاداب بے ساختہ ہنس پڑا۔

”پاپا ایسا تو نہ کہیے ماں ہے آخر میری، میں تو لڑوں گا اس بات پر آپ سے۔“ احمد کمال نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”کیوں کیا تمہاری ماں کافی نہیں ہے، میرے ساتھ لڑنے کے لیے جو تم بھی کمر بستہ ہو رہے ہو۔“ شاداب مسکرانے لگا۔

”چھوڑیں اس ذکر کو، ہم بھی اپنے اصل موضوع سے بھٹک گئے؟ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ نہ صرف مما کو راضی کریں بلکہ تہمینہ خالہ اور تعبیر کو بھی آپ ہی رضامند کر سکتے ہیں۔ آپ کو اس سلسلے میں ان لوگوں سے بات کرنی ہوگی۔“

اس کی بات پر انہوں نے طویل سانس بھری۔

”میں اپنے ہی سلسلے میں کچھ نہ کر سکا تو تجھ غریب کے لیے کیا کر سکوں گا۔“ احمد کمال کے چہرے پر بے پناہ اداسی اور ماضی کی یادیں رقصاں تھیں۔ شاداب بغور باپ کو دیکھ رہا تھا اس نے تجسس آمیز انداز میں احمد کمال سے سوال کیا۔

”پاپا کیا بات ہے، آپ ایک دم غمگین اور اداس کیوں ہو گئے؟“ احمد کمال نے چونکتے ہوئے سر کو خفیف سی جنبش دی۔

”کچھ نہیں بیٹا بس ایک خواب پرانا یاد آیا۔“ وہ آہستہ سے بولے۔ شاداب نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنا مطالبہ پھر دُہرایا۔ اور اس بار بھی احمد کمال نے اسے یہی مشورہ دیا کہ وہ تعبیر کا خیال اپنے دل و دماغ سے نکال دے۔

”پاپا یہ کیا بات ہوئی محبت کسی اور سے اور شادی کسی اور سے۔“ بیٹے کی زبان سے یہ جملہ سن کر احمد کمال کے ہونٹوں پر ایک یاس انگیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ پھر شکست خوردہ لہجے میں انہوں نے کہا۔

”یہی تو ساری زندگی میں بھی کرتا رہا ہوں۔ بس تمہیں بھی میرے نقشِ قدم پر چلنا ہے۔ رہ گزر بہت سخت اور خاردار ہوتی ہے مگر بہ چشمِ پُرنم طے ہو ہی جاتی ہے۔“

”پاپا آپ کی جلیبی کی طرح گھماؤ پھراؤ والی باتیں میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ بہرحال تعبیر مجھے اچھی

لگتی ہے اور میں اسی سے شادی کروں گا۔“ شاداب نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”یہ کر کے نہ صرف تم اپنے حق میں کانٹے بوؤ گے بلکہ اس معصوم کی بھی زندگی خراب کرو گے کیونکہ تمہاری ماں ان دونوں کی ازلی دشمن ہے، وہ کوئی نیا کھیل رچائے گی۔“ احمد کمال نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

”پاپا آخر کیا بات ہے، مما ان لوگوں کے لیے زہرِ قاتل کیوں بنی ہوئی ہیں۔ یہ سب آخر ہے کیا؟“ وہ سخت الجھن کا شکار ہوا۔

”یہ سب قدرت کی کاریگری ہے۔“ احمد کمال نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اوپر والے کا کھیل ہے، کسی کے کھاتے میں وہ پیاس اور تشنہ لبی لکھ دیتا ہے اور کسی کے ہاتھ میں لبریز، بھرا ہوا جام تھما دیتا ہے۔ اور ہم مٹی کے بنے ہوئے انسان اسے ہی نوشتۂ تقدیر سمجھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔“

☆☆☆

احمد کمال کے سمجھانے بجھانے پر شاداب نے تعبیر والا چیپٹر ہی کلوز کر دیا جبکہ تمکین اپنی جگہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی کہ اس کے بیٹے نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ چٹ منگنی بیاہ کے مصداق سب کچھ جلدی، جلدی طے پا گیا۔ بڑی دھوم دھام سے نکاح کی تقریب بھی انجام پذیر ہوئی لیکن رخصتی دو مہینے کے لیے مؤخر کر دی گئی۔ کیونکہ لڑکی کا بھائی دو ماہ بعد آنے والا تھا۔

انعام الرحمٰن اور تہمینہ بھی مع فیملی آئے شرکت کی اور فوراً واپس بھی ہو گئے، تمام مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد تمکین نے گھر جا کر جائزہ لیا تو سارا گھر زیروزبر ہو کر عجیب سا منظر پیش کر رہا تھا۔ دو دن سے وہ ملازمین سے صفائی ستھرائی کروا رہی تھی آج وہ بالائی منزل کے کمروں کا جائزہ لینے اوپر پہنچی اور ہر کمرے پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے وہ اس کمرے میں داخل ہوئی جو اس کی شادی سے پہلے احمد کمال کے استعمال میں تھا۔ لیکن کافی دنوں سے متروک حصہ سمجھ کر کوئی اُدھر کا رخ ہی نہیں کرتا تھا۔ گھر کا فالتو سامان بھی یہیں ڈال دیا گیا تھا۔ تمکین نے فرش سے چھت تک نظر دوڑائی تو اسے محسوس ہوا کہ مکڑیوں کے جالے اور گرد و غبار میں اٹا ہوا یہ کمرا کافی محنت کا طلبگار ہے۔ اس لیے اس نے یہ کام بھی ملازمین کو سونپا اور احمد کمال کے بک شیلف کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دھول مٹی میں اٹی ہوئی کتابیں وہ اِدھر اُدھر کر رہی تھی کہ اچانک ایک موٹی سی کتاب اس کے قدموں میں آ گری اور اس میں سے ایک پرانا بوسیدہ لفافہ اس کے قدم چومنے لگا۔ وہ شاید اس لفافے کو کتاب میں رکھ کر کتاب کو اس کی جگہ رکھ دیتی لیکن لفافے پر کچھ دیکھ کر وہ بری طرح چونک پڑی۔ لفافے کا رنگ مٹیالا اور اڑا، اڑا سا تھا لیکن اس پر درج تحریر تہمینہ کی ہی تھی یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھی۔ لفافے پر اس کی خوشخط تحریر میں احمد کمال کا نام درج تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافے میں سے اندر کی تحریر نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

”احمد کمال...... سلام مؤدبانہ قبول فرمائیں۔ میرا یہ پہلا اور آخری خط ہے آپ کے نام کیونکہ نہ میں نے کبھی آپ سے کوئی خط کتابت کا سلسلہ رکھا اور نہ ہی ہم دونوں کے درمیان کوئی ٹیلی فونک رابطہ رہا لیکن آج میں ایک مجبوری کے تحت آپ سے یہ تحریری گفتگو کر رہی ہوں۔ گزشتہ روز میں ایک ایسی بداخلاقی کی مرتکب ہوئی جس نے ہم دونوں کی زندگی کا پانسہ ہی پلٹ دیا۔ کل اچانک تمکین کی ڈائری میرے ہاتھ لگ گئی، نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے چند صفحات میں نے پڑھ لیے، میں ڈائری کھولنے کے فوراً بعد بند کر دیتی لیکن مجھے تجسس اس لیے ہوا کہ اس میں جابجا آپ کا نام لکھا تھا اور تب جا کر مجھ پر یہ راز آشکارا ہوا کہ وہ پگلی تو دل کی گہرائیوں سے آپ کو چاہتی ہے۔ نادانستگی اور نادانی میں وہ کیا کر بیٹھی اسے خود بھی نہیں معلوم...... یقین کرو میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے ساری کائنات کی گردش یکلخت تھم گئی ہو۔ چند لمحوں کے لیے تو میں بالکل بے جان ہو گئی۔ کافی غور و

فکر کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ میں اپنے ہاتھ سے وہ عہدِ وفا توڑ ڈالوں جسے ہم دونوں نے اپنے دل کی دھڑکنوں میں بسا رکھا ہے اور اس کام میں آپ کو میرا ساتھ دینا ہوگا۔ کمال...... زندگی میں حالات ہمیشہ دو رخ پر سفر کرتے ہیں موافقت یا مخالفت...... ہم دونوں کے عہد و پیاں مخالف سمت میں رواں دواں ہیں، قصور میرا نہ آپ کا...... بے وفا ہم دونوں نہیں اس کے باوجود کمال سب کچھ بکھر گیا۔ ہم دونوں کب قریب آئے اور کیوں بچھڑے اس کی ہوا بھی کبھی تمکین کو مت لگنے دینا۔ آپ کا احسانِ عظیم ہوگا مجھ پر اور میرے خاندان پر...... مجھے آپ سے قوی امید ہے کہ آپ میری خاطر تمکین کو اپنا کر اسے خوش رکھنے کی کوشش کریں گے۔ آج سے ہم دونوں کی راہیں جدا، جدا ہیں، میرا اگلا قدم کیا ہوگا، میں کچھ نہیں جانتی......

بہرحال اللہ کی رحمت پر بھروسا ہے وہ میرے لیے جو بھی کرے گا وہ بہتر ہی ہوگا۔'' آخر میں تہمین کے دستخط مع تاریخ موجود تھے۔ کاغذ زرد اور الفاظ مٹے، مٹے ضرور تھے لیکن پھر بھی ایک، ایک لفظ صاف سمجھ میں آرہا تھا۔ تمکین کا چہرہ لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے، کیا نہیں کرے، دل کی دھڑکن بڑھ گئی تھی۔ مٹھیاں کھل بند ہو رہی تھیں۔ جسم کا سارا خون نچڑ کر چہرے پر آگیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سلگتا ہوا فیتہ لگا کر نہ صرف اس کا جسم اس کا وجود بلکہ اس کی زندگی کی ہر خوشی بم بلاسٹ کردی گئی ہو' شدتِ جذبات سے مغلوب ہو کر وہ بری طرح کپکپا رہی تھی۔ کرسی کا ہتھا پکڑ کر اس پر بیٹھنا چاہا لیکن چکرا کر گرد آلود فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔ اب وہ پھوٹ، پھوٹ کر رو رہی تھی۔ خود کلامی کرتے ہوئے اس نے دیوار سے ٹیک لگائی اور بولی۔

''آپا آپ ہار کر بھی جیت گئیں اور میں جیت کر بھی ہار گئی۔ میری بے رخی، بے اعتنائی اور بدتمیزی کتنے صبر کے ساتھ برداشت کرتی رہیں۔'' بہت سی کہی، ان کہی ...... باتیں اور کہانیاں یاد آگئیں۔ والدین کا اصرار' تہمین کا انکار اور احمد کمال کے رشتے سے دست بردار ہوتے ہوئے اپنی جگہ تمکین کو پیش کر کے خوشی، خوشی اس کی شادی کی تمام ذمے داریوں کو نبھانا۔ ''اُف میرے خدا...... کتنا بڑا دل ہے آپا کا......'' اس نے اپنا اور تہمین کا تقابلی جائزہ لیا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ تو اس قابل بھی نہیں ہے کہ تہمین کے پیروں میں بیٹھ کر اس سے معافی مانگ سکے۔ آنسو ایک بار پھر اس روانی سے بہنے لگے۔ جب وہ روتے، روتے بے سدھ ہوگئی تو تھرتھراتی انگلیوں سے تہمین کا نمبر ڈائل کیا۔ چند ثانیے کے توقف کے بعد سیل فون میں تہمین کی آواز ابھری۔

''کیا بات ہے تمکین' خیریت تو ہے ناں؟'' اس کی پیار بھری نرم اور میٹھی آواز سن کر تمکین کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ تہمین اس کے اس طرح رونے پر حواس باختہ ہوگئی اور گھبرا کر بولی۔

''کیا بات ہے تم اس طرح کیوں رو رہی ہو، مجھے نہیں بتاؤ گی، خدارا جلدی بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟'' تمکین کے لیے الفاظ کا انتخاب بھی مشکل ہو رہا تھا. ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی قوتِ گویائی ہی چھین لی ہو. بدقت تمام اس نے ہمت کی۔

''آپا آج مجھے وہ خط مل گیا ہے جو برسوں پہلے آپ نے احمد کمال کو لکھ کر اپنی زندگی کی تمام رنگینیاں میرے کشکول میں ڈال کر خود دکھ اور غم کے اتھاہ ساگر میں اترتی چلی گئیں۔ آپا مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ نے میرے لیے اتنا بڑا ایثار کیا ہے اور بدلے میں، میں نے آپ کو کیا دیا ہے، ہر جگہ' ہر موقع پر آپ کی اور آپ کی بیٹی کی تذلیل اور دل شکنی کی' میں تو اس قابل بھی نہیں آپ کے قدموں میں بیٹھ کر معافی مانگ سکوں۔'' وہ بلک رہی تھی، بہن کی اشکبار آواز سن کر تہمین کا آبگینہ دل چھلک اٹھا۔ لیکن حتی الوسع پُرسکون لہجہ اختیار کیے رکھا۔

''یہ تمہارے شوہرِ نامدار میرا ایک خط بھی نہیں سنبھال سکے... ہیں بہت بے پروا، خیر تم سے مجھے کوئی گلہ یا شکوہ نہیں، نہ میں اس انتظار میں ہوں کہ تم میرے

سامنے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے معافی مانگو، تمکین زندگی میں بہت سے واقعات ایسے رونما ہوتے ہیں جہاں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ان پر کوئی اختیار نہیں۔ یہیں پر آکر قائل ہونا پڑتا ہے کہ ہے کوئی ایسی سوپر پاور جس کی مرضی اور رضا سے سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہ اس عالمِ فانی میں آمد ہماری مرضی سے ہوتی ہے اور نہ واپسی میں ہمارا عمل دخل ہوتا ہے تو پھر تم خود ہی غور کرو آنے اور جانے کے درمیان جو وقفہ ہے جسے ہم زندگی کہتے ہیں، اس میں رونما ہونے والے واقعات میں بھی کہیں ہماری مرضی، ہماری خواہش ہماری رضا شامل نہیں ہوتی بلکہ ہمارے ساتھ پیش آنے والے تمام واقعات کاتبِ تقدیر لوحِ محفوظ پر پہلے ہی رقم کر دیتا ہے، تم کیا سمجھ رہی ہو، تمہاری شادی پر مجھے اپنے دل پر جبر کر کے کوئی اداکاری کرنی پڑی ہے، نہیں...... بالکل نہیں...... تم اپنی آرزوؤں کو اپنی تمناؤں کو پسِ پشت ڈال کر کسی کے لیے کچھ کرنے کی کوشش تو کرو پھر دیکھو رب تمہیں ایسا حوصلہ اور استقلال عطا کرتا ہے کہ کہیں بناوٹ کا سہارا نہیں لینا پڑتا بلکہ دل کو عجیب سا سکون اور راحت نصیب ہوتی ہے۔ بلکہ میں تو یہی کہوں گی پا کر جو خوشی نہیں ملتی وہ قربان کر کے ملتی ہے اور میری بہن تم اس خام خیالی میں مت رہنا کہ میں احمد کمال کے لیے آج بھی تڑپ رہی ہوں اور آہیں بھر رہی ہوں، تمہاری شادی سے پہلے جو کچھ ہوا وہ شاید اوائل عمری کی ایک نادانی تھی۔ وقت کے ساتھ، ساتھ جس کا اثر کم ہوتے، ہوتے بالکل ختم ہوگیا۔ ہاں اگر اظہر الدین کے قدم بہ قدم مجھے ساری زندگی چلنا پڑتا تو کہیں نہ کہیں میں ضرور ڈگمگا جاتی لیکن مجھے میرے ایثار کا انعام'' ''رحمٰن'' نے دنیا میں ہی دے دیا۔ میں قسمیہ کہتی ہوں کہ انعام الرحمٰن کے ملنے کے بعد تمہارے میاں کی شبیہ میرے پردۂ ذہن سے اس طرح مٹ گئی جیسے پانی پر لکھی تحریر...... خالقِ کائنات جب، جب اس دنیا کو تشکیل دے گا اور مجھ سے پوچھے گا کہ مجھے کیا چاہیے تو میرے دستِ طلب میں صرف ایک شخص ہوگا اور وہ ہے انعام الرحمٰن......'' بولتے، بولتے اس کی سانس ہلکی، ہلکی پھول گئی تھی۔

''تمکین میری بہن انعام الرحمٰن جیسے لوگ بنتے نہیں بلکہ پیدا ہوتے ہیں اور اسی کیٹگری میں احمد کمال بھی شامل ہیں جنہوں نے ہم دونوں بہنوں کا مان رکھ کر اپنا قد اتنا بلند کر لیا کہ ہم نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھ بھی نہیں سکتے۔ انعام اور کمال یہ دونوں شاید ہمارے والدین کی کسی نیکی کا صلہ ہیں جو ربِ کائنات نے خوش ہو کر ہماری جھولیوں میں ڈال دیا۔ بس اب رونا دھونا ختم کرو اور اپنے مزاج میں خوشگوار تبدیلی لانے کی کوشش کرو، بہو کے ساتھ محبت آمیز رویہ رکھنا، روایتی ساس بننے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ بیٹے کی بھی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔''

''پھر بھی آپا، میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں، خدارا مجھے معاف کر دیجیے۔'' تمکین نے سب کچھ سننے کے بعد دلگرفتہ لہجے میں کہا۔

''اچھا چلو معاف کیا اب تم بھی ہنستی مسکراتی رہا کرو، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے سلسلہ موقوف کر دیا۔

☆☆☆

''تہمین تم سے ایک اہم مسئلے پر بات کرنی ہے۔'' انعام الرحمٰن نے پُرخیال انداز میں تہمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

تہمین جو مطالعے میں غرق تھی، اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کتاب ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

''فرمائیں......'' وہ استفسارانہ نظروں سے شوہر کی جانب دیکھنے لگی۔ انعام الرحمٰن بغیر کسی تمہید کے اصل موضوع کی طرف آئے۔

''آج دفتر میں سروش نے مجھے ایک عجیب بات بتائی۔ میرا تو کبھی اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ وہ دراصل تعبیر کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' شوہر کی بات سننے کے بعد تہمین گم صم بیٹھی رہی ایسا لگتا تھا جیسے پتھرا گئی ہو، انعام الرحمٰن وضاحت طلب

نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ لیکن ایک طویل وقفے تک وہ کچھ نہیں بولی تو انہوں نے کھنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ تہمین چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ انعام الرحمٰن نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''کہاں گم ہوگئی تھیں؟'' میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔

''انعام اس سر پھری اور احمق لڑکی سے سروش کیوں دل لگا بیٹھا، آپ کیا سمجھتے ہیں وہ مان جائے گی اور یہ رشتہ قبول کرلے گی۔'' تہمین نے روہانسی آواز میں آہستہ سے کہا۔

''آخر خرابی کیا ہے سروش میں؟'' انعام الرحمٰن نے حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے جچے تلے انداز میں کہا۔

''خرابی اس میں یہ ہے کہ وہ آپ کا بھانجا ہے اور وہ ہٹ دھرم، سرکش اور بے وقوف لڑکی ہر اس چیز سے نفرت کرتی ہے جس کا تعلق آپ سے ہے۔'' انعام الرحمٰن کے چہرے پر گہرے غم اور دکھ کے سائے لہرانے لگے لیکن پھر بھی انہوں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے سنجیدگی اور متانت کے ساتھ کہا۔

''کوئی بات نہیں! مجھ سے نفرت کرتی ہے لیکن ہوسکتا ہے تم اگر اسے پیار سے محبت سے سمجھاؤ گی تو وہ اس رشتے کے لیے رضامند ہوجائے۔ ایک بار بات تو کرکے دیکھو۔'' تہمین کے چہرے پر بے یقینی صاف محسوس کی جاسکتی تھی۔ لیکن پھر بھی شوہر کا دل رکھنے کے لیے اس نے اثبات میں آہستہ سے سر ہلایا۔

تعبیر نے کمرے کی لائٹ آف کی اور بیڈ پر سونے ہی جارہی تھی کہ تہمین کمرے میں داخل ہوئی۔ نیند سے بوجھل آنکھیں ماں کو دیکھ کر فوراً کھل گئیں۔

''مما آپ اس وقت؟''

''ہاں مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔'' یہ کہہ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے تہمین کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگئی۔

تعبیر منتظر نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پُرسوچ نظروں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے اس نے وہ ساری باتیں من و عن تعبیر کے سامنے دُہرادیں جو آج انعام الرحمٰن سے ہوئی تھیں۔ ماں کی زبان سے نکلا ہوا ایک، ایک لفظ وہ بصد ہوش و حواس سن بھی رہی تھی اور سمجھ بھی رہی تھی۔ ماں کی بات مکمل ہوتے ہی اس نے نہایت بے باکی اور گستاخانہ لہجے میں کہا۔

''انعام الرحمٰن صاحب سے کہہ دیجیے گا کہ سروش خوش بخت اگر ان کا بھانجا نہ ہوتا تو اس سے شادی کر کے میں اپنے آپ کو دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی تصور کرتی لیکن چونکہ وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کے اتنے قریبی عزیز ہیں اس لیے یہ شادی ناممکن ہے۔'' تہمین نے سب کچھ صبر کے ساتھ سنا اور پھر تیز نظروں سے بیٹی کو دیکھ کر کہا۔

''مجھے تو پہلے ہی علم تھا کہ تمہاری جانب سے یہی جواب ملنے والا ہے اس لیے۔''

''آپ کو سب کچھ تو معلوم ہے کہ انعام صاحب سے میں کتنی نفرت کرتی ہوں، انہیں دیکھ کر مجھے لگتا ہے کسی نے میرے باپ کو زندہ دفن کردیا ہے اور مجھ سے میری ماں کو چھین لیا ہے۔'' تعبیر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

تہمین جو ابھی تک بیٹی کی ہر بدتمیزی اور گستاخی کو برداشت کیے جارہی تھی یک دم سے پھٹ پڑی، برسوں سے پکتا ہوا لاوا آج باہر آگیا تھا۔

''تم جو ہمیشہ ... اپنے باپ کو اتنا یاد کرتی ہو تو آج میں اس کی حقیقت بتاتی ہوں، وہ شخص نہیں چاہتا تھا کہ تم اس عالمِ رنگ و بو میں قدم رکھو۔'' اس نے اشکوں اور سسکیوں کے درمیان حقیقت بتائی۔ ''اس کی خواہش تھی کہ کسی گائناکولوجسٹ کے ذریعے تمہارا وجود میرے بطن سے ہی ختم کردیا جائے جیسے اللہ نہ کرے تم اس کی ناجائز اولاد تھیں۔ اس کے پاس تمہارے لیے وقت تھا نہ پیسہ...... سوال اگر صرف میری زندگی کا ہوتا تو میں گھٹ، گھٹ کر اس قید خانے میں اپنی سانسیں پوری کرلیتی لیکن مجھے تمہیں بچانا منظور تھا اسی لیے میں نے راہِ فرار اختیار کی اور کچھ سننا ہے تو سنو۔'' اس کی سانس پھول رہی تھی۔ ''تمہاری پیدائش پر بھی نہ وہ خود آیا اور نہ اس کے خاندان کا کوئی فرد تمہیں دیکھنے آیا۔ تمہارے باپ نے طلاق نامہ بھیج کر تعلق صرف مجھ سے ہی نہیں توڑا بلکہ تمہیں بھی کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اور اپنے لائق فائق باپ کا ایک کارنامہ اور سنو پہلے تہمینہ اور پھر میرے بعد اس نے ایک اور لڑکی کے ساتھ یہی کھیل کھیلا لیکن اس لڑکی کا میکا اثر رسوخ والا تھا۔ ان لوگوں نے اس کے خاندان کو جیل کی ہوا کھلادی۔ بہت دنوں تک یہ کیس اخباروں کی زینت بنتا رہا، تحسین کے پاس اس کے تراشے موجود ہوں گے، اگر کبھی دل چاہے تو اپنی آنکھیں سینک لینا اپنے باپ کے اور ددھیال والوں کے کارنامے پڑھ کر۔ اللہ تعالیٰ ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ضرور پیدا کرتا ہے، اس لڑکی نے تمہارے باپ کو چھٹی کا دودھ یاد دلادیا۔'' تہمین اتنا سب کچھ کہہ گئی کہ اس کا تنفس ہی اتھل پتھل ہوگیا۔

تعبیر نے فوراً گلاس میں پانی بھر کر ماں کے منہ سے لگانا چاہا لیکن تہمین پر اس وقت ایک ہسٹریائی دورہ پڑا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے پانی کا گلاس پھینکا اور روتی سسکتی تیز قدموں سے کمرے سے نکل گئی۔

تعبیر پر آج وہ حقیقت، وہ راز عیاں ہوا تھا جو ابھی تک اس کے ذہن میں سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔ تکیے پر سر رکھ وہ بھی بری طرح رو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا باپ ایسے ہوتے ہیں جیسے اس کا باپ تھا، اس کے تصور میں صولت حسین چلے آئے جو اس کی ماں اور خالاؤں کو ٹوٹ کر چاہتے تھے، احمد کمال بحیثیت باپ یاد آئے جو شاداب اور فاطمہ پر جان نثار کرتے ہیں اور پھر انعام الرحمٰن کا عکس دل و دماغ میں لہرایا جو نہ صرف عزمی اور آمنہ پر جان چھڑکتے تھے بلکہ خود اس کی ہر بدتمیزی کے باوجود اسے اتنا ہی پیار، اتنی ہی شفقت اتنی ہی محبت دی کہ اس کا دامن تنگ ہوگیا لیکن ان کی عطا میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اپنے آنسوؤں کو اپنی ہتھیلیوں سے سمیٹتے ہوئے اس نے سوچا کاش عزمی اور آمنہ کی طرح میں بھی انعام الرحمٰن کی بیٹی ہوتی، ان دونوں کی طرح میں بھی انہیں بابا کہہ کر مخاطب کرتی۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ کب نیند کی آغوش میں چلی گئی اسے پتا ہی نہیں چلا۔

☆☆☆

تعبیر لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ قدموں کی آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ہی سروش کھڑا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''آپ سے چند ایک باتیں کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ایک نزدیکی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ لمحے اگر مجھے عنایت کرسکیں تو میں ممنون ہوں گا۔'' تعبیر اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وہ کیا بات کرنے والا ہے۔ انکار کے لیے کوئی جواز نہیں تھا اس لیے سر کو اثبات میں خفیف سی جنبش دی۔

سروش نے عقابی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

''آپ کا انکار مجھ تک پہنچ چکا ہے لیکن کیا میں وجہ جان سکتا ہوں۔'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔

سروش کا چہرہ اس کے غم کی بھرپور عکاسی کررہا تھا۔ اس لیے وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریز کررہی تھی کہ کہیں وہ انا، وہ بھرم نہ ختم ہوجائے جو برسوں سے انعام الرحمٰن اور ان کے خاندان کے لیے اس نے دل و دماغ میں بسا رکھا ہے، کہیں سروش اس کی منافق آنکھیں نہ پڑھ لے جہاں اس کے لیے پیار کی قندیلیں جل رہی ہیں، انہی چور آنکھوں سے وہ لان کی ہری، ہری گھاس کو تکے جارہی تھی جبکہ سروش امید و بیم کی کیفیت سے دوچار تھا۔ تعبیر کے اندر ایک جنگ جاری تھی، دل کہہ رہا تھا بس اب بہت ہوچکا آج یہ ناٹک ختم کردے لیکن دماغ کہہ رہا تھا کہ اس کا تعلق انعام الرحمٰن سے ہے جس سے تو وہ سب سے زیادہ نفرت کرتی ہے۔ اپنے جذبات کو بڑی مشکل سے اس نے کنٹرول کیا۔

''دیکھیے مسٹر خوش بخت......'' وہ ذرا آہستہ لیکن ٹھوس لہجے میں بولی۔

اچانک اس کی بات پر سروش نے قینچی چلادی اور

ایک حزیں مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''آپ تو ہمیشہ مجھے بد بخت کہا کرتی تھیں اور شاید ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ اگر میں بد بخت نہ ہوتا تو آپ انکار کیوں کرتیں۔'' تعبیر یکلخت خاموش ہوگئی۔ سروش نے گہری نظروں سے جواب طلب انداز میں دیکھا۔

''آپ خاموش کیوں ہوگئیں...... میں آپ کے انکار کی وجہ جاننے کے لیے بے چین ہوں۔'' اس کی باتوں پر تعبیر کا دل خون ہورہا تھا، دل میں طوفان برپا تھا۔

''خوش بخت صاحب! میں دراصل وہ لڈو چکھنا ہی نہیں چاہتی ہوں جسے کھا کر بھی لوگ پچھتاتے ہیں اور نہ کھا کر بھی پچھتاتے ہیں۔'' اس نے ہمت اور حوصلہ مجتمع کرکے کہا۔ سروش نے گمبھیر سانس لی۔

''تعبیر صاحبہ......'' چند ثانیے توقف کے بعد اس نے کہا۔ ''میرا تمام ددھیال امریکا میں رہائش پزیر ہے چند ایک ہفتے بعد میں بھی اس شہر کو خیر باد کہہ کر امریکا پرواز کر جاؤں گا لیکن کبھی زندگی میں میری ضرورت محسوس ہو تو ضرور آواز دیجیے گا، دوڑا چلا آؤں گا۔ آپ یقین کیجیے آپ مجھے بہت یاد آئیں گی۔''

''کیوں؟'' تعبیر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔ اس کے بدلے ہوئے لب و لہجے پر اچانک سروش نے اسے چونک کر دیکھا لیکن تعبیر نے فوراً ہی اپنے چہرے پر بیزاری و نفرت کا نقاب چڑھا لیا۔ تعبیر کے اس کیوں نے سروش کے تھمے ہوئے جذبات میں کنکری کا کام کیا، اس کی سانسیں ایک دم بے ترتیب ہونے لگیں۔

''آپ جب بھی میرے سامنے آتی ہیں، میرے ذہن میں بیک وقت دو چیزوں کا تصور آتا ہے بلکہ دو متضاد چیزیں ذہن میں ابھرتی ہیں۔'' ایک اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے کہا۔

''میں کچھ سمجھی نہیں۔'' تعبیر نے حیرت سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

''مثال کے طور پر جب بھی آپ کا سراپا سامنے ہوتا ہے تو میں سوچتا دھوپ کہتے ہیں کسے اور چاندنی کیا چیز ہے۔ ذہن میں اگر سپیدیٔ سحر نمودار ہوتی ہے تو شرمگیں شام کا تصور بھی انگڑائی لیتا ہے۔ قوسِ قزح کے رنگ ابھرتے ہیں تو اماوس کی رات بھی یاد آتی ہے۔ گرمیوں کی جھلستی دوپہر کا خیال آتا ہے تو رم جھم بارش کی پھوار بھی ہلکورے لیتی ہے۔'' سروش ہنسنے لگا لیکن ہنسی میں بھی دکھ کا عنصر غالب تھا۔

تعبیر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ اگر وہ وہاں اور ٹھہر جاتی تو شاید سارا جھوٹ خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا اور اصلیت سامنے آجاتی کہ وہ بھی اس آگ کے دریا کو پار کرنے کی کوشش کررہی ہے جس میں سروش پہلے ہی ڈوب چکا ہے۔ تعبیر نے عقب میں پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ سروش اپنے خوابوں کی کرچیاں کس طرح سمیٹ رہا ہے، اس وقت تو اسے اپنا آپ ہی سنبھالنا مشکل ہورہا تھا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سیلاب رواں تھا جو کمرے میں پہنچتے ہی زور شور سے بہہ نکلا۔

☆☆☆

ڈنر پر گھر کے سب افراد جمع تھے، ہلکی پھلکی خوشگوار باتوں کے درمیان کھانا کھایا جارہا تھا اچانک انعام الرحمٰن نے سروش کو مخاطب کیا۔

''سروش تمہاری سیٹ کنفرم ہوچکی ہے۔''

''جی اس مہینے کی بیس تاریخ کو میں فلائی کر جاؤں گا۔'' اس نے نیپکین سے اپنے ہاتھ صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

تعبیر کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ ساری بھوک، پیاس آنِ واحد میں غائب ہوچکی تھی۔ کچھ دیر پلیٹ اور چمچ سے کھیلتی رہی اور پھر وہاں سے سرک گئی۔ لان مزاکرات کے بعد دونوں کے درمیان چپقلش کا آکڑا تھا۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں تھا۔ سروش کی ساری خوش مزاجی اور زندہ دلی ہوا ہوچکی تھی۔ اور تعبیر مزید خاموش اور تنہائی پسند ہوگئی تھی۔ تہمینہ کو بھی اچھی طرح علم تھا کہ بیٹی کو ایک کی تو دس سناتی ہے اس لیے اس نے بھی ہونٹ سی لیے۔

ھے۔ تعبیر بہت سخت ضرورت کے تحت جمیلہ بوا سے طلب ہوتی ورنہ وہ غریب بھی سہمی سہمی رہتی کہ کوئی بات مزاج کے خلاف ہوگئی تو پھر اس کی شامت آجائے گی۔ انعام الرحمٰن اور عزمی سے تو اسے خدا واسطے کا بیر تھا۔ انعام الرحمٰن تو ہمیشہ عفو و درگزر سے کام لیتے اور اس کی ہر چھوٹی بڑی غلطی کو نظر انداز کر دیتے لیکن عزمی اب کافی سمجھ دار ہوگیا تھا۔ تعبیر اور ان کے رشتوں کے درمیان جو الجھاوے اور کبھی نہ کھلنے والی گرہ پڑی ہے وہ کیوں ہے اس کی سمجھ میں اچھی طرح آگیا تھا۔ اس لیے جتنی تنتناہٹ تعبیر دکھاتی تو جواب میں عزمی بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا۔ حالانکہ انعام الرحمٰن، تہمینہ اور سروش اسے کئی بار سمجھا چکے تھے لیکن وہ بھی اپنی حرکت سے باز نہیں آتا۔ البتہ ثمنہ اور تعبیر نہ صرف بہنیں بلکہ اچھی دوست بھی تھیں۔

☆☆☆

آج صبح کی فلائٹ سے سروش کی روانگی تھی اور ساری رات تعبیر نے جاگ کر گزاری تھی۔ اضمحلال، تھکن اور رت جگا چہرے سے عیاں تھا۔ اچانک باہر بھاری قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ دل شکستہ سے صدا بلند ہوئی سروش آرہا ہے، جمیلہ بوا سے آنکھوں آنکھوں میں کچھ باتیں ہوئی اور انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر جلدی سے تعبیر نے اپنے آپ کو ریشمیں دبیز پردوں کے پیچھے چھپالیا۔ پردوں کے درمیان جھری بنا کر آنکھیں دروازے کو تک رہی تھیں۔ سروش کمرے میں داخل ہوا تو ذہنی کرب اور جدائی کا دکھ منہ سے بول رہا تھا۔ الوداعی ملاقات کے لیے آیا تھا کمرے میں داخل ہوتے ہی آنکھیں تعبیر کو ڈھونڈ رہی تھیں جیسے صحرا میں پیاسا پانی تلاش کررہا ہو۔ مرتعش آواز میں جمیلہ بوا سے استفسار کیا انہوں نے پان چباتے ہوئے جواب دیا۔

''اے بیٹا وہ تو باتھ روم میں ہے، آج ذرا طبیعت بھی ان منی سی ہے۔'' سروش کچھ ساعت خاموش کھڑا رہا وہ بار، بار اپنی گھڑی دیکھ رہا تھا۔ پھر

نظم

تری زندگی میں، میں کہیں بھی نہیں ہوں
میں کچھ بھی نہیں تھی، میں کچھ بھی نہیں ہوں
میرے بازوؤں سے جدا جب تم ہوئیں
وہ لمحے مجھے یاد آتے ہیں اب بھی
رُلاتے ہیں اب بھی
میرے دل نے جو کرب جھیلا تھا بیٹی
لہو بن کے اب دوڑتا ہے رگوں میں
ترا لمس محسوس ہوتا ہے مجھ کو
وہ خوشبو جو تجھ میں بسی تھی
ابھی تک رلاتی ہے مجھ کو اکثر شبوں میں
مری جانی اب بھی میرے پاس ہے تو
میری زندگی ہے مری آس ہے تو
ترے دل میں نفرت جو میرے لیے ہے
بھری اِک کدورت جو میرے لیے ہے
مجھے سب خبر ہے مجھے سب پتا ہے
تری ہر خوشی میں تری زندگی میں
میرا نام ممنوع ہے جانتی ہوں
مگر اے مری چاندنی
وہ رشتہ جو میرے تیرے درمیاں ہے
وہ کیا ٹوٹ سکتا ہے اتنا بتا دے
مگر مدتوں بعد اے میری پیاری
میں اقرار کرتی ہوں اس بے بسی کا
کہ میں ایک کمزور عورت ہوں بیٹی
مجھے فیصلوں کی اجازت نہیں ہے
وہ ایسا ہی کمزور لمحہ تھا شاید
کہ میں نے محبت میں ہارا تھا تجھ کو
پکارا تھا تجھ کو

کلام: ہما بیگ، کراچی

ایک گہری سانس لے کر وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ چند ثانیے انتظار کے بعد تعبیر کی رائٹنگ ٹیبل پر جا کر اس کے لیٹر پیڈ سے ایک کاغذ نکال کر کچھ لکھتا رہا۔ اور پھر جمیلہ بوا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''اچھا بوا میں تو اب چلوں گا' مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا، محترمہ تو شاید مجھ سے ملنا ہی نہیں چاہتی ہیں۔'' اللہ حافظ کہتا ہوا وہ کمرے سے تیز، تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے جمیلہ بوا بھی نکل گئیں۔ تعبیر فوراً ٹیبل کے پاس جا کر سروش کی تحریر پڑھنے لگی۔ سروش نے اپنے خوب صورت خط میں لکھا تھا۔

نہ میں تم سے کوئی امید رکھوں دلنوازی کی
نہ تم میری طرف دیکھو غلط انداز نظروں سے
نہ میرے دل کی دھڑکن لڑکھڑائے میری باتوں میں
نہ ظاہر ہو تمہاری کشمکش کا راز نظروں سے
تعلق بوجھ بن جائے تو اس کو توڑنا اچھا
تعارف روگ ہو جائے تو اس کا بھولنا بہتر
وہ افسانہ جسے انجام تک لانا نہ ہو ممکن
اسے ایک خوب صورت موڑ دے کر چھوڑنا اچھا
چلو ایک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں

ضبط و بند کی ڈور ایک جھٹکے میں ٹوٹ گئی۔ آنکھوں سے اشکوں کی برسات ایسی ٹوٹ کر برسی کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ ہوش و حواس سے ہی بیگانہ ہوگئی۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا کیونکہ کیا دھرا ابھی سب اپنے ہی ہاتھوں کا تھا۔ کسی کو کوئی الزام بھی نہیں دے سکتی تھی۔ دن گزرتے رہے وہ روز جیتی رہی اور روز مرتی رہی۔ تہمین ماں تھی بیٹی کی حالت دیکھ کر مزید پریشان اور متفکر ہوجاتی۔

☆☆☆

یونیورسٹی سے نکل کر تعبیر نے جیسے ہی ایک طائرانہ نظر ڈالی اسے دور، دور تک اپنی گاڑی نظر نہیں آئی۔ اپنی گھڑی دیکھی تو اسے احساس ہوا کہ شاید وہ ہی وقت سے پہلے کلاس چھوڑ کر آگئی ہے۔ لیکن یوں ہی کھڑے، کھڑے مزید دس منٹ اور گزر گئے تو بے چین ہو کر اس نے پرس میں سے سیل فون نکالنا چاہا۔ پرس اچھی طرح ٹٹولنے کے بعد بھی سیل فون اسے نہیں ملا تو اس کی پریشانی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالا تو اسے یاد آیا کہ سیل فون اس کے پرس میں ہی موجود تھا لیکن پتا نہیں کس نے ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔ ان ہی سوچوں میں وہ حیران و پریشان کھڑی تھی کہ اچانک ایک کار اس کے قریب آ کر رکی۔ ڈرائیور نے ایک جھٹکے کے ساتھ بریک لگائی تھی چرچراہٹ کی آواز اتنی زبردست تھی کہ وہ چونک کر کار کی طرف دیکھنے لگی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر اس کی دوست شیریں کا بھائی شاہنواز بیٹھا تھا۔ شاہنواز نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''ارے تعبیر بہن آپ..... گھر نہیں گئیں ابھی تک؟'' تعبیر کو ہمیشہ سے ہی شاہنواز کی یہ عادت بہت اچھی لگتی تھی وہ اس کے نام کے ساتھ بہن کا لفظ ضرور استعمال کرتا تھا۔ اسی لیے وہ بھی بے تکلفی سے اس سے بات کر لیتی تھی۔

''آپ شاید شیریں کو لینے آئے ہیں؟'' اس نے شاہنواز کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

شاہنواز نے گھڑی دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہاں لیکن شاید وہ فری نہیں ہوئی۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو آپ کو آپ کے گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ کچھ دیر بعد شیریں کو پک کرلوں گا۔'' تعبیر بنا کسی حیل و حجت کے فوراً تیار ہوگئی کیونکہ شاہنواز ہمیشہ اس کے ساتھ نہایت شرافت اور خوش اخلاقی سے پیش آتا تھا۔ اس نے فوراً عقبی سیٹ سنبھالی۔

''چلیے پھر جلدی سے کیونکہ دھوپ اور گرمی نے بہت حشر خراب کیا ہے۔'' اس کے بیٹھتے ہی شاہنواز نے گاڑی اسٹارٹ کی اور گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ اچانک شاہنواز نے عقب میں مڑتے ہوئے تعبیر سے کہا۔

''تعبیر بہن ہمارے گھر چلوگی، امی سے ملاقات

کر لینا۔''

''نہیں بالکل نہیں شاہنواز بھائی، میری امی اس معاملے میں بہت سخت ہیں اور میں بھی ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھتی، میں آپ کے ساتھ آ کر پچھتا رہی ہوں، اگر امی کو پتا چل گیا تو میری شامت آجائے گی۔''

شاہنواز نے زور کا قہقہہ لگایا۔

''ارے ابھی تک امی سے ڈرتی ہو، میں آنٹی کو سمجھا دوں گا۔ میں آپ کو اس وقت امی کے پاس لے جا رہا ہوں۔'' تعبیر کے احتجاج کے باوجود اس نے گاڑی کا رخ موڑ دیا۔ اور جب گاڑی ٹیڑھے میڑھے اور کچے راستوں میں سے گزرنے لگی تو تعبیر کی سمجھ میں اچھی طرح آگیا کہ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکا ہوگیا ہے۔ گاڑی انتہائی سنسان علاقے میں ایک ویران عمارت کے سامنے جا کر رک گئی۔ تعبیر نے ہمت و حوصلہ مجتمع کر کے روہانسی آواز میں کہا۔

''شاہنواز بھائی میں تو آپ کی بہن ہوں ناں..... جس طرح شیریں اسی طرح میں۔''

''تو شیریں کون سی میری سگی بہن ہے، بس ہمارے گینگ کے لیے کام کرتی ہے۔'' شاہنواز نے مکاری کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ تعبیر سرتاپا لرز کر رہ گئی۔ سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ دماغ ماؤف ہوگیا۔ شاہنواز اسے دھکیلتا ہوا عمارت کے اس کمرے میں لے آیا جو تمام کمروں سے گھرا ہوا تھا۔ اس کمرے میں سورج کی روشنی بالکل ہلکی تھی۔ اسی لیے زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ بجلی کی آنکھ مچولی کی وجہ سے ایک بیٹری فین اور سرچ لائٹ کا بھی انتظام تھا..... شاہنواز، تعبیر کو جیسے ہی اس کمرے میں لے کر داخل ہوا، کمرے میں موجود اس کے ساتھیوں نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ شاہنواز نے اس میں سے ایک نوجوان کو مخاطب کیا۔

''انور کر دیا تیرا کام، اب فوراً اپنی کارروائی شروع کر دے کیونکہ یہ بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے، فوراً پولیس فورس حرکت میں آجائے گی اور لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ موبائل پر کسی سے باتوں میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

ڈرائیور نے جب تہمین کو واپس آ کر بتایا کہ گاڑی میں کچھ فالٹ آگیا تھا۔ اس کی درستگی میں کافی وقت صرف ہوا۔ اور جب وہ یونیورسٹی پہنچا تو بی بی جی وہاں نہیں تھیں اس لیے وہ کافی انتظار کے بعد گھر واپس آگیا۔

تہمین نے فوراً تحسین سے استفسار کیا لیکن تحسین کا جواب انکار میں تھا۔ جیسے، جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا تہمین کی گھبراہٹ اور فکر و پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بالآخر گھبرا کر اس نے انعام الرحمٰن سے بات کی۔ تہمین کے لہجے سے ہی انعام الرحمٰن نے اندازہ لگا لیا کہ معاملہ ضرور سنگین نوعیت کا ہے کیونکہ تعبیر ماں کی اجازت کے بغیر کبھی اتنی دیر گھر سے باہر نہیں رہتی ہے۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں آرہا ہوں۔'' انہوں نے تہمین کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئے ملازمین کی موجودگی میں تو تہمین نے اپنے آپ پر قابو رکھا لیکن تنہائی میں شوہر سے لپٹ کر بری طرح رو پڑی۔

''انعام میری بچی کہاں چلی گئی۔ میں اسے کہاں تلاش کروں۔'' انعام الرحمٰن نے بہ مشکل اس کو سنبھالا۔

''اللہ پر بھروسا رکھو وہ کارساز ہے، اپنے آپ پر قابو رکھو، عزمی، آمنہ یا ملازمین یا اپنے ملنے جلنے والوں کے سامنے ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں، لڑکی کا معاملہ ہے... جو کچھ بھی کرنا ہوگا بہت سنبھل کر کرنا ہوگا۔'' پھر انہوں نے تہمین کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک بات بتاؤ تم ہمیشہ اسے سخت و سست سناتی رہتی تھیں۔ اس دوران کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی جو اسے ناگوار گزری ہو اور غصے میں اس نے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔''

''کچھ دن پہلے جب سروش والے معاملے میں آپ نے اس کی مرضی جاننے کی کوشش کی تھی اس وقت اس کے باپ کے حوالے سے میری زبان سے کچھ

ایسے جملے نکل گئے تھے جو یقیناً اس کی دل آزاری کا سبب بنے ہوں گے لیکن اس کے بعد تو وہ نارمل ہوگئی تھی۔“

انعام الرحمٰن نے پریشان کن نظروں سے تہمین کو دیکھا۔”تمہیں کتنی بار کہا ہے جوان بچے ہیں جوان خون ہے، بات کرتے وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لیا کرو، خیر میں سوچتا ہوں مجھے کیا کرنا ہے۔“ اسی اثنا میں تہمین کا سیل فون بجا، تہمین نے نمبر دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

”انعام تعبیر کا نمبر ہے یہ تو۔“ یہ کہہ کر اس نے فوراً کہا۔”تابی میری جان کہاں ہو تم؟“ لیکن جواب میں انتہائی کرخت مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

”اپنے شوہر سے بات کراؤ؟“ تہمین کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ لرزتے ہاتھوں سے اس نے موبائل فون انعام الرحمٰن کے حوالے کر دیا۔ انعام الرحمٰن کے ہیلو کہتے ہی دوسری جانب سے بولنے والے نے کافی وقت لیا۔ انعام الرحمٰن کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار تھے جواب میں وہ ہاں، ہوں اور اچھا کہتے رہے، بس آخر میں انہوں نے بولنے والے سے ایک سوال پوچھا۔

”مجھے رقم لے کر کہاں پہنچنا ہوگا؟“ تھوڑی دیر بعد انعام الرحمٰن نے اچھا کہہ کر فون پر بات ختم کر دی۔ ایسا لگ رہا تھا سلسلہ اُدھر سے ہی منقطع ہوگیا۔ انعام الرحمٰن کے آخری جملے سے ہی تہمین معاملے کی تہ تک پہنچ گئی۔ نیم بیہوشی کی حالت میں وہ بیٹھتی چلی گئی۔

انعام الرحمٰن نے فوراً تحسین کو فون کر کے بلایا اور تہمین کو اس کے حوالے کرتے ہوئے تحسین کو دو نمبرز دیتے ہوئے کہا۔

”تحسین اگر میرے آنے میں تاخیر ہوتی ہے تو ان نمبروں پر بات کر کے حقیقتِ حال سے باخبر کر دینا، کچھ بھی مت چھپانا۔“ تحسین کی جان پر بنی ہوئی تھی اس نے اشکبار آواز میں کہا۔

”انعام بھائی اللہ آپ کی مدد کرے، کسی کو کال کرنے کی نوبت نہیں آئے، آپ اور تعبیر بخیر و عافیت جلدی سے واپس آجائیں۔ آپا کی آپ فکر نہیں کریں۔ آپ لوگوں کے آنے تک میں یہیں ہوں۔“ دونوں نے خلوص دل سے ایک دوسرے کو اللہ حافظ کہا۔ اور پھر انعام الرحمٰن نوٹوں سے بھرا بیگ لے کر کھڑے ہوئے، کار وہ خود ہی ڈرائیو کر رہے تھے اور کار کی رفتار کافی تیز تھی۔

☆☆☆

انعام الرحمٰن جیسے ہی اس عمارت میں داخل ہوئے۔ انہیں بھی اس کمرے میں دھکیل دیا گیا جہاں تعبیر کو رکھا گیا تھا۔ انعام الرحمٰن کو دیکھتے ہی تعبیر ہذیانی انداز میں چلائی۔

”بابا!“ آج زندگی میں پہلی بار وہ انعام الرحمٰن سے مخاطب ہوئی تھی۔ اور انہیں ”بابا“ کہہ کر پکارا تھا۔ شاید کوئی اور وقت ہوتا تو انعام الرحمٰن خوشی سے اسے گلے لگا لیتے لیکن اس وقت صورتِ حال انتہائی خطرناک اور نازک تھی۔ وہ اور تعبیر خونخوار درندوں میں گھرے کھڑے تھے، ان لوگوں کے چہرے مہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اچھے لوگ نہیں ہیں، انعام الرحمٰن نے تعبیر کی طرف دیکھتے ہوئے جواباً کہا۔

”تابی میری بچی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بس ان کتوں کے آگے ہڈی پھینک دوں پھر چلتے ہیں۔“ انعام الرحمٰن نے تعبیر کی طرف دیکھتے ہوئے جواباً کہا۔

پھر انہوں نے ان چاروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”آپ لوگوں نے مجھے جیسا کہا تھا میں نے ویسا ہی کیا۔ نہ پولیس کو انفارم کیا اور نہ کسی کو ساتھ لایا۔ اب آپ کو بھی میری بات ماننی ہوگی۔ آپ کی مطلوبہ رقم آپ کے حوالے کر کے میں اور تعبیر فوراً یہاں سے نکل جائیں گے، کوئی ہمارا تعاقب نہیں کرے گا۔ ورنہ آپ لوگ مجھے بھی کم نہیں سمجھیں۔ جواب میں، میں بھی سخت قدم اٹھا سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ بھی کافی لمبے ہیں۔“ حالانکہ انہیں اچھی طرح علم تھا کہ اس وقت وہ اور تعبیر

اس سفاک اور بے رحم مسلح گروہ کے..... رحم و کرم پر ہیں لیکن وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ منہ توڑ جواب دینا انہیں بھی آتا ہے۔

”بس، بس ذرا ایک شخص کا انتظار ہے، اس کے بعد تم آزاد ہو۔“ شاہنواز کے ایک ساتھی انور نے کہا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کمرے میں ایک پختہ العمر شخص کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ان سب کو دیکھ کر بری طرح ٹھٹکا ایسا لگ رہا تھا یہ سب اس کے لیے قطعی غیر متوقع ہے، اس کے چہرے سے مترشح تھا کہ جیسے وہ شدید قسم کی جھلاہٹ کا شکار ہوگیا ہو، اس نے حیران نظروں سے انور کو دیکھا۔

”یہ سب کیا ہے؟ یہ کون لوگ ہیں اور مجھے تم نے یہاں کیوں بلایا ہے؟“

”بھائی یہ میرے بندے ہیں ہم لوگ بہت دنوں سے یہ کام کر رہے ہیں۔ لیکن اچانک شیریں اور شاہنواز کی مدد سے ایک ایسی چیز سامنے آئی کہ میں نے سوچا آپ سے ملاقات کروا دوں۔“

”کون سی چیز؟“ اس شخص نے پوچھا۔

”بھائی تعجب ہے اس لڑکی کو دیکھ کر آپ کو کچھ بھی نہیں یاد آیا جبکہ یہ لڑکی ہو بہو آپ کی مطلقہ بیوی تہمین کی کاپی ہے۔“ اس سنسنی خیز انکشاف پر تعبیر اور انعام الرحمٰن کو شدید حیرت کا جھٹکا لگا۔ تعبیر کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور بدلتے ہوئے رنگ اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ سخت ذہنی کرب اور انتشار سے گزر رہی ہے۔ پھٹی، پھٹی اور بے بس نظروں سے وہ سب تکے جا رہی تھی۔ اظہر الدین کے بھی اعصاب تن گئے تھے۔ کھردری آواز میں اس نے ہوں کہہ کر ہنکارا بھرا۔ انعام الرحمٰن اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑے تھے۔ رقم کا بیگ ان کے ہاتھ میں ہی تھا۔ تعبیر کا دل و دماغ ہنوز انکاری تھا کہ یہ شیطان صفت اور بدکردار گینگ کا سردار اس کا چچا ہے اور یہ ساری رقم اب اس کا نام نہاد باپ وصول کرے گا۔ جس کے لیے وہ ہمیشہ تڑپتی رہی ہے، اس کے جسم پر رعشہ سا طاری تھا۔

”بھائی آپ کے سارے دلدر دور ہو جائیں گی۔ انعام الرحمٰن بھلے ہی سوتیلا باپ ہے مگر ٹوٹ کر چاہتا ہے آپ کی بیٹی کو ایک کال پر مطلوبہ کیش سمیت دوڑا چلا آیا۔“ انور کی بات پر انعام الرحمٰن سناٹے میں رہ گئے۔

”اظہر الدین اور انور پوری زندگی میں نے بہت سے گھٹیا اور نیچ لوگ دیکھے ہیں لیکن تم جیسے (گالی) نہیں دیکھے۔ ارے کم بختو میرے در پر آ کر مانگتے تو اس سے زیادہ پیسہ میں تعبیر کا صدقہ اتار کر تم دونوں کی جھولی میں ڈال دیتا۔ بیٹی رب کی وہ رحمت ہے جس کی تعظیم کے لیے اللہ کے رسول پاک بھی کھڑے ہو جاتے تھے لیکن تم لوگوں نے اس کی بھی قدر نہیں کی، ہو بڑے ہی بدنصیب۔“ اظہر الدین اور انور کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی۔ اظہر الدین نے یکایک تحکمانہ لہجے میں انور سے کہا۔

”یہاں تم نے اتنی بھیڑ کیوں جمع کر رکھی ہے، اپنے دوستوں سے کہو کہ وہ جا سکتے ہیں۔“ انور کے جواب دینے سے پہلے شاہنواز نے احتجاجی آواز میں کہا۔

”اظہر بھائی اس رقم میں ہم تینوں کا بھی حصہ ہے کیونکہ اس لڑکی کو اور انعام الرحمٰن کو یہاں تک لانے میں ہمیں کئی مراحل سے گزرنا پڑا۔ شیریں کو بھی حصہ دینا ہوگا۔ موبائل فون اسی نے چرایا تھا دوستی کا ڈھونگ رچا کر۔ اور اس سارے منصوبے کا ماسٹر مائنڈ میں تھا۔ اسی لیے حصے بخرے ہو جائیں تو بہتر ہے۔“

”ارے بھئی تمہارے حق محنتانہ کے ساتھ انعام بھی دوں گا۔ بس اب زچ نہ کروا اور اپنا، اپنا راستہ پکڑو۔“ اظہر الدین نے اِک مکروہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ان تینوں نے انور کو دیکھا اور انور نے اشارے سے انہیں جانے کے لیے کہا۔ ایک کے بعد ایک تینوں وہاں سے چلے گئے۔ اظہر الدین نے تحکمانہ انداز میں انور کو مخاطب کیا۔

”انور اپنا پستول مجھے دو میں ان دونوں کو کور کرتا

ہوں۔ اور تم انعام الرحمٰن کے ہاتھ سے بیگ لے کر دیکھ کر نوٹ صحیح ہیں یا نہیں...... ذرا پھرتی سے گنتی بھی کرلینا۔'' انور نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور پستول اظہر الدین کی جانب اچھال دیا۔ جیسے ہی پستول اظہر الدین کے ہاتھ میں، اظہر الدین نے تھوڑا چیخ کر انعام الرحمٰن کو مخاطب کیا۔

''انعام الرحمٰن تعبیر کو لے کر فوراً نکل جاؤ۔ ایک لمحے کی بھی تاخیر مت کرو۔'' لمحے میں کھیل کا پانسہ پلٹ گیا تھا۔ انور کے منہ سے مغلظات کا سیلاب امڈ پڑا۔ غصے اور طیش سے مغلوب ہو کر وہ کہہ رہا تھا۔

''غدار، بیٹی کی محبت غالب آگئی تجھ پر۔'' اسی اثنا میں وہ اظہر الدین پر جھپٹا۔ اظہر الدین کے پستول نے شعلہ اگلا اور گولی انور کے بازو کو چیرتے ہوئے نکل گئی۔ اس بار اظہر الدین نے بری طرح چیخ کر کہا۔

''انعام الرحمٰن میری بیٹی اور اپنا پیسہ لے کر یہاں سے فوراً فرار ہو جاؤ، تمہارا اور تعبیر کا نام بھی اس کیس میں نہ آنے پائے، میری زندگی کی پرچھائیں بھی تعبیر پر مت پڑنے دینا۔'' وہ دونوں بری طرح حواس باختہ تھے۔ لیکن انعام الرحمٰن نے اپنے حوصلے اور ہمت کو مجتمع کرتے ہوئے ایک ہاتھ سے تعبیر کا بازو تھاما اور دوسرے ہاتھ سے بیگ پکڑ کر دوڑ لگادی۔ عقب میں دونوں بھائی ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے، موت کا کھیل شروع ہو چکا تھا۔ پستول ایک ضرور تھا لیکن دونوں بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے اور پھر تھوڑی دیر بعد وہاں دو لاشیں خون میں تر بتر پڑی تھیں۔ جنہیں رونے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

تعبیر کو نیم بے ہوشی کی حالت میں انعام الرحمٰن نے گاڑی کی عقبی سیٹ پر لٹایا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے بجلی کی سرعت کے ساتھ وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

تعبیر کے نیم مردہ بدن میں جنبش ہوئی۔ اور ہلکی سی کسمساہٹ کے بعد جب اس کے خوابیدہ حواس بیدار ہوئے تو اس نے دیکھا گھر کے سارے افراد اس کے اردگرد جمع ہیں۔ اسے ہوش میں آتے دیکھ کر سب کے چہرے کھل اٹھے۔ ڈاکٹر نے جو سکون پہنچانے والے انجکشن لگائے تھے انہوں نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔ جیسے ہی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال ہوئی اسے وہ روح فرسا منظر یاد آگیا۔ اس نے گلوگیر آواز میں انعام الرحمٰن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بابا وہ سب کیا تھا؟'' انعام الرحمٰن صوفے سے اٹھ کر اس کے سرہانے آکر بیٹھ گئے اور مشفقانہ انداز میں اس کا سر تھپتھپانے لگے۔

''تابی بیٹا وہ ایک ٹھوس اور تلخ حقیقت تھی لیکن تم اسے ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔''

''بابا آپ کی اعلیٰ و ارفع شخصیت کو میں پہچان ہی نہیں سکی۔ میرے گستاخانہ رویے اور انتہائی بدتمیزی کے باوجود بھی آپ میرے لیے اپنی جان پر کھیل گئے۔'' تعبیر ان کے کندھے پر سر رکھ کر بری طرح رو پڑی۔

''جان پر میں نہیں کھیلا میں تو محض بے خوفی اور خود اعتمادی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔'' انہوں نے پُرخلوص اور میٹھے لہجے میں کہا۔

''موت سے آنکھیں تو تمہارے باپ نے ملائی ہیں۔ میں تو کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ اور سب اتنا آناً فاناً ہوا اور بازی ہی پلٹ گئی اظہر الدین نے زندگی کے آخری لمحات میں جو کام کیا ہے وہ اس کی ساری زندگی پر بھاری ہیں، ان چند لمحات نے اس کی زندگی کے سارے گناہوں کی سیاہی دھو ڈالی۔ اس کی موت سے پہلے میں نے جو سخت الفاظ اس سے کہے تھے اس کے لیے شاید میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہ کرسکوں۔''

''نہیں بابا، آپ نے کچھ بھی غلط نہیں کہا نہ کیا کیونکہ صورتِ حال ہی اس وقت ایسی تھی کہ... وہ تو وقتِ آخر اللہ نے میرے ابو کا دل پھیر دیا ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔ بہر حال بابا میں دل کی گہرائیوں سے آپ سے معافی کی خواستگار ہوں۔''

''تم میری عزیز ترین بیٹی ہو، تمہاری کسی نادانی کا میں نے کبھی کوئی اثر نہیں لیا۔ پھر کیسی معافی، بس ہمیشہ مسکراتی رہا کرو۔ اسٹریس تمہارے لیے خطرناک ہے۔'' انہوں نے تعبیر کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ تعبیر کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ خوشی سے بھرپور لہجے اور شہد جیسی آواز میں اس نے کہا۔

''بابا میرے اچھے بابا......'' انعام الرحمٰن نے شفقت سے اپنی بانہیں پھیلائیں اور وہ اس میں سما گئی۔ تہمین پاس بیٹھی نہ صرف دونوں کی باتیں سن رہی تھی بلکہ باپ، بیٹی کا یہ ملاپ بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ایسا سکون اور اطمینان تھا جیسے اسے برسوں کی ریاضت و عبادت کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اسی دنیا میں دے دیا ہو اور اظہارِ تشکر کے لیے اس کی ساری زندگی بھی کم ہے۔ بیٹی کے سرہانے تکیہ لگاتے ہوئے اسے آرام سے لٹاتے ہوئے تہمین نے شوہر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''انعام بس اسے آرام کرنے دیجیے اور آپ بھی تھکے ہوئے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے آپ بھی لیٹ جائیں اور اس قصے کو بھولنے کی کوشش کریں۔ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی بھرتا ہے جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے۔''

''نہیں تہمین ایسا مت بولو، ہمارا رب ارحم الراحمین ہے ہمارے گناہوں سے کئی گنا بڑی اس کی رحمت ہے، مجھے یقینِ کامل ہے اس کی رحمت اظہر الدین کے گناہوں کو ضرور ڈھانپ لے گی، تم نے مرتے وقت اس کی آنکھیں نہیں دیکھیں جس میں ایک پیاس، ایک پچھتاوا اور کرب ناک اذیت چھپی ہوئی تھی۔ اللہ اس کی مغفرت کرے، جس بیٹی کو وہ دنیا میں نہیں لانا چاہتا تھا اسی کو بچاتے ہوئے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کر دیا۔'' انعام الرحمٰن نے تہدیدی لہجے میں کہا۔

☆☆☆

انعام الرحمٰن اور تہمین روزانہ ناشتا تعبیر کے کمرے میں ہی کرتے تھے۔ اس وقت بھی ناشتے سے فارغ ہو کر بیٹھے تھے کہ تعبیر نے اپنی الماری سے تحفے تحائف کے وہ پیک نکالنا شروع کیے جو انعام الرحمٰن اسے وقتاً فوقتاً گاہے بگاہے دیتے رہے تھے اور وہ ان قیمتی سامان کو فضول اور ناکارہ اشیا سمجھ کر الماری میں سینت دیتی تھی۔ یہ تو اسے علم تھا کہ ان رنگ برنگی کاغذوں کے پیچھے بہت خوب صورت اور بیش قیمت اشیا چھپی ہوئی ہیں لیکن انہیں استعمال نہ کر کے وہ در پردہ اپنی نفرت کا اظہار کرتی تھی لیکن آج انعام الرحمٰن کے سامنے تمام اشیا کا ڈھیر لگاتے ہوئے اس نے کہا۔

''بابا آپ کو یاد ہے یہ قیمتی ملبوسات اور اتنے پیارے گفٹ آپ مجھے مختلف موقعوں پر دیتے رہے ہیں۔ لیکن میری عقل پر تو پتھر پڑ گئے تھے۔ نہ کبھی آپ کا شکریہ ادا کیا اور نہ کوئی چیز استعمال کی۔ اب انشاءاللہ سب سامان استعمال کروں گی۔''

''تعبیر بیٹا ایک انتہائی قیمتی اور جیتا جاگتا تحفہ بھی ایک بار میں نے تمہیں دینے کی کوشش کی تھی۔ وہ بھی تم نے بڑی بے دردی سے ٹھکرا دیا تھا۔ پتا نہیں تمہیں میرا وہ تحفہ یاد بھی ہے یا نہیں......'' انعام الرحمٰن نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔ تعبیر حیران کُن نظروں سے انہیں دیکھنے لگی کیونکہ وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔ لیکن چند لمحوں بعد یہ پہیلی سمجھ میں آئی تو وہ بری طرح شرما گئی۔ حیا سے اس کے گال سرخ ہو گئے، تہمین اور انعام الرحمٰن ہنسنے لگے۔ وہ نگاہیں جھکائے خاموش بیٹھی۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟'' انعام الرحمٰن نے جواب طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بابا آپ کا تحفہ سر آنکھوں پر لیکن بات میں نہیں کروں گی آپ کو یا ماما کو کرنی ہوگی۔'' اس نے شرمگیں مسکراہٹ سے کہا۔

''نہیں، بالکل نہیں میں اور تہمین اس معاملے میں ایک لفظ بھی نہیں بولیں گے۔'' انعام الرحمٰن نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے ٹھوس اور

حتمی لہجے میں کہا۔ ''بات تو جناب آپ کو خود ہی کرنی ہوگی۔ اس معاملے کو تم کس طرح ہینڈل کرتی ہو، کروگی تم بہتر جان سکتی ہو۔'' تعبیر نے اثبات میں گردن ہلا کر ہاں کی مہر ثبت کردی اور جلدی سے نو دو گیارہ ہوگئی جبکہ ان دونوں کو ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے دکھ کے سارے بادل چھٹ کر خوشی کی پھوار برس رہی ہو۔

☆☆☆

دھڑکتے دل اور کپکپاتی انگلیوں کے ساتھ اس نے سروش کا نمبر ڈائل کیا۔ ایک طویل عرصے بعد سروش کی آواز سماعت سے ٹکرائی تو دل میں ان گنت چراغ جل اٹھے، جلترنگ سے بجنے لگے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھول ہی گئی کہ اسے سروش سے کیا کہنا ہے۔ اُدھر سے سروش کی ہیلو، ہیلو کی رٹ جاری تھی۔

''سروش میں تعبیر بول رہی ہوں۔'' بہ مشکل اس نے آہستہ سے کہا۔

''اوہ، آپ ہیں، یادآوری کا شکریہ...... فرمائیں بندۂ ناچیز کو کیوں یاد کیا؟'' سروش نے چہکتی آواز میں کہا۔ تعبیر کو بات شروع کرنے کے لیے کوئی سرا نہیں مل رہا تھا۔ الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ اچانک آنکھوں میں چمک سی لہرائی اور وہ زیرلب مسکرائی۔

''سروش مجھے آپ سے ایک سوال کا جواب چاہیے۔''

''جی ضرور، ایک نہیں ایک ہزار سوال کیجیے۔ بندہ ہر سوال کا جواب دینے کے لیے حاضر ہے...... فرمائیں۔'' وہ بولا۔

''سروش کیا تعارف اور تعلق صرف بھولنے اور توڑنے کے لیے ہی ہوتے ہیں، ہم اپنے تعارف اور تعلق کو مضبوط اور خوشگوار بنا کر اپنی زندگی کے ہر موڑ کو مزید خوب صورت نہیں بنا سکتے۔ اپنی زیست کے انجام کو مکمل اور دل خوش کن نہیں بنا سکتے؟ مجھے میرے اس سوال کا جواب ابھی اور اسی وقت چاہیے۔'' چند لمحے تو وہ حیرت میں ڈوبا رہا۔

''محترمہ وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن آپ جس بنا پر مجھے رد کرچکی ہے وہ وجہ تو جوں کی توں ہے کیونکہ انعام الرحمٰن آج بھی میرے ماموں اور میں ان کا بھانجا ہوں۔ یہ حقیقت تو اپنی جگہ اٹل ہے۔''

''بس اب ختم کریں یہ ڈائیلاگ بازی، آپ کے ماموں اب میرے بابا ہیں......'' تعبیر نے جھنجلا کر کہا۔

''اوہ ویسے یہ معجزہ کب؟ کیسے اور کہاں رونما ہوا۔'' سروش نے استعجاب انگیز لہجے میں کہا۔ وہ خوشی کا تاثر لیے پوچھنے لگا۔

''آپ یہاں آئیں تو سہی...... انشاءاللہ سب سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ آرہے ہیں ناں......؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

''بالکل جناب عنقریب میں پاکستان آرہا ہوں۔'' سروش نے مسرت سے لبریز آواز میں کہا۔

''میں چشم براہ ہوں۔'' وہ شوخی سے بولی۔

''ہیلو، ہیلو رابطہ منقطع مت کرنا۔ ایک ضروری بات کرنی ہے۔ وہ تمہاری اتالیق جمیلہ بوا کیسی ہیں؟ تم جب بھی میرے خوابوں میں آتی تھیں تو وہ بھی تمہارے ساتھ ہوتی تھیں۔ اسی خوف سے میں نے سونا ہی چھوڑ دیا ہے۔ روز شب بیداری کرتا ہوں۔ ایمان سے تعبیر جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔'' اس کی بات پر تعبیر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''روتے بسورتے لوگ جب کھل کر ہنستے ہیں ناں تو پتا ہے کیا محسوس ہوتا ہے۔'' ہنسی سن کر سروش نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا محسوس ہوتا ہے؟'' تعبیر نے جلدی سے پوچھا۔

''ایسا لگتا ہے جیسے موسمِ گل ہنس پڑا ہے۔'' اب سروش نے ہنستے ہوئے کہا۔

تعبیر نے فوراً ہی سیل فون بند کردیا۔ اور خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''موسمِ گل تو جب ہنسے گا جب آپ یہاں آئیں گے۔'' اس کے چہرے پر خوشیوں اور مسرتوں کے عکس لرز رہے تھے۔



اختر شجاعت

طعام...... نعمتِ الٰہی

تمام تر حمد و ثنا اے رب کائنات تیرے لیے ہے، تو پاک ہے تنگ ہیں راستے اس کے لیے جس کا رہبر تو نہ ہو اور اس کے لیے حق کتنا واضح ہے جسے تو راستہ بتائے، اے ہمارے رب! ہمیں ان لوگوں میں رکھ جو تیرے ہاں زیادہ حصہ رکھتے ہیں اور تیرے حضور ان کا مقام بلند ہے اور تیری معرفت اور تیری رحمت میں بہت زیادہ حصہ لے چکے ہیں۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہمارے رب...... رحمت و برکت نازل فرما آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی آلؑ پر ان کے اصحابؓ پر درود و سلام ہو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر......

ہمارا موضوع طعام ہے، جس کے لغوی معنی کھانا، بھوجن، غذا کے ہیں، اربابِ عقل و دانش کا مقصد حیات یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کا شرف حاصل کرسکیں اور اس شرف کے حصول کا ذریعہ ...علم و عمل کا مجموعہ ہے۔ علم کی تحصیل جسمانی قوت و طاقت اور سلامتی کے بغیر ممکن نہیں اور جسم کی سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ انسان بھوک کے وقت ضرورت کے مطابق غذا استعمال کرے، کسی بزرگ کا قول ہے کہ ''کھانا بھی دین کا ایک جزو ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ''حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل (عبادت) کرو۔'' (سورۂ مومنون) وہ شخص جو علم و عمل اور تقویٰ پر قدرت حاصل کرنے کے لیے کھانا کھائے تو اسے چاہیے کہ اپنے نفس کو قابو میں رکھے، جانوروں کی طرح جگالی نہ کرے۔ کھانا کیونکہ دین کا جزو ہے اور علم و عمل کا ذریعہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس عمل میں بھی دین کے انوار ظاہر ہوں۔ دین کے انوار سے مراد کھانے کے آداب و سنتیں ہیں۔ کھانے والے کو چاہیے کہ ان باتوں کا خیال رکھے تاکہ نفس بیمار نہ ہو۔ کھانے کا عمل شریعت کی حدود سے تجاوز نہ کرے...... آداب و سنن کی رعایت کے ساتھ کھانے کا استعمال اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔ بلکہ اس کے ذریعے گناہوں سے بچنے کی توفیق بھی ہوگی...... ''بندے کو اس لقمے کا بھی ثواب عطا کیا جاتا ہے جو وہ اپنی بیوی کے منہ میں دے۔'' مگر یہ اجر و ثواب اس صورت میں ہے کہ انسان محض دین کی خاطر اور دین کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق یہ لقمہ کھائے اور کھلائے۔

کھانا چار طریقوں پر کھایا جاتا ہے۔

1۔ تنہا کھائے

2۔ مجمع کے ساتھ کھائے۔

3۔ مہمانوں کے سامنے پیش کرے۔

4۔ دعوت وغیرہ کی تخصیص ہوجائے۔

کھانے کا پہلا ادب یہ ہے کہ حلال ہو، پاک و طاہر اور جائز طریقے سے شریعت اور تقویٰ کے تقاضوں کے مطابق حاصل کیا گیا ہو، حصولِ رزق کی خاطر نہ دین میں مداہنت (خوشامد جھوٹ نفاق، سستی) کی جائے نہ خواہشات نفسانی کا اتباع کیا جائے اور نہ وہ ذرائع استعمال کیے جائیں جو شریعت کی نظر میں ناپسندیدہ ہوں...... اللہ تعالیٰ نے حلال و طیب رزق کھانے کا حکم دیا ہے اور باطل طریقے پر مال کھانے سے منع فرمایا۔

دوسرا ادب یہ ہے کہ کھانے سے پہلے دونوں ہاتھ دھوئے...... سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد پاک ہے کہ ''کھانے سے پہلے ہاتھ دھونا غربت دور کرتا ہے اور کھانے کے بعد ہاتھ دھونا رنج دور کرتا ہے۔''

کھانا عبادت ہے اس لیے کہ کھانے سے جسم

میں قوت آتی ہے اور فرائض ادا کرنے میں مدد ملتی ہے جس طرح نماز عبادت ہے اور اس سے پہلے وضو کیا جاتا ہے اسی طرح کھانا بھی عبادت ہے اس سے پہلے بھی ہاتھ دھونے چاہئیں۔

تیسرا ادب یہ ہے کہ کھانا اس دسترخوان پر رکھا جائے جو زمین پر بچھا ہوا ہو۔ سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ جب آپ کی خدمت میں کھانا لایا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے زمین پر رکھتے۔

زمین پر رکھ کر کھانا تواضع اور انکساری کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ اگر غرور تکبر اور شیخی کی نیت نہ ہو تو اونچے دسترخوان پر کھانا بھی بلا کراہیت جائز ہے۔ جہاں تک شکم سیری کا تعلق ہے یہ واقعی بدعت ہے بلکہ اسے سخت ترین بدعت کہنا چاہیے کیونکہ شکم سیری کے باعث شہوتوں کو تحریک ملتی ہے۔ اور بدن میں طرح، طرح کی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔

چوتھا ادب یہ ہے کہ دسترخوان پر مسنون طریقے سے بیٹھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی دوزانو ہو کر اپنے پاؤں کی پشت پر بیٹھتے اور کبھی دایاں پاؤں کھڑا کر لیتے اور بائیں پاؤں پر بیٹھتے اور کھانا تناول فرماتے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں تکیہ لگا کر کھانا نہیں کھاتا، میں تو ایک بندہ ہوں اور بندوں کی طرح کھاتا ہوں اور بندوں کی طرح بیٹھتا ہوں، تکیہ لگا کر پانی پینا یا لیٹ کر کھانا کھانا مکروہ ہے اور صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔

پانچواں ادب یہ ہے کہ کھانے میں لذت، آرام طلبی اور عیش کوشی کی نیت نہ کرے بلکہ یہ نیت کرے کہ کھانے سے اللہ تعالیٰ کی عبادت پر قدرت حاصل ہو، بندے کا کھانا بھی اطاعت ہی ہونا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد پاک ہے کہ ''آدمی نے کوئی برتن اپنے پیٹ سے زیادہ برا نہیں بھرا۔ ابن آدم کے لیے چند ایسے لقمے کافی ہیں جو اس کی پشت سیدھی کر دیں اگر وہ چند لقموں پر اکتفا نہ کر سکے تو ایسا کرے کہ ایک تہائی کھانا کھائے۔ ایک تہائی پانی پیے اور ایک تہائی جگہ سانس کے لیے رہنے دے۔'' کھانے کی طرف اس وقت ہاتھ بڑھائے جب بھوک محسوس کرے اور پھر شکم سیر ہونے سے پہلے کھانے سے ہاتھ کھینچ لے...... جو شخص بھوک کے وقت کھانا کھائے گا اور کم کھائے گا وہ کبھی ڈاکٹر کا محتاج نہیں ہوگا۔

چھٹا ادب یہ ہے کہ جو کھانا موجود ہو اسی پر خوش رہے...... اگر صرف دسترخوان پر روٹی ہو تو اس کی تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ سالن کا انتظار کیا جائے...... کھانے کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔ بلکہ شریعت کا حکم تو یہ ہے کہ اگر نماز کا وقت آجائے اور وقتِ ادا میں گنجائش ہو تو پہلے کھانا کھالے...... سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اگر رات کا کھانا اور عشا کی نماز دونوں آجائیں تو پہلے کھانا کھالو۔''

اس میں حکمت یہ ہے کہ نماز میں دل جمعی رہے گی دھیان نہیں بٹے گا۔

ساتواں ادب یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے ساتھ کھلانے کی کوشش کرے، خواہ اپنے بچوں کو ساتھ بٹھا کر کھلائے...... سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''اپنے کھانے پر جمع رہو، یعنی مل کر کھاؤ، اس سے تمہارے کھانے میں برکت ہوگی۔'' اور ایک جگہ ارشاد ہے کہ بہترین کھانا وہ ہے جس پر ہاتھ زیادہ ہوں۔'' حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی معمول تھا کہ آپ کھانا تنہا تناول نہ فرماتے تھے۔

ذیل میں وہ آداب بیان کیے جا رہے ہیں جس کا تعلق عین کھانے کی حالت سے ہے۔

پہلا ادب یہ ہے کہ بسم اللہ سے ابتدا کرے اور آخر میں الحمد للہ کہے...... اگر ہر لقمے کے ساتھ بسم اللہ کہے تو زیادہ بہتر ہے کہ یہ ثابت ہو کہ کھانے کی ہوس نے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہیں کیا ہے، پہلے لقمے پر بسم اللہ کہے دوسرے لقمے پر بسم اللہ الرحمٰن کہے اور تیسرے لقمے پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہے...... اس موقع پر بلند آواز سے بسم اللہ کہنا اچھا ہے، تاکہ دوسروں کو بھی اس کی توفیق ہو جائے...... دائیں ہاتھ سے کھانا کھائے، نمکین چیز سے شروع کرے اور آخر میں بھی نمکین چیز کھائے، لقمہ چھوٹا ہونا چاہیے کھانا چبا، چبا کر کھائے جب تک پہلا لقمہ ختم نہ ہو دوسرے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے۔ کسی بھی کھانے کی برائی نہ کرے...... سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی بھی کھانے کی برائی نہیں کرتے تھے۔

کھانا ہمیشہ اپنے سامنے سے کھانا چاہیے، پلیٹ یا پیالے کے درمیان سے مت کھائے روٹی بھی درمیان میں سے نہیں کھائے اگر روٹی توڑنے کی ضرورت پیش آئے تو ٹکڑا توڑے لیکن چھری وغیرہ سے نہ کاٹے، پکا ہوا گوشت بھی چھری سے نہ کاٹے بلکہ دانتوں سے کاٹ کر کھائے، حدیث میں چھری وغیرہ کے ذریعے پکا ہوا گوشت کاٹنے سے منع فرمایا گیا ہے بلکہ حکم یہ ہے کہ دانتوں سے گوشت جدا کرو، پیالہ وغیرہ روٹی پر نہیں رکھنا چاہیے البتہ روٹی پر سالن رکھا جا سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''روٹی کی تعظیم کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان کی برکتوں کے ضمن میں روٹی نازل کی ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ ''اگر تم میں سے کسی کا لقمہ گر جائے تو اسے اٹھالے اور جو مٹی وغیرہ لگ گئی ہو وہ صاف کرے اس لقمے کو شیطان کے لیے نہ چھوڑے جب تک کھانے کے بعد انگلیاں نہ چاٹ لے رومال سے صاف نہ کرے...... اسے کیا معلوم کہ برکت کس کھانے میں ہے۔''

روٹی سے ہاتھ صاف کرنا بھی بے ادبی ہے، گرم کھانے کو پھونک مار کر ٹھنڈا کرنا بھی مکروہ ہے بلکہ اگر کھانا گرم ہو تھوڑی دیر صبر کرے...... چھوارے، کھجور، میوے وغیرہ طاق کھائے یعنی تین، پانچ، سات، اکیس بہر حال طاق عدد کا خیال رکھے۔ کھجور اور گٹھلی ایک برتن میں جمع نہ کرے نہ ہاتھ میں رکھے بلکہ منہ سے گٹھلی نکال کر ہاتھ کی پشت پر رکھے اور نیچے ڈال دے، ہر اس چیز کا جس میں گٹھلی یا بیج وغیرہ ہو یہی حال ہے، ہڈی وغیرہ جیسی چیزوں کو بھی کھانے کے برتن میں نہ رکھے بلکہ الگ ڈال دے، کھانے کے دوران پانی زیادہ نہ پیے، اطباء کہتے ہیں کہ کھانے کے دوران زیادہ پانی پینے سے معدہ کو نقصان پہنچتا ہے۔

پانی کے گلاس یا کٹورے وغیرہ کو دائیں ہاتھ میں لے بسم اللہ پڑھ کر پیے آہستہ، آہستہ چھوٹے گھونٹ لے کر پیے...... اور پینے میں جلدی نہ کرے کھڑے ہو کر اور لیٹ کر پانی نہیں پینا چاہیے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے، پانی پینے سے پہلے گلاس پر نظر ڈال لے ایسا نہ ہو کہ کوئی کیڑا وغیرہ پانی میں ہو، پانی پیتے ہوئے ڈکار نہ لے، نہ سانس لے بلکہ ضرورت ہو تو برتن منہ سے الگ کر دے پھر سانس لے اور الحمد للہ کہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پانی پینے کے بعد حسبِ ذیل کلمات ارشاد فرماتے تھے۔ ترجمہ...... ''تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، جس نے پانی کو شیریں اور پیاس بجھانے والا بنایا اور اسے ہمارے گناہوں کی وجہ سے کھارا اور کڑوا نہیں کیا۔''

کھانے کے بعد کے آداب یہ ہیں کہ پیٹ بھرنے سے پہلے ہاتھ روک لے انگلیاں چاٹے (ناخن ترشے ہوئے ہوں) ہاتھ رومال سے صاف کرے پھر پانی سے دھوئے، دسترخوان پر پڑے ہوئے ریزے اٹھا کر کھالے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو شخص دسترخوان سے ریزے اٹھا کر کھائے گا اسے رزق میں وسعت حاصل ہوگی اور وہ فقر و تنگ دستی، برص اور جذام سے محفوظ رہے گا اور اسے بے وقوف اولاد نہیں دی جائے گی۔'' کھانے کے بعد خلال کرے، خلال وغیرہ کرنے سے جو ریزے نکلیں انہیں تھوک دے۔ خلال کے بعد کلی کرے اس سلسلے میں اہل بیت رضوان اللہ علیہ اجمعین سے ایک اثر بھی منقول ہے کہ برتن میں لگا ہوا سالن چاٹ لے اور اس کا دھوون پی لے، اسے ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا، دل میں اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا شکر ادا کرے کہ اس نے کھانا کھلایا اور بہترین رزق عطا کیا۔

حلال غذا کے بعد یہ دعا پڑھے۔ ''تمام تر تعریفیں خدائے پاک کے لیے ہیں جس کی نعمت سے اچھائیاں تکمیل پاتی ہیں اور برکتیں نازل ہوتی ہیں، اے اللہ! ہمیں پاک غذا کھلا اور ہم سے نیک کام لے۔'' اگر کھانے میں کسی قسم کا شبہ ہو تو یہ الفاظ کہے۔ ''ہر حال میں تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں، اے اللہ! اس کھانے کو ہمارے لیے اپنی نافرمانی پر قوت کا ذریعہ نہ بنا۔'' کھانے کے بعد قل ھو اللہ احد اور سورۂ قریش کی تلاوت کرے...... جب تک دسترخوان نہ اٹھا لیا جائے اپنی جگہ سے نہ اٹھے اگر کسی دوسرے شخص کے دسترخوان پر کھانا کھائے تو میزبان کے حق میں دعائے خیر کرے۔

اگر کوئی مشتبہ غذا کھالے تو کثرت سے استغفار کرے اور اظہارِ غم کے طور پر آنسو بہائے تاکہ آنسوؤں کے پانی سے اس آگ کی حرارت کم ہوجائے جو مشتبہ مال کھانے سے معدے میں پیدا ہو گئی ہے۔ مال حرام کے متعلق سخت وعیدیں ہیں۔

☆☆☆

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت معقل بن یسارؓ کھانا کھارہے تھے کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ گر گیا۔ انہوں نے اٹھالیا اور صاف کر کے کھالیا۔ یہ دیکھ کر گنواروں نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ (کہ کتنی ذلیل وحقیر بات ہے کہ گرے ہوئے لقمے کو انہوں نے کھالیا) کسی نے ان سے کہا خدا امیر کا بھلا کرے (معقل بن یسارؓ وہاں امیر وسردار کی حیثیت سے تھے) یہ گنوار اشاروں سے کہتے ہیں کہ آپؓ نے گرا ہوا لقمہ کھالیا اور آپ کے سامنے یہ کھانا موجود ہے، انہوں نے فرمایا۔ ''ان عجمیوں کی وجہ سے میں اس چیز کو نہیں چھوڑ سکتا ہوں جسے میرے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ ہم کو حکم ہوا تھا کہ ''جب لقمہ گر جائے تو اسے صاف کر کے کھالیا جائے شیطان کے لیے نہ چھوڑا جائے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ ''روٹی کا احترام کرو کہ وہ آسمان وزمین کی برکات سے ہے جو شخص دسترخوان سے گری ہوئی روٹی کو کھائے گا اس کی مغفرت ہوجائے گی۔''

ایک بار سیدنا عبداللہ بن عمرؓ نے روٹی کا ٹکڑا پڑا دیکھا تو غلام سے فرمایا۔ اسے صاف کر کے رکھ دے، شام کو افطار کے وقت غلام سے وہ ٹکڑا مانگا اس نے کہا وہ تو میں نے کھالیا...... فرمایا'' جا تو آزاد ہے، میں نے تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جو روٹی کا پڑا ہوا ٹکڑا اٹھا کر کھالیتا ہے تو اس کے پیٹ میں پہنچنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرمادیتا ہے۔ اب جس کی مغفرت ہوگئی میں اس کو غلام کس طرح بنائے رکھوں؟''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انگلیوں اور برتن کو چاٹنے کا حکم دیا اور فرمایا۔ ''تمہیں معلوم نہیں کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے۔'' اجتماعی طور پر کھانے کے آداب ان آداب کے علاوہ ہیں جو تنہا کھانے میں ملحوظ رکھنے چاہئیں۔

☆ اگر مجمع میں کوئی شخص علم وفضل یا عمر میں سب سے بڑا ہے تو کھانے کی ابتدا نہ کرے بلکہ بڑوں کا انتظار کرے۔

☆ کھانے کے وقت خاموش نہ رہیں، عجمیوں (غیر مسلموں) کا یہ طریقہ تھا کہ وہ دسترخوان پہ بیٹھنے کے بعد ایک دوسرے سے گفتگو نہ کرتے...... مسلمانوں کو ان کی عادت نہیں اختیار کرنی چاہیے بلکہ کھانے کے وقت اچھی باتیں کریں سلف صالحین کے وہ قصے اور اقوال بیان کریں جو کھانے وغیرہ سے متعلق ہوں۔

☆ اپنے اس رفیق کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے جو کھانے میں اس کا شریک ہے۔ یعنی اس سے زیادہ کھانے کا ارادہ نہ کرے، بہتر ہے کہ آدمی اپنے شریکِ طعام کے لیے ایثار کرے...... کھانے کے لیے تین مرتبہ سے زیادہ نہ کہے، تین مرتبہ سے زیادہ کہنا حسنِ ادب کے خلاف ہے۔ اس طرح کھائے کہ شریکِ طعام کو کہنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔

☆ ساتھ کھانے والے کو نہ تکے اور نہ ان کے کھانے پر نظر رکھے بلکہ نگاہیں اپنے کھانے پر مرکوز رہیں، اگر کسی وجہ سے کھانے کی خواہش نہ ہو تو معذرت کردے۔

☆ کوئی ایسا کام نہ کرے جو دوسروں کو برا معلوم ہو۔

مہمانوں کے سامنے کھانا پیش کرنے کے بہت سے فضائل ہیں۔

حضرت جعفر بن محمدؒ کہتے ہیں کہ'' جب تم اپنے بھائیوں کے سامنے دسترخوان پر بیٹھو تو دیر تک بیٹھے رہو...... اس لیے کہ یہ گھڑی تمہاری عمر میں محسوب نہیں ہوگی۔'' حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ'' آدمی اپنی ذات پر ماں، باپ اہل وعیال اور دوسرے رشتے داروں پر جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کا حساب لیا جائے گا لیکن جو خرچ برادرانِ اسلام کو کھانا کھلانے میں ہوتا ہے اس کا محاسبہ نہیں ہوگا...... اللہ تعالیٰ کو اس سلسلے میں حساب لینے سے شرم آئے گی۔''

کھانا کھلانے کے سلسلے میں متعدد روایات بھی ہیں، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ'' فرشتے تم میں سے ایک شخص کے لیے رحمت کی دعا میں مشغول رہتے ہیں جب تک اس کا دسترخوان اس کے سامنے بچھا رہے

اٹھ نہ جائے۔''

''تم میں سے بہتر وہ ہے جو کھانا کھلائے۔''

''جو شخص اپنے بھائی کو اتنا کھلادے کہ وہ شکم سیر ہوجائے اور اتنا پانی پلادے کہ اس کی پیاس باقی نہ رہے تو اللہ تعالیٰ اسے دوزخ سے سات خندقیں دور کردے گا اور وہ خندقیں ایسی ہوں گی کہ ہر دو خندقوں کے درمیان پانچ سو برس کا فاصلہ ہوگا۔''

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں کسی نے عرض کیا...... یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایمان کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا......

کھانا کھلانا اور سلام کرنا۔''

خراسان کے بعض علما کے متعلق منقول ہے کہ وہ اپنے ملنے والوں کے سامنے اتنا کھانا رکھتے تھے کہ ان سے کھایا نہیں جاتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ''ہمیں آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا علم ہے کہ جب بھائی کھانے سے ہاتھ روک لیں تو جو شخص ان کا بچا ہوا کھانا کھائے گا اس کا محاسبہ نہ ہوگا...... اسی لیے ہم ان کی خدمت میں زیادہ کھانا رکھتے ہیں ہم ان کا بچا ہوا کھانا کھائیں اور احتساب سے محفوظ رہیں۔'' بندے سے تین کھانوں کا حساب نہ ہوگا...... ایک سحر کا کھانا، دوسرا افطار کا کھانا، تیسرا وہ کھانا جو مہمانوں کے ساتھ کھائے۔

کھانے کی تیاری میں کسی قسم کا تکلف نہ کرے، جو کچھ موجود ہو پیش کردے۔ ایک شخص نے مولائے کائنات حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی دعوت کی۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں حسب ذیل تین شرطوں پر تمہاری دعوت قبول کرتا ہوں کہ ایک یہ کہ بازار سے میرے لیے کچھ نہ لانا، دوسری یہ کہ جو کچھ گھر میں ہو اسے اٹھا کر مت رکھنا، تیسری یہ کہ بیوی، بچوں کے لیے تنگی مت کرنا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ ''مہمانوں کے لیے تکلیف مت کرو اگر تکلیف کروگے تو انہیں برا سمجھوگے اور جو شخص مہمانوں کو برا سمجھتا ہے گویا وہ اللہ کو برا سمجھتا ہے اور جو اللہ کو برا سمجھتا ہے اللہ اسے برا سمجھتا ہے۔''

ایک حدیث میں ہے کہ ''جو شخص مہمان کی ضیافت نہ کرے اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔'' سب سے اہم بات یہ ہے کہ عبادت کے لیے پیٹ کی حفاظت اور اصلاح بھی لازمی اور ضروری ہے اور یہ بڑا مشکل اور دقّت طلب مرحلہ ہے کیونکہ دیگر اعضا میں قوت وضعف اور عفت وسرکشی کے امور پیٹ کے فساد کی وجہ سے برپا ہوتے ہیں، ضرورت سے زائد اور فضول حلال چیزوں سے احتراز کرنا لازمی ہے۔

حرام اور مشتبہ چیزیں کھانے والا عملِ خیر سے محروم ہوجاتا ہے، اور جہاں تک تعلق ہے کہ ضرورت سے زائد (یعنی زیادہ کھانا) حلال اور فضول چیزوں کا کھانا تو وہ بھی عابدوں کے لیے آفت اور راہِ حق میں مجاہدہ کرنے والوں کے لیے مصیبتوں سے کم نہیں۔ کیونکہ ضرورت سے زائد کھانے سے دل سخت ہوجاتا ہے اور اس کا نور زائل ہوجاتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے ''کہ کھانے پینے کی کثرت سے دل کو مردہ نہ کرو، کیونکہ دل اس کھیتی کی طرح مردہ ہوجاتا ہے جو پانی کی کثرت سے کاشت کے قابل نہیں رہتی۔''

ضرورت سے زیادہ کھانے سے گو حلال ہی ہو اعضا فتنوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، فسادات اور فضول کاموں میں برانگیختہ ہوتے ہیں کیونکہ شکم سیری ہو تو انسان اتراتا ہے آنکھیں حرام اور بیکار چیزوں کو تکنے کی آرزومند ہوتی ہیں، زبان بے ہودہ بکنے اور پاؤں بے راہ روی کے خواہش مند ہوتے ہیں، اور اگر انسان بھوکا ہو تو سارے اعضا اطمینان اور سکون سے رہتے ہیں اور کوئی عضو سرکشی نہیں کرتا ہے۔

حضرت ابو جعفرؒ فرماتے ہیں کہ بے شک پیٹ ایسا عضو ہے اگر یہ بھوکا ہو تو سارے اعضا سیر ہوتے ہیں یعنی سکون میں ہوتے ہیں، کسی چیز کا مطالبہ بھی نہیں کرتے اور پیٹ بھرا ہوا ہو تو سارے اعضا بھوکے ہوتے ہیں۔ (یعنی اپنی خواہش کے مطابق برائی کے بھوکے ہوتے ہیں) زیادہ کھانے سے ایک جو آفت اور آتی ہے وہ علم وعقل کی شکل میں رونما ہوتی ہے کیونکہ شکم سیری فہم وادراک کو ختم کردیتی ہے۔ پھر کثرت طعام سے عبادت میں کمی واقع ہوجاتی ہے، کیونکہ زیادہ کھانے سے اس کا بدن بوجھل اور آنکھوں میں نیند کا غلبہ ہوگا، اعضا نرم اور سست پڑ جائیں گے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا جاتا ہے

کہ ایک دن شیطان ملعون آپ کے پاس آیا۔ اس کے پاس بہت سے جال تھے، حضرت یحییٰ علیہ السلام نے پوچھا۔ یہ کیا ہے؟ تو شیطان نے کہا کہ یہ شہواتِ نفسانیہ اور لذاتِ جسمانیہ کے جال ہیں جن سے میں بنی آدم کو شکار کرتا ہوں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ کیا اس میں میرے لیے کوئی جال ہے؟ جس سے تو نے مجھے شکار کیا ہو؟

تب شیطان نے کہا نہیں...... ہاں البتہ ایک شب آپ نے پیٹ بھر کر کھایا تو میں نے نماز کو آپ پر بوجھل کردیا...... حضرت یحییٰ علیہ السلام نے کہا...... یقیناً اب بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھاؤں گا...... شیطان نے کہا، باخدا میں بھی اس کے بعد کسی کو خیر خواہی کی بات نہیں بتاؤں گا۔

یہ اس شخص کا حال ہے کہ جس نے ایک رات کے سوا زندگی میں کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا اور اس شخص کی کیا حالت ہوگی جس نے ایک رات کے سوا کبھی زندگی میں پیٹ کو بھوکا نہیں رکھا ہو اور پھر عبادت کی طمع کرے۔

کثرتِ طعام سے عبادت کی لذت و حلاوت ختم ہوجاتی ہے، حضرت ابو بکر صدیقؓ فرماتے ہیں کہ ”جب سے میں دولت اسلام سے مالا مال ہوا ہوں میں نے کبھی سیر ہو کر کھانا نہیں کھایا تا کہ میں اپنے رب کی عبادت کی حلاوت سے آشنائے راز ہوسکوں...... اور نہ ہی کبھی سیر ہو کر پانی پیا تا کہ اپنے رب کی ملاقات کے اشتیاق کے جذبوں کو تسکین دے سکوں۔“

کثرت طعام سے امورِ آخرت میں سختی اور سکراتِ موت میں شدت ہوتی ہے، حدیث مبارکہ میں ہے کہ سکراتِ موت کی شدت کا دارومدار دنیاوی لذتوں پہ ہے جو دنیاوی لذتیں زیادہ اٹھائے گا اس کی سکراتِ موت بھی اسی قدر شدید ہوگی۔“ کثرتِ طعام کا اور نقصان یہ بھی ہے کہ آخرت میں ثواب میں کمی واقع ہوجاتی ہے، جس قدر دنیاوی لذتوں سے زیادہ فائدہ اٹھاؤ گے اسی قدر اُخروی لذتوں میں کمی واقع ہوگی۔ اور اُخری لذتوں سے محروم رہو گے۔

ایک دن حضرت عمر فاروقؓ کو پیاس نے تنگ کیا تو آپؓ نے کسی شخص سے پانی طلب کیا۔ اس شخص نے کھجوروں سے کشید کیے ہوئے مشروب کا پیالہ آپ کو پیش کیا۔ جب آپؓ نے پیالے کے منہ کے قریب کیا تو مشروب کی ٹھنڈک اور لذت محسوس کی۔ آپؓ پینے سے رک گئے۔ اور درد مند آواز میں کہا...... ”آہ“ اس شخص نے کہا اے امیر المومنین! اس کی حلاوت میں، میں نے کمی نہیں چھوڑی...... حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا۔ ”اسی حلاوت نے تو مجھے اسے نوش کرنے سے روکا اگر آخرت کا خیال نہ ہوتا تو ہم بھی تمہاری زندگی کی طرح عیش وعشرت میں شریک ہوتے۔“ ضرورت سے زائد حلال چیزوں کے حصول میں ترکِ ادب پر میدانِ حشر میں حساب کتاب کے لیے دیر تک روکا جائے گا۔ پیٹ فقط لذات کے لیے بھرنے پر ملامت کی جائے گی۔ دنیا اور اس کی حلال چیزوں پر حساب وکتاب جبکہ دنیا کی حرام چیزوں پر عذاب الٰہی اور اس کی زینت اختیار کرنے پر ہلاکت وتباہی کا سامنا کرنا ہوگا......

پیٹ کی حفاظت کے حوالے سے اتنی آفتیں ذکر کی گئی ہیں، اپنے آپ پر غور وفکر کرنے والے صاحبانِ نظر کے لیے تو ان میں سے ایک ہی کافی ہے تو اپنے رزق کے معاملے میں احتیاط سے کام لے تا کہ حرام اور مشتبہ کی دلدل میں نہ پھنس جائے...... تو بس حلال رزق بھی اسی قدر کافی ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں معاون ثابت ہوسکے اور خود جو رزق اللہ تعالیٰ کی عبادت شمار ہوسکے تا کہ نہ تو شر میں مبتلا ہونے کا خدشہ ہو اور نہ ہی میدانِ حشر میں روکے جانے کا اندیشہ......

تو ہمارے پیارے اللہ ہمیں سنت کے مطابق کھانے اور پینے کی توفیق عطا فرما۔ اور ہمیں وہ رزق کھلا جو تیری عبادت میں ہمارے جسم کو قوت و توانائی بخشے...... آمین، الٰہی آمین......

حرفِ آخر......: کھانا ایک اہم ضرورت ہے تا کہ زندگی برقرار رہے مگر بعض لوگ اس کو اپنی زندگی بنا لیتے ہیں یعنی مقصد حیات صرف کھانا ہے، اللہ ہمیں اس بدعت سے محفوظ رکھے، آمین...... بہر حال اس مضمون کی تیاری میں میں نے جن قابلِ احترام ہستیوں کی کتب سے مضامین منتخب کیے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے...... آمین۔

آخر میں اپنے عظیم رب کی بارگاہ میں دعا گو ہوں کہ اس مضمون میں کہیں کوئی غلطی کوئی کوتاہی یا کمی رہ گئی ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے کہ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔

وہ آئے ہماری بزم میں

نزہت اصغر



خوب صورت جذبوں کو بامعنی الفاظ

کے قالب میں کامیابی سے

ڈھالنے والی مایہ ناز مصنفہ

غزالہ رشید سے دلکش باتیں

حسین موسم سرما کا لطف لیتے اور آمدِ بہار کی تیاریاں کرتے پیارے، پیارے قارئین کی خدمت میں سلامِ محبت...... آپ یقیناً منتظر ہیں کہ اب اس پیاری سی بزم میں کس تحریر نگار کی آمد ہے تو آج ہمارے ساتھ...... ایک اور باصلاحیت مصنفہ اور خوب صورت شاعری کی دلدادہ، غزال صفت و باذوق خاتون غزالہ رشید موجود ہیں، غزالہ سے ہماری دوستی کچھ زیادہ پرانی نہیں مگر خوشگوار ضرور ہے۔ جب بھی ہم

ملنے لگا کہ وہ ایک اچھی، ہنس مکھ اور دل گداز گفتگو کرنے والی ہستی ہیں۔ ہاں پاکیزہ سے تو بلاشبہ ان کا برسوں پرانا ناتا ہے۔ دوستوں کی دوست ہیں، کافی عاجزی ہے طبیعت میں مگر لکھنے میں تھوڑی سستی دکھاتی ہیں مگر ہم نے بھی مجبور کردیا، اپنی محبت و اپنائیت کے ذریعے جو انہوں نے ہماری بات کی لاج بھی رکھ لی اور انشاء اللہ آئندہ بھی رکھتی رہیں گی کیوں غزالہ...... ٹھیک ہے ناں......!

تو آئیے پیاری بہنو آپ کا مزید وقت نہیں لیں گے......غزالہ رشید سے گفتگو کا آغاز کچھ یوں کرتے ہیں۔

پاکیزہ ✧......سب سے پہلے تو آپ کا بہت شکریہ کہ اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر پاکیزہ کی بزم میں رونق افروز ہوئیں کیسا لگ رہا ہے؟

غزالہ رشید ❖......دوستوں سے وہ بھی کتاب دوستی کہہ لیں یا قلمی دوستی......ایسے دوستوں سے بات کرنا ہمیشہ ہی اچھا لگتا ہے۔ (جی یہ تو ہے)

پاکیزہ ✧......جی کافی عرصے سے ہم چاہ رہے تھے کہ آپ سے بات چیت ہو مگر کبھی آپ مصروف کبھی ہم......اب تو خیر بزم میں آہی گئی ہیں تو خوب باتیں ہوں گی......تیار ہیں ناں......؟

غزالہ رشید ❖......جی نزہت......عدالت کی حاضری تو ہے نہیں جو بہانے تراشوں، بالکل تیار ہوں مسکرا بھی رہی ہوں۔ (آپ تو ہنس مکھ ہیں ہی)

پاکیزہ ✧......کچھ آج کل کی مصروفیات کے بارے میں بتائیے؟

غزالہ رشید ❖......خواتین کی مصروفیات گھر سے، بچوں سے، شریکِ حیات سے اگر وقت نکالیں تو پھر لکھنا پڑھنا، بہترین مصروفیت، وقت کہاں ملتا ہے پھر۔

پاکیزہ ✧......چینل پر جاب کرنا کیسا رہا......کیا تخلیقی عمل جاری ہے یا آج کل بریک آیا ہوا ہے؟

غزالہ رشید ❖......چینل پر جاب کا تجربہ اچھا رہا۔ کام کرنے والا بندہ کچھ نہ کچھ سیکھ کے ہی نکلتا ہے، خاص طور پر کمرشل، نیشنل، انٹرنیشنل ٹیموں کے لوگوں کے ساتھ کام کرنا بالکل مختلف اور اچھا تجربہ رہا......لیکن لکھنے میں جو بریک آیا وہ شاید میرے لیے تکلیف دہ تھا کہ ہم لوگ ذرا موڈی قسم کے ہوتے ہیں ناں......(ہاں یہ تو ٹھیک کہا)

پاکیزہ ✧......غزالہ نام تو بڑا افسانوی سا لگتا ہے، کبھی شاعر کبھی افسانہ نگار، لفظ غزل، غزال یا غزالہ استعمال کرتے ہیں۔ کیسا لگتا ہے؟ آپ اپنے نام کے کس حد تک مصداق ہیں؟

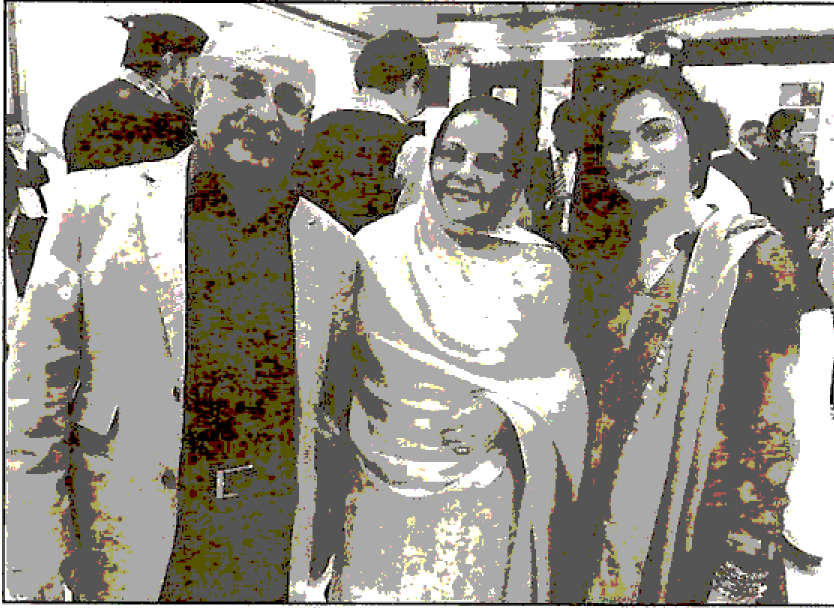
غزالہ رشید ❖......شاعری تو میرا جنون ہے، مجھے مصرعے میں بات کرنا، نظم میں وضاحت کرنا غزل میں درد سہنا زیادہ اچھا لگتا ہے......تو بالکل غزل کے مصداق لیکن بے چین فطرت غزال والی ہے۔ (اوہو)

پاکیزہ ✧......چلیں آپ کی تحریروں پر بات ہوجائے کب قلم کاغذ پر ایک تحریر، افسانے کی شکل میں وجود میں آئی؟

غزالہ رشید ❖......مجھے شاعری کا شوق تو ہمیشہ سے تھا اپنے والد کی وجہ سے، وہ سمجھانے کے لیے ہمیشہ علامہ اقبال کے اشعار کی مثال دیا کرتے تھے۔ حسِ مزاح بھی ان ہی سے ملی ہے اگر ہے مزاج میں تو......پہلا افسانہ لکھا اور ایک ڈائجسٹ میں فوراً چھپا۔ شاعری آج بھی ڈائری کی زینت زیادہ بنتی ہے۔

پاکیزہ ✧......پھر گھر سے یا ماحول سے کس حد تک پزیرائی ملی؟ مطلب پہلے کوئی افسانہ لکھنا گناہ کے زمرے میں آتا تھا ایک دھوم مچ جاتی تھی ارے اس لڑکی نے افسانہ لکھ ڈالا، شعر کہہ ڈالا، یہ کیا غضب ہوا......آپ کے سلسلے میں کیا ہوا؟

غزالہ رشید ❖......موروثی شوق ہے، میرا خیال ہے ابو ہمیشہ خوش ہوتے تھے۔ ان ہی کی وجہ سے کبھی کوئی پابندی نہیں لگی اور شاید ان ہی کی وجہ سے افسانے میں، روایت، تہذیب اور مذہبی رچاؤ حاوی رہا۔ میرے وہ قاری بھی تھے، نقاد اور لائبریری بھی اب ہر



غزالہ رشید اپنے رفیقِ حیات محمد نسیم عرشی اور (پیاری بھانجی) شزاء گیلانی کے ساتھ

لمحہ اس کا احساس حاوی رہتا ہے۔

پاکیزہ ✧......اسکول، کالج کی یادیں کس حد تک آج بھی یاد ہیں، ہم سے بھی کچھ شیئر کریں؟

غزالہ رشید ❖......اسکول، کالج میں اچھی اسٹوڈنٹ تھی......پڑھاکو سی، اچھے جملے اور شعر کی عادت نے اسی زمانے سے عزت کرنے اور عزت لینے کی عادت ڈال دی اب نہ ملے تو سمجھا کریں ناں تکلیف تو ہوتی ہے کیونکہ لب و لہجہ رویّے کی شناخت ہمیں ہمارے اساتذہ ہی کراتے ہیں...... یہ آج کے بچوں سے اس طرح نہیں ملتی۔

پاکیزہ ✧......ہاں بھئی اب قارئین کی دلچسپی رائٹر کی ذاتیات میں بہت ہوتی ہے اسی لیے ایسے سوال ضرور کروں گی؟

غزالہ رشید ❖......جی، جی بالکل کریں......اور اسی میں سارے جواب ہیں۔ شادی سے پہلے کا دور والدین کے لاڈ اور بھائیوں کے ساتھ شرارتیں دوستوں کی ناراضیاں اور اہمیت لیے ہوئے ہوتا ہے۔ شادی کے بعد کی زندگی مصروفیات کے ساتھ، ساتھ ذمّے داریاں لیے ہوتی ہے، تحریروں میں بھی وہی فرق واضح ہوتا ہے پہلے صرف اپنے دکھ بڑے لگتے ہیں اور پھر معاشرتی رویّے بھی قلم کی سیاہی کو کبھی رنگین کردیتے ہیں اور کبھی صرف لکیریں......چیک بک پر سائن کی طرح......(کیا علامتی بات کی ہے)

پاکیزہ ✧......شوہرِ نامدار اور پھر مشرقی سسرال کس حد تک معاون رہی یا پھر مزاحمت ہوئی؟

غزالہ رشید ❖......ایسی کسی رکاوٹ کا تو بالکل بھی سامنا نہیں کرنا پڑا، یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ سب میری شخصیت سے متاثر تھے لیکن مزاحمت یا مذاق اڑانے والا رویّہ بھی کسی کا نہیں رہا۔ اور خود مجھے بھی وہاں جو کردار نبھانے تھے ان پر فوکس زیادہ کیا کیونکہ لکھنا میرا شوق تھا۔ ہاں اب بچے بہت خوش ہوتے ہیں ممانی جان، چچی جان سے بات کرکے کہانیوں پر ڈسکشن بھی

چلتا رہتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... بچوں میں یہ شوق، یہ صلاحیت کس حد تک آئی؟

غزالہ رشید ❖...... بیٹے حسن بن نسیم کو کوئی خاص شوق نہیں بس art lover ہے میری آنے والی کتاب کا سرورق ان ہی نے بنایا ہے۔ گٹار وغیرہ کا بھی شوق ہے۔ کبھی، کبھی شاعری کا ذوق ان میں بھی اور ان کے والد صاحب میں بھی سر اٹھاتا رہتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... آج کی نسل خصوصاً لڑکیوں، بچیوں کو اکثر کیا نصیحتیں یا تجربات کا نچوڑ بتاتی ہیں؟

غزالہ رشید ❖...... موجودہ نسل ماشاء اللہ ہم سے زیادہ سمجھدار ہے لیکن زندگی کو یا تو زیادہ ہی سنجیدگی سے لیتے ہیں یا پھر لاابالی پن زیادہ ہے جو شاید اس عمر کا تقاضا بھی ہے زبردستی نہیں...... ہاں اگر مشورہ لیتے ہیں تو ضرور دیتی ہوں۔

پاکیزہ ✧...... زندگی نے کیا سکھایا یا زندگی نے ہی آپ سے کچھ سیکھا؟

غزالہ رشید ❖...... میں نے تو یہ سیکھا کہ صبر و استقامت آپ کو جینے کی راہ دکھاتی ہے، زندگی تو ملتی ہے رب کی مہربانی سے ہم اسے کون ہوتے ہیں کچھ سکھانے والے...... بس اچھی گزر جائے کسی کو درد دیے بغیر...... (جی بالکل)

پاکیزہ ✧...... اردگرد بسنے والے لوگ آپ کے مزاج اور عادات پر کس، کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں؟

غزالہ رشید ❖...... صحبت اثر انداز تو ہوتی ہے اس لیے نئے دوست بنانے میں شاید محتاط رہتی ہوں، اسے میری کمی کہہ لیں...... شعر میں ہی جواب عرض کردوں......

آدمی آدمی سے ملتا ہے
دل مگر کم کسی سے ملتا ہے

پاکیزہ ✧...... اپنے بہن، بھائیوں اور دوستوں میں وقت گزارنا کس حد تک ممکن ہوتا ہے؟

غزالہ رشید ❖...... ایک عرصے تک ملازمت کرتی رہی تو شاید اتنی اچھی طرح نبھانے کا دعویٰ تو نہیں کرسکتی لیکن اتنا ضرور ہے کہ محبت اور خلوص سے ہر رشتہ نبھانے کی بھرپور کوشش کرتی ہوں کیونکہ میں رشتے اپنے سمجھتی ہوں...... میکا یا سسرالی تفریق کے بغیر کیونکہ ہر رشتہ عزت مانگتا ہے' محبت سے نبھائیں تو آسان...... بوجھ بن جائے تو دوستی بھی مشکل...... رشتے بوجھ نہیں ہوتے، رویے انہیں بوجھل ضرور بنادیتے ہیں۔ (ہاں جب کسی کا غصہ کسی پر اترتا ہے)

پاکیزہ ✧...... کیونکہ شادی کے بعد تو سسرال سے وابستہ رشتوں کو وقت دینا ہوتا ہے تو آپ کیسے مینیج کرتی ہیں؟

غزالہ رشید ❖...... اوپر والا ہی جواب ہے کوشش کرتی ہوں شکایتوں، شکووں کے بغیر اچھا وقت گزاروں کیونکہ موجودہ دور میں ہر کوئی تنہائی، بیماری اور مہنگائی سے تھکا ہوا ہے تو جب ملو مسکرا کر ملو...... دل سے ملو...... کام سے کام رکھو...... اور بس......

پاکیزہ ✧...... افسانوں کے موضوعات کی اگر بات کروں تو آپ کے ذہن میں کوئی کہانی، کوئی خاکہ یا کوئی کردار ہوتا ہے کہ اس پر قلم آزمائی کی جائے؟

غزالہ رشید ❖...... میں کہانی کی باقاعدہ پلاننگ نہیں کرتی، کہانی اور کردار خود ہی ساتھ چل پڑتے ہیں...... کبھی، کبھی تو دنوں کوئی کہانی قلم نہیں اٹھانے دیتی اور کبھی سب سے ہاتھ چھڑا کے قلم کاغذ کے ساتھ جا بیٹھتی ہوں اور پھر سکون ہی سکون...... جو دل کا درد تھا کاغذ پر بکھیر دیا۔ (یہی تو ایک کہانی نگار کی خوبی ہوتی ہے)

پاکیزہ ✧...... ناول، افسانے ڈرامائی شکل میں آکر بدل کیوں جاتے ہیں۔ کیا رائٹر احتجاج نہیں کرتا؟

غزالہ رشید ❖...... بڑا مشکل سوال ہے، ڈراما ایک ٹیکنیکل کام ہے، صفحات آپ کے اختیار میں ہوتے ہیں۔ کردار بھاگتے پھرتے ہیں اور آپ کے ساتھ آپ کی مرضی سے چلتے ہیں۔ ڈرامے میں کرداروں کو

سمیٹنا پڑتا ہے۔ تاکہ دیکھنے والا الجھ نہ جائے...... کم لوگوں کے ساتھ ملاقات زیادہ اثرات چھوڑتی ہے۔ ہجوم میں انسان گم ہوجاتا ہے۔ اور بھلا کھوئے ہوؤں کو کون ڈھونڈتا ہے۔ (جستجوئے مسلسل تو ہونی چاہیے)

پاکیزہ ✧...... آج تو بے شمار چینلز ہیں اس میں کس نام کو کیسے پہچانا جائے؟ مطلب کون کس وجہ سے کلک ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے؟

غزالہ رشید ❖...... اچھی کہانی، مکالمہ، خوب صورت چہرے، ڈائریکشن، لوکیشن گھر بیٹھے مل جائے تو مزہ تو آتا ہے خاص طور پر OST (ٹائٹل سونگ) بہت سے ڈرامے دیکھیں، سوچیں یادوں میں کون گھر بناتا ہے۔

پاکیزہ ✧...... ایک گھریلو عورت اور ورکنگ وومن میں کیا فرق پاتی ہیں؟

غزالہ رشید ❖...... الگ الگ تو نہ کردیں ناں، بس یہ کہہ لیں ورکنگ وومن، مرد کے مسائل بھی سمجھتی ہے۔ ناراض کم ہوتی ہے، اپنے مسائل خود حل کرلیتی ہے۔ بس مرد کو سمجھنا چاہیے، کام چور نہیں ہوجانا چاہیے۔ عورت کا حق اسے ضرور دے اگر وہ بغیر شکایت کے ساتھ، ساتھ قدم ملا کے چل رہی ہے ورنہ تو گھر کے کام بھی کچھ آسان نہیں ہوتے۔ بیگم صاحبہ کو بھی ایڈمن تو بننا ہی پڑتا ہے۔ ورکنگ وومن ذرا پریکٹیکل زیادہ ہوتی ہے، میرے خیال میں۔ (اس کا یہی پریکٹیکل ہونا کبھی کبھی اسے مہنگا بھی پڑجایا کرتا ہے)

پاکیزہ ✧...... خواتین کے کیا حقوق ہیں جو اُن کو مل نہیں پارہے اور وہ سراپا احتجاج بنی رہتی ہیں؟

غزالہ رشید ❖...... ہمارے دین نے تو عورت کو بہت حقوق دیے ہیں...لیکن برصغیر پاک و ہند کے مرد حضرات کو متوازن کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ انہیں سوچنے والے ذہن شاید خوف زدہ کردیتے ہیں۔

پاکیزہ ✧...... اپنے معاشرے کی اچھی اقدار کیا ہیں؟ کیا خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے؟

غزالہ رشید ❖...... دیکھیں ہم اسلامی اقدار کہیں تو وہاں اچھی اقدار کے ساتھ جینے کی عادت



غزالہ رشید اپنی کتاب ''نہاں اور عیاں'' کی تعارفی تقریب منعقدہ لاہور میں اپنی پیاری فیملی کے ہمراہ

ڈالنی پڑے گی، ہم ثقافت کے ساتھ مذہب کو ملا دیتے ہیں۔ اب دیکھیں پردے دار عورت کس طرح جیٹھ اور دیور کے ساتھ رہ سکتی ہے؟ خاندانی نظام کو سمجھنے کی ضرورت ہے ایک گھر میں ساتھ رہنے کے طریقے مناسب انداز میں ٹھیک ہونے چاہئیں۔ جس کی ذمے داری بزرگوں پر عائد ہوتی ہے، اگر وہ دین دار ہوں تو آسانی...... دنیادار ہوں تو ٹوٹ پھوٹ......

پاکیزہ ✧......اگر ایسا ہے تو میڈیا خصوصاً ڈراموں کا اس میں کیا کردار ہے؟

غزالہ رشید ❖......ہم ساری ذمّے داری میڈیا پہ نہ ہی ڈالیں تو بہتر ہے، ہم ہر وقت اس کے سامنے نہ بیٹھیں، وقت کا مناسب استعمال کرنا تو خود ہی سیکھنا ہے ناں...... ٹیلی ویژن کا ریموٹ آپ کے ہاتھ میں ہے، نہ دیکھیں ایسے ڈرامے...... ویسے تو خبریں بھی اچھا خاصا ڈراما بتایا کرتی ہیں۔ (آج کل کے پرائم ٹائم میں یہی ڈرامے پسند کیے جا رہے ہیں)

پاکیزہ ✧......اچھا دل لگی...... دل کی لگی کب بنتی ہے؟

غزالہ رشید ❖......اس سوال کا جواب کم از کم میرے پاس نہیں ہے، نہ دل لگی کی اور نہ اس کا جواب میرے پاس ہے، سوری......

پاکیزہ ✧......کیا دنیا دل لگانے کو ہے یا دل کو ٹھکانے لگانے کو؟

غزالہ رشید ❖......نزہت یہ ایک ایسی عمر کی بات ہے جو فطرت، مزاح اور محبت سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک زمانہ ہوتا ہے جب بات، بات پر ہنسی آجاتی ہے اور ڈانٹ پڑنے کی وجہ سمجھ نہیں آتی...... اور پھر اللہ تعالیٰ خود بخود بندے کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس کی وجہ کچھ بھی ہو سکتی ہے، میرا خیال ہے سب سے سچی محبت والدین کی ہوتی ہے۔ ان کے جانے کے بعد ہر ایک کو دنیا کی سمجھ ضرور آجاتی ہے کبھی دیر میں یا کبھی جلد...... بندے پر منحصر ہے۔

پاکیزہ ✧......ارے حیران نہ ہوں بس ایسے ہی دل چاہا کہ آپ کو تھوڑا سا تنگ کروں اس لیے ایسے سوال پوچھے؟

غزالہ رشید ❖......ارے نہیں، سوال کا جواب دینے میں، کوئی نہ کوئی بات تو دل کو چھو ہی جاتی ہے یا بندہ دل سے اتر جاتا ہے یا بات دل میں...... سوال جواب تو ہونے چاہئیں، کوئی بات......

پاکیزہ ✧......اچھا ایک سنجیدہ سوال ہے، رشتوں یا دوستی میں غلط فہمیاں کیوں پیدا ہوتی ہیں اور ان کو دور کیسے کیا جائے؟

غزالہ رشید ❖......گھسا پٹا جواب لگے گا...... لیکن میرا خیال ہے، جب، جب ہم صرف اپنی ذات کو اہمیت دیں گے تو شکایتیں بھی زیادہ ہوں گی اور غلط فہمیاں بھی...... بس یہ ایسے ہی دور ہو سکتی ہیں کہ ہم یہ بھی سوچنا شروع کریں کہ ہو سکتا ہے، وہ پریشان ہو، ہو سکتا ہے ہم نے ہی جانے انجانے میں زیادتی کر دی ہو...... اپنی سوچ کے دائرے کو وسیع کریں اور صرف اپنی ذات تک محدود نہ رہیں تو دوسرے کو معاف کرنے کا بھی حوصلہ اللہ تعالیٰ دیتا ہے۔ یہ بھی ہنر ہے۔ (ہاں مثبت طرزِ فکر تو ضرور اپنانا چاہیے یہ خود اپنے لیے بھی بہتر ہے اور دوسرے بھی شر انگیزی سے محفوظ رہتے ہیں)

پاکیزہ ✧......بھئی ایک رائٹر اتنا حساس ہوتا ہے...... نفسیات داں بھی ہوتا ہے طرح، طرح کے کردار بُنتا ہے تو اسے تمام مسائل کا حل بھی پتا ہونا چاہیے...... کیوں ٹھیک ہے ناں......؟

غزالہ رشید ❖......اکثر لوگ حساس ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، سچ پوچھیں تو مسئلے کے اندر ہی اس کا حل بھی موجود ہوتا ہے۔ (ہاں دعا کرنی چاہیے اللہ تعالیٰ وہ بصیرت بھی دے دے)

پاکیزہ ✧......عالمی ادب کو کس حد تک مطالعے میں رکھتی ہیں؟

غزالہ رشید ❖......سچ پوچھیں نزہت تو چھوٹا



غزالہ رشید اپنے بیٹے حسن بن نسیم، شریک زندگی محمد نسیم عرشی اور بھانجی شزاء کے ہمراہ

سا کالم بھی پڑھ کر بہت انجوائے کرتی ہوں اور کبھی، کبھی ناول بھی مزہ نہیں دیتے۔ موپاساں کے افسانے اکثر ہی پسند آتے ہیں۔ کالموں کی کتاب چکن کورن سوپ بہت سادہ انداز میں لکھی گئی اور بہت اچھی لگی۔ امرتا پریتم، مجھے ہمیشہ سے پسند ہیں، صفیہ کے خطوط جو آج بھی یاد ہیں پھر اپنے بہت پسندیدہ مصنف اشفاق احمد، بانو قدسیہ، اخلاق احمد، عنیزہ سید بلکہ اپنے سارے افسانہ نگار مجھے کبھی، کبھی تو بے حد اپنے، اپنے سے لگتے ہیں۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

پاکیزہ ✧......اپنی پسند ناپسند سے بھی ہمیں آگاہ کریں؟ بھیگے موسم میں فوری کیا دل چاہتا ہے؟ ارے بھئی دل کا بھیگا موسم نہیں بلکہ اللہ کی دی ہوئی برسات......؟

غزالہ رشید ❖......موسم برسات کل بھی دل میں پھول کھلا دیتا تھا آج بھی دل کے قریب لگتا ہے۔ یہ موسم جو مٹی کی خوشبو سے پھولوں کی مہک تک کہتے ہیں، ”تم رب تعالیٰ کی کون، کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“ (جی بے شک)

پاکیزہ ✧......پسندیدہ پکوان، خوشبو، ذائقہ، تفریحی مقام، لباس، رشتہ، وقت، کتاب، شعر، کوئی جملہ جو بار، بار ذہن میں آتا ہو؟

غزالہ رشید ❖......کھانا سادہ ہو، گرم ہو اچھا لگتا ہے، سبزی زیادہ پسند ہے، خوشبو کی اسیر ہوں، سمندر ہمیشہ پُراسرار لگتا ہے، دن میں پُرسکون کرتا ہے، رات میں اداس کر دیتا ہے۔ سب جگہیں اچھی لگتی ہیں، تاریخی مقامات دیکھنے کا بہت اشتیاق رہتا ہے، لباس شلوار قمیص، ساڑی، رشتہ ماں اور صرف ماں کا...... اور ہر وہ رشتہ جو عزت دینے کا ہنر رکھتا ہو۔ وقت صبح کا...... شام اداس کرتی ہے، دوستوں کے ساتھ ہو تو شاد کر دیتی ہے۔ کتاب سچ پوچھیں جو زندگی کے سوال کو آسانی سے سمجھا دے۔ کبھی کوئی جملہ بھی اگر خوب صورت لگے تو وہ کتاب اچھی لگتی ہے تو ایسی لاتعداد کتابیں اور جملے......

شعر، ہاں وہ مجھے جب کہیں سنا دوں بہت پہلے کا شعر آج بھی سماعتوں کو سننا اچھا لگتا ہے......

آؤ ناصر کوئی غزل چھیڑیں
جی بہل جائے گا ، ارے کچھ تو

مسکراہٹ انسان کی ڈھال ہے۔

پاکیزہ ✧......اپنی ہم عصر رائٹرز سے کس حد تک

میل ملاپ ہے......کیا ایک دوسرے سے ملنے کے لیے ذہنی ہم آہنگی کا ہونا ضروری ہے؟

غزالہ رشید ❖......دوست تو دوست ہوتا ہے، سب سے ملنا اچھا لگتا ہے، ویسے اس قلم قبیلے نے بہت سے دوست عطا کیے۔ جن میں کسی ایک کا نام لوں تو دوسرے کے ساتھ زیادتی ہوگی......ذہنی ہم آہنگی کی اگر بات ہے تو ہم عصروں میں دلشاد نسیم......ویسے بھی عزت کے ساتھ نام لوں تو صبیحہ شاہ کا احترام ہے دل میں......سیما رضا، سائرہ غلام نبی، سیما مناف، منزہ سہام سے ملنا اچھا لگتا ہے۔ ڈاکٹر نگہت نسیم دوست ہے مگر مسیحاؤں جیسی ہے۔ عقیلہ حق ناراض نہ ہوں تو یہ سب جونیئر پیاری، پیاری لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں، اللہ انہیں شاد و آباد رکھے۔ انجم انصار، فریدہ مسرور، رضوانہ پرنس، ایڈیٹر اور کولیگ رہے اور بہت اچھے دل سے احترام ہے۔ ایک دوست فرزانہ آغا جس سے ایسی دوستی ہے کہ روحانی خوشی ہوتی ہے۔(بہت خوب، اللہ ان سب پیارے، پیارے دوستوں کو شاد و آباد رکھے، آمین)

پاکیزہ ✧......دوستی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے......؟ اس میں کوئی عمر، کوئی صنف یا کسی طبقے کی قید ہے؟

غزالہ رشید ❖......دوست وہ ہوتا ہے جو خاموشی میں بھی اپنا ہو اور شور میں بھی......دعاؤں میں بھی......ایسے دوست رخ چوہدری جیسے، زمر نعیم جیسے ہوتے ہیں (واہ بھئی خوش ہو جاؤ تم دونوں)

پاکیزہ ✧......اپنی کاوشوں کو کتابی شکل میں کب لائیں یا ارادہ ہے؟

غزالہ رشید ❖......انٹرویو کے دنوں میں ہی میرے چھوٹے سے بھیا احسان گیلانی ان کی شریک حیات رعنا گیلانی نے یہ خوب صورت تحفہ کتابی شکل میں دیا......جس کا نام ”نہاں اور عیاں“ ہے۔ ان کے ساتھ، ساتھ ڈاکٹر نگہت نسیم کی ڈانٹ اور دلشاد نسیم کی محنتوں کا کوئی مول نہیں......اللہ تعالیٰ میرے پیاروں کو سلامت رکھے، آمین......اور ہاں خاص طور پر ماہنامہ پاکیزہ کا شکریہ جس نے مجھے اس محبت سے بات چیت کے لیے منتخب کر کے عام سے خاص بنا دیا۔(ارے یہ تو آپ کا حق ہے)

پاکیزہ ✧......آج کی نئی رائٹرز کو کوئی نصیحت کرنا چاہیں کوئی گُر کی بات؟

غزالہ رشید ❖......نصیحت کرنے والی کہاں حیثیت ہماری......میں نے تو یہیں سیکھا ہے آپ بھی سیکھیں......قلم آپ کی تلوار ہے......اسے کسی کے نامناسب، ہتک آمیز رویّے کے باوجود بھی زنگ نہ لگنے دیں۔ یہ خدا کا خاص تحفہ ہے، جو ہمیں ملا ہے، اس سے استفادہ ضرور حاصل کریں۔ دوسروں کا بھی ہاتھ تھام لیں۔

پاکیزہ ✧......ماہنامہ پاکیزہ سے دوستی کی داستان کچھ ہمیں بھی بتائیں؟

غزالہ رشید ❖......انجم انصار سے ملاقات بہت عرصہ پہلے دلشاد نسیم کے گھر پر ہوئی تھی جب سے تو نہیں لیکن میرے خیال میں 1993ء میں پہلی تحریر دی اور ان کی محبت کہ شرفِ قبولیت بخشا......تو متعارف کرنے کا سہرا پاکیزہ میں ان ہی کے سر جاتا ہے، ورنہ تو ساری زندگی تعارف ہی کے مرحلے میں بندہ رہتا ہے۔(بہت خوب)

پاکیزہ ✧......تو پھر اس رابطے کو بریک کیوں کیا؟ اب کب نئی کہانی دے رہی ہیں؟

غزالہ رشید ❖......بریک پہلے توڑا......بس کچھ ذاتی مصروفیات جن میں ریڈیو کی مصروفیت بھی شامل ہے، آج کل SCLD میں بچوں کے ساتھ بھی کچھ وقت بہت اچھا گزارتی ہوں۔ بلکہ بہت ہی یادگار......صبیحہ شاہ نے منتخب کیا، اس کے لیے بھی رب کا شکر ادا کرتی ہوں، اور ان کا بھی......(قارئین SCLD صبیحہ شاہ کی پیاری بیٹی کا اسکول ہے)

پاکیزہ ✧......پاکیزہ میں مزید کیا اچھا چاہتی ہیں، کوئی تبدیلی کوئی نئی بات......کسی چیز کی کمی لگتی ہو تو



ضرور بتائیں؟

غزالہ رشید ❖......کتابیں شیلف میں سجی رہ جاتی ہیں، ایسے ماحول میں ہر ماہ ہم تک اچھی تحریروں کا پہنچانا بھی جہاد ہے، اس کے لیے عذرا رسول کا، آپ کا......آپ کی ٹیم کا بہت شکریہ! بہت اچھا کام ہے اردو کی ترویج میں اہم کردار ہے آپ کا۔ ورنہ تو آج کے دور میں سب صرف اسی موضوع پر بات کرتے نظر آتے ہیں کہ کون سا بوتیک اچھا ہے تو جیتے رہیں......اس کارِ خیر میں حصہ لینے والے......شاد رہیں آباد رہیں، میرا کوئی لفظ، کوئی بھی جملہ جانے انجانے میں کسی کو پسند نہ آیا ہو تو اس کے لیے پیشگی معذرت......(ایسا بھی کچھ تیکھا نہیں کہا! آپ نے ڈیئر)

پاکیزہ ✧......بہت شکریہ غزالہ، اپنا قیمتی وقت ہمارے حوالے کرنے کا۔

☆☆☆

جی تو پیاری بہنو! غزالہ رشید نے اپنے بارے میں بتانے میں خاصا کسرِ نفسی سے کام لیا...... ورنہ لوگوں کو تو اپنے بارے میں بتانے کا موقع ملے تو پھر صفحے کے صفحے بھر جاتے ہیں خیر غزالہ کے متعلق اتنا ضرور کہیں گے کہ یہ مصنفہ ہونے کے ساتھ، ساتھ بہترین انتظامی امور کی بھی مالک ہیں، جبھی تو کامیاب براڈ کاسٹر اور بے حد باصلاحیت مدیرہ بھی رہ چکی ہیں مگر اپنے آپ کو ناچیز ہی کہتی ہیں، یہ تو ان کا بڑا پن ہوا ناں......! ان کی دلچسپ اور متاثر کُن گفتگو یقیناً آپ کو بھی پسند آئی ہوگی۔ اپنی اس بزم پر اظہارِ رائے ضرور کیجیے گا۔ حسبِ معمول ایک مختصر سی بات کے ساتھ اجازت طلب کرتے ہیں کہ جہاں بھی رہیں اپنے گرد و نواح میں مثبت رویّے اور خوشگوار اثرات ضرور ثبت کریں کہ یہی زندگی کا حُسن ہے۔ نیک تمناؤں اور دعاؤں کے ساتھ......اللہ نگہبان......!

جنوں کے راستے یوں تو کٹھن سے لگتے ہیں
مگر یہ راستے منزل تلک نکلتے ہیں
زمانہ ہر قدم پہ راہ روکنے والا
عزائم پختہ ہوں جن کے وہ کب بھٹکتے ہیں

☆☆☆

ہوا منشور جاری حقوقِ نوعِ نسواں کا

شائستہ زریں

عزیز قارئین! السلام علیکم!

ایک صدی سے زائد عرصہ بیت گیا جب پھول کھلنے کی رُت میں محنت کش خواتین نے اپنے استحصال کے خلاف آواز اٹھائی تو نہ صرف اسے رد کیا گیا بلکہ ان پر تشدد بھی کیا گیا اور پھر یہی غیر انسانی رویہ ناتواں خواتین کی توانائی بن گیا اور انہوں نے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر جہدِ مسلسل کی صورت بالآخر اقوامِ متحدہ سے اپنا مطالبہ تسلیم کروالیا۔ یوں عالمی سطح پر سال میں ایک دن یعنی ۸ مارچ خواتین سے منسوب کیا جانے لگا۔ گویا بہار رُت میں آنے والا عالمی یومِ نسواں خواتین کی اپنے حقوق سے آگہی اور خود پر ہونے والے تشدد کی روک تھام کے لیے پیش رفت کی ایک پُرعزم اور پُرامید کاوش ہے۔

موسمِ بہار میں منائے جانے والے عالمی یومِ نسواں کے موقع پر اگر 20% خواتین مسرتوں اور بہاروں سے لطف اندوز ہو رہی ہوتی ہیں تو 80% خواتین خزاؤں کی زد میں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ ہماری ذاتی رائے ہے۔ اس ضمن میں دیگر خواتین کیا کہتی ہیں یہ جاننے کے لیے ہم نے ایک سروے رپورٹ کا اہتمام کیا اور ان سے معلوم کیا کہ......

''موسمِ بہار کے اوائل میں خواتین کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ کیا یہ دن خواتین کو بہاروں کی نوید دیتا ہے؟''

سروے میں شریک خواتین کی آرا نذرِ قارئین ہے۔

رضیہ سبحان
(ماہرِ تعلیم، مصورہ)

بہت دلچسپ سوال ہے۔ اس ایک سوال میں کئی جواب پوشیدہ ہیں جو توجہ طلب بھی ہیں اور طویل بھی اس لیے مختصراً یہی کہوں گی کہ ...

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ



عورت تو خود سراپا بہار ہے، سراپا رنگ اور خوشبو ہے، عورت کی تعریف کا سلسلہ لا متناہی ہے۔ موسمِ بہار کی وجہ سے عورت پر بہار نہیں آتی بلکہ عورت جہاں بھی ہوگی اپنے وجود سے اس عالمی دن کو بہاروں میں تبدیل کردے گی کہ عورت تو خود بہار کی نوید اور بہار کا سراپا پیغام ہے۔

شہناز احد
(صحافی)

عورت اور بہار ایک ہی چیز کے دو نام ہیں بہار کیا ہے؟ رنگ، پھول، خوشبو، احساسِ خوشگواریت۔ دل چاہے پتنگ بن اڑ جائیں۔ اور عورت کیا ہے؟ تازہ ہوا کا جھونکا، خوشبو کا احساس، چاندنی کی ٹھنڈک، زندگی کا وہ روپ جو جینے کا سبب ہو، دیکھنے کو بار، بار دل چاہے، چھونے کی خواہش ہو، دل کا قرار، آنکھ کی ٹھنڈک...... بہار کا



موسم بھی ایسے ہی احساسات کے ساتھ آتا ہے اور جس نے بھی اس عالمی دن کے لیے موسمِ بہار کے آغاز کا انتخاب کیا ہے بہت خوب کیا ہے۔ پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں۔ اس موسم میں صنفِ نازک کی بات نہ ہوگی تو پھر کب ہوگی؟

تزئین دانش
(ماہر تعلیم)



میرے خیال میں کسی کے لیے کوئی دن منانے سے معاشرتی، سیاسی اور اخلاقی سطح پر انسانی رویوں میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ البتہ اس دن کچھ خواتین اپنی خوش فہمیوں میں اضافہ ضرور کرلیتی ہیں۔

تنویر عشرت
(ماہر نفسیات)

آپ کے سوال کے کئی پہلو ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ موسمِ بہار دنیا کے ہر خطے میں نہیں ہوتا۔ پاکستان ان چند خوش قسمت ممالک میں سے ایک ہے جہاں موسمِ بہار ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ خواتین تو بذاتِ خود موسمِ بہار ہیں۔ خاتون ماں کے روپ میں بچوں کے لیے موسمِ بہار ہے۔ شوہر دفتر سے گھر آتے ہی خاتونِ خانہ کو پکارتے اور تلاش کرتے ہیں۔ پھر بہنوں کے دل میں ہر وقت



بھائیوں کی محبت کے پھول کھلتے رہتے ہیں۔ بیٹی اپنے باپ کے لیے موسمِ بہار کے ساتھ، ساتھ ایک باغ میں پرندوں کے چہچہانے کی آواز بھی ہے۔ ہمارے پاکستانی معاشرے اور ثقافت میں عورت مکمل بہار کے مانند ہے۔ شاید اسی لیے یہاں موسمِ بہار خواتین کے دن کے ساتھ، ساتھ اپنی آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ میرے نزدیک یہ عورت موسمِ بہار ہے اگر وہ اپنے آپ کو پہچان لے اور اپنے ہر کردار کو بخوبی نباہ لے۔ ایسی عورت جہاں بھی ہوگی وہاں موسمِ بہار ہوگا۔ لہٰذا عورت ہر روز، ہر لمحہ موسمِ بہار کی نوید دے سکتی ہے۔ بجائے موسمِ بہار کا انتظار کرنے کے۔

منزہ ارشاد
(معلمہ، براڈکاسٹر)

بہار کے رنگوں سے خواتین کا ناتا تو ازلی و ابدی ہے۔ اسی موسمِ بہار میں خواتین کا عالمی دن بھی منایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عالمی دن منانے کا مقصد دنیا بھر کے لوگوں میں خواتین کے حقوق سے متعلق آگہی دینا ہے اور اگر سال کے اس اہم دن ہم دنیا بھر کے معاشرے کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ آج سے زیادہ کبھی عورت پر اتنا ظلم نہیں ہوا ہوگا۔ خواتین کا احترام اور ان سے محبت کرنا صرف اور صرف بہتر تربیت سے ہی ممکن ہے۔ کسی دن کو مخصوص کرنے سے نہیں۔



ایڈووکیٹ سعدیہ ہما شیخ
(شاعرہ، قانون داں)

زرد پتوں کا تسلط ہے ہما گلشن پر
کوئی بتلائے بہاروں کی فضا کیسے ہو

خواتین کی زندگی میں بہار اس ایک دن کو منانے

سے کیسے آسکتی ہے؟ ہر سال ایک دن منالینا اور عملی اقدامات ندارد۔ وہی تشدد، مار پیٹ۔ ساس اور نند کی ہرزہ سرائی۔ بیٹیاں ہیں تو بیٹا نہ ہونے کی پاداش میں سوکن کا خوف، شوہروں کا دوسری عورت سے تعلق، تعلیم حاصل کرنے پر اعتراض، قرآن سے شادی، ونی کرنا۔ ان سب کے ہوتے ہوئے کیسی بہار؟ کہاں کی بہار؟ خواتین کا دن منانے کے لیے ضروری ہے کہ عملی اقدامات کیے جائیں۔ انہیں تحفظ دیا جائے۔ انہیں عزت دی جائے۔ پیار دیا جائے۔ تبھی یہ دن بہاراں کی نوید بنے گا۔ ابھی تو عورت صرف شوہر اور بچوں کی زندگی کو پُر بہار بنانے کے لیے اپنی ساری زندگی خزاں میں گزار دیتی ہے۔



ہما بیگ
(شاعرہ)

خواتین تو خود بہار کی طرح ہوتی ہیں ماں باپ کے گلشن میں کھلتی ہیں تو ہر سمت بہار کے رنگ بکھر جاتے ہیں اور جب رخصت ہو کر پیا کے گھر سدھارتی ہیں تو ان کی خوشبو اور رنگ اپنے وجود سے اس ماحول کو گل و گلزار بنا دیتے ہیں۔ اور جو کبھی زندگی میں خزاں آجائے تو عورت سب اپنے اوپر جھیل کر... حتی الامکان اپنے پیاروں کو نقصان سے بچاتی ہے۔ اور موسم بہار میں جس طرح خوبانی، آڑو، آلوچہ کے



پودے خود تو ٹنڈ منڈ ہو جاتے ہیں مگر ان پر لگے شگوفے ہر ایک کی طبیعت نہال رکھتے ہیں اور ماحول کو افسردگی کا شکار نہیں ہونے دیتے۔

اسی طرح بہاروں میں آنے والا خواتین کا عالمی دن احساس دلاتا ہے کہ اب خزاں جانے کو ہے اور بہاروں کی آمد آمد ہے۔

موسم کوئی بھی ہو اہم بات یہ ہے کہ عورت سدا تندرست، پُر سکون اور خوش رہے، خود بھی بھرپور جذبوں سے زندگی گزارے اور جو رشتے اس سے جڑے ہیں وہ بھی پھولوں کی طرح مہکتے رہیں۔ آمین

ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر
(مدیرہ اسالیب، شاعرہ)

حقیقت یہ ہے کہ موسم انسان کے باہر نہیں اس کے اندر ہوتے ہیں۔ جب انسان خوش ہوتا ہے تو اس کے لیے موسم بہار ہے ورنہ خزاں کا گماں ہوتا ہے۔ موسم بہار کے اوائل میں منایا جانے والا عالمی یوم خواتین دراصل امید کی کرن ہے۔ کہ ایک دن ہی سہی خواتین کے مسائل کو سنجیدگی سے لیا جا رہا ہے۔ اور یہ سنجیدگی ان مسائل کے حل کی طرف جانے والا راستہ ہے۔ امید کی یہ کرن خواتین کے لیے حقیقتاً موسم بہار کی نوید لاتی ہے۔ تاہم اس بہار کو مزید نکھارنے کے لیے لازمی ہے کہ صرف ایک دن نہیں پورے سال سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے خواتین کے مسائل پر کام کیا جائے اور خواتین میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور یگانگت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ جب تک عورت، عورت کی خیر خواہ نہیں بنے گی کوئی یوم خواتین بہار نہیں لا سکتا۔ اس لیے کہ



مسائل کے حل کے لیے ''بہن چارہ'' لازمی شرط ہے اور دائمی بہار کی نوید بھی۔

تسنیم ماپارا
(ماہر پکوان)

ویسے تو صرف ایک مخصوص دن منانے کا رواج مجھے تو کبھی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا آپ خواتین کا کردار سارا سال نظر انداز کر سکتی ہیں۔ جو محبت، محنت اور خلوص سے اپنی تمام زندگی قائداعظم کے فرمان کے مطابق کام، کام دن رات کریں کام کی تفسیر بنی رہتی ہیں تو اگر ساری زندگی بھی خواتین کا دن منایا جائے تو کم ہے کہ......



حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
ہمارا وجود ہی بہار ہے سدا بہار

صائمہ سید
(تبصرہ نگار)

زندگی نام ہے موسموں کے آنے جانے کا، زندگی میں تغیر موسم کی مناسبت سے نہیں بلکہ علم و افکار کی بنیاد پر آتا ہے۔ ایک مثبت سوچ کی حامل عورت اپنے مثبت طرز عمل سے خود سے وابستہ لوگوں کی زندگی میں بہاریں لا سکتی ہے۔ خوشیوں کا کوئی موسم نہیں ہوتا۔ ہر اچھی خبر اور کامیابی خواتین کی زندگی میں بہاروں کے پھول کھلا سکتی ہے خواہ وہ موسم خزاں ہی کیوں نہ ہو رشتہ خواہ کوئی بھی ہو مثبت طرز عمل اپنائیں، خود خوش رہیں اور دیگر خواتین کو خوش رکھیں آپس کی یہی محبت عورت کی طاقت ہے۔ جو اس دن بہاروں کی نوید دیتی ہے۔

پُر خلوص دوست کے نام

سوچوں پر غم کی شال ہے تم کیوں چلے گئے
ہر سمت ایک جال ہے تم کیوں چلے گئے

تازہ تمام زخم بہاروں نے کر دیے
ہر پھول کا سوال ہے تم کیوں چلے گئے

ہنسنا تو خیر اپنا مقدر نہ تھا کبھی
رونا بھی اب محال ہے تم کیوں چلے گئے

کیوں ہاتھ میں نہیں ہے میری جاں تمہارا ہاتھ
کتنا برا یہ سال ہے تم کیوں چلے گئے

تم نے تو جاتے، جاتے ملاقات تک نہ کی
اب تک یہی ملال ہے تم کیوں چلے گئے

از: صبا نور، لیہ

ارم کمال
(تبصرہ نگار)

جی ہاں! یہ دن ہمیں بہاروں کی نوید دیتا ہے۔ ہمیں مضبوط بناتا ہے۔ خواہ مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹیں یا گرد آلود آندھیاں چلیں۔ اللہ پر کامل یقین۔ صبر و تحمل اور پختہ عزم کو ہم اپنے ہتھیار بنالیں تو کانٹوں بھرے راستے بھی خوش رنگ پھولوں سے لدے ہوں گے۔ خواتین کی اہمیت تسلیم کرنے کے لیے ہی تو یہ دن منایا جاتا ہے اس لیے میری پیاری بہنوں آپ چاند کی طرح نہ بنیں بلکہ سورج کی طرح بنیں تاکہ کوئی آپ پر نظر نہ جما سکے۔ مشکلات کا مقابلہ ہمت سے کریں۔ تو بہاریں زندگی کے دروازے پر دستک دینا شروع کر دیں گی۔

رخسانہ ناصر
(تبصرہ نگار)

اپنے گھر کے بزرگوں، گھر، شوہر اور بچوں کی تمام ذمے داریاں نبھانے اور ان کو خوش رکھنے ہی میں ہم خواتین کی خوشی ہے۔ ایسے میں ان کی تعریف اور محبت کے دو میٹھے بول ہمارے لیے فخر کا باعث ہی نہیں بہاروں



کی نوید بھی بن جاتے ہیں۔ خواتین کا عالمی دن یقیناً ہم خواتین کو بہاروں کی نوید دیتا ہے۔اس سے ہمارے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ہمت بڑھتی ہے۔ امید پہ دنیا قائم ہے اس لیے اس دن یہ یقین ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن خواتین کے مسائل ضرور حل ہوں گے۔

☆☆☆

سروے میں شریک بیشتر خواتین کی نظر میں خواتین سراپا بہار ہیں۔بے شک

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

اور ان رنگوں میں اضافہ محض زبانی کلامی اپنے حقوق کی جنگ لڑنے سے نہیں ہوتا بلکہ ہر حق کے ساتھ ایک بھاری ذمے داری کی حقیقت محسوس کرنے اور اس پر عمل کرنے سے بھی ہوتا ہے۔ہم مغربی روایات کے تحت ہر سال خواتین کا دن مناتے ہیں اس کے باوجود وہ کامیابی ہمارے حصے میں نہیں آتی جو اس کاوشِ پیہم کے نتیجے میں آنی چاہیے۔آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی کلی کے پھول بننے سے پہلے ہی مسلنے کے لرزہ خیز واقعات صنفِ نازک کو عدم تحفظ کا احساس دلاتے ہیں۔غور کریں تو یہ اسلامی تعلیمات سے دوری کا سبب ہے۔معلمِ انسانیت سرکارِ دو عالم ﷺ کی مبارک آمد کی خبر سنتے ہی آپ کے چچا نے کنیز کو آزاد کر دیا تھا۔یہ تھا پہلا احسان محسنِ نسواں کا خواتین پر۔آپ ﷺ نے خواتین کو نازک آبگینے قرار دے کر صنفِ نازک کے احترام ،حفاظت اور باعزت مقام کی تعلیم فرمائی تھی۔ ہمارے معاشرے میں بیٹی کی تربیت کی جانب تو خوب توجہ دی گئی لیکن بیٹوں کی تربیت سے ہاتھ کھینچ لیا گیا' انجام کار وہ شرمناک واقعات اکیسویں صدی میں بھی منظرِ عام پر آنے لگے جو اسلام سے پہلے دورِ جہالت کی شان سمجھے جاتے تھے۔ قرآن حکیم ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور قرآن مجید کی ایک پوری سورہ خواتین کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کرتی ہے۔سورۂ نساء میں خواتین کے مسائل کا مکمل حل موجود ہے۔

خواتین کے حقوق کا منشور تو صدیوں پہلے طلوعِ اسلام کے ساتھ ہی سرورِ دو جہاں ﷺ نے پیش کر دیا۔ بس ضرورت اس پر عمل درآمد کی ہے۔گر خواتین کو اسلام کے مقرر کردہ حقوق مل جاتے ہیں تو ان کا ہر پل بہاروں کا امین ہے۔اسلام حسد اور انتقام جیسے افعال کی ممانعت کرتا ہے۔اور جو خواتین ایسے برے اعمال میں ملوث ہوتی ہیں صرف اپنی ہی ہم صنف کے لیے خطرہ نہیں ہوتیں بلکہ وہ خود اپنے آپ کو بھی خزاں کی دعوت دیتی ہیں ۔ایسے مکروہ خیالات اور اعمال سے خود کو بچائیے اور بقول ڈاکٹر عنبرین حبیب عنبر مسائل کے حل کے لیے ''بہن چارہ'' اختیار کیجیے۔خواتین کا باہمی حسن سلوک ہی دراصل مژدۂ بہار ہے۔خواتین اپنی جیسی دیگر خواتین کے حق میں مخلص اور منصف ہو جائیں تب دیکھیے کمال محبت کا اعجاز۔محبت کو اپنا شعار بنا لیجیے۔ ہر سو بہاریں ہی بہاریں ہوں گی۔جیسا بیج بوئیں گی ویسا ہی پھل پائیں گی سو.....

دلوں میں خواہشوں کے بیج بو کے دیکھتے ہیں
بہاریں خود بخود آ کر ہمارے پاؤں چھو لیں گی

اگر حقوقِ نسواں کے کرتا دھرتا مرد حضرات ہی ہیں تو اپنے گھر کے مردوں کے قلب و ذہن کو احترامِ نسواں کے احساس سے معمور کر دیجیے ۔اس تخم ریزی کے بہترین ثمرات سامنے آئیں گے ۔ یوں خواتین کو اپنی اہمیت اور مقام منوانے کے لیے کسی ایک دن کا مرہونِ منت نہیں ہونا پڑے گا موسم خواہ کوئی ہو ہر دن نویدِ بہار دے گا۔

خزاں کی اجاڑ شامیں نہ آئیں اگلے برس
آؤ اس بہار رُت کو زنجیر کرتے ہیں

☆☆☆

آتا ہے یاد مجھ کو

نرگس نسیم

آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ......
وہ بارش کا پانی وہ کاغذ کی کشتی

بابا جی جب اکثر یہ فقرات گنگناتے تو ہم کہتے......بابا جی گزرے دور کو دُہرانے کا کیا فائدہ آپ تو اب بھی بارش کے موسم میں کاغذ کی کشتی بنا کر اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں۔

بابا جی بولتے۔''اُڑا لو مذاق جب خود پر گزرے گی تو تب ہم یاد آئیں گے۔''

بے شک گزرے ہوئے حسین لمحات کبھی واپس نہیں آتے مگر ہم بھلے لوگ جب جی چاہتا ہے یادِ ماضی کی پگڈنڈیوں پر قدم دھر لیتے ہیں......ایسے میں ان اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے راستوں پر ہمیں اپنے ان بابا جی کی جھلک بھی ضرور نظر آتی ہے جو اپنے بچپن کو یاد کر کے ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے تھے......ہمارا بچپن اپنے نانا کے گاؤں میں گزرا......نانا ابو اپنے علاقے کے ایک صاحبِ حیثیت معزز زمیندار تھے۔اس کے علاوہ پاکستان آرمی کے ریٹائرڈ صوبیدار بھی...... اس ناتے نانا ابو روایتی جاگیرداروں سے کچھ ہٹ کر تھے۔ انتہائی نیک شفیق انسان، ہماری نانی اماں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں......ان کے والدین کی تین چار گاؤں میں کافی اراضی تھی......اس کے علاوہ تقریباً دس بارہ میل کی مسافت پر اک بہت بڑا زمین کا قطعہ جن پر درخت تھے،اسے ایک چھوٹا موٹا جنگل بھی کہہ سکتے ہیں وہ بھی نانی امی کی ملکیت تھا۔پھل ،دودھ، دہی، مکھن، لسی ،سبزیاں، اناج وغیرہ زمینوں سے وافر مقدار میں دستیاب تھیں......آج جب بازار سے پھل، سبزیاں آتی ہیں تو اپنے باغ کے پھل اور کھیتوں کی تازہ سبزیاں بہت یاد آتی ہیں، جب ملاوٹ والا دودھ استعمال کرتے ہیں تو خالص دودھ ،دہی بہت یاد آتا ہے......جب کہیں پکنک منانے جائیں تو اپنے گاؤں کے اونچے نیچے ٹیلے سرسبز و شاداب کھیت، گاؤں سے ہٹ کر پانی کی بہتی ہوئی نہر اور اپنے گاؤں کا میلا بہت یاد آتا ہے' ہاں آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ......ہم بچے گرمیوں کے موسم میں نہر کے ٹھنڈے پانی میں تیرنے کا مقابلہ کرتے تو گاؤں بھر کی خواتین کپڑے دھوتیں......گاؤں سے ہٹ کر کھیتوں میں مال مویشیوں کے لیے ڈیرے بنے ہوتے ہر ڈیرے میں الگ، الگ ہر شخص کا کنواں ہوتا جس کے پانی سے کھیتوں کو سیراب کیا جاتا......کنویں کے ارد گرد درخت بھی لگے ہوتے جن میں سے ایک آدھ پر جھولا بھی لگا ہوتا۔ جب خواتین کنویں پر پانی بھرنے جاتیں تو جھولے بھی لازمی جھولتیں......ہم بچے کنواں چلا کر پانی کا حوض بھر کر صبح سویرے اپنے کھیتوں کے پھل، سبزیاں، تربوز، خربوزے توڑ کر حوض میں ڈال دیتے تا کہ وہ خوب ٹھنڈے ہو جائیں کیا مزہ تھا ان پھلوں کا۔ ہمارے گاؤں کے ساتھ قریبی قصبے میں ہر سال میلا لگا کرتا...... یوں تو عورتوں کا وہاں جانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا مگر ہمارے ماموں ایک بہت بڑی کوسٹر گاڑی میں خواتین اور بچوں کو چاندرات کو میلے میں لنگر کھلانے لے جاتے۔لنگر کا انتظام چونکہ ماموں کرتے تھے اس لیے ہمارے گھر کی خواتین کے لیے الگ سے خیمہ لگا ہوتا گاڑی عین خیمے کے دروازے کے سامنے جا رکتی خواتین تو خیمے میں چلی جاتیں جبکہ ہم بچے، ماموں کے ساتھ میلے میں گھومنے پھرنے لگتے،لڑکے

اپنی پسند کی چیزیں تو بچیاں، مہندی، چوڑیاں جیولری خریدتیں۔

عید کے روز صبح سویرے میلے والے اپنے، اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے صرف مقامی دکاندار رہ جاتے تب ہمارے چھوٹے ماموں جوامی کے چچا زاد بھائی تھے ہم سب بچوں کو عید کے دن بھی میلے پر دوبارہ لے کر جاتے۔ ہم اپنے ننھے منھے پرسوں میں اپنی، اپنی عیدی لے کر میلے میں خوب خریداری کرتے تمام بچے اپنی پسند کی چیزیں لے لیتے جبکہ میں بے چین روح کے مانند اپنی ریز گاری والے پرس کو پکڑے یہاں وہاں چکراتی۔ آخر مجھے ان پیسوں کا صحیح مصرف سمجھ آجاتا...... لاٹری والے کے پاس انعام کے طور پر الگ سے بچوں کی کہانیوں والی چھوٹی، چھوٹی کتابیں ہوتیں جو کہ لاٹری کے انعام میں نکلا کرتیں، میں ساری ریز گاری لاٹری والے کو دے کر ساری لاٹری خرید لیتی صرف ان کہانیوں کے لیے ......اکثر میلے سے واپسی پر جب دوسرے بچے کھلونے چوڑیاں جیولری اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھرے شاپر لے کر گھر روانہ ہو رہے ہوتے میں ان سب سے پیچھے ایک اسٹوری کی ننھی منی بک کھولے چلتے، چلتے کہانی پڑھ رہی ہوتی۔

ان سب باتوں سے ہٹ کر جب موسم گرما میں ہماری آنٹی اپنے بلونگڑوں کے ساتھ میکے تشریف لاتیں تو ہم ان کا بیگ کھلنے کا انتظار کرتے وہ اپنے بیگ سے چیزیں نکال کر جب الماری کی زینت بنا کر تالا لگاتیں تو ہم اس تاک میں رہتے کہ کب موقع ملے تو ان چیزوں تک ہماری رسائی ہو......اور جب کبھی بھول چوک کر وہ تالا لگانا بھول جاتیں تو ہم آرام سے ان کا کوئی رسالہ چرا کر کنویں (ڈیرے) پر چلے جاتے اور درخت پر چڑھ کر کسی گھنی شاخ پر بیٹھ کر اپنی الگ دنیا میں کھو جاتے...... یہ اور بات کہ جب رسالے کی ڈھنڈیا مچتی تو لے دے کے مجرم کے طور پر ہمارا ہی نام سب سے پہلے سامنا آتا اور سب باجماعت ہماری تلاش میں سرگرداں ہو جاتے مگر ہم بھی کوئی پاگل تھے جو ان امکانات پر غور نہ کرتے اس لیے ڈھونڈ ڈھانڈ کر وہ گوشے منتخب کرتے جس کی طرف کسی کا خیال، خواب بھی نہیں آتا۔

ہم بچے بڑے جبکہ بڑے بوڑھے ہو گئے اور بوڑھے ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئے...... آج بھی نہر بہتی ہے، آج بھی وہی پرانے کھیت کھلیان ہیں...... مگر عورتیں کپڑے دھونے نہر پر نہیں جاتیں، پانی بھرنے کوئی کنویں پر نہیں جاتا، جھولے بھی کب کے بوسیدہ ہو کر زمانے کے ستم سے ہواؤں کے دوش سے یہاں وہاں بکھر گئے......وہ گھر کی سبزیاں، پھل اناج اب بھی آتے ہیں مگر موجودہ دور کے رنگ میں رنگے خالص رنگ وروپ خواب وخیال ہوئے۔

میں اپنے بچوں کو جب یہ قصے سناتی تو ان کو اشتیاق ہوتا کہ امی آپ جب بھی گاؤں جاتی ہیں اوپر، اوپر گھر سے ہی ہو کر واپس آجاتی ہیں...... ہمیں نہر، کھیت، کنویں دکھائیں تو میں ان کو ایک دن وقت نکال کر سب سے پہلے بہت اشتیاق سے کنویں پر لے گئی مگر یہ کیا وہاں پہنچتے ہی میرے ارمانوں کا محل دھڑام سے زمیں بوس ہو گیا...... نہ وہ سرسبز کھیت...... نہ پانی کا حوض...... نہ وہ گھنے درخت، اجڑے ہوئے ویران باغ اور سب سے الگ تھلگ اپنی ویرانی پر ماتم کناں سوکھا کنواں...... میں حیرت، صدمے کی زیادتی سے کھڑی کی کھڑی رہ گئی جبکہ میرے بچے بار، بار میرا کندھا ہلا کر پوچھتے ”امی آپ کے نانا ابو والے کھیت کہاں ہیں“ تو میں صرف سوچ کر رہ گئی کہ نانا ابو سب تہذیب و روایت بھی اپنے ساتھ لے گئے، پیچھے سوائے گم شدہ یادوں کے کچھ بھی نہیں چھوڑ گئے......اور آج ہم ہیں اور ہمارے ساتھ ساتھ کچھ گم شدہ یادیں...... آج جب ہم اپنے ماضی کو دہراتے ہیں تو ہم کو وہ باباجی بہت یاد آتے ہیں جو ہر وقت یہ گنگنایا کرتے تھے......

”آتا ہے یاد مجھ کو گزرا ہوا زمانہ......“

☆☆☆

فکاہیہ کالم — گوشۂ ظرافت — ادارہ

مزاح نگاری، کمال کی صنفِ ادب ہے کہ جس میں وہ بات بھی بہ آسانی کہہ دی جاتی ہے کہ جسے سوچنے میں زمانے لگیں...... مگر ایسی نشتر زنی بخاطرِ اصلاح کا فن بھی کسی کسی کو آتا ہے۔ ورنہ مزاح نگاری کو عامیانہ طرزِ تحریر بننے میں دیر نہیں لگتی۔

مشتاق احمد یوسفی مزاح نگاری کی صنف میں ایک بڑا معتبر نام...... اس ماہ ان کی کتاب زرگزشت جو اُن کی سوانحِ نوعمری کے نام سے بھی جانی جاتی ہے اس میں سے تین اقتباسات منتخب کیے گئے ہیں۔ امید ہے آپ جیسے باذوق قارئین بہت محظوظ ہوں گے۔

تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

کراچی میں سردی اتنی ہی پڑتی ہے جتنی مری میں گرمی، اس سے ساکنانِ کوہ مری کی دل آزاری نہیں بلکہ عروس البلاد کراچی کی دلداری مقصود ہے۔ کبھی کبھار شہر خوباں کا درجۂ حرارت جسم کے نارمل درجہ حرارت یعنی ۴ء 98 سے دو تین ڈگری نیچے پھسل جائے تو خوبانِ شہر لحاف اوڑھ کر ائر کنڈیشنر تیز کر دیتے ہیں۔ حسن خود بین وخود آرا جب 43 نمبر کے مشمولات کا ۳۴ نمبر کے سوئٹر میں خلاصہ کر کے آئینہ دیکھتا ہے تو حیا کی سرخی رخساروں پر دوڑ جاتی ہے جسے موسم سرما کے خون صالح پر محمول کیا جاتا ہے۔ اس حسنِ تضاد کو کراچی کے محکمۂ موسمیات کی اصطلاح میں کولڈ ویو (سردی کی لہر) کہتے ہیں۔ یہ خوبی صرف کراچی کے متلون موسم میں دیکھی کہ گھر سے جو لباس بھی پہن کر نکلو، دو گھنٹے بعد غلط معلوم ہوتا ہے۔ لوگ جب اخبار میں لاہور اور پنڈی کی سردی کی شدید خبریں پڑھتے ہیں تو ان سے بچاؤ کے لیے بالو کی بھنی مونگ پھلی اور گزک کے پھنکے مارتے ہیں۔ ان کے بچے بھی انہی پر پڑے ہیں۔ بادِ شمال اور گوشمالی سے بچنے کے لیے اونی کنٹوپ پہن کر آئس کریم کھاتے اور بڑوں کے سامنے بتیسی بجاتے ہیں۔ کراچی میں پنڈی سے تین لحاف کم سردی پڑتی ہے۔ نو وارد حیران ہوتا ہے کہ اگر یہ جاڑا ہے تو اللہ جانے گرمی کیسی ہوتی ہوگی۔ بیس سال سرد و گرم جھیلنے کے بعد ہمیں اب معلوم ہوا کہ کراچی کے جاڑے اور گرمی میں تو اتنا واضح فرق ہے کہ بچہ بھی بتا سکتا ہے۔ نوّے ڈگری فارن ہائٹ ٹمپریچر اگر مئی میں ہو تو یہ موسم گرما کی علامت ہے۔ اگر دسمبر میں ہو تو ظاہر ہے کہ جاڑا پڑ رہا ہے۔ البتہ جولائی میں نوّے ڈگری ٹمپریچر ہو اور شام کو گرج چمک کے ساتھ بوندی برس پڑے تو برسات کا موسم کہلاتا ہے۔ غالباً کیا یقیناً ایسے ہی کسی نیم گرم، گنگنے کراچوی جاڑے سے اکتا کر نظیر اکبر آبادی نے تمنا کی تھی۔

ہر چار طرف سے سردی اور صحن کھلا ہو کوٹھے کا\
اور تن میں نیمہ شبنم کا، ہو جس میں خس کا عطر لگا\
چھڑکاؤ ہوا ہو پانی کا، اور خوب پلنگ بھی ہو بھیگا\
ہاتھوں میں پیالہ شربت کا، ہو آگے اِک فراش کھڑا\
فراش بھی پنکھا جھلتا ہو، تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

تین چار سال بعد دو تین دن کے لیے سردی کا موسم آجائے تو اہلِ کراچی اس کا الزام کوئٹہ وِنڈ پر دھرتے ہیں اور کوئٹہ کی سردی کی شدت کو کسی سیم تن کے ستر نما سوئٹر سے ناپتے ہیں۔ کراچی کی سردی بیوہ کی جوانی کی طرح ہوتی ہے۔ ہر

ایک کی نظر پڑتی ہے اور وہیں ٹھہر بلکہ ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔
اُدھر کوئٹہ میں جب دستانے، کمبل، مفلر اور سمور کے انبار میں سے صرف چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہوجائے کہ ان کے جنوب میں مونچھ ہے یا پنکھڑی اِک گلاب کی سی ہے تو کوئٹہ والے اس کھلپے کا ذمے دار قندھاری ہوا کو ٹھہراتے ہیں اور جب قندھار میں سائبیریا کی زمہریری ہواؤں سے درختوں پر اناروں کے بجائے برف کے لڈو لٹکتے ہیں، گوالے گائے کے تھنوں سے آئس کریم دوہتے ہیں اور سردی سے تھر تھر کانپتے ہوئے انسان کے دل میں خود کو واصلِ جہنم کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے تو اہالیانِ قندھار کمبل سے چمٹ کر ہمسایہ ملک کی طرف غضبناک نگاہوں سے دیکھتے ہیں، چھوٹے ملکوں کے موسم بھی تو اپنے نہیں ہوتے۔ ہوائیں اور طوفان بھی دوسرے ملکوں سے آتے ہیں، زلزلوں کا مرکز بھی سرحد پار ہوتا ہے۔

یہ جنوری 1950ء کی ایک ایسی ہی صبح کا ذکر ہے، موسمی کیفیت ہم نے قدرے تفصیلی و تنقیص کے ساتھ اس لیے بیان کی کہ کراچی میں یہ ہماری پہلی صبح تھی۔ گوارا حد تک گرم ہونے کے علاوہ یہ ایک تاریخ ساز صبح بھی تھی۔ زمستان کی اس صبح بینکاری کے پیشے سے ہمارے طویل فلرٹیشن کا آغاز ہوا۔ اور صبح اس وقت نہیں ہوتی جب سورج نکلتا ہے بلکہ صبح اس وقت ہوتی ہے جب آدمی جاگ اٹھے۔

آج ہم نے اپنا چہرہ دیکھا

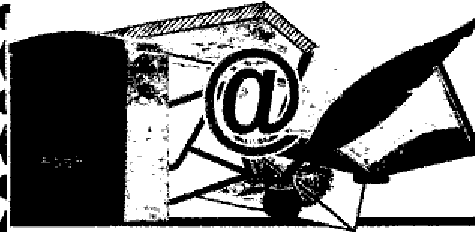
بیگم بہت خوش خوش نظر آرہی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہمیں کچے صحن میں لے گئیں اور کہا دیکھو آج میں نے دو ٹنکیاں پانی سے بھرلی ہیں ...... بالکل موتی کی طرح! ڈھیروں کپڑے دھل جائیں گے، تین دن سے پانی بالکل بند تھا اور لوگ بوند، بوند کو ترس گئے تھے، یہ دو ٹنکیاں انہوں نے برآمدے کے پرنالے کے نیچے رکھ کر پانی سے بھری تھیں۔ انہیں دیکھ، دیکھ کر یہ بی بی اس قدر خوش ہو رہی تھی کہ گویا کوئی خزانہ مل گیا۔ یہ دکھانے کے لیے کہ دونوں لبالب بھری ہیں، انھوں نے لالٹین اپنے چہرے تک اٹھائی تو مانگ میں ایک سفید بال نظر آیا جو اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پانی اولے کی طرح ٹھنڈا ٹھار اور موتی کے مانند جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ ہمیں اس میں اپنا چہرہ نظر آیا۔

مفلسی میں جوتا گیلا

گھر کی ساری کائنات چار پائیوں پر محفوظ کر لی گئی تھی۔ بچے ایلومینیم کی پتیلی کو تیرتا ہوا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ مٹی کے چولھے سے پانی ابل رہا تھا۔ دیکھا کہ آج پیروں پر ورم نہیں ہے۔ اتنی دیر ٹھنڈے پانی میں رہنے سے تلوے اتنے گورے ہوگئے کہ ہمیں شبہ ہونے لگا کہ کسی اور کے تو نہیں آگئے۔ سلوٹیں پڑنے سے بقول گڈو میاں، کریپ سول بن گئے تھے۔ تھوڑی دیر میں نالا اتر گیا اور سارے گھر میں اجلی، اجلی ملائم مٹی کی دبیز تہہ چھوڑ گیا۔ بچے اپنے ننھے منے پیروں کے نشان دیکھنے کے لیے اس پر خوب چلے۔ بالکل ایسے ہی بقدم خود نشان پلنگ کی چادر پر بھی تھے مگر وہ زیادہ واضح اور دیرپا تھے۔ سونے سے پہلے ہم نے دونوں جوتوں کو فیتے سے باندھ کر لالٹین کی گردن میں ہار کی طرح لٹکا دیا تا کہ صبح تک سوکھ جائیں۔

صبح ساڑھے چار بجے بجلی کے کڑکنے سے آنکھ کھلی تو کمرے میں چمڑا جلنے کی چراند پھیلی ہوئی تھی۔ اٹھ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ جو جوتا گلوب کے ٹوٹے ہوئے رخ پر تھا۔ اس کی ایڑی کے اوپر کا پشتہ جل کر اب پشاوری چپل بن گیا ہے۔ ہم لالٹین اور جوتا بجھا کر ایسے سوئے کہ صبح پونے سات بجے آنکھ کھلی۔ اس وقت تک بیوی ہمارے کپڑوں پر استری کر کے اپنے اسکول پڑھانے جا چکی تھیں۔ کپڑوں پر ایک پرچہ رکھا ملا جس پر لکھا تھا کہ رات میں تمہیں بتا نہ سکی۔ ڈاکٹر نے مجھے یرقان بتایا ہے۔ خواہ مخواہ ڈھیر ساری دوائیں اور انجکشن لکھ مارے ہیں۔ میں واپسی میں پاکستان چوک کے ہومیو پیتھ ڈاکٹر سے دوا لیتی آؤں گی۔ زرد رنگ تمہارا فیورٹ (پسندیدہ) رنگ بھی تو ہے۔

☆☆☆



بہنوں کی محفل

مدیرہ

خط کتابت کے لیے پی او باکس 662 جی پی او کراچی 74200 ای میل: jdpgroup@hotmail.com

پیاری پاکیزہ بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ

تمام تعریفیں اس رب العزت جل شانہ کو زیبا ہیں جو ہمارا اور کل عالمین کا پروردگار ہے۔ وہ وحدہ لاشریک ہے......اور کروڑ ہا درود وسلام رحمتہ اللعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کہ جن کی آمد سے جہالت وظلمت کے اندھیرے چھٹے اور دنیا میں حق کا بول بالا ہوا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ ہم سب کو ایمان کی قوت وپختگی کے ساتھ دونوں جہاں میں سرخروئی نصیب فرمائے اور اپنے کنزِ خاص سے وہ سب کچھ عطا فرمائے جو ہمارے حق میں بہتر ہو (الٰہی آمین)

☆☆☆

کچھ باتیں اپنی بہنوں سے

پیاری بہنو سلام اور پُرخلوص دعائیں لیے آپ کی اس پیاری محفل میں پھر حاضر ہوں، بہنو! پچھلے دنوں ہماری نامور مصنفہ، ناول نگار اور شاعرہ ڈاکٹر نگہت نسیم آسٹریلیا سے پاکستان آئیں تو ان کے اعزاز میں کئی محفلیں منعقد کی گئیں جس میں سے صبیحہ شاہ کی طرف سے دی گئی پارٹی میں، میں بھی شریک تھی۔ نگہت نسیم کی باغ وبہار شخصیت اور ان کی شگفتہ باتوں سے محفل گل وگلزار رہی اور ان کی منفرد طرز کی شاعری اور منظوم دعائیں سن کر تو بہت لطف آیا۔ امید ہے جلد ہی مجھے ان کی یہ دونوں کتابیں مہیا ہو جائیں گی، انشاءاللہ!

جب بھی کبھی رائٹرز کا اجتماع ہوتا ہے، سب ہی ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوتی ہیں، خوب باتیں ہوتی ہیں، سب ایک دوسرے کی کاوشوں کو سراہ رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ ایسے خوشگوار مواقع جلدی، جلدی ملا کریں اور جناب صبیحہ شاہ اور غزالہ رشید کی میزبانی بھی خوب لاجواب رہی۔ نگہت نسیم اور غزالہ رشید دونوں کو ان کی کتابوں کی تقریب اجرا پر دلی مبارک باد......کچھ دن پہلے امینہ عندلیب کا فون آیا جس نے اپنی بیماری بھلا کر معراج صاحب اور ان کی بہن کی خیریت معلوم کی۔ اس کی محبت اور خلوص کے جواب میں میرے پاس اس کے لیے ڈھیروں دعائیں ہیں......ابھی تک بہنیں انجم انصار کو دی گئی پارٹی پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہی ہیں جن کو بلایا نہ جاسکا اور جو بہنیں بلاوے کے باوجود نہ آسکیں وہ اپنے نہ آنے پر افسوس کا اظہار کر رہی ہیں تو پیاری بہنو! انشاءاللہ صحت وزندگی رہی تو ایسی بہت سی تقریبات ہوں گی اور آپ سب لوگ شرکت کریں گے۔ پاکیزہ سے وابستہ تمام بہنوں سے امید کرتی ہوں کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں ہمیشہ نیک جذبات اور مثبت رائے رکھیں گی......وسوسے ڈالنا شیطانی عمل ہے اور آپ تمام بہنیں اس سے دور ہی رہا کریں تاکہ نہ صرف آپ کی اپنی زندگی بلکہ دوسروں کی زندگی بھی خوشگوار رہے۔

جو بہنیں معراج صاحب اور ان کی بڑی بہن کی صحت کے لیے خصوصی دعائیں کرتی رہیں اور مجھ سے خیریت دریافت کرتی رہیں ان سب کا بے حد شکریہ......میری بھی دعائیں آپ سب کے ساتھ ہیں......انشاءاللہ اگلے ماہ پھر ملیں گے۔

اللہ نگہبان......!

دعاگو عذرا رسول......!

عزیز پاکیزہ قارئین! اس ماہ بہار رت کے حوالے سے آپ کو بہت کچھ پڑھنے کو ملے گا اور اس کے ساتھ، ساتھ آپ کو یہ بھی بتاتے

چلیں بلکہ آپ آگاہ ہی ہیں کہ ماہ اپریل، مئی پاکیزہ کے سالگرہ نمبرز ہوں گے تو اس حوالے سے اپنی نگارشات جلد سے جلد بھیج دیں اور اپنے دیرینہ قارئین کے لیے خاص طور پر سوالنامہ بھی ترتیب دیا گیا ہے کیونکہ اکثر بہنیں کہہ رہی ہوتی ہیں کہ ہم عرصہ تیس، چالیس سال سے پڑھ رہے ہیں۔ اب تو ہمارے بچوں کے بچے بھی پڑھتے ہیں۔ بہنو کسی نئی یا پرانی رائٹرز کے لیے کوئی پیار بھرا، پُرخلوص پیغام، سلام دینا چاہیں تو اس کے لیے پاکیزہ صفحات حاضر ہیں۔ یہ سالگرہ نمبر انشاء اللہ بہت خاص ہوگا۔ بہتر ہے اپنے پرچے ابھی سے بک کروالیں۔ جن بہنوں کو پرچہ ملنے میں دشواری ہے تو اپنے علاقے کے بک اسٹال وغیرہ کا فون نمبر، پتا بھی ضرور بتائیں۔ ویسے تو پاکیزہ صوابی، تیمر گراں، کوہاٹ، مردان، ژوب، میلسی، چمن، خضدار، کشمیر، کاغان، گدوال، ہری پور بلکہ پورا پاکستان پڑھتا ہے جس کا ثبوت ان علاقوں سے آنے والے خطوط، ای میلز اور ٹیلی فون کالز ہیں۔ یہ تو صرف پاکستان کا ذکر ہے۔ پوری دنیا سے قارئین کا رابطہ کرنا بلاشبہ بے حد خوش آئند ہے، ارے ہمارے سندھ اور پنجاب کے علاقوں سے تو خیر بہت قارئین ہیں مگر یہاں تو ذرا دور دراز علاقوں کا لکھا ہے۔ جیتی رہیں تمام بہنیں اور اسی طرح ٹیلی فون، ای میلز اور خطوط کے ذریعے اپنی حاضری کو ممکن بناتی رہیں...... اللہ پاک ہم سب کو باایمان رکھے...... خوش باش رکھے، اور دوسروں کا دکھ درد محسوس کرنے اور اسے بانٹنے کا شعور عطا کرے، کتنی خوب صورت بات ہے کہ خوشیاں بانٹنے سے بڑھتی ہیں جبکہ غم بانٹنے سے ہلکے پڑ جاتے ہیں اور یہ اسی صورت ہوتا ہے جب آپ ایک دردمند دل رکھنے والے سچے مسلمان عملی طور پر بھی ہوں۔

ماہنامہ پاکیزہ میں رابطہ کرنے کے لیے نمبرز نوٹ فرمالیں۔

03316266612,021.35386783.021.35802552.Ext:122.107 ۔ موبائل پر میسج کرنے کی صورت میں اپنا نام اور شہر ضرور لکھا کریں۔ ہر دفعہ پوچھنا پڑتا ہے اب اتنے ہزاروں نام (save) کرنا تو ممکن نہیں ہے ناں اگر ایک دفعہ نام محفوظ کر بھی لیا تو اگلی دفعہ اک نئے نمبر سے میسج آجاتا ہے خدارا ایک ہی نمبر سے کیا کریں۔ اپنی آسانی کے ساتھ، ساتھ دوسروں کے لیے بھی آسانیاں پیدا کیا کریں...... شکریہ۔

☆☆☆

اور حسب روایت نت نئی خبروں اور سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے قبل ایک بار خلوص دل سے درود ابراہیمی اور اس کے بعد تین بار آیت کریمہ ضرور پڑھ لیں اور اپنی دعاؤں میں اپنے پیاروں کے ساتھ، ساتھ تمام اہل وطن کو بھی یاد رکھیں۔ اللہ رب العزت عالم اسلام کی تمام پریشانیوں کو رفع کرے اور تمام مسلمانان عالم کو کامیابی نصیب ہو۔ (الٰہی آمین)

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ نامور مصنفہ غزالہ رشید ماشاء اللہ صاحب کتاب ہوگئی ہیں، پچھلے دنوں آن لائن روزنامہ عالمی اخبار کے زیر اہتمام غزالہ کی کتاب نہاں اور عیاں، مصنفہ دلشاد نسیم کی زیر لب اور مصنفہ اور شاعرہ ڈاکٹر نگہت نسیم (مقیم آسٹریلیا) کی ادبی کاوشوں، دعاؤں کے چراغ اور زاد عشق کی تقریب اجرا منعقد ہوئی۔ جس میں ادب دوست حلقے نے ایک بڑی تعداد میں شرکت کی۔ اسی تقریب میں شاہین اشر کی کتاب چراغ در چراغ بھی منظر عام پر آئی۔ ڈاکٹر نگہت نسیم جو میڈیکل ڈاکٹر ہونے کے ساتھ، ساتھ مصنفہ، شاعرہ اور مدیرہ بھی ہیں کی آسٹریلیا سے آمد ادبی حلقوں کے لیے دل خوش کن ثابت ہوئی۔ انہی کتب کے سلسلے کی کئی تقریبات کراچی کے علاوہ لاہور، ملتان، فیصل آباد اور اسلام آباد میں بھی منعقد ہوئیں۔

☆ ڈاکٹر نگہت نسیم کی آمد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریڈیو پروڈیوسر، براڈ کاسٹر سیما رضا نے بھی ریڈیو پاکستان کراچی میں نگہت صاحبہ کے ساتھ کئی پروگرام ریکارڈ کیے۔

☆ مصنفہ صبیحہ شاہ نے ڈاکٹر نگہت نسیم اور غزالہ رشید کے اعزاز میں ایک پُروقار تقریب SCLD...... School of Cognition and language Development میں رکھی جہاں عذرا رسول صاحبہ ہم (نزہت اصغر) اور آمنہ حماد بطور خاص مدعو تھیں۔ یہ اسپیشل ایجوکیشن کا اسکول صبیحہ شاہ کی بیٹی نور العین اور بہو سحر یاسر بڑی کامیابی سے چلا رہی ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک رفاعی اور سماجی خدمت ہے، یہیں پر غزالہ رشید بھی اعزازی طور پر اردو اور اسلامیات ان پیارے، پیارے بچوں کو پڑھا رہی ہیں۔ اس گیٹ ٹو گیدر میں دیگر مہمانوں میں خولہ عرفان، سیما مناف، ناہید فاطمہ حسنین، سیما رضا ردا، مسرت بانو، سنبل، سائرہ غلام نبی، ریحانہ علی، فرح اسلم اور فرح انیس شامل تھیں۔ تقریب کے بعد... پُرتکلف چائے ناشتے سے حاضرین خوب محظوظ ہوئے۔

☆ تسنیم کوثر، کراچی کے بیٹا، بہو کی اس ماہ شادی کی سالگرہ ہے اور جناب تسنیم ایک عدد پیاری سی پوتی کی دادی بھی بن گئی ہیں (بہت مبارک ہو)

☆ ہماری پیاری مصنفہ عالیہ حرا کی بڑی بیٹی کی ماشاء اللہ نسبت طے پاگئی اور شادی بھی انشاء اللہ اسی سال ہوگی۔ (بہت، بہت مبارک باد)

☆ مستقل قاری ارم کمال، فیصل آباد پیارے سے نواسے کی نانی جان بن گئی ہیں۔ (مبارک ہو)

☆ مصنفہ شیریں حیدر کے پیارے بیٹے کی شادی اسی ماہ ہونا قرار پائی ہے۔ (مبارکاں)

☆ مستقل قاری عنبر وسیم، گوجرانوالہ ان دنوں اپنے سی ایس ایس کے امتحانوں میں مصروف ہیں۔ (اللہ پاک عنبر کو کامیاب کرے آمین!)

دعائے صحت کے لیے التماس ہے

☆ مصنفہ ارجمند عقیل پچھلے کئی ماہ سے شدید بیمار تھیں اب الحمدللہ کافی بہتر ہیں۔

☆ مستقل قاری نادیہ، راول پنڈی کے بیٹے کے لیے دعائے صحت اور نادیہ کی چھوٹی خالہ بھی کافی بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ بہنوں کی لاڈلی امینہ عندلیب، سلانوالی کی طبیعت ان دنوں کافی ناساز ہے مگر اس کے باوجود امینہ اپنی دعاؤں میں تمام بہنوں کو یاد رکھے ہوتی ہیں۔ (اللہ صحت دے تمہیں، پیاری امینہ)

☆ ہماری پیاری ہردلعزیز آپا ذکیہ بلگرامی کی طبیعت ان دنوں کافی ناساز ہے وہ پھر بھی تمام پاکیزہ بہنوں کو دعاؤں میں یاد رکھتی ہیں ان تک سارے پیغامات پہنچ جاتے ہیں، آپ لوگ ان سے بات کرنے پر اصرار نہ کیا کریں۔ اللہ تعالیٰ ذکیہ آپا کا سایہ ہم سب کے سروں پر قائم رکھے، الٰہی آمین۔ یہ ہم بھی اور وہ بھی جانتی ہیں کہ سب بہنیں ان سے کتنی عقیدت و محبت رکھتی ہیں۔

☆ مصنفہ اور شاعرہ پروین عذرا تشنہ کو بھی آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

☆ مستقل قاری نسا آصف، عارف والہ ان دنوں بیمار ہیں۔

☆ پاکیزہ قاری ہما علی، اسلام آباد کی والدہ محترمہ کے لیے دعائے صحت ضرور کریں۔

☆ بہبود ایجوکیشن اسکول کی پرنسپل حسینہ ممتاز شیخ کی آج کل طبیعت ناساز ہے۔

پروردگار عالم تمام بیماروں کو صحت عاجلہ و کاملہ عطا فرمائے۔ آمین......

انتقال پُرملال

☆ نامور اداکار اور صداکار قاضی واجد، برضائے ربی انتقال کر گئے۔

☆ نادیہ، راول پنڈی کی بڑی خالہ کا برضائے ربی انتقال ہوگیا۔

☆ مستقل قاری نائلہ بلیغ الرحمن، بہاول پور کے شوہر انتقال کر گئے۔

☆ غزالہ رشید کے کزن کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔

☆ مصنفہ نگہت غفار کی جواں سال بیٹی ٹائیفائیڈ بگڑ جانے کے سبب انتقال کر گئیں۔ مرحومہ کے تین کم سن بچے ہیں۔ اللہ نگہت غفار کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔

اللہ پاک تمام مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین۔

☆ اب آتے ہیں آپ بہنوں کے کھٹے میٹھے خطوط کی جانب......

ڈاکٹر ممتاز ضیا، کراچی سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے میں نزہت تم نے بہت قابل قدر واقعہ بیان کیا ہے۔ کاش ہمارے حکمرانوں کو بھی اللہ تعالیٰ سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ عذرا رسول کی باتیں اور ذکیہ بلگرامی کا ایمان افروز مضمون تبصرے سے بالاتر ہے۔ رفعت سراج اچھا لکھ رہی ہیں، رفعت سے گزارش ہے کہ پرنس کو انسان ہی رہنے دیں کوئی ماورائی مخلوق نہ بنائیں اور یہ کیا کہ بیچاری زارا کو بالکل ہی بیچارہ کردیں۔ عقیلہ حق کی تحریر بہت اچھے موضوع پر تھی۔ حیا بخاری کی گوارا تحریر ہے۔ امرت بہت اچھا جارہا ہے پر کبھی ماضی، کبھی حال ذرا غور کرنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی ماشاء اللہ بہت بڑی فیملی کی کہانی ہے۔ عورت کہانی دل کو لگی۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر نے مزہ نہیں دیا ایسے لگا یہ پہلے بھی چھپ چکی ہے اگر میں غلط ہوں تو معذرت (ہاں کبھی، کبھی کسی واقعے کا لگتا ہے مگر ایسا ہے نہیں) سعدیہ رئیس نے اچھا لکھا۔ طیبہ عنصر نے بہت

مایوس کیا یہ ٹی وی پر ڈراما بھی چل چکا ہے، باقی کہانیاں بس گوارا تھیں۔ شائستہ زریں کا کیا گیا شہزادو شیخ کا انٹرویو بہت اچھا لگا۔ انجم کے اعزاز میں دی گئی شام کی کوریج عظمٰی نے بہت اچھے انداز میں لکھی جو اسی کا خاصہ ہے، یادگار تقریب تھی مزہ آگیا۔ عذرا جیو اور اسی طرح لوگوں کو خوش کرتی رہو۔ بہنوں کی محفل میں عذرا سے مل کر اچھا لگتا ہے، ویسے بھی بہت پیاری پیاری بہنوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔'' (جی ہاں بالکل)

☆ عنیزہ سید، سیالکوٹ سے۔ ''پاکیزہ ماشاء اللہ بہت خوب اچھا جارہا ہے، اس دفعہ تو کمال ہو گیا۔ ناول تو چلیں اچھے ہیں مگر تمام مختصر کہانیاں بے حد عمدہ اور الگ، الگ موضوعات لیے ہوئے تھیں۔ یقین کریں نزہت مجھے تو دلکش اب بھی یاد آتا ہے۔ دوبارہ سے شروع کر دیں ناں (جی بس دعا کریں) میری بھی کافی مصروفیت چل رہی ہے۔ انشاء اللہ پاکیزہ میں جلد ہی کوئی کہانی دوں گی پاکیزہ سے برسوں کا ناتا ہے اور ایسے معیاری رسالے سے جڑے رہنے کو ہی دل چاہتا ہے۔ (بہت شکریہ عنیزہ یہ آپ کی محبت ہے) انجم انصار کی تقریب کا احوال پڑھا ظاہر ہے ان کا جانا محسوس تو ہوا مگر آپ کو دلکش کا تجربہ تھا تو پاکیزہ کو بھی اچھا سنبھال لیا۔'' (عنیزہ یہ آپ سب رائٹرز اور قارئین کا تعاون ہے۔)

☆ سیمارضا، کراچی سے کچھ وضاحتیں کر رہی ہیں...... ''گزشتہ شمارے میں میرے افسانے سائن ان سائن آؤٹ کے حوالے سے جو ایک قاری بہن نے اعتراض اٹھایا ہے۔ اس پر تہِ دل سے شکر گزاری کے ساتھ انہیں یہ بتانا ضروری ہے کہ کسی بھی لکھاری کا کام گزرے ہوئے واقعات کو قلم بند کرنا نہیں ہوا کرتا بلکہ وہ معاشرے میں پڑ جانے والے ایسی روایتوں پر بھی تنبیہی نوعیت کی کوئی تحریر، افسانہ یا مضمون لکھتا ہے جس سے اس منفی روایت کی حوصلہ شکنی کی جاسکے یا مثبت روایت کو دوام پہنچایا جائے۔ سائن ان سائن آؤٹ ایک ایسی ہی روایت کی جانب تنبیہی انداز میں لکھا ہوا افسانہ ہے جو ہمارے معاشرے میں بہت تیزی سے پھیل رہی ہے۔ یہ افسانہ اس مسئلے کے ضرر رساں ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ جہاں تک بات انٹرنیٹ اور ٹیکنالوجی کی سہولیات کی ہے جو ہمارے ملک میں حالات کے پیشِ نظر مخصوص دنوں یعنی عید، محرم، ربیع الاول یا سیکورٹی کے مسائل کے باعث انٹرنیٹ اور موبائل سگنل کا منقطع کرنا معمول کی بات ہے۔ اس میں رابطے میں نہ رہنے والے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر اس افسانے میں ایک طرح کا سبق دیا گیا ہے کہ خدارا ٹیکنالوجی کو ضرور استعمال کریں...... لیکن اس انداز سے کہ جس میں ان کی اپنی یا دوسروں کی زندگی اور گھریلو ماحول کے لیے کوئی مسئلہ نہ بنے۔'' (شکریہ، سیمارضا...... آپ کی وضاحت کا)

☆ ہما بیگ، کراچی سے۔ ''جنوری کا نہیں، بلکہ فروری کا، بلکہ دسمبر کا بہتر سے بہترین ہوتا رسالہ ملا۔ ماشاء اللہ نزہت اصغر کی محنت رنگ لا رہی ہے، رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ گھس جانے کے بعد...... یقیناً لکھاری بھی اس محنت میں حصے دار ہیں (جی بالکل) طیبہ عنصر مغل! بیٹا رانی بہت حساس موضوع پر قلم اٹھایا اور آخر تک اس کو ذمے داری سے نبھایا، کمال انداز ہے، لگتا ہے اپنی ساری صلاحیتیں بروئے کار لا کر ایک شاہکار افسانہ قارئین کی نذر کیا ہے۔ ایک جملہ جن کو اللہ نے صاحبِ اولاد نہیں کیا تو اس کی مصلحت پر صبر کریں۔ کتنی خوب صورت اور مکمل بات...... کاش ہم اللہ کی مصلحت پر راضی بہ رضا ہو سکیں۔ اس موضوع پر میں آپ سب سے مذہبی نقطۂ نظر شیئر کرنا چاہوں گی۔ ہمارے مذہب میں بچہ اڈاپٹ کرنے کو سراہا نہیں گیا۔ اگر بچہ لڑکا ہے تو گود لینے والی ماں اس کے لیے نامحرم ہے اور بچی ہے تو باپ نامحرم ہے۔ طلوعِ اسلام کے بعد باری تعالیٰ نے اپنے پیارے حبیبؐ کے ذریعے قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے اعلیٰ اخلاقی اقدار کے وہ روشن اصول عطا فرما دیے جن پر جب بھی عمل پیرا ہوئے مثالی معاشرہ وجود میں آیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن حارثؓ کو اپنا بیٹا بنایا۔ پھر جو واقعات ہوئے ان سے یہ ثابت ہوا کہ منہ بولا بچہ سگا بچہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی ولدیت نہیں تبدیل ہو سکتی، جائداد میں بھی اس کا حصہ نہیں ہو سکتا۔ تفصیل کے لیے سورۂ احزاب کی آیت نمبر چار، پانچ اور 37 کا حوالہ حاضر ہے۔ متبنّیٰ (لے پالک) کو قرآن میں ناپسند بھی نہیں کیا گیا اور پسند بھی نہیں کیا گیا اس کے نتیجے میں جو مسائل پیدا ہوتے ہیں ان کو طیبہ عنصر مغل نے اپنی کہانی میں بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔'' (مستند معلومات فراہم کرنے کا شکریہ)

☆ تسنیم ماپارا، کراچی سے۔ ''اداریہ بہت مفید معلومات لیے ہوئے تھا۔ بچوں کی تربیت کا جو نکتہ اٹھایا بہت خوب اور آج کے زمانے میں بہت ضروری، عظمٰی نے محفل کا حال بہت خوب صورت انداز میں بیان کیا۔ ویل ڈن عظمٰی۔ باقی افسانوں میں عقیلہ حق، سعدیہ رئیس، ہما بیگ ایک سے بڑھ کر ایک تمام افسانے...... شیریں حیدر سے کہیں امرت پر ظلم کرنا اب چھوڑ دیں۔ روز بروز پاکیزہ ماشاء اللہ مزید ترقی کی طرف گامزن ہے۔ اللہ سب کو خوش رکھے۔ (اللہ آپ کو بھی خوش رکھے آئندہ تفصیلی تبصرہ لکھیے گا)

☆ تسنیم منیر علوی، دبئی سے۔ ''جنوری 2018ء کا پاکیزہ زیرِ نظر ہے، اسما طاہر کی کہانی تاراج نے دل کے تاروں پر انگلی رکھ دی۔ اتنی سفاک اور ننگی حقیقت دکھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں، واقعی آج کے والدین معصوم کلیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھ رہے ہیں، وہ معاشرے کا ناسور ہے، بہت جاندار کہانی لکھی گئی۔ رواج شمع تفسیر کی ایک اچھی کہانی تھی، رسم و رواج میں جکڑ کر ہم بے رحمی سے معاشرے کو تباہ کر رہے ہیں۔ اس موضوع پر پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، شمع نے بھی اپنے حصے کی شمع روشن کی...... اسما قادری کا افسانہ حد ایک فکر انگیز کہانی ثابت ہوا۔ کہانی نے اچھا تاثر چھوڑا۔ قدر کو ایک کامیاب کاوش کہا جا سکتا ہے کو کہ اس سے پہلے بھی اس ناقدری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور شاید آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ بانو کے نام مختصر مگر جامع کہانی ہے اس لیے افسانہ بوجھل ہونے سے بچ گیا۔ الفاظ کا چناؤ مصنف نے بڑی سوچ سمجھ کر کیا۔ سیمارضا ردا ہماری بہت پیاری اور کہنہ مشق لکھاری ہیں۔ انہوں نے معاشرے کے نازک مسائل پر بڑی کاری ضرب لگائی...... انٹرنیٹ، سائبر کرائم کی کرشمہ سازی جانے کتنی زندگیوں کو جہنم بنائے گی۔ مگر فدائیانِ موبائل کو کون سمجھائے۔ ہاجرہ ریحان افسانوں کی دنیا کا نیا نام نہیں خاموش سمندر میں قنوطیت کے ساتھ استقامت کا بھی پیغام پوشیدہ ہے۔ ''نارنجی سورج یقیناً امریکا میں بھی ہوتا تو ہوگا مگر وہ اپنا نہ ہوگا'' اس جملے کی گہرائی میں بڑا رمز پوشیدہ ہے، واہ ہاجرہ جملوں کی کاٹ نے بہت دور رس نتائج مرتب کیے۔ فصلِ بہار، امید صبح بھی اچھے افسانے تھے۔ ارے ہاں ہماری غزالہ رشید پاکیزہ میں عرصے کے بعد نظر آئیں۔ ان کے افسانے پر تبصرہ چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ (اس دفعہ تو ان سے تفصیلی ملاقات بھی کر لی ہو گی آپ نے) مگر ہمیں یہ کہنے دیجیے ہیرو کا بے رحم رویّہ اور ہیروئن ایک نرم رو برسات سہی...... جس نے قدم، قدم پر رشتہ اور خاندان کا بھرم رکھا۔ لیکن غزالہ یہ کچھ زیادہ نہیں ہو گیا منیب صاحب بڑے طمطراق سے حلقۂ دوستاں میں کہتے پھریں کہ منگنی فائزہ نے ختم کر دی...... یہاں فائزہ کی خاموشی؟ ایک پڑھی لکھی لڑکی ایک عورت کا استحقاق مجروح ہوتا محسوس ہوا۔ جانے کیوں...... معذرت بے انتہا معذرت ہمارے خیال میں آج تک کے لیے اتنا کافی ہے پہلی ہی انٹری اتنی طویل ہونے پر ساتھی کہیں برہم نہ ہو جائیں۔'' (بہت شکریہ تفصیلی تبصرے کا)

☆ سعدیہ رئیس، کراچی سے۔ ''بے حد خوب صورت اداریے کے ساتھ فروری کا پاکیزہ پڑھا اور تبصرہ لکھنے سے قلم کو نہ روک سکی۔ کوشش تو یہ تھی کہ جنوری کے شمارے پر تبصرہ بھیجوں گی مگر جو اللہ کی مرضی...... اداریہ زبردست تھا آج کے معاشرے کے لحاظ سے اصلاحی اور سبق آموز اداریہ تھا۔ دعا ہے کہ یہ صرف پڑھنے کی حد تک نہ رہے پڑھ کر سمجھا بھی جائے اور عمل درآمد بھی کرایا جائے۔ ہم آج کل کی نوجوان نسل کو برا تو کہتے ہیں مگر پھر یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ ان کی تربیت کرنے والے کہاں سو رہے ہیں آخر۔ خوب صورت تصاویر سے آراستہ احوالِ تقریب عظمٰی آفاق کی زبانی پڑھ کر دس جنوری کی وہ خوب صورت شام یاد آگئی۔ جہاں عذرا جی کی پُرخلوص میزبانی میں تمام مصنفین کو مل بیٹھنے کا بہترین موقع میسر آیا۔ انجم انصار کے ساتھ ایک یادگار شام منانے کے بہانے سب مصنفات یکجا ہوئیں اور سب ہی کو یقیناً بہت مزہ آیا۔ عذرا رسول کی محبت اور توجہ قابلِ ستائش ہے کہ وہ اپنی انتہائی ذاتی پریشانیوں کے باوجود مصنفات کو وقت بھی دیتی ہیں اور اہمیت بھی۔ پاکیزہ کی امتیازی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں تمام مصنفات کے لیے اپنائیت ہے۔ (جی مصنفات تو ہوتی ہی قابلِ قدر ہیں) افسانوں کی لمبی لسٹ میں ابھی عقیلہ حق کا اگر میں ہوتا اور ماہ وش طالب کا حلال تربیت پڑھا ہے۔ اچھی متاثر کن تحریریں ہیں، یہاں طیبہ عنصر کو بھی بطورِ خاص سراہوں گی بہت نازک اور گہرے مسئلے پر قلم اٹھایا ہے، رہا تو محرم راز میرا بہت خوب صورت تحریر...... شمع ہدایت بہترین سلسلہ ہے، بہنوں کی محفل میں عذرا رسول کی مستقل حاضری بہت اچھی لگ رہی ہے۔ (جی یہ تو ہے) نزہت نے اس محفل کو اسی رنگ اور رونق کے ساتھ جما رکھا ہے ماشاء اللہ۔'' (بہت شکریہ سعدیہ، تبصرے کے لیے وقت نکال ہی لیا)

☆ تسنیم کوثر، کراچی سے۔ ''دلکش اور خوب صورت تحریروں سے سجا فروری کا شمارہ پڑھ کر ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر انجم انصار کے اعزاز میں دی گئی تقریب کا احوال اور تصاویر نے پاکیزہ میں چار چاند لگا دیے۔ بلاشبہ انجم باجی گریس فل اور شاندار شخصیت کی مالک ہیں۔ اس دفعہ افسانوں میں دل کے کھوٹے، صدف آصف کا افسانہ بازی لے گیا۔ اتنی خوب صورت اسٹوری لکھنے پر مصنفہ مبارک باد کی مستحق ہیں، حلال تربیت، ماہ وش طالب نے بھی بہتر کوشش کی ہے، عقیلہ حق کا... اگر میں ہوتا یہ افسانہ بس مناسب تھا، زیادہ متاثر نہیں کر سکا۔ اس کے علاوہ محبت میری جنت ہے و دیا مسکان نے بہت خوب لکھا ہے۔ یہ کہاں بچیں کہ دل ہے، اسٹوری نکھر تو رہی ہے مگر رفعت سراج سے گزارش ہے

کہ پلیز کہانی کو تیزی سے آگے بڑھائیں ورنہ یکسانیت کا شکار ہو کر اس کا چارم ختم ہو جائے گا۔ (ارے جلدی، جلدی کرنے میں چارم ختم ہو جاتا ہے ناں اس لیے مصنفہ کو موقع تو دیجیے) اسی طرح امرت بھی اچھی لیکن مشکل ترین اسٹوری لگتی ہے۔ نہایت دھیان اور سمجھ سے پڑھنا پڑتا ہے، سچ نزہت اتنی ٹیپکل کہانی سرُ دکھا دیتی ہے۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی صاحبہ کی پُرنور تحریر بے مثال شاندار لگتی ہے میں نہایت دل سے سمجھ کر احترام سے پڑھتی ہوں۔'' (بہت نوازش)

✍ ارم کمال، فیصل آباد سے۔ ''میں کچھ عرصے کے بعد آپ سے مخاطب ہوں کیا میری کمی محسوس کی۔ (جی بالکل) میں اپنی بیٹی کرن کے پاس کراچی گئی ہوئی تھی اللہ کے فضل و کرم سے میرا دوسرا نواسہ فرقان اس دنیا میں رونقیں بکھیرنے آیا ہے (مبارک باد) کچھ دن پہلے ہی میں کراچی سے واپس آئی ہوں۔ پاکیزہ سے جدائی برداشت نہیں ہوتی زندگی میں کافی کچھ مسنگ لگتا ہے، میری طرف سے تمام بہنوں کو بہار نمبر کی مبارک باد......'' (چھوٹے سے خط کا بھی شکریہ)

✍ فریدہ فری، لاہور سے۔ ''آج دو تاریخ کو پاکیزہ ملا آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر اپنی شاعری دیکھی مگر اس دفعہ کچھ بھی نہیں تھا نہ ہی تبصرہ تھا اور پھر یاد آ گیا کہ مجھے تو بہت سخت فلو تھا اٹھ کر بیٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔ کچھ بھی نہیں لکھا تھا۔ (ڈیئر بھی، بھی تو آپ کی دو غزلیں بھی لگی ہوتی ہیں، اچھا اب آپ کیسی ہیں؟) اپنی ہر دلعزیز رائٹروں کے افسانے پڑھ کر مزہ آ گیا واہ نزہت جبیں، طیبہ عنصر مغل، صدف آصف، عقیلہ حق، یہ میری فیورٹ رائٹرز ہیں، ویسے ہما بیگ، ودیا مسکان، اور حرا قریشی کے افسانے بھی لاجواب تھے۔ سویرا فلک اور حنا اصغر کی تحریریں بھی خوب تھیں۔ پیاری بھابی تمہارا تبصرہ پڑھ کر تو دل خوش ہو جاتا ہے پروین بھابی، تمہیں ہماری غزل پسند آئی شکریہ اور طیبہ جی کا بھی شاعری پسند کرنے پر بے حد شکریہ۔ اچھا اب زیادہ لکھا نہیں جا رہا۔ انجم انصار باجی کی صحت یابی کی بہت دعائیں مانگیں۔ وہ ہمیں بہت یاد آتی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں لمبی اور صحت مند زندگی دے، آمین۔'' (آپ کا پیغام ان تک پہنچا دیا تھا، اب اگلی دفعہ خوب تفصیلی تبصرہ لکھیے گا۔)

✍ شانزہ اعوان، ترنول، راول پنڈی سے۔ ''میں پاکیزہ سترہ سال سے پڑھ رہی ہوں مجھے اس میں لکھنے کا بے حد شوق تھا مگر لکھائی اچھی نہیں تھی (لکھائی پڑھنے کے قابل ہو بہت ہے) اب میری دوست اور میری استانی صاحبہ جن سے میری ملاقات تقریباً سات سال کے بعد ہوئی تو انہوں نے مجھے حوصلہ دیا کہ شانزہ تم لکھ سکتی ہو ہمت کرو خدا پر بھروسا رکھو خدا تمہیں کامیاب کرے گا میری دوست نے بھی مجھے حوصلہ دیا۔ مجھے لکھنے کا بہت شوق تھا میں اکثر لکھتی اور پھاڑ دیتی تھی آج ہمت کر کے روانہ کر رہی ہوں مجھے آپ کے تعاون کی اشد ضرورت ہے اگر آپ نے مجھے اس قابل سمجھا تو یقین مانیے میری زندگی کی یہ سب سے بڑی خوشی ہوگی۔'' (شانزہ آپ میں صلاحیت ہوگی تو ضرور مانی بھی جائے گی۔ لکھائی کا مسئلہ نہیں ہوتا، افسانے میں جان ہونی چاہیے)

✍ عطیہ ہدایت اللہ، پشاور سے۔ ''عرصہ دراز سے پاکیزہ کی قاری اور مصنفہ ہوں، (جی ہم جانتے ہیں عطیہ آپا) یہاں پشاور میں کم ہی رائٹرز ہیں مگر جو بھی ہیں جیسے شمیم فضل خالق وغیرہ سب ہی اپنا اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔ آج کل یہاں رائٹرز فورم کی صدر ہوں، کافی مصروفیت ہوتی ہے مگر پاکیزہ پڑھنا نہیں چھوڑتی (جی شکریہ) حالانکہ سوشل ورک میں بھی مصروف رہتی ہوں۔ ہم رائٹرز کی تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ معاشرے میں برائیوں کی نشاندہی کر کے ان کے حل بھی بتائیں (جی ہاں بالکل) اس مرتبہ ہما بیگ کی کہانی مختصر ترین مگر بہت اچھی لگی۔ قارئین کو چکرا کر چھوڑتی ہیں، جیتی رہو ہما...... اس کے علاوہ ناول بھی بہت اچھے جا رہے ہیں، انجم انصار کے بعد آپ نے بھی اچھا سنبھالا ہے۔ (بس یہ آپ لوگوں کا تعاون ہے)

✉ حنا بشریٰ، لاہور۔ آپ کی کہانی دل کی بستی ناقابل اشاعت باقی دو قابل اشاعت ہیں انشاء اللہ جلد ہی لگیں گی۔

✉ شمیم احمد، کراچی۔ امید ہے آپ کو بزم پاکیزہ کا انعام مل گیا ہوگا۔ آئندہ بھی حصہ لیتی رہیں۔

✍ تبسم حفیظ الرحمٰن، ممبئی، انڈیا سے۔ ''پہلے میں انجم انصار کو کبھی کبھی فون کر لیا کرتی تھی۔ اب آپ سے بھی بات ہوئی تو بہت اچھا لگا۔ پاکیزہ رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اس میں شامل تمام سلسلے بھی بہت پسند آتے ہیں۔'' (تبسم بہت شکریہ اتنی دور سے فون کرنے کا)

✉ عائشہ یوسف، راول پنڈی۔ ایک ذرا سا انتظار کر لو بیٹی، تحریر ضرور لگے گی، تم کوئی اور مختصر کہانی بھی ضرور بھیجو۔

✍ مسز شگفتہ ناصر، فیصل آباد سے۔ ''بھئی نزہت صاحبہ ہمیں پاکیزہ میں ضرور یاد رکھا کریں۔ یہ ہمارے گھر کا رسالہ ہے، میں پچھلے دنوں لٹریری فیسٹول میں مصروف رہی مصنفہ بشریٰ رحمٰن کے ساتھ بھی بہت اچھی نشست رہی۔ پاکیزہ خوب اچھا جا رہا ہے۔ انجم انصار کی تقریب کا احوال پڑھا۔ ان کا لہجہ بہت دوستانہ ہوتا تھا میں اکثر بات کرتی تھی۔'' (جی وہ اب بھی آپ سب کی دوست ہیں آپ اپنی سرگرمیوں سے ضرور آگاہ کرتی رہا کریں۔)

✉ بشریٰ ماہا، بدین۔ آپ کی اگلی کہانی بھی جلد ہی لگے گی۔

✉ اسما طاہر، راول پنڈی۔ انشاء اللہ آپ کی کہانیاں لگتی رہیں گی۔

✉ یمنیٰ ظفر، لاہور۔ تحریر کی سلیکشن اور اشاعت میں کچھ دیر تو لگ ہی جاتی ہے۔ آپ پاکیزہ پر تبصرہ بھی لکھیں۔

✍ نادیہ، راول پنڈی سے۔ ''باجی آپ سے بات کر کے بہت اچھا لگتا ہے، آپ بہت سکون سے ساری بات سنتی ہیں، میں انشاء اللہ اگلی دفعہ کراچی آ کر آپ سے ضرور ملوں گی (جی ضرور) بس میں اپنے بچے کی بیماری سے پریشان رہتی ہوں.... اس دفعہ باجی انجم انصار کی تقریب کا حال پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ تصویریں بھی بہت اچھی لگیں۔ (شکریہ) بس باجی سب بہنیں میرے مالی حالات بہتر ہونے کے لیے ضرور دعائیں کریں۔'' (جی بالکل آپ روحانی مشوروں سے استفادہ کریں)

✍ جبینا، کراچی سے۔ ''پچھلے چند ماہ سے رسالہ نہ پڑھ سکی تھی اس لیے چند دن پہلے پرانے پاکیزہ اکٹھے لے لیے۔ جولائی کے مہینے میں اپنی نظم میرے خدا کے نام سے دیکھی بہت خوشی ہوئی شکریہ...... یہ میری اپنی شاعری ہے پھر اگست میں، اپنی غزل پڑھی بہت مزہ آیا نوازش...... اب اپنا ایک تازہ افسانہ بھیج رہی ہوں۔ امید ہے آپ کے معیار پورا اترے گا۔ (جی پڑھ کر فیصلہ ہوگا) تمام پاکیزہ بہنوں کو سلام۔'' (وعلیکم السلام)

✍ انجم فاروق، لاہور سے۔ ''دلکش کے بعد اب آپ کو پاکیزہ ڈائجسٹ کو چلانے اور سنوارنے کی ذمّے داری سونپی گئی ہے۔ پاکیزہ ایک خوب صورت اور معروف جریدہ ہے۔ دلکش کی اعزازی کاپی مجھے ملتی رہی ہے۔ (جی آپ نے تو اس میں لکھا بھی تھا) یہ امر باعث مسرت ہے کہ اب آپ اپنی صلاحیتوں کا اظہار زیادہ بہتر طریقے سے کر سکتی ہیں۔'' (مختصر سے خط کا شکریہ)

✍ غزالہ عمران بھٹی، مرید کے سے۔ ''پاکیزہ ملتے ہی سب سے پہلے ذکیہ آپا کو پڑھا آنکھوں سے نہیں دل سے جس کا ہر لفظ دل پر اثر کرتا ہے، رفعت سراج میری پسندیدہ رائٹر ماشاء اللہ بہت خوب لکھ رہی ہیں، ان کی تصویریں بھی دیکھیں، کیا خوب پارٹی تھی ہم بھی اس میں شامل تھے۔ انجم آپی کے اعزاز میں دی گئی پارٹی اور اس میں بہت سی رائٹر کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انجم آپی کو صحت اور تندرستی دے۔ عظمیٰ، رضوانہ پرنس واقعی چیتی لگ رہی تھیں۔ میں جہاں بھی لفظ لدی پھندی دیکھتی ہوں عقیلہ حق فوراً ذہن میں آ جاتی ہیں، اللہ انہیں سلامت رکھے۔ عذرا آپی کے کیا کہنے سب سے ممتاز نظر آتی ہیں، اور عظمیٰ براؤن بالوں کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ نزہت جی آپ اسکارف بڑی خوب صورتی سے لیتی ہیں اور بہت ڈیسنٹ لگتی ہیں، اللہ آپ کو اور اس میں لکھنے والے اور تمام پڑھنے والوں کو سلامت رکھے (اللہ آپ کو بھی صحت و سلامتی سے رکھے) ہم سب تو آپ کو ایسے جانتے ہیں جیسے آپ ہماری فیملی ممبر ہیں۔ (جی کیوں نہیں) پاکیزہ میں اپنا نام دیکھا تو بہت خوشی ہوئی۔'' (جی کہانی کے بارے میں پڑھ کر جلد ہی مطلع کریں گے تھوڑا انتظار تو کریں)

✍ ملاحت ڈیفنس سے۔ ''فروری کا پاکیزہ اچھا تھا، ہر صفحہ توجہ سمیٹ لیتا ہے، میرا عشق صوفیانہ بہت اچھا لگا متاثر کیا حقیقت یہی ہے کہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کا سفر ہوتا ہے۔ عظمیٰ آفاق کا مخصوص انداز ہمیں بہت اچھا لگا۔ آپ کی کوشش اور محنت نظر آتی ہے۔ پاکیزہ واقعی بہت اچھا رسالہ ہے۔'' (بہت شکریہ)

✉ قانتہ رابعہ، گوجرہ۔ معذرت کہ آپ کا شہر غلط لکھ دیا گیا تھا۔ آئندہ خیال رکھیں گے، آپ کی تحریر تو ہوتی ہی لاجواب ہے، بہت اچھے موضوعات لیتی ہیں، خوش رہیں اور اپنی تحریروں سے نوازتی رہیں۔

✍ زندگی تنویر خلیل، گاؤں متھرا پختونخواہ سے۔ ''باجی میں بھی پاکیزہ کا مستقل حصہ رہنا چاہتی ہوں، آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے۔'' (آپ مراسلات کے ذریعے شرکت کرتی رہیں۔)

✍ خمیرا الاشاری، کھوڑ سے۔ ''پہلی دفعہ کال کی ہے باجی...... آپ نے انجم باجی کے جانے کے بعد بہت اچھے طریقے سے پاکیزہ سنبھال لیا کمی تو ظاہر ہے جانے والوں کی ہوتی ہی ہے مگر آپ نے کافی حد تک پوری کی ہے (بس کوشش

کررہے ہیں) پاکیزہ پورے کا پورا ہی لاجواب ہے۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ بچوں کی تربیت کے حوالے سے بھی کہانیاں دیا کریں۔ بلکہ کوئی الگ سے مضمون بھی دیا کریں۔(جی ضرور) میں پاکیزہ عرصہ دراز سے پڑھ رہی ہوں بس خط کبھی نہیں لکھا۔ آپ کا شکریہ کہ فون پر اتنی اچھی طرح بات کی۔" (پاکیزہ کی یہی خاص بات ہے کہ ہم اپنے قارئین کو بہت اہمیت دیتے ہیں، سراہنے کا شکریہ)

✉ آسیہ مظہر چوہدری، آزاد کشمیر۔ آپ کی کہانی تاحال نہیں ملی، رسالے کی پسندیدگی کا شکریہ۔

✍ سعدیہ، بنوں شہر سے۔ "باجی آپ کا پاکیزہ ہم سب ہی شوق سے پڑھتے ہیں، تقریب کا احوال پڑھا کاش میں بھی شامل ہوتی۔(اب احوال پڑھ کر اپنے آپ کو شامل سمجھو) میری سہیلیوں کو بھی بہت اچھا لگا۔ عقیلہ حق کا افسانہ اور تبصرہ دونوں بہت اچھے تھے۔ سب ہی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔" (شکریہ)

✍ آسیہ عامر، کراچی سے۔ "فروری کے شمارے میں انجم آنٹی کے اعزاز میں تقریب دیکھ کر دل چاہا میرا بھی کوئی بیان ہونا چاہیے جو عظمیٰ سے مس ہو گیا۔ انجم آنٹی کے بارے میں اتنا کہوں گی، جگ گھومیا تیرے جیسا نہ کوئی اور ایک بات یہ کہ بڑا ہی دل جلتا ہے جب پاکیزہ کے ستارے اکٹھے ہوتے ہیں اور ہم کراچی میں ہوتے ہوئے بھی شامل نہیں ہوتے تو اس جلے ہوئے دل کے کوئلے سے محلے والے باربی کیو کرتے ہیں اور عظمیٰ بچی بچی بتا دو روز بروز چھوٹی کیوں لگ رہی ہو حد ہو گئی اب تو اجیہ سے بھی چھوٹی لگ رہی ہو (ماشاء اللہ کہو بھئی) اب آتے ہیں تبصرے کی طرف تو جو کہوں گی سچ کہوں گی سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گی (واقعی؟) سب سے پہلے تقریب کا احوال پڑھا جو پڑھنا ضروری تھا کیونکہ انجم آنٹی بہت یاد آتی ہیں، اس کے بعد انٹرویو پڑھا کچھ خاص نہیں لگا بس ٹھیک ہے......... راحیلہ بنت مہر علی کا میرا گھر کاش حقیقت میں بھی ایسے جھٹ پٹ مسئلے حل ہو جایا کریں۔ جڑواں بس سو سو ہے، یہ کہاں بچیں کہ دل ہے اٹھارہ اقساط تک پڑھنے کا بے حد مزہ آیا میں اپنے آپ کو سفینہ اور سیٹھ صاحب (عامر) کو پرنس سمجھتی تھی پڑھتے وقت لیکن یہ والی قسط پڑھنے کا بالکل بھی مزہ نہیں آیا۔ اب آتے ہیں، شیریں جی کے امرت کی طرف...... ہمیشہ کی طرح شاندار، ایسا لگ رہا ہے جیسے زائنہ کے ساتھ بہت غلط ہو گیا ہے جو دوسروں کے ساتھ برا کرتے ہیں ان کا اپنا برا ہوتا ہے۔ ایسا سچ ہوتا ہے کہ بے ہوش کرنے کی دوائی سے کبھی کبھی انسان ہوش میں نہیں آتا طیبہ عنصر مغل نے بہت اچھا لکھا ہے۔ میرا عشق صوفیانہ شاندار ہے شاباش روشانے باقی سب ٹھیک ہے۔" (تبصرے کا شکریہ، تم نے تو سچ کچھ آخر میں ڈرا دیا اب کیا ڈاکٹر بے ہوش کرنا چھوڑ دیں)

✍ بختاور بلوچ، لوہی بلوچستان سے۔ "پاکیزہ اور انجم باجی سے ہمارا بہت پرانا اور پائیدار تعلق ہے، اور دلکش کے توسط سے نزہت باجی آپ سے بھی شناسائی کا شرف حاصل ہوا۔(جی بالکل) کچھ عرصے سے پاکیزہ سے قلمی رابطہ نہ ہونے کے برابر ہے لیکن ہر ماہ کسی بھی طرح پاکیزہ منگوا کے پڑھنا نہیں بھولے۔(بہت شکریہ آئندہ بھی رابطے میں رہیے گا) تمام سلسلے اپنی جگہ بے مثال ہیں، اس بار کافی سینئر مصنفات کی تحاریر سے مستفید ہوئے، ناہید سلطانہ جیسی مایہ ناز مصنفہ کو ہر ماہ اگر شامل کیا جائے تو بہتر ہے چاک، چاک قبائے دل پڑھ کر دل عورت کی بے بسی اور تذلیل پر رو دیا۔ اس بار جن تحریروں نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ روشانے عبدالقیوم کا ناول میرا عشق صوفیانہ تھا۔ کس قدر خوب صورت اور سچے جذبات کی عکاسی تھی یہ تحریر...... خصوصاً خنسہ کے جذبات اور محبت کی راہ میں اپنا وجود فنا کر دینا...... ہر لفظ نے رُلا دیا۔ یہ اس ماہ کی بیسٹ تحریر تھی۔ اتنا اچھا لکھنے پر مبارک باد مصنفہ کو (مصنفہ شکریہ کہتی ہیں) دوسری پوزیشن طیبہ عنصر کی تحریر رہا تو محرم راز میرا کو ملی ہماری طرف سے۔ طیبہ کو اس فیلڈ میں آئے شاید کچھ ہی عرصہ ہوا ہے مگر قلم میں کافی پختگی ہے۔ جس دکھ نے ہو انمول رشتوں کو بے مول کیا۔ اسی دکھ سے آشنا ہم بھی ہیں، لوگ اتنے بھی ظالم ہو سکتے ہیں، جنہوں نے پاکیزہ رشتوں کو ان کی اپنی نظر میں گرا دیا۔ بہر حال یہ تحریر بھی متاثر کرنے میں کامیاب رہی۔ نزہت جبیں ضیا نے کچھ لکھا ہو اور ہمیں پسند نہیں آیا ہو، یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کچھ دل نے ہمیں برباد کیا کے انجام نے بھی رُلا دیا...... بشریٰ سیال نے بھی زبردست لکھا اور سعدیہ رئیس کے نیا دوست نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا کہ انسان کے بھٹکنے کا سبب اکثر اپنوں کی بے انتہا ناقدری اور ان کے غلط فیصلے ہی ہوتے ہیں۔ سعدیہ رئیس بہت اچھی لکھاری ہیں۔ اس لحاظ سے پاکیزہ بہت منفرد ہے کہ کوئی عامیانہ یا سطحی الفاظ اس میں جگہ نہیں پا سکتے۔ الفاظ اور کردار ظاہر کرتے ہیں کہ تمام مصنفات سلجھی ہوئی، بااخلاق اور پختہ ذہن و کردار کی مالک ہیں۔ ان کی شخصیت کا عکس جھلکتا ہے ان کے قلم اور الفاظ میں۔ یہی وجہ ہے کہ برسوں گزرنے کے بعد بھی ہم پاکیزہ سے اپنا تعلق نہ توڑ سکے۔(ارے سچے

تعلق توڑے تھوڑی جاتے ہیں) شیریں حیدر اور رفعت سراج کے کیا کہنے...... ان کی تعریف و توصیف کے لیے الفاظ نہیں ہمارے پاس...... کافی گہرائی اور گیرائی سے انسانی جذبات کی عکاسی کرتی ہیں۔ یوں جیسے روح کی گہرائیوں میں اتر کے اندر کے احساسات کو کھنگال کے ہمارے سامنے رکھ دیں۔ عقیلہ حق نے اگر میں ہوتا لکھ کر حقِ قلم ادا کیا۔ عقیلہ ڈیئر آپ کس، کس درد کو کھوجیں گی اپنے قلم سے...... میرے آس پاس آ کے دیکھو لو ہر گھر میں صبا جیسا کردار موجود ہے۔ حنا اصغر کی ہلکی پھلکی تحریر بھی بہترین تھی۔ تمام نئی لکھنے والی بہنوں کو سلام...... مجھے ان سب حساس دلوں سے پیار ہے۔ جن کے اندر انسانیت کا درد اور پیار ہے۔ مجھے ہر اس انسان سے محبت ہے جس کے ہاتھ میں قلم اور کتاب ہے۔" (بہت خوب، خوش رہیں۔ پاکیزہ تو آپ عرصے سے پڑھ رہی ہیں اس لیے تحریروں کا مزاج بھی معلوم ہو گا۔ ایک افسانہ لکھ کر بھیج دیں پھر دیکھ لیں گے)

✍ سلمیٰ غزل، کراچی سے۔ "اس مرتبہ پاکیزہ تیس جنوری کو ہی مل گیا ماشاء اللہ روز بروز نکھار آتا جا رہا ہے۔ مجموعی طور پر بہتری کی جانب گامزن ہے مگر انجم انصار کی تقریب رسالے کی جان رہی مزہ آیا۔ عظمیٰ آفاق نے خوب لکھا، لگا ہم بھی اس تقریب میں موجود ہیں۔ سب مصنفات بے حد سادہ، باوقار اور پُر کشش لگیں اب ذرا تبصرہ ہو جائے افسانوں پر اس مرتبہ سارے افسانے ایک سے بڑھ کر ایک اتفاق سے تین دن میں، میں نے پورا میگزین چاٹ لیا۔(واہ بھئی) شہزاد شیخ سے ملاقات بہت اچھی لگی اس مرتبہ تصوف پر اختر شجاعت صاحبہ کا مضمون اس لیے دلچسپ لگا کہ انہوں نے چھوٹے، چھوٹے واقعات کے ساتھ تصوف کے رنگ کو اجاگر کیا۔ اب ذرا ذکر ہو جائے روشانے عبدالقیوم کے میرا عشق صوفیانہ پر ماشاء اللہ لفظوں کا چناؤ، جملوں کی کنسٹرکشن اور جذبات کی عکاسی، ہر چیز لاجواب تصوف کا بہترین انداز لیکن اگر وہ برا نہ مانیں تو اتنی مہارت اور خوب صورتی کے باوجود کچھ چیزیں اسلام کے منافی، اس کی روح کے خلاف اور انسانی فطرت سے بالکل ہم آہنگ نہیں...... اسلام دین فطرت ہے اللہ تعالیٰ نے تجرد کی زندگی سے منع فرمایا ہے میری ناقص معلومات کے مطابق قرآن میں کہا گیا ہے (حلال چیزوں میں)۔ کھاؤ، پیو اور فضول خرچی مت کرو۔ آخر اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں ہم انسانوں کے لیے ہی تو دنیا میں بھیجی ہیں اور سورۂ رحمٰن میں بار، بار کہا گیا ہے تم اپنے رب کی کن، کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔ صالح نے صاحبِ حیثیت ہوتے ہوئے بھی ایسی زندگی کیوں گزاری؟ کیا صاحب خانہ کی دعوت پر کچھ نہ کھانے سے ان کی دل آزاری نہیں ہوئی؟ جبکہ دل آزاری بہت بڑا گناہ ہے۔ ایک مختصر سا واقعہ ایک مرتبہ ایک شخص بڑے شوق سے ہمارے نبی پاکؐ کے لیے ککڑی لایا۔ آپؐ نے کھائی اور تعریف بھی کی صحابہ کو حیرانی ہوئی کہ سب کو شامل کیے بغیر آپؐ تنہا کچھ نہیں کھاتے تھے ایک صحابی کے پوچھنے پر آپؐ نے فرمایا "ککڑی کڑوی تھی اگر تم میں سے کسی کے منہ سے نکل جاتا تو اس شخص کی دل آزاری ہوتی اس لیے میں نے تم لوگوں کو نہیں کھلائی"۔ ہمارے مذہب میں جائز پیسوں سے کما کر خود پر خرچ کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ اگر لسی اور خالی روٹی ہی اللہ کی قربت کا ذریعہ ہے تو پھر یہ بے شمار اجناس کی قسمیں معاف کیجیے گا۔ کیا صرف یہودی و نصاریٰ کے لیے ہیں؟ ہمارے نبی کی زندگی تو ہر مسلمان کے لیے ایک روشن مثال اور ایک سبق ہے۔ اب روشانے نے جیسی زندگی صالح کے نصیب میں لکھی ہے وہ حقیقت سے کوسوں دور ہے پھر بیچاری خنسہ کو کیوں مار دیا؟ اس کا گناہ کیا تھا؟ یہ کیسی بے خبری اور معصومیت تھی کہ ایک نیک لڑکی اپنی جان سے گئی۔ خنسہ کے خالص اور سچے عشق سے صالح کیوں خائف تھا؟ اگر کسی کی دل آزاری ہوئی ہے تو میں تہِ دل سے معذرت چاہتی ہوں یہ میری ذاتی رائے تھی امید ہے آپ نے برا نہیں مانا ہو گا اس مرتبہ بس اتنا ہی نمرہ احمد کا انٹرویو پڑھنے کی خواہش ہے۔" (تفصیلی تبصرے کا شکریہ...... آپ کا اعتراض روشانے تک پہنچ گیا ہے، یہ محفل اسی لیے ہے کہ سب اپنا، اپنا نقطۂ نظر بیان کریں، انٹرویو کی فرمائش بھی نوٹ کر لی گئی ہے)

✍ پروین افضل شاہین، بہاول نگر سے۔ "اس بار فروری کا شمارہ تین تاریخ کو ہی مل گیا۔ دین کی باتیں اور اللہ اور اس کا نور پڑھ کر روح کو سرشار کیا۔ آپ کے اداریے میں آپ نے نوشیرواں عادل کی کیا خوب صورت بات پیش کی۔ پاکیزہ کے مہمان میں شائستہ زریں نے جاوید شیخ کے بیٹے شہزاد شیخ اور ان کی بہو حنا شہزاد سے خوب انٹرویو کیا۔ یہ دوستی ہم نہیں چھوڑیں گے میں آپ نے انجم انصار کو الوداعی پارٹی دی جس میں سب کو دیکھ کر اچھا لگا۔ اس پارٹی کا احوال پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ہمیں ایسے لگا کہ جیسے ہم بھی اس خوب صورت پارٹی کا حصہ ہیں اور اتنی نامور ہستیوں کے درمیان وقت گزار کر بہت کچھ سیکھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بھیا معراج رسول کو مکمل صحت دے۔ آمین۔" (آپ بھی تو شریک ہی تھیں ناں)

✍ صائمہ آفاق، لاہور سے۔ "میں عرصہ تیس سال سے پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں، اس دفعہ اپنی خاموشی توڑنے کی وجہ عید

ملن پارٹی جو کراچی میں ہوتی ہے بنی ہے۔ میں چاہوں گی کہ آپ مجھے اس میں شرکت کا دعوت نامہ ارسال کریں۔ (آپ کو ابھی سے دعوت دے رہے ہیں) میرے کراچی میں رشتے دار ہیں لیکن جانا نہیں ہوتا اس بہانے آپ سب سے ملاقات ہوجائے گی۔ مجھے اس کے سب سلسلے بہت پسند ہیں، جب اس میں کپڑوں کی ڈیزائنگ کے صفحے ہوتے تھے، میں جب سے پڑھتی ہوں انجم انصار کے بعد اس میں اور امپروومنٹ آئی ہے لگتا ہی نہیں کہ انہوں نے رسالہ چھوڑ دیا ہے۔ اب میرے اپنے بچے جوان ہیں دو بچوں کی نانی ہوں۔ (ماشاء اللہ) اللہ آپ کو دن دُگنی رات چوگنی ترقی دے اور یہ سفر کامیابی سے پورا ہو، آمین۔" (بہت شکریہ تبصرہ بھی لکھیں۔)

✍ فاطمہ، بہاولپور سے۔ "چند ماہ سے آپ کا میگزین میرے دل کی آنکھیں تک پڑھ چکی ہیں، آپ مجھے بہت ہی اچھی لگی ہیں، میم پاکیزہ سارے کا سارا بہت اچھا ہے۔" (کہانیوں پر بھی تبصرہ لکھیں پیاری بیٹی)

✍ بلقیس جعفر، کوئٹہ سے۔ "میں بھی پاکیزہ میں لکھنا چاہتی ہوں، میں نے نوٹ کیا ہے کہ آپ کے رسالے میں پورے پاکستان سے نمائندگی ہوتی ہے۔ کیا آپ میری بھی حوصلہ افزائی کریں گی۔" (جی ضرور بلقیس، آپ لکھیں تو)

☒ نظیر فاطمہ، لاہور سے۔ جی آپ کی کہانیاں انشاء اللہ لگتی رہیں گی، ایک تو اسی ماہ لگی ہے ڈیئر۔

☒ رضوانہ اسحاق، کراچی۔ آپ ابھی مشق جاری رکھیں، آپ کی تحریر میں غیر ضروری طوالت ہے، مشق کریں انشاء اللہ کہانی بھی لگ جائے گی۔

✍ نیر فہیم خان، کراچی سے۔ "باجی امتحانوں کے دن قریب ہیں، بہت سی مائیں اسی جنون کا شکار ہوتی ہیں کہ بچہ ریس کا گھوڑا بن کر ایوارڈ جیت لائے، چاہے اس معصوم کی روح کتنی ہی چھلنی کیوں نہ ہوجائے۔ اس سے پہلے بھی ایک افسانہ بھیجا تھا حاضری ضروری ہے، پلیز بتادیں کہ کیا ہوا؟ پچھلی بار یہ فیصلہ کیا تھا ہر بار میں بھی حاضری دوں گی۔ سو جنوری کے بعد فروری میں بھی حاضر ہوں آپ کا تعاون درکار ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس اہم منصب پر برقرار اور اس کی تمام خوبیوں کو قائم رکھنے کی ہمت و طاقت عقل و سمجھ عطا فرمائے اور پاکیزہ ترقی کرتا رہے۔" (دعاؤں کے لیے جزاک اللہ، فہیم حاضری ضروری ہے، ناقابلِ اشاعت ہے اب اس نئی کہانی کو دیکھ لیں گے، آپ کوشش جاری رکھیں۔)

✍ حمیرا فاروق، جہلم سے "آپ کے ادارے کو اللہ پاک دن دگنی اور رات چوگنی ترقی سے نوازے۔ جس کی بدولت مجھ جیسی عام لڑکیاں بھی اپنے دل کی آواز کو سیاہی میں گھول کر دوسروں کے دل و دماغ میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوجاتی ہیں، آج کے اس ترقی یافتہ دور میں کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ آپ کے دل کا راز جان سکے...... ایسا صرف کہانیوں کی صورت ہی ممکن رہ گیا ہے۔ اگر میری اس تحریر سے کسی ایک کی بھی زندگی بدل جائے تو مجھے سرد راتوں میں بیٹھ کر لکھنے کی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ (انشاء اللہ) ....پاکیزہ دل میں اچھا تاثر قائم کرنے والا نام ہے۔ جب نام ہی اتنا خاص ہے تو ہر انداز نرالا تو ضرور ہوگا۔ نئی لکھنے والی بہنوں کا کھلے دل سے پاکیزہ کا ہر بار استقبال کرنا اچھا لگتا ہے۔ دعا ہے پاکیزہ آسمان کی بلندیوں کو چھولے، آمین۔" (جی حمیرا، آپ لوگوں کا سراہنا ہمارے لیے مزید ترقی کی راہیں طے کرنے میں مدد دیتا ہے، آپ رسالہ پڑھتی رہیں اسی طرح کہانی لکھنا بھی سیکھ جائیں گی۔)

✍ حرا قریشی، ملتان سے۔ "باجی رب سوہنا جانتا ہے کہ میرا دل ماہ فروری کے پاکیزہ میں شام کی دلہن کی اشاعت پر کس قدر شکر گزار ہے، حسرتوں کے پیراہن میں لپٹی اس کی اشاعت ہمارے لیے ایک ایسا قیمتی اور عزیز ترین تحفہ ہے جو کوئی بہت ہی محبوب رفیق ہی دے سکتا ہے انتہائی گرم جوشی کے ساتھ چشم تصور میں داد بھری تھپکی دے کر تشکر کا یہ نذرانہ قبول کیجیے۔" بہت پیارے افسانوی شکریے کا شکریہ اچھی تحریر ہی جگہ پاتی ہے حرا)

✍ عنبر وسیم، گوجرانوالہ سے۔ "باجی پاکیزہ ہاتھ میں آتے ہی دل باغ، باغ ہوگیا، انجم آنٹی اور تمام رائٹرز کو ساتھ دیکھ کر بہت اچھا لگا، میں تو سب کو بہت یاد کرتی ہوں۔" (ہم بھی آپ کو یاد کرتے ہیں)

✍ ظل شاہین، رحیم یار خان سے۔ "مئی 2016 میں جب انجم باجی نے پاکیزہ سے علیحدگی اختیار کی تب سے میرا قلم سے رابطہ منقطع رہا مگر پاکیزہ بدستور زیر مطالعہ رہا۔ کئی بار سوچا کہ آپ کو ایڈیٹرشپ کی مبارک باد دوں مگر کچھ مصروفیات آڑے آتی رہیں اور کبھی باجی کے جانے کا دکھ...... مگر اس تمام عرصے میں پاکیزہ کو deeply observe کرتی رہی۔ (شکریہ) جس پودے کی انجم باجی نے عذرا آپا اور معراج انکل کی زیر نگرانی آبیاری کی وہ آج ایک مضبوط درخت میں ڈھل چکا ہے جس کے ثمرات سے ہزاروں لوگ مستفید ہورہے ہیں اور نزہت اب آپ اور عذرا آپا اس شجر بے مثال کو سنبھالنے میں بہت ذمے داری سے کام لے رہی ہیں کیونکہ کسی

بھی چیز کے معیار کو برقرار رکھنا ایک مشکل امر ہوتا ہے۔ اب تو ہر ماہ بہنوں کی محفل کے آغاز میں عذرا آپا سے ملاقات ہوتی ہے یہ ایک اچھی تبدیلی ہے۔ محترمہ ذکیہ آنٹی کا اللہ اور اس کا نور...... ایک پُرنور سلسلہ ہے جس کی تعریف کے لیے الفاظ کا چناؤ بہت مشکل ہوتا ہے۔ ذکیہ آنٹی کی قرآن حکیم پر اس قدر تحقیق پر عقل دنگ رہ جاتی ہے، میرا عقیدت بھرا اسلام اور دعائیں ان کو پہنچا دیجیے گا۔ (جی ضرور) اب ذکر کرتی ہوں اس ماہ کے پاکیزہ کا...... محترمہ عذرا آپا نے انجم باجی کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کیا جس کا احوال عظمیٰ نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا اور ہم نے پڑھ کر انجوائے کیا تصاویر بھی اچھی لگیں۔ رائٹرز نے اپنے خوب صورت خیالات کو لفظوں کا پیراہن دیا۔ آمنہ حماد اپنے خوب صورت اشعار میں ہی سب کچھ کہہ گئیں جبکہ شائستہ زریں کا اخباری مضمون اے ون رہا۔ جبکہ عذرا آپا نے اپنے خیالات کے اظہار میں ایک بڑی بات ایک خاص الخاص جملہ کہ میں انجم انصار کو کبھی الوداع نہیں کہہ سکتی کہہ کر انجم باجی سے اپنی محبت اور اپنائیت کا ثبوت دے ڈالا اور بلاشبہ انجم باجی ایسی ہی لازوال محبتوں کی حقدار بھی ہیں۔ پھر بہنوں کی محفل پڑھی جہاں محترمہ شائستہ اعجاز اور محترمہ عقیلہ حق صاحبہ کے خطوط بھی پڑھے جن میں کم و بیش ایک سی باتیں تھیں انہیں پڑھ کر حیرانی کے ساتھ بہت دکھ ہوا کہ یہ باتیں ایک ایسی خاتون کے بارے میں کہی گئیں جنہوں نے اس رسالے کے لیے اپنے فرائض منصبی کے لیے دن رات محنت کی۔ تب ہی تو عذرا آپا کے دل میں انجم باجی کے لیے اس قدر عزت و محبت ہے۔ رہی بات گفٹ اور ایوارڈز کی تو یہ دنیاوی رسم و رواج ہیں ان سے انسان کی حوصلہ افزائی تو ہوتی ہے اور کام میں تحریک بھی ملتی ہے۔ انسان کے لیے سب سے بڑا ایوارڈ اس کی عزت و توقیر ہوتی ہے۔ (جی ہاں بالکل) نزہت آپا اگر کوئی بات بری لگے تو معذرت چاہتی ہوں کیا امید رکھوں کہ میرا یہ خط شائع ہوگا؟ ویسے مجھے علم ہے پاکیزہ کے دامن میں بہت وسعت ہے۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ آئندہ بھی رابطہ رہے گا۔" (پیاری ظل شاہین آپ کا طویل خط موصول ہوا جو جگہ کی کمی کے باعث پورا شائع نہیں ہوسکتا تھا بہت شکریہ...... آپ کی مبارک باد اور حوصلہ افزائی کا۔ آپ لوگوں کی رائے اور مشورے سے ہی رسالہ بہتر سے بہتر کرنے میں مدد ملتی ہے، آپ نے انجم باجی کو یاد کیا ان کے کام کو سراہا...... یہ تو دستورِ دنیا ہے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں اور ہر ایک اپنے انداز سے کام کرتا ہے جیسا کہ آپ نے محفل کی دعا کے سلسلے میں لکھا تو پیاری بہن دعائیں ہر آن، ہر گھڑی ہم کرتے ہی ہیں، اب انداز اور الفاظ ظاہر ہے سب کے مختلف ہوتے ہیں، یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں، دعا طویل اور مختصر ہوتی رہتی ہے۔ آپ نے محفل میں شائستہ اعجاز اور عقیلہ حق کے خطوط پر بھی بات کی تو انجم انصار کی خدمات کے سلسلے میں ان کو جو گولڈ گفٹ دیا گیا تھا اس کا تذکرہ تو ان خطوط میں انجم باجی کی عزت افزائی کے طور پر کیا گیا تھا آپ کیوں اس قدر دکھی ہوئیں یہ تو فخر کی بات تھی آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ انجم انصار اس سے ہرٹ ہوئی ہوں گی بھلا کسی کے تحفے کے ذکر سے کوئی ہرٹ بھی ہوتا ہے، میرا تو خیال ہے لوگ فخریہ بیان کرتے ہیں کہ ہمارے ادارے نے ہماری اس قدر عزت افزائی کی' اتنا خیال رکھا یعنی یہ بات تو ان کی اہمیت ظاہر کرتی ہے کہ انجم باجی کو اپنا سمجھ کر ہی گولڈ میڈل سے نوازا گیا تھا۔ اب آپ نے جانے کس انداز سے سوچا یہ ہم کیا کہہ سکتے ہیں بہرحال یہ آپ کی اپنی سوچ ہے، ہمیں پوری امید ہے جب بھی اس کا ذکر ہوگا انجم انصار فخر ہی محسوس کریں گی کیونکہ وہ تو اس کو اپنا ادارہ ہی سمجھتی ہیں اور اپنوں کے دیے گئے تحفے کے ذکر پر کیا کوئی انسان دکھی بھی ہوسکتا ہے؟ یہ تو بڑی نئی بات پتا چلی، بہرحال خط لکھنے کا شکریہ، امید ہے آپ آئندہ ہمارے مصنفین کی کہانیوں پر بھی ضرور تبصرہ کریں گی)

✍ طیبہ عنصر مغل، راولپنڈی سے۔ "ہر ماہ کا ہی مجھے تو پاکیزہ بہت پسند آرہا ہے۔ اس ماہ بھی شامل تمام کہانیاں بہت اچھی ہیں، نزہت اصغر بہت اچھا کام کررہی ہیں، آپ کا ادارہ رائٹرز کو بہت عزت دیتا ہے اور آپ نے تو مجھے گولڈن اسٹار واقعی دے دیا۔ سرورق پر میرا نام آگیا میرے لیے تو یہ کسی ایوارڈ سے کم نہیں۔ پاکیزہ کے تمام سلسلے ہی اے ون ہے۔ تمام مصنفات کو سلام کہ اتنی پیاری کہانیاں لکھتی ہیں اور پورے ادارے کو بھی سلام کہ اتنے بہترین رسالے مرتب کرتے ہیں۔" (طیبہ بہت شکریہ تمہاری حوصلہ افزائی کا۔)

✍ نگینہ ضیا بنگش، کراچی سے۔ "باجی آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے میرے اور میرے شوہر کے لیے دعائے صحت کروائی۔ میں بھی عذرا باجی، معراج صاحب کو خصوصاً اور باقی سب کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھتی ہوں، اس ماہ تو انجم انصار کو دی گئی پارٹی کی کوریج پڑھ کر دل خوش ہوگیا یہ آپ کے ادارے کا بڑا پن ہے۔ سب ایڈیٹرز کو دیکھ کر اچھا لگا...... شائستہ زریں کا کیا گیا انٹرویو بہت اچھا تھا۔ سوال کے ساتھ شہزاد شیخ نے اچھے جواب دیے میں تو اس کے ڈرامے دیکھتی ہوں، اور ہاں نزہت جبیں ضیا کا افسانہ بہت اچھا تھا اور بھی رائٹرز نے بہت اچھا لکھا۔ میری طرف سے سب بہنوں کو سلام۔" (وعلیکم السلام اور دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

☆ فریدہ ہاشمی تخفی، کراچی سے۔ "فروری کے رسالے نے تو دل خوش کردیا۔ ماشاء اللہ رسالہ انجم انصار کی خوشبو میں بسا ہوا

ہے۔ خدا انہیں زندہ سلامت اور صحت مند رکھے...... آمین۔ عذرا رسول نے ان کی پزیرائی میں جو تقریب کی اس کی بڑی خوشی ہوئی۔ عذرا بہن تو ہمیشہ ہی بہت زیادہ خلوص و محبت کا اظہار کرتی ہی رہتی ہیں، ہم سب ان کے شکر گزار ہیں۔ معراج صاحب کی مزاج پرسی کے ساتھ ان کی کلی صحت مندی کے لیے دعا گو ہوں۔ (بہت شکریہ) آپ کا اداریہ بہت اچھا ہے، عوام سے لے کر خواص تک کے لیے اتنا اچھا پیغام ہے۔ خدا کرے لوگ اس سے متاثر ہوں، ہمارے سربراہان مملکت کچھ سیکھیں اور عدل و انصاف کا مطلب سمجھیں...... آمین۔ اختر بہن نے تو اس بار کمال کردیا۔ بالکل وہی مثال ہے کہ دریا کو کوزے میں بند کردیا ہے، اتنے مختصر مقالے میں اتنی عمدہ معلومات دینا واقعی کمال کی بات ہے، دعا کرتی ہوں کہ وہ ہمیشہ یونہی سب بہنوں کی دینی رہنمائی کرتی رہیں...... آمین۔ کہانیاں سب نہایت عمدہ ہیں، ناہید سلطانہ اختر نے اس دنیا کے عام آدمی کی بات کی کاش دلوں میں خدا کا خوف پیدا ہو اور مرد خود کو برتر سمجھنا چھوڑیں۔ حرا قریشی نے وطن کے جیالوں کے بارے میں بہت عمدگی سے لکھا ہے۔ عقیلہ حق نے بھی بہت اچھا لکھا ہے۔ فرحین اظفر کی عورت کہانی نے متاثر کیا۔ عورت کی خدمت اور محبت ہمیشہ جیت جاتی ہے، یہی عورت کی عظمت کی نشانی ہے۔ طیبہ عنصر مغل کے افسانے رہا تو محرم راز میرا، نے ہلا کر رکھ دیا۔ ایسی پست سوچ کیسے ممکن ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ بہت ہی ذہنی تکلیف پہنچی۔ خدا لوگوں کو عقل و سمجھ عطا فرمائے۔ دونوں ناول بہت عمدہ جارہے ہیں، ذکیہ بہن کا مقالہ تو سیدھا دل میں اتر جاتا ہے خدا انہیں صحت دے اور ہم کو ایسے ہی دینی معلوماتی مضامین پڑھنے کو ملتے رہیں، عورت کے بارے میں سلمٰی غزل کے خیالات پڑھ کر بہت خوشی ہوئی، میں ان کی رائے سے سو فی صد متفق ہوں...... کہانیوں اور ڈراموں میں جس طرح عورت کو مظلوم، بے بس کمزور دکھایا جاتا ہے، مجھے بہت ناگوار گزرتا ہے، عورت تو بہت نازک مگر بہت مضبوط ہستی ہے، سارے اچھے معاشرے عورت ہی کے مرہونِ منت ہیں۔"

(بہت شکریہ پیارے سے تبصرے کا)

☆ مسز افتخار شوق، میاں چنوں سے۔ ''آج کل بہت مصروفیت ہے کیونکہ کلاس 5th اور 8th کے وظیفے کے امتحان ہو رہے ہیں اس میں ڈیوٹی سپرنٹنڈنٹ جنرل کی لگی ہوئی ہے، کافی سخت کام تھا لیکن میرا عملہ بھی بہت مستعد ہے اور اپنے کام میں خالص پیشہ ورانہ صلاحیتوں کا مالک ہے پھر بھی میں اس دوران فروری کا شمارہ پڑھنا نہیں بھولی...... جو میرے آرام کا وقت ہوتا ہے، بس اس میں رسالہ پڑھتی رہی کیونکہ اس کے بغیر میں رہ نہیں سکتی۔ بہرحال کام کے ساتھ ہی میری تفریح ہوتی ہے (واہ بھئی) آج کل میں ماہر قانون رانا سعید کی کتاب ''عقل'' کا مطالعہ کر رہی ہوں دیکھیں میری عقل جاتی ہے یا مزید آتی ہے۔ (اللہ نہ کرے جائے، آپ تو ویسے ہی کافی عقل مند ہیں افتخار) میری بہن ماہ نور کا بیٹا یاسر مجھ سے کہہ رہا تھا کہ آپ اپنے اسکول میں ''سوائن فلو'' آگاہی کی کمپین چلائیں وہ مجھے نانو لالا کہتا ہے (اچھا بہت خوب) نزہت آج کل یہاں کافی چل رہا ہے۔ اس کے لیے یاسر نے کہا کہ وٹامن سی کی کمی ہو جاتی ہے تو آج کل اورنج کا موسم ہے آپ سب سے کہیں کہ خوب مالٹے، کینو، موسمی کھائیں۔'' (واہ بھئی بڑا اچھا بچہ ہے، نالج بھی کافی ہے، چلیں ابھی تو آپ مصروف ہیں آئندہ تفصیلی تبصرہ بھی لکھیے گا)

پیاری بہنو...... محفل کے اختتام کا وقت آن پہنچا...... انشاء اللہ سانس کی ڈور یونہی بندھی رہی تو سالگرہ نمبر پر پوری آب و تاب سے محفل سجائیں گے۔ رب کائنات اللہ جل شانہ کے حضور سب مل کر دعا کریں۔ اے ہمارے رب ہمیں بخش دے، اے ہمارے معبود برحق ہمیں اپنی اس نظر کرم سے بہرہ مند فرما جس سے سبھی سختیاں، آلام، مصائب ٹل جائیں۔ یاارحم الراحمین ہم پر موت کے وقت رحم فرمانا اور موت کے بعد عذاب قبر، فشار قبر، وحشت قبر سے محفوظ رکھنا اور قیامت کے روز ہمارا نامۂ اعمال ہمارے داہنے ہاتھ میں دینا...... بے شک تو قادرِ مطلق ہے!

آپ کی خیریت کی طالب

نزہت اصغر

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز III ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

فون نمبر 021-35804200 , 021-35386783,021-35802552 EXT 107,122



پاکیزہ ڈائری — عظمیٰ آفاق سعید

حمد

ہر نام تیرا پیارا ہر ذکر تیرا پیارا
دیکھوں جہاں، جہاں میں ہر سو تیرا نظارہ
وہم و گماں میں نہ تھا وہ تو نے کر دکھایا
دے کر مجھے بلاوا اپنے حرم بلایا
یہی آرزو تھی میری، یہی میری تھی تمنا
کروں میں بھی جا کے سجدے صحنِ حرم میں ہر جا
سجدوں کے صدقے تو نے روشن میری جبیں کی
اپنے کرم کی تو نے بس انتہا ہی کردی
مجھے خاک سے اٹھایا مجھے معتبر بنایا
صد شکر تیرا مولا، صد شکر تیرا مولا
سجدے میں جب میں جاؤں
تب تک نہ سر اٹھاؤں
کوئی دل کے پاس بولے
کوئی آ کے یہ بتائے
وہ تھا مہربان تجھ پہ
اب اور ہوگیا ہے
بخشش عطا کی تجھ کو، تجھے معاف کردیا
اعلیٰ ہے اس کی عظمت وہ سب کا بادشاہ ہے

شاعرہ: ہما علی، اسلام آباد

شانِ کریمی

ہر حال میں تیرا ہی رہا آسرا مجھے
مایوس کرسکا نہ ہجومِ بلا مجھے
جب کرچکے عدو یقیں ہار کا مری
تیرے کرم نے ہمیشہ جتوا دیا مجھے
مجھ ایسے گنہگار پر تری ایسی رحمتیں
شانِ کریمی تیری گئی رُلا رُلا مجھے
اپنے غموں کا ڈھونڈ رہا تھا علاج میں
بتلا دیا گھر کا ترے تو نے پتا مجھے
خرم اس رب سے غافل تو کبھی نہ ہونا
دکھلا رہا ہے ہر آن جو شانِ عطا تجھے

کلام: خرم علی راؤ

پسند: گل شاد نذیر، اسلام آباد

نعتِ رسول مقبولؐ

درِ نبیؐ پر پڑا رہوں گا پڑے ہی رہنے سے کام ہوگا
کبھی تو قسمت کھلے گی میری کبھی تو میرا سلام ہوگا
خلافِ معشوق نہ کچھ ہوا ہے نہ کوئی عاشق سے کام ہوگا
خدا بھی ہوگا اُدھر ہی اے دل جدھر وہ عالی مقام ہوگا
کیے ہی جاؤں گا عرضِ مطلب ملے گا جب تک نہ دل کا مطلب
نہ شامِ مطلب کی صبح ہوگی نہ یہ فسانہ تمام ہوگا
جو دل سے ہے مائلِ پیغمبر، یہ اس کی پہچان ہے مقرر
کہ ہر دم اس کے منہ و لب پہ درود ہوگا، سلام ہوگا
اسی توقع پہ جی رہا ہوں یہی تمنا جلا رہی ہے
نگاہِ لطف و کرم نہ ہوگی تو مجھ کو جینا حرام ہوگا

عقیدت مند: شازیہ محبوب، راولپنڈی

خصوصی دعا

میرے مالک میری دھرتی کی حفاظت کرنا
کر رہے ہیں جو دعائیں تو سماعت کرنا
ملک ہے تو ہیں ہماری بھی امیدیں زندہ
اس کے ہی دم سے ہیں یہ ساری نویدیں زندہ
ہم کہ آپس میں کبھی مولا، نہ بدگمان رہیں
وفا، خلوص، محبت کے درمیان رہیں

مٹادے ذہنوں سے ساری کدورتیں مالک
تو کردے پوری ہماری ضرورتیں مالک
کسی کے سامنے جھکنے سے اب بچا مالک
ہمیں غیور و جری پاک تو بنا مالک
ہمارے دل میں یہ احساس اب تو زندہ کر
ہماری جھولیاں مہر و وفا سے اب تو بھر
اٹھا کے ہاتھ یہ کہتے ہیں ہم کو نیک بنا
یہ التجا ہے ہماری کہ ہم کو ایک بنا
ہمارے مسائل کا حل بھی دے مولا
دعا قبول ہو جس میں وہ پل بھی دے مولا

دعا گو: یاسمین کنول، پسرور

یاد رکھیں

☆ اپنا اخلاق سنوارو، دوست اخلاق سے بنتے ہیں۔

☆ اپنے اللہ کو یہ نہ بتاؤ کہ میرا دکھ کتنا بڑا ہے بلکہ اپنے دکھ کو یہ بتاؤ کہ میرا اللہ کتنا بڑا ہے۔

☆ قدر کرو زندہ لوگوں کی کیونکہ ان کے مرنے کے بعد کچھ حاصل نہیں سوائے دکھ، درد، آنسوؤں اور پچھتاوؤں کے۔

☆ دکھ یہ نہیں کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے بلکہ دکھ یہ ہے کہ میں نے ایک انسان کو پہچاننے میں اتنی دیر کیوں لگا دی۔

☆ اگر کسی انسان نے مرنے کے بعد جنت کی سیر کرنی ہے تو نماز کا ٹکٹ ضرور حاصل کرے۔

☆ خوشیاں بھی ساون کے بادلوں کی طرح ہوتی ہیں کوئی نہیں جانتا کہ کب اور کہاں برس جائیں۔

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

سنہری کرنیں

☆ قرآن پاک نہایت بہترین ہدایت، نماز اچھی عبادت اور اپنے آپ کو پہچاننا کمالِ معرفت ہے۔ (حضرت علیؓ)

☆ خوش کلامی ایک ایسا پھول ہے جو کبھی نہیں مرجھاتا۔ (بابا فرید)

☆ لوگ نفرت کے لیے کیسے وقت نکالتے ہیں جبکہ محبت کے لیے بھی زندگی کم ہے۔ (ایمرسن)

کیوں ٹھیک ہے ناں!

وضاحتیں صرف غلط ہونے پر نہیں دی جاتیں......کئی بار وضاحتیں ہم اس لیے بھی دیتے ہیں کہ سامنے والا ہمیں بے حد عزیز ہوتا ہے اور بوجھ صرف غلطیوں کا ہی تو نہیں ہوتا، چاہتوں کا بھی تو بوجھ ہوا کرتا ہے۔

از: فرح طاہر، ملتان

غزل

اس ویران دل کی دنیا میں جو شہر تھے وہ اجڑ گئے
تیز آندھی کی زد میں آ کے جو عکس تھے وہ بکھر گئے
قسمتوں کے زوال میں جو منزلوں میں غبار تھا
جو ساتھ دیتے تھے قدم، قدم وہ لوگ اب کدھر گئے
یہ وقت، وقت کی بات ہے یہ مقدروں کے ہیں فیصلے
جنہیں زندگی کی تلاش تھی وہی لوگ جاں سے گزر گئے
یہ گئے دنوں کا احوال ہے ٹوٹے بھرم پہ ملال کیا
وہیں پہ لگی ٹھوکر ہمیں لیے پارۂ دل جدھر گئے
اس ہار جیت کی دوڑ میں سنبھلنا پڑتا ہے بار، بار
یہ اور ہیں جو بگڑ گئے وہ اور تھے جو سدھر گئے
انہی منزلوں کی تلاش میں شبانہ تھی تنہا بہت
کہ میرے نصیب کے قافلے کسی اور راہ سے گزر گئے

کاوش: شبانہ نواز، لیہ

خوش فہمی

کسی کے کچھ نہیں ہیں ہم
مگر پھر بھی نہ جانے کیوں
ہمیں یہ وہم رہتا ہے
کوئی تو منتظر ہوگا

از: سیدہ غزالہ عالم، لانڈھی کراچی

وفا سیکھو

وفا کرو تو ہمیشہ دریا کے کنارے پر اُگی گھاس کی طرح
کہ جب ڈوبنے والا اسے پکڑتا ہے تو

یا تو وہ اس کو بچا لیتی ہے
یا پھر خود بھی اس کے ساتھ ہی ڈوب جاتی ہے

از: کائنات عبدالحلیم، میرپور خاص

پاکیزہ بہنوں کے لیے

خصوصی تحفہ

آپریشن مت کروائیں دل کی بند شریانیں کھولیں۔

یہ نسخہ کولیسٹرول لیول، ہائی بلڈ پریشر، اسکن، بالوں کے امراض، موٹاپا، نمونیہ، دمہ، گاڑھا خون جیسی بیماریوں کو جڑ سے نکالتا اور مریض کو آرام دیتا ہے خاص کر دل کی بند شریانیں، سکڑتی شریانیں دل سے متعلق ہر طرح کی بیماری......انجائنا کا بہترین علاج ہے۔ گزارش ہے خدا کے لیے بازار کی بنی ہوئی یہ دوائی نہ خریدیں خود بنائیں خالص صاف اور کم قیمت پر اصلی علاج کریں۔

نسخہ:

دیسی لہسن کا رس، تین کپ۔ دیسی ادرک کا رس، تین کپ۔ لیموں کا رس، تین کپ۔ سیب کا سرکہ، تین کپ کو مٹی کی ہانڈی یا نان اسٹک یا کانچ کے برتن میں ڈال کر ہلکی آنچ پر پکائیں جب یہ ایک حصہ ختم ہو کر تین حصہ رہ جائے تو اتار کر اسی مقدار میں شہد ملائیں خالص مل جائے تو کیا کہنے ورنہ کوئی بھی کمپنی کا شہد لیں۔

طریقۂ استعمال:

دل کے لیے: تین کھانے کے چمچ نہار منہ اور رات کو مریض کو دیں۔

موٹاپے کے لیے: ایک گلاس پانی میں تین چمچہ ملا کر تین ٹائم دیں۔

کولیسٹرول اور دیگر امراض کے لیے، تین ٹائم روزانہ تین چمچہ دیں۔

نیاز مند: بیگم کاظمی، راول پنڈی

اپنی پہچان کو زندہ رکھنا ہے

ہم نے اپنے اردگرد احساس کمتری کے شکار عجب کردار دیکھے ہیں۔ لاشعور میں چھپا ہوا خوف ان کے ہر عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے تصرف میں موجود تمام ستارے بے اعتنائی کا شکار ہو کر اپنی تابناکی کھو چکے ہیں۔ اور وہ انجانے ستاروں کے تعاقب میں عقل و خرد سے بیگانہ ہو رہے ہیں۔ اپنی زبان کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اور گفتگو میں پرائی زبانوں کی غلط اور بلا ضرورت الفاظ کی بھرمار کو طبقۂ اشرفیہ میں اپنی پہچان کا سبب گردانتے ہیں۔ سادہ اور بے تکلف زندگیوں کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ رویّوں میں عجب تصنع اور بناوٹ در آئی ہے۔ ہر لمحہ مال و زر کی تمنا نے اخلاقی اقدار سے بیگانہ کر دیا ہے۔ زندہ اور آزاد قوموں کی طرح سر بلند ہو کر جینے کا تصور ختم ہو چکا ہے۔ ایسے میں ایک مہربان روشنی ہمیں آگہی کا پیغام دے رہی ہے کہ......! ہم نے اس ہجوم میں اپنی ذات کی پہچان کو زندہ رکھنا ہے۔ ہاں......زندہ رکھنا ہے۔

مرسلہ: رابعہ سرفراز، راول پنڈی

پیار

کچھ کہتے، کہتے رہ جانا
اور رکتے، رکتے کہہ جانا
یہ پیار تو ایسا ہوتا ہے
جو دل میں درد سموتا ہے
اب بھیگی، بھیگی شاموں میں
اِک چہرہ ہر پل آنکھوں میں
ہنستا بھی ہے، روتا بھی ہے
دل میں درد ڈبوتا بھی ہے
پھر نظروں سے کھو جاتا ہے
اور خوابوں کو مہکاتا ہے
کہ اک احساس مٹانے کو
کہ دل میں درد بسانے کو
ہر دھڑکن میں ہر آنگن میں
کہ چھنکتے ہاتھ کے کنگن میں
یہ رنگ نظر بس آتا ہے

ایسا اکثر ہو جاتا ہے
دل کا داغ انوکھا ہے
خانم یہ سب تو دھوکا ہے

کلام: فریدہ خانم، لاہور

پاکیزہ باتیں

☆جب کوئی مسلمان یتیم کے سر پر دست شفقت پھیرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے حساب میں اتنی نیکیاں لکھ دیتا ہے جتنے یتیم کے سر پر بال ہوتے ہیں۔

☆بیماری میں جب تک ہمت ہو چلتے پھرتے رہنا چاہیے۔

☆مسلمان جتنا غیرت مند ہوگا اتنا ہی پاک دامن ہوگا۔

☆مشورہ کر لینا بہترین مددگاری ہے۔

☆ناراض دوست کو منالو اور اچھے طریقے سے راضی کر کے اس کے شر سے محفوظ ہو جاؤ کیونکہ وہ بہت سے راز جانتا ہے۔

☆مشورے سے بہتر کوئی اقدام بھروسے کے قابل نہیں۔

☆عورت کا جہاد شوہر سے حسنِ معاشرت ہے۔

☆حاجت مند کو تھوڑا دینے سے نہ شرماؤ کیونکہ بالکل خالی ہاتھ لوٹانا تو بہت گری ہوئی بات ہے۔

☆غذا سے جسم کو، قناعت سے روح کو راحت پہنچتی ہے۔

☆پیٹ بھر کے کھانا اور فاقے کرنا دونوں عبادت کے لیے بہتر نہیں۔

☆جو بندوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ خدا تعالیٰ کا بھی شکر گزار نہیں ہو سکتا۔

از: نگہت غفار، کراچی

پیکج کی مار

☆ایک شیخ صاحب فون پر ایک گھنٹے تک بات کرتے رہے پھر اس کے بعد اچانک بے ہوش ہو گئے۔ آخر کیوں...... پتا چلا کہ وہ پیکج کروانا بھول گئے تھے۔

از: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

غزل

ہجوم یاران وحشتاں
کروں میں کیا تنہا یہاں
دل میں ہے یاد ناتواں
اجڑی ہوں میں ناگہاں
بھٹکتی پھری میں دربدر
ہر سمت عشق وحشتاں
تن اجلا، اجلا ہے نور سا
روح زخم، زخم ہے کہکشاں
میں ماتمی ملبوس میں
ہوں عشق کی نوحہ کناں
وہ رنگ و بو کی محفلوں میں
یوں خوش گماں و شادماں
گُل مر گئے ہیں سب کے سب
کیوں تتلیوں کو مبارکاں

شاعرہ: سیدہ علیشاہ، بہاول پور

اقوال زریں

☆ہمیشہ یہی سوچ رکھو کہ میرے رب نے مجھے بہت کچھ دیا ہے اگر میرے اعمال کے برابر ملتا تو میرے پاس کچھ بھی نہ ہوتا۔

☆زندگی ایک سفر ہے اگر دیکھ کر چلو گے تو منزل ملے گی ورنہ گہری کھائی میں گر جاؤ گے۔

☆سادگی ایمان کی علامت ہے۔

☆حیا اور کم بولنا ایمان کی شاخیں ہیں۔

از: سیدہ ممتاز خانم، کراچی

غزل

زندگی کا نشاں نہیں ہوتا
تو جہاں میری جاں نہیں ہوتا
جانے کیوں تیری بے رخی پہ بھی
دل میرا بدگماں نہیں ہوتا
میں زخموں کا سہارا لیتی ہوں
جب میرا مہرباں نہیں ہوتا

آشیاں روز، روز جلتا نہیں
روز ہی امتحاں نہیں ہوتا
دل کے جلنے کو کس نے دیکھا ہے
جلتے دل میں دھواں نہیں ہوتا
ہم سنائیں تو کیا سنائیں فری
دردِ دل داستاں نہیں ہوتا

کلام: فریدہ فری، لاہور

انسان بچ سکتا ہے

1۔ تکبر سے سلام کے ذریعے۔
2۔ مصیبت سے صدقے کے ذریعے۔
3۔ بیماری سے دعا کے ذریعے۔
4۔ شیطان سے علم کے ذریعے۔
5۔ گناہ سے اللہ کے خوف کے ذریعے۔

دوستی

☆دنیا کی سب سے مہنگی چیز عزت اور سب سے قیمتی دوستی ہے۔

☆اس کے ساتھ دوستی کرو جو نیکی کر کے بھول جائے۔

☆دوست نما دشمن سب سے زیادہ خطرناک ہیں۔

سچ

ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کو ایک مانتے ہیں لیکن ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اللہ کی ایک نہیں مانتے۔

دستک

اگر اللہ تمہاری دعائیں پوری کر رہا ہے تو وہ تمہارا یقین بڑھا رہا ہے۔ اگر تمہاری دعائیں پوری کرنے میں دیر کر رہا ہے تو تمہارا صبر بڑھا رہا ہے۔ اگر تمہاری دعاؤں کا جواب نہیں دیتا تو آزما رہا ہے لہٰذا آپ دعا مانگتے رہیں، دعا ایک دستک ہے اور دستک بار، بار دینے سے دروازہ چاہے دیر سے کھلے، کھلتا ضرور ہے۔

مرسلہ: ناظمہ شاہین اعوان، واہ کینٹ

آس کی روشنی

اندھیرے راستے پہ چلتے چلتے
میرے زخمی قدم اب تھکنے لگے ہیں
میری روح پہ لگے گھاؤ بھی اب
قطرہ، قطرہ اب لہو دینے لگے ہیں
سامنے حد نگاہ تک تاریکیاں ہیں
مرے حوصلے بھی اب پست پڑنے لگے ہیں
نہ روشنی ہے نہ منزل کا کوئی نشاں
مری بے نور آنکھوں کے خواب جلنے لگے ہیں
کہیں سے پھر صبحِ نو کی نوید آئے
ضیاؔ اس آس پر پھر جینے لگے ہیں

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

کیسے، کیسے کردار

کونے والی خالہ کی وجہ سے جتنی تباہی اس محلے میں آئی تھی اتنی تو شاید ہیروشیما اور ناگاساکی پر بمباری کے نتیجے میں بھی نہ آئی ہوگی۔ تصویر کے دو چھوڑ تیسرا رخ تک دکھا دیتیں۔ رہتی کونے والے مکان میں تھیں لیکن پائی محلے کے ہر گھر میں جاتی تھیں۔ دوسروں کے معاملاتِ زندگی میں وہ مداخلت کرتیں کہ توبہ الٰہی..... فہمیدہ خالہ کے ہاں ان کے ازلی پھوہڑپن کے باعث دھلے کپڑے گٹھری میں بندھے پڑے تھے، ڈرائنگ روم کے صوفے پر فوراً بیچ میں لقمہ دیا۔

"اے بھنو یہ کیا تُک ہے ڈرائنگ روم میں گٹھری؟"

فہمیدہ خالہ کی بیٹی جو پاس ہی براجمان تھی اور موبائل میں پوری طرح غرق تھی پٹ سے بولی۔

"خالہ جان ڈرائنگ روم میں گٹھری ہوگی اب گٹھری میں تو ڈرائنگ روم ہونے سے رہا ناں۔"

ایسا کرارا جواب خالہ سے کہاں ہضم ہوتا فہمیدہ خالہ کو نئی نسل کی زبان درازی پر خوب، خوب لیکچر دیے پھر محلے بھر میں بدنام کیا سو الگ......

تحریر: صائمہ سید، کراچی

☆☆☆



☆تسلیم شیخ، لاہور
لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہے
زندہ رہے تو پھر ملیں گے
مگر آپ سے مل کے ایسا لگا
ملتے رہے تو زندہ رہیں گے
☆نادیہ، راول پنڈی
ہوئی ہے مجھ پہ عنایت خدا خیر کرے
میرے حصے میں محبت خدا خیر کرے
پیار کرتے ہیں وہ تسلیم کیے بیٹھے ہیں
لائے آنکھوں میں محبت خدا! خیر کرے
☆فریدہ فری، لاہور
جو الجھن تھی درپیش حل ہوگئی
تجھے دیکھتے ہی غزل ہوگئی
میرے دل میں جب سے مکیں ہو تم
یہی کوٹھری اِک محل ہوگئی
☆تسنیم کوثر، کراچی
روز کھالیتے ہیں ہنستے ہوئے چہروں سے فریب
کیا کریں اپنی نگاہوں میں مروت ہے وہی
☆نیر فہیم خان، کراچی
کچھ تو مشکل ہے بہت کارِ محبت اور کچھ
یار لوگوں سے مشقت نہیں کی جاسکتی
☆حسینہ ممتاز خان، اسلام آباد
ضبطِ غم نے بچالیا ورنہ
ہم کوئی داستان ہوجاتے
☆فریدہ فضل، یو ایس اے
ایک تصویر تھی اور وہ بھی کہیں گم کردی
عمر بھر ڈھونڈنا اب اپنی کتابوں میں مجھے

☆مہرین ضیا، کیماڑی
یا تو مری بینائی پہ ہے خوف مسلط
یا نہر کے پانی میں شجر کانپ رہا ہے
بجھنے نہیں دوں گا میں کبھی ہجر کے صدمے
دل میں تری یادوں کا شرر کانپ رہا ہے
☆زرینہ خان، بہارہ کہو
ہنستے ہوئے غنچے یہ مہکتے ہوئے رستے
سوئی ہوئی یادوں کو جگا دیتے رہیں گے
آہوں کے ترنم کبھی اشکوں کی زباں میں
ہم بھولنے والے کو صدا دیتے رہیں گے
☆نگہت اعوان، سرگودھا
تمہارے حسن کی ہیبت سبھی پہ طاری ہے
تمہارے آگے کسی کی کوئی مجال نہیں
تمہارے ہوتے ہر اک لمحہ ہر صدی تھی مری
تمہارے بعد کوئی سال میرا سال نہیں
☆نیلوفر خان، بہارہ کہو
ہمیں یہ زعم رہا اب کے وہ پکاریں گے
انہیں یہ ضد تھی کہ ہر بار ہم صدا دیتے
☆تمثیلہ لطیف، جوڑ ھالہ
بھلائے کون اذیت پسندیاں اس کی
خوشی کے ڈھیر میں صدمے تلاش کرتی تھی
عجیب ہجر پرستی تھی اس کی فطرت میں
شجر کے ٹوٹتے پتے تلاش کرتی تھی
☆ایلیا شیراز، لاہور
خزاں کا جبر تو سینے پہ روک لیتے ہیں
ہمیں اداس بہاروں سے خوف آتا ہے
ملے ہیں دوستوں بیساکھیوں سے غم اتنے
مرے بدن کو سہاروں سے خوف آتا ہے

☆تہمینہ آرزو، جہلم
اسے عشق تھا مری ذات سے
مجھے عمر بھر یہ گماں رہا
☆عروبہ ناز، کوٹلی
ترے کوچے سے اب میرا تعلق واجبی سا ہے
مگر جب بھی گزرتا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
ہزاروں موسموں کی حکمرانی ہے مرے دل پر
وصی میں جب بھی ہنستا ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
☆فوزیہ احسان، لاہور
میری تو خیر مگر تیرا دکھ زیادہ ہے
کہ جس کو تو نے گنوایا ہے، چاہتا تھا تجھے
☆انیلا ظفر، بہارہ کہو
وفا، خلوص، محبت ضرور ہوں گے کہیں
کبھی ملیں تو تبرک سمجھ کے لے آنا
☆صائمہ سید، کراچی
ستارے رات کے آنسو ہیں پھول دل کی ہنسی
ہر اک رنگ میں اے جانِ رنگ و بو تو ہے
☆گل شاد نذیر، اسلام آباد
خدا کرے کہ سلامت رہیں وہ لوگ جنہیں
بڑے خلوص سے ہم روز یاد کرتے ہیں
☆رابعہ یاسمین، راول پنڈی
اچھا خاصا بیٹھے بیٹھے گم ہوجاتا ہوں
اب میں اکثر میں نہیں رہتا تم ہوجاتا ہوں
☆عمارہ خان، کراچی
منیر اس کو محبت کہا ہے لوگوں نے
کہ خون بن کے رگوں میں اتر گیا ہے کوئی
☆ثمینہ کوکب، جہلم
بارشوں کے چہرے پر آنسوؤں سے لکھنا تھا
کوئی کچھ نہ پڑھ نہ پائے ایسی روشنائی دی
کس نے میری پلکوں پر تتلیوں کے پر رکھے
آج اپنی آہٹ بھی دیر تک سنائی دی
☆تسنیم چوہدری، آزاد کشمیر
کبھی گلاب سے مہکیں کبھی چراغ جلیں
سخن کے باب میں یہ بھی کمال ہونا تھا

☆صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ
گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں
کوئی بدلی تیری پازیب سے ٹکرائی ہے
☆رابعہ، کراچی
چارہ گر آج ستاروں کی قسم کھا کے بتا
کس نے انساں کو تبسم کے لیے ترسایا
نذر کرتا رہا میں پھول سے جذبات اسے
جس نے پتھر کے کھلونوں سے مجھے بہلایا
☆عظمیٰ زیدی، اسلام آباد
جی جلاتا ہوں اور سوچتا ہوں
رائگاں یہ ہنر نہ جائے کہیں
☆نسا آصف، عارف والہ
وہ مجھ کو سونپ گیا فرقتیں دسمبر کی
درختِ جاں پہ وہی سردیوں کا موسم ہے
☆حرا قریشی، ملتان
اپنے نیرنگیِ انداز کا اعجاز تو دیکھ
ابھی شوخی تھی، ابھی اس کا حیا ہوجانا
☆سعیدہ بانو، لوئر مال، مری
یادوں کو محبت کے گلابوں میں پرو کر
ہم کتنی نفاست سے تمہیں سوچ رہے ہیں
☆ممتاز خانم، کراچی
بڑا محسوس ہوتا ہے
ترا محسوس نہ کرنا
☆فریدہ خانم، لاہور
کتاب خانۂ ہستی کی وہ کتاب ہوں میں
جسے کسی نے کبھی کھول کر نہیں دیکھا
☆بلقیس جعفر، کوئٹہ
بانسری سے سیکھ لیجیے سبق زندگی جینے کا
کتنے چھید ہیں سینے میں پھر بھی گنگناتی ہے
☆فرح طاہر، ملتان
چوڑی ٹوٹی تو ترے عشق کا گجرا پہنا
خالی رکھی ہی نہیں ہم نے کلائی اپنی
☆☆☆

منتخب غزلیں

مارچ ناسور مقبول عام شاعر ناصر کاظمی کا ماہِ وفات ہے اسی مناسبت سے اس غزلیہ شاعر کا خوب صورت کلام آپ کے ذوق کی نذر

دیارِ دل کی رات میں چراغ سا جلا گیا
ملا نہیں تو کیا ہوا وہ شکل تو دکھا گیا

وہ دوستی تو خیر اب نصیبِ دشمناں ہوئی
وہ چھوٹی چھوٹی رنجشوں کا لطف بھی چلا گیا

جدائیوں کے زخم دردِ زندگی نے بھر دیے
تجھے بھی نیند آ گئی مجھے بھی صبر آ گیا

پکارتی ہیں فرصتیں کہاں گئیں وہ صحبتیں
زمیں نگل گئی انہیں کہ آسمان کھا گیا

یہ صبح کی سفیدیاں یہ دوپہر کی زردیاں
اب آئینے میں دیکھتا ہوں میں کہاں چلا گیا

یہ کس خوشی کی ریت پر غموں کو نیند آ گئی
وہ لہر کس طرف گئی یہ میں کہاں سما گیا

گئے دنوں کی لاش پر پڑے رہو گے کب تلک
الم کشو اٹھو کہ آفتاب سر پہ آ گیا

اپنی دُھن میں رہتا ہوں
میں بھی تیرے جیسا ہوں

او پچھلی رُت کے ساتھی
اب کے برس میں تنہا ہوں

تیری گلی میں سارا دن
دکھ کے کنکر چُنتا ہوں

میرا دیا جلائے کون
میں ترا خالی کمرا ہوں

تیرے سوا مجھے پہنے کون
میں ترے تن کا کپڑا ہوں

تو جیون کی بھری گلی
میں جنگل کا رستہ ہوں

آتی رت مجھے روئے گی
جاتی رت کا جھونکا ہوں

اپنی لہر ہے اپنا روگ
دریا ہوں اور پیاسا ہوں

8 دسمبر 1925ء تا 2 مارچ 1972ء

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں

بہنو آج بات اسٹرابیری سے شروع کرتے ہیں جس کی آج کل بہار ہی بہار ہے۔ ہم ہمیشہ سے اسٹرابیری آئس کریم یا کسٹرڈ ہی سنتے آرہے ہیں آج اس کا شیک اور یوگرٹ بنانے کی بھی ترکیب بتاتے ہیں۔ یہ ترکیب نفضہ بتول نے بہارہ کہو سے بھیجی ہے۔

اسٹرابیری شیک اور یوگرٹ

آدھا کلو اسٹرابیری میں دو ٹیبل اسپون شکر اور دو گلاس دودھ ڈال کر بلینڈر میں خوب چلالیں۔ مزیدار شیک تیار ہے، موسم چونکہ سرد ہے اس لیے برف کی بالکل ضرورت نہیں...... اس میں آپ، کیلے، سیب اور خربوزہ بھی مکس کرسکتی ہیں اور اسٹرابیری چار پانچ بھی ہیں تو کوئی مسئلہ نہیں۔ چاہیں تو ایک کپ پانی بھی ڈال دیں۔

اسی طرح دہی کے ساتھ بلینڈ کریں یا پھر باریک، باریک کاٹ کر میٹھے دہی میں ملا کر کھائیں۔ چینی کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی طرح سادہ ونیلا آئس کریم میں بھی تازہ اسٹرابیری کاٹ کر ڈالیں۔ یہ پھل تھوڑے عرصے کے لیے آتا ہے مگر آپ اسے فریزڈ بھی کرسکتی ہیں۔ رشین سلاد میں سیب کے ساتھ اسٹرابیری بھی کاٹ کر ڈالیں غرضیکہ مصنوعی ذائقوں سے بچیں اور قدرت کے ذائقوں سے لطف اندوز ہوں۔ یاد رکھیں بیریز...اور کیلوں کو ''برین فوڈ'' (دماغی خوراک) بھی کہا جاتا ہے۔

چکن پوٹلی

اشیا: مرغی کا قیمہ، ایک کپ۔ سویا ساس، ایک کھانے کا چمچ۔ سرکہ، ایک چائے کا چمچ۔ بند گوبھی (باریک چوپ کرلیں) دو کپ۔ کارن فلور، دو کھانے کے چمچ۔ چینی، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، حسبِ ذائقہ۔ تیل، دو چائے کے چمچ۔ لہسن (چوپ کرلیں)، ایک چائے کا چمچ۔

آٹا گوندھنے کے لیے۔
میدہ، دو کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ گرم پانی، حسبِ ضرورت۔

لئی بنانے کے لیے۔
میدہ، دو کھانے کے چمچ۔ پانی، ایک چوتھائی کپ۔

سوس کے لیے۔
املی کا رس، آدھا کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ ہری پیاز، چوپ کرلیں، آدھا کپ۔ لہسن، (باریک چوپ کرلیں)، ایک چائے کا چمچ۔ لیموں کا رس، ایک کھانے کا چمچ۔ سرخ مرچ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ چینی، ایک کھانے کا چمچ۔

ترکیب: ایک سوس پین میں گرم تیل میں قیمہ اور لہسن فرائی کریں قیمے کا پانی خشک ہوجائے تو نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، سرکہ، سویا سوس، بند گوبھی اور چینی ڈال کر بھونیں۔ پھر کارن فلور ایک کھانے کا چمچ پانی میں مکس کر کے ڈالیں۔ گاڑھا ہوجائے تو چولھا بند کردیں اور یہ مکسچر ٹھنڈا کرلیں۔ میدہ ایک برتن میں نکال کر نمک ڈال کر گرم پانی سے گوندھ لیں اور کور کر کے آدھا گھنٹا چھوڑ دیں، سوس بنانے کے لیے املی کے گاڑھے رس میں نمک، ہری پیاز، لیموں کا رس، چینی، لہسن اور لال مرچ پاؤڈر مکس کردیں، پیالے میں نکال کر رکھیں۔

آٹے کی بڑی روٹی بیل لیں اور کٹر سے گول گول کاٹ لیں اس میں گوشت کا مکسچر رکھ کر پوٹلی سی بنالیں۔ میدہ اور پانی کو مکس کر کے لئی بنالیں اور اس لئی سے پوٹلیاں سیل کرلیں اور اس طرح سب پوٹلیاں بنالیں۔ ایک دیگچی میں پانی ابلنے رکھ دیں، ابال آنے پر یہ پوٹلیاں ڈال کر پانچ منٹ پکائیں پھر نکال کر سوس کے ساتھ پیش کریں۔

مرسلہ: نفیسہ آرا، راس الخیمہ

چکن اینڈ رائس سوپ

اشیا: چکن، (بون لیس، ابلی ہوئی) دو کپ۔ چاول، (نرم ابلے ہوئے) دو کپ۔ لہسن کے جوے، پانچ، چھ عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ کریم، دو کھانے کے چمچ۔ دودھ، آدھا کپ۔ سفید مرچ پاؤڈر، آدھا چائے کا چمچ۔ چائنیز نمک، آدھا چائے کا چمچ۔ سویا ساس، ایک کھانے کا چمچ۔ سرکہ، ایک کھانے کا چمچ۔ کارن فلور، ایک کھانے کا چمچ۔ پانی، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: ابلی ہوئی چکن کے ریشے کرلیں اور اس میں ابلے ہوئے چاول، سرکہ، سفید مرچ پاؤڈر، چائنیز نمک اور سویا سوس ڈال کر مکس کرلیں اس کے بعد اس میں دودھ شامل کر کے آٹھ سے دس منٹ پکائیں کارن فلور پانی میں گھول کر شامل کر کے مسلسل چمچ چلائیں جب گاڑھا ہوجائے تو کریم ڈال کر مکس کریں اور سرونگ باؤل میں نکال کر سویا ساس، چلی ساس اور کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔ یہ نئی طرح کی ڈش ہے ضرور ٹرائی کریں۔

مرسلہ: نگہت اعوان، سرگودھا

گلاوٹ گوشت سفید تل کے ساتھ

اشیا: گوشت، گائے کا (بون لیس)، ایک کلو۔ سفید تل، تین کھانے کے چمچ۔ پیاز (سلائس کاٹ لیں) دو عدد۔ دہی، ایک کپ۔ ادرک (چوپ کیا ہوا)، ایک چائے کا چمچ لہسن (چوپ کیا ہوا)، ایک چائے کا چمچ۔ سرخ مرچ پاؤڈر، ڈیڑھ کھانے کا چمچ۔ گرم مسالا پاؤڈر، ایک چائے کا چمچ۔ جائفل، جاوتری پاؤڈر، ایک چٹکی۔ کچا پپیتا پیسٹ، دو کھانے کے چمچ۔ ہری مرچیں، چھ سے سات عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ تیل، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: دیگچی میں تیل گرم کر کے پیاز ڈال کر فرائی کریں، براؤن ہوجائے تو پلیٹ میں نکال لیں۔ ایک برتن میں گوشت، براؤن کی ہوئی پیاز، دہی، ادرک، لہسن، سرخ مرچ پاؤڈر، گرم مسالا پاؤڈر، جائفل، جاوتری پاؤڈر، کچا پپیتا پیسٹ اور نمک ڈال کر تین گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اب اسی تیل میں میرینیٹ شدہ گوشت، سفید تل اور ہری مرچیں ڈال کر درمیانی آنچ پر گوشت گلنے تک پکائیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر ہرا دھنیا اور ہری مرچ چھڑک دیں اور چپاتی کے ساتھ سرو کریں۔

مرسلہ: عرشیہ جنید، کراچی

برمودہ رائس

اشیا: انڈے، چھ عدد۔ دہی، ایک کپ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ زیرہ (کُٹا ہوا) ایک چائے کا چمچ۔ ہری مرچ، (پیس لیں) تین عدد۔ لہسن پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ ادرک پیسٹ، آدھا کھانے کا چمچ۔ تیل، آدھا کپ۔ سرکہ، ایک کھانے کا چمچ۔ پیاز، (باریک چوپ کرلیں) دو عدد۔ چاول سیلا، (بھگو دیں) دو کپ۔ ثابت گرم مسالا، ایک چائے کا چمچ۔ ہرا دھنیا، (چوپ کرلیں) ایک گٹھی۔ ہری مرچیں، چار عدد ثابت۔ شملہ مرچ، دو عدد۔ ٹماٹر، (چوپ کرلیں) دو عدد۔ زعفرانی رنگ، ایک چٹکی۔

ترکیب: انڈوں کو ابال کر کانٹے سے گود لیں۔ چاولوں کو دو گھنٹے بھگو کر نمک اور ثابت گرم مسالا ڈال کر ابال لیں۔ جب چاول ابل جائیں تو ایک چمچ سرکہ ڈال کر مکس کریں اور چھالی میں ڈال کر بقیہ پانی نکال دیں۔ دیگچی میں تیل گرم کریں، اس میں پیاز فرائی کریں آدھے کپ دہی میں نمک، پسی ہری مرچ، زیرہ، لہسن، ادرک پیسٹ مکس کر کے فرائی پیاز میں ڈالیں ساتھ میں ابلے انڈے بھی ڈالیں۔ انڈوں میں مسالا اچھی طرح لگ جائے تو انڈے نکال لیں۔ شملہ مرچ، ٹماٹر ڈالیں ایک منٹ تک پکائیں۔ آدھے چاول مکس کردیں، بچے ہوئے دہی میں زعفرانی رنگ، ہری مرچیں، ہرا دھنیا مکس کردیں اور باقی چاول ڈال کر رنگ والا دہی پھیلائیں اور پانچ منٹ دم پر رکھ دیں پھر چاول مکس کردیں، ڈش میں نکال کر انڈے رکھ کر سرو کریں۔

مرسلہ: سنبل ملک اعوان، شاہدرہ

بزمِ پاکیزہ — پاکیزہ بہنیں

پہلا انعام یافتہ سوال

☆ اسما کاشف...... لطیف آباد

سوال: انسان کا اصل روپ دیکھنا ہو تو اسے کس حالت میں دیکھیں؟

جواب: غصے میں۔

دوسرا انعام یافتہ سوال

☆ ماہ رخ...... گریانی لائن

سوال: کسی سیاست داں کا نشہ کب ہرن ہوتا ہے؟

جواب: جب از خود نوٹس لیا جاتا ہے۔

☆ پروین افضل شاہین...... بہاول نگر

سوال: لوگ خوب صورت چہروں کو چاند سے کیوں تشبیہہ دیتے ہیں، سورج سے کیوں نہیں؟

جواب: سورج پر نظر نہیں ٹھہرتی ناں...... چاند کو دیکھنا ٹھنڈک دیتا ہے۔

سوال: میرے ویران کمرے کی کھڑکی سے جب انہوں نے؟

جواب: جھانکا اور کہا...... ”گھوڑے بیچ کر سوتی ہو کیا...... مجھے پائپ سے آنا پڑا۔“

سوال: زیادہ تر لڑکیوں کا دل کس بات پر ٹوٹتا ہے؟

جواب: کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی بات پر مثلاً ”یہ کیا تم بال کھول کر چڑیل بنی پھر رہی ہو؟“

☆ ناعمہ تحریم...... کراچی

سوال: مہنگائی کے جن کو قابو میں کرنے کا آزمودہ ترین ٹوٹکا بتائیں؟

جواب: چیزیں خریدنا چھوڑ دیں۔

سوال: نو دو گیارہ ہو جاؤ سے کیا مراد ہے؟

جواب: دور دفعان ہو جاؤ...... سمجھ میں آیا۔

سوال: پاکستان سے مہنگائی اور لوڈ شیڈنگ ختم کرنے کا کون سا فارمولا ہے؟

جواب: خواب بُنتے رہو اور سپنے دیکھتے رہو۔

☆ سائرہ ارم...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: عقل بادام کھانے سے آتی ہے یا دھوکا کھانے سے؟

جواب: اللہ ہی عقل دلائے تو دلائے ورنہ بندہ تو کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔

سوال: لوگ دوسروں کے گلے میں اشکوں کی مالا پہنا کر خوش کیوں ہوتے ہیں؟

جواب: خود کو خود نمائی کی مالا جو پہننا ہوتی ہے۔

☆ ساجدہ ظفر...... کمالیہ

سوال: آنسو پلکوں کی دیواروں سے ٹکرا کر کب خودکشی کرتے ہیں؟

جواب: جب برداشت کا پل کراس ہوجائے۔

سوال: شوہر لوگ کب شادی شدہ ہونے پر پچھتاتے ہیں؟

جواب: ہاہاہا...... بیشتر اوقات......

سوال: کہتے ہیں دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے تو کیا غریبی بھی......

جواب: کیوں نہیں...... آج کل ہر طرف یہی تو ہے۔

☆ ارم کمال...... فیصل آباد

سوال: مہکتی مہندی، چھنکتی بندیا، مہکے ہوئے پھولوں کا خمار، ہنستا اور گنگناتا ہوا دل آخر کس بات کا پتا

دے رہے ہیں؟

جواب: تم نے کوئی رومینٹک فلم دیکھ لی ہے۔

سوال: باجی! جلدی سے بتادیں پیار کے درخت کو کیسے ہرا بھرا رکھا جاسکتا ہے؟

جواب: خلوص ومحبت کے آبشار سے۔

سوال: آج کل رشتوں میں سے محبت کا وٹامن کیوں کم ہوتا جارہا ہے؟

جواب: وہ بھی تو دو نمبر آرہا ہے ناں......

سوال: ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے بھلا کیسے؟

جواب: پکایا بیچاری نند نے اور تم نے لپک کر ٹرے سنبھال لی، مہمانوں کے سامنے یہی تو ہے۔

☆ حمنیٰ قندیل......ٹوبہ ٹیک سنگھ

سوال: اگر ساس کی گردن میں درد ہو تو بہو بیگم کو کیا کرنا چاہیے؟

جواب: کرائے ٹیکھو پھر پوچھنا۔

سوال: اگر ساس اور نند کی سالگرہ ایک ہی دن ہو تو کیا تحفہ دینا چاہیے؟

جواب: جائے نماز اور تسبیح...... بولتی بند!

☆ نیر فہیم......کراچی

سوال: ساس کے ماتھے کے بل ٹھیک کرتے، کرتے اپنے ہی کس بل نکل جائیں تو کیا کریں؟

جواب: میاں سے مضبوط سا پیچ کس منگوالو۔

سوال: کیا دشمنی کے بھی معیار ہوا کرتے ہیں؟

جواب: ہاں جیسے دوستی کے ہوتے ہیں۔

☆ زرمین سرھیو......سندھ

سوال: یہ بڑی بڑی رائٹرز کی فیس بک آئی ڈی کہاں سے ملتی ہیں؟

جواب: فیس بک سے ہی ملتی ہیں ڈھونڈو تو صحیح۔

سوال: جو لکھاری پوری کہانی کاپی کرے تو اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟

جواب: اس کے لیے ہدایت کی دعا، وہ بھی انسان ہی تو ہے۔

☆ نسرین یاسین......حیدرآباد

سوال: فنون لطیفہ کسے کہتے ہیں؟

جواب: کاش کہ ساتھ لغت بھی تم پڑھ لیتیں۔

سوال: دیرینہ خواہش کسے کہتے ہیں؟

جواب: لغت پڑھنے کی خواہش جو شاید کبھی پوری ہو۔

سوال: اماں پٹاخا، بیٹی بم تو شوہر کیا ہوگا؟

جواب: شکار اور کیا۔

☆ ثمینہ کوکب......جہلم

سوال: یادیں دل کے اندر زخم کیوں بنا دیتی ہیں؟

جواب: یادوں کے ساتھ مرہم بھی رکھ دیا کرو، ناں زخم بھر بھی جائے گا۔

☆ شاہین مسعود......کمالیہ

سوال: لڑتے وقت مردوں کے ہاتھ گریبان اور عورتوں کے ہاتھ بالوں میں کیوں جاتے ہیں؟

جواب: جس پر جس کا بس چلے بی بی......

سوال: اگر کوئی آپ کو پھونکوں سے بلب بجھانے کو کہے تو......؟

جواب: اس کی عقل پر شک کے سوا کیا ہوگا۔

☆ مارہ رخ......گریانی لائن

سوال: عورت سب سے زیادہ خوف کس چیز سے کھاتی ہے؟

جواب: محبت واعتماد کے کھونے سے۔

سوال: ماں، بیٹے کو ادب سکھاتی ہے جبکہ بیوی؟

جواب: ماں اور بیٹے بلکہ پورے خاندان کو ادب سکھا دیتی ہے۔

☆ اسما کاشف......لطیف آباد

سوال: برے وقت کے ساتھی کون لوگ ہوتے ہیں؟

جواب: جو اس برے وقت سے تمہیں بچالیں۔

سوال: میرے سے میں جھوٹ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اس سے کیسے چھٹکارا مل سکتا ہے؟

جواب: پہلے جملہ صحیح کرو "میرے میں" کچھ نہیں ہوتا۔

☆☆☆



موسم سرما میں جلد کا خشک ہونا ایک عام بات ہے' ایسے میں اگر جلد کی حفاظت نہ کی جائے تو بے شمار مسائل لاحق ہوسکتے ہیں۔ سرد موسم میں لوشن اور کریم کا استعمال جلد کو نمی فراہم کرتا ہے، جلد چکنی ہو، خشک ہو یا نارمل ہو یعنی جلد کسی بھی قسم کی ہو سردیوں میں اس کی خاص حفاظت کی ضرورت ہوتی ہے۔ رات سونے سے قبل کسی معیاری موئسچرائزنگ کریم، لوشن یا گھریلو بنی ہوئی کریم سے چہرے کا مساج کریں اور صبح کسی اچھے صابن یا فیس واش سے چہرہ دھولیں۔ جلد نرم وملائم اور خوب تر وتازہ ہوجائے گی لیکن یہ سب عارضی ہوگا۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کی جلد سردیوں میں بھی خوب تر وتازہ رہے تو قدرتی اجزا سے اپنی جلد کی حفاظت اپنا معمول بنالیں۔ ذیل میں ہم چند قدرتی اجزا پر مشتمل گھریلو نسخے پیش کررہے ہیں۔

☆ موسم سرما میں چہرہ کھچا، کھچا سا لگنے لگتا ہے اور چہرے کی جلد بے رونق ہوجاتی ہے۔ سردی کے موسم میں چہرے کی جلد کو خاص دیکھ بھال اور نگہداشت کی ضرورت ہوتی ہے، اس موسم میں چہرے کی نمی، تازگی اور شگفتگی برقرار رکھنے کے لیے قدرتی اجزا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ جلد کے لیے ہماری روایتی اشیا بہت زبردست ہوتی ہیں جیسے ابٹن، بیسن اور تھوڑا سا دودھ، ان کو مکس کرکے اگر جلد پر مساج کیا جائے تو اس کے اثرات حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

یہ اجزا آپ کی جلد کو صحت مند اور تازہ رکھنے کے ساتھ، ساتھ نم بھی رکھتے ہیں۔ جو کا آٹا، ابٹن، بیسن اور دودھ جلد کی خوب صورتی کے ضامن ہیں، جلد پر ان کے اثرات انتہائی مثبت اور خوشگوار ہوتے ہیں۔

☆ انڈے کی زردی میں سنگترے کا رس ملا کر چہرے پر لگائیں۔ گاجر پیس کر اس کا پیسٹ چہرے پر لگائیں اور کم سے کم نصف گھنٹے لگا رہنے دیں اور اس کے بعد ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ چہرہ شاداب محسوس ہوگا۔

☆ خشک جلد کے لیے چہرے پر انڈے کی زردی میں سرسوں کا تیل ملا کر لگائیں۔ گھر کا مکھن لگانے سے بھی چہرے کی جلد کی خشکی اور کھردرا پن دور ہوجاتا ہے۔

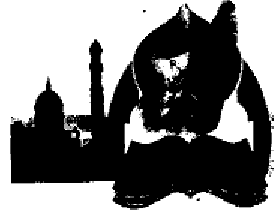
☆ عرقِ گلاب اور لیموں کے رس میں گلیسرین ملا کر لگانے سے چہرے کی خشکی دور ہوجاتی ہے۔ خشک جلد پر دودھ کی بالائی، خالص شہد ملا کر چہرے پر مالش کریں، چہرہ نرم وملائم اور شفاف ہوجائے گا۔ یہی عمل ہاتھوں اور گردن پر بھی کریں تو جلد کی خشکی دور ہوجائے گی اور جلد نرم وملائم ہوجائے گی۔

☆ اگر چہرے کی جلد مرجھائی ہوئی ہو تو کینو، مالٹے کے چھلکوں کو سکھا کر ایک پیالے دودھ میں بھگودیں، دو یا تین گھنٹے کے بعد جب چھلکے نرم ہوجائیں تو انہیں باریک پیس لیں اور رات کو سونے سے پہلے چہرے پر لگائیں چند دن کے استعمال سے چہرہ کھل اٹھے گا اور سردیوں میں چہرہ کھلا، کھلا نظر آئے گا۔ یہ آزمودہ نسخہ ہے۔

☆ چہرے کی رنگت نکھری ہوئی نہ ہو تو سرد ہواؤں سے مزید بے رونق لگنے لگتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بیسن میں دودھ، لیموں کا رس اور ایک چٹکی ہلدی ملا کر چہرے پر لگائیں، جب جلد خشک ہوجائے تو پانی سے دھولیں اس کے علاوہ چہرے کی رنگت نکھارنے کے لیے گاجر کا رس روئی کی مدد سے روزانہ چہرے پر لگائیں رنگت نکھر جائے گی اور چہرے کی شگفتگی صاف نظر آئے گی۔ گاجر اور چقندر کا جوس بھی پئیں۔

☆☆☆

روحانی مشورے



ادارہ

دعائیں مانگنے کا حکم شرعی ہے، پروردگار عالم نے دعا مانگنے کا حکم دیا اور اس کا طریقہ سلیقہ انبیائے کرام، صدیقین و صالحین نے ہمیں بتایا۔ دعا کرنا بھی ایک پوری عبادت ہے کہ جس میں مومن کا قلب و ذہن خالقِ حقیقی اور رسول پاک کی اطاعت کا اقرار کرتا ہے......اور احکام شرعی کے تحت اپنے اعمال بجا لاتا ہے، یقینِ کامل کے ساتھ دعا مانگنا، اپنے برادر مومن کے لیے پہلے دعا مانگنا اور پروردگار عالم پر مکمل بھروسا...... دعا کی قبولیت میں آسانیاں پیدا کرتا ہے۔

قرآن پاک مکمل شفا ہے اگر اسے سمجھو اور مادی طور پر دعا کی قبولیت سامنے نظر نہیں آ رہی ہو تو اس میں رازِ یزدانی جان کر شکرِ خدا ادا کرو کہ وہ کسی نہ کسی روپ میں ہمارے لیے آسانیاں ہی آسانیاں پیدا کرتا ہے۔

قبولیت دعا کا ایک مجرب عمل

قرآن پاک کا ستائیسواں سورۃ......سورۂ نمل آیت 62 کی تلاوت ......اول و آخر گیارہ مرتبہ درود پاک اور گیارہ ہی مرتبہ یہ آیت پڑھ کر کسی بھی شرعی حاجت کے لیے خلوصِ نیت سے دعا کیجیے......انشاءاللہ تعالیٰ قبول ہوگی۔

ترجمہ: ”بھلا کون بے قرار کی التجا قبول کرتا ہے، جب وہ اس سے دعا کرتا ہے اور (کون اس کی) تکلیف کو دور کرتا ہے اور (کون) تم کو زمین (اگلوں کا) جانشین بناتا ہے۔ یہ تو کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود بھی ہے (ہرگز نہیں مگر) تم بہت کم غور کرتے ہو۔“

صدقے کی فضیلت

☆صدقہ مومن کی حفاظت کرتا ہے۔

☆صدقہ تمہارے جان و مال کا محافظ ہے۔

☆مشکل میں گھرو تو اپنے رب سے صدقے کے ذریعے تجارت کرو۔

☆صدقہ مال کم نہیں کرتا بلکہ برکت عطا کرتا ہے۔

☆زندہ برادر کے ساتھ، ساتھ اپنے مرحومین کا بھی صدقہ نکالنا چاہیے۔

☆صدقہ قیامت کی ہولناکی کے خوف سے امان ہے۔

☆صدقہ علاج بھی ہے، دوا بھی اور شفا بھی۔

☆صدقہ دینے والے سے خیرِ کثیر اور بڑے اجر کا وعدہ ہے۔

ہزار نیکی مگر کیسے

جس طرح ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ اور تین مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھ لینے سے ایک قرآن پاک کا ثواب ملتا ہے اسی طرح ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ سو مرتبہ ”سبحان اللہ“ پڑھ لینے سے ہزار نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ بے شک خداوندِ عالم کا ذکرِ پاک آخرت سے نجات کا ذریعہ ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قرآن پاک ہی نہیں پڑھا جائے ہاں اس طرح سورۂ فاتحہ اپنے مرحومین پر پڑھنے سے قرآن پاک کا ثواب ضرور مل جائے گا۔

ذکرِ الٰہی کا نور دنیا میں بھی ساتھ رہتا ہے اور آخرت میں پل صراط پر آگے، آگے چلتا ہے۔

☆☆☆

زوجین میں محبت

☆آیت کریمہ سو مرتبہ پڑھ کر آپس میں محبت کے لیے دعا مانگیں اور...لاحول ولا قوۃ الا باللہ 40 مرتبہ پڑھ کر دعا مانگیں۔

☆یا ارحم الراحمین پانچ سو مرتبہ یا ستر مرتبہ یا سات مرتبہ پڑھ کر دعا مانگے اور یہ جملہ ادا کریں۔ ”اے اللہ! ہم دونوں میاں، بیوی میں محبت پیدا فرما۔“

ان وظائف کے اہتمام سے بہت ہی فائدہ ہوگا۔ مستقل پابندی سے پڑھیں اور اہتمام سے گناہوں سے بچیں اور کوشش کریں کہ کسی طرح کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جس سے اللہ تبارک و تعالیٰ ناراض ہو جائے۔ اس لیے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی ناراضی کے ساتھ دنیا و آخرت کی کوئی نعمت حاصل نہیں ہو سکتی اور بشری تقاضے سے اگر کبھی گناہ ہو بھی جائے تو آئندہ نہ کرنے کی نیت سے فوراً توبہ استغفار کرے۔

ایک جامع ترین دعا جس میں حضور کی 23 سال کی دعائیں موجود ہیں۔

ہر مسلمان مرد و عورت کو چاہیے کہ ہر فرض نماز کے بعد اس دعا کو ایک مرتبہ پڑھ لے تو بہت ہی بہتر ہے، چھوٹے بچوں کو بھی بچپن سے یہ دعا یاد کروا دینی چاہیے، اس دعا میں تمام بھلائیاں اللہ تبارک و تعالیٰ سے مانگی گئی ہیں اور تمام برائیوں، مصیبتوں سے حفاظت کی دعا مانگی گئی ہے۔

حضرت ابوامامہؓ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت زیادہ دعا مانگی لیکن ہمیں اس میں سے کچھ یاد نہیں رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ”کیا میں تمہیں ایسی جامع دعا نہ بتاؤں جس میں یہ سب کچھ آ جائے؟ تم یہ دعا مانگا کرو۔“

اللھم انا نسالک من خیر ما سالک منہ نبیک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ونعوذ بک من شر ما استعاذ منہ نبیک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وانت المستعان وعلیک البلاغ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ

ترجمہ: ”اے اللہ! ہم تجھ سے سوال کرتے ہیں ان تمام بھلائیوں کا جن کا سوال کیا تجھ سے تیرے حبیب پاک نے اور ہم تیری پناہ چاہتے ہیں ان تمام شرور سے جن سے پناہ چاہی حضرت محمدؐ نے اور تو ہی وہ ذات ہے جس سے مدد مانگی جاتی ہے اور تو ہی دعا قبول کرنے والا ہے، نہیں گناہوں سے بچنے کی طاقت مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی حفاظت سے اور نہیں ہے نیکی کی قوت مگر اللہ تبارک و تعالیٰ کی مدد سے۔“

ذیابیطس (شوگر) کا شرطیہ علاج

تین عدد بھنڈیاں لے کر دونوں سرے کاٹ کر درمیان سے لمبائی کے رخ چیرا لگائیں۔ اب ان کٹی ہوئی بھنڈیوں کو ایک گلاس پانی میں ساری رات پڑا رہنے دیں۔ صبح معمول کا ناشتا کرنے کے بعد بھنڈیاں نکال لیں اور وہ لیس والا پانی پینا ہے۔ مگر ٹھہریں اس پانی پر اول و آخر تین، تین بار درود پاک پڑھ کر سات بار سورۂ فاتحہ (الحمد) ضرور پڑھیں اور پھر پئیں۔ دو گھنٹے بعد شوگر چیک کریں اس پانی کو تین دن متواتر پئیں اور شوگر چیک کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھنڈی کے اس پانی میں انسولین کے معجزاتی خواص رکھے ہیں۔ اگر کھا سکتی ہیں تو ان بھنڈیوں کو کچا کھا لیں یہ گھٹنوں میں لیس کے لیے بھی مفید ہے۔

یہ نسخہ ہمیں قراۃ العین اعجاز مہدی نے کراچی سے بطورِ خاص بھیجا ہے۔

☆☆☆



اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جارہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں، ڈاکٹر حامد جنرل ہومیو پرائیویٹ لمیٹڈ آرام باغ روڈ کراچی 74200۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔ (اپنے علاقے میں دوا نہ ملنے کی صورت میں ہم سے رجوع کریں)

پتے میں پتھری

نازبیگم......راولپنڈی

عرض یہ ہے کہ مجھے تقریباً ایک سال سے گیس کا مسئلہ ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے اور گیس خارج ہوتی ہے۔ کوئی مرغن یا ثقیل کھانا کھالوں تو پیٹ میں شدید درد ہوتا ہے۔ میں نے الٹراساؤنڈ کروایا تو معلوم ہوا کہ پتے میں پتھری ہے۔ میں نے سنا ہے کہ ہومیوپیتھی میں پتے کی پتھری کا علاج ہے۔ پلیز آپ میری مدد کریں۔ مجھے کوئی اچھی دوا تجویز کریں۔

جواب: کھانا اچھی طرح چبا کر کھائیں اور کھانے کے ساتھ پانی، شربت یا کولڈ ڈرنک کا استعمال نہ کریں۔ اگر دانتوں کا مسئلہ ہے تو روٹی کو سالن میں ڈبو کر یا اگر بھنا سالن ہے تو اس میں پانی یا دہی شامل کرکے روٹی کو بھگو کر نرم کرلیں۔ پھر اس کو میش کرکے کھائیں، گیس نہیں ہوگی۔ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ بھیجنی چاہیے تھی تاکہ پتا چلتا کہ پتھری ہے کتنی بڑی۔ 3 ماہ تک ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں پھر الٹراساؤنڈ کرا کر دوبارہ اپنا حال بتائیں۔ Lycopod-30، Carboveg30 کے 5-5 قطرے جبکہ Chelidonum-Ø کے 10 قطرے آدھے گلاس

پانی ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

جسمانی کمزوری

رابعہ......اسلام آباد

میری عمر 20 سال ہے لیکن لگتی نہیں ہے۔ میری ڈائٹ بھی بہت زیادہ اچھی ہے بس جسم کو نہیں لگتی۔ نسوانی کمزوری ہے۔ آپ پلیز کوئی دوا تجویز کریں کہ نسوانی کمزوری دور ہوجائے۔ میں ہر مہینے پاکیزہ شوق سے پڑھتی ہوں۔

جواب: عمر لکھ دی، قد لکھ دیا وزن نہیں لکھا کہ کتنا ہے؟ ماہواری کے متعلق بھی نہیں لکھا کہ اس کی کیا حالت ہے؟ ویسے جتنا آپ نے بیان کیا ہے اس کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ جن میں ہارمون کی خرابی، ڈپریشن، گھریلو ماحول، خوف یا بہت زیادہ ذمے داریاں یا کوئی بیماری جسمانی تو نہیں۔ ان سب چیزوں کے صحیح علاج کے لیے مکمل تفصیلات کا جاننا ضروری ہے۔ آپ متوازن غذا لیں، اچھا ماحول بنانے کی کوشش کریں۔ صبح سویرے ورزش کریں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Natr. mur-30، Iodium-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ ایک ماہ بعد تفصیل سے حالت لکھیں۔

نسوانی کمزوری

شیما......ساہیوال

محترم ڈاکٹر! میں پاکیزہ بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری نسوانی نشوونما نہ ہونے کے برابر ہے شروع سے۔ اگست میں میری شادی ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا مگر شائع نہیں ہوا۔ اس دفعہ آپ مہربانی کرکے میرے مسئلے کا جواب ضرور دیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ سدا خوش رہیں آپ۔

جواب: ہمیں پہلی بار آپ کا خط ملا ہے۔ ماہواری کے متعلق نہیں لکھا کہ وہ کیسی ہے؟ لیکوریا کی شکایت تو نہیں ہوتی؟ قد کتنا ہے؟ کوئی اور جسمانی بیماری تو نہیں؟ ہارمونز



کی خرابی ہو بھی سکتی ہے۔ آپ لوگ اشتہار پڑھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ بس ہم آپ اس مرض سے متعلق بتائی ہوئی دوا استعمال کریں گے تو ٹھیک ہوجائیں گے۔ یہ نہیں سوچتے کہ سبب جانے بغیر ایک دوا سب پر کیسے کام کرے گی؟ متوازن غذا استعمال کریں، ورزش کریں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 2 ماہ استعمال کے بعد کیفیت سے مطلع کریں۔ Sabalser-30، Thyroidim-30 کے 7-7 قطرے آدھا گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

چہرے پر دانے اور بالوں کا گرنا

سارہ خان......پشاور

عرض یہ ہے کہ میں نے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھا تو مجھے اپنا مسئلہ پیش کرنے کا خیال آیا ہے۔ ایک سال پہلے میرے چہرے پر لال لال موٹے موٹے دانے نکلنے شروع ہوئے اور ساتھ ہی بالوں نے بھی گرنا شروع کردیا۔ میرے بال لمبے اور گھنے تھے اب گر گر بالکل شانوں تک آگئے ہیں۔ دانوں کی وجہ سے چہرہ بدنما لگتا ہے۔ بالوں اور چہرے کی وجہ سے خوبصورتی متاثر ہو رہی ہے۔ میں نے پشاور میں اسکن اسپیشلسٹ ڈاکٹر سے علاج کروایا لیکن فرق نہیں پڑا۔ دانے میں پیپ بھی ہوتی ہے جو پہلے چھوٹا اور بعد میں بڑا ہو کر چہرے پر بدنما گڑھا چھوڑ دیتا ہے۔ ان دونوں مسئلوں کا علاج بتائیں۔ آپ کا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔

جواب: صبح سویرے سورج نکلتے ہوئے 15 منٹ کے لیے دھوپ میں بیٹھیں۔ اس طرح کے جسم کا زیادہ سے زیادہ حصہ دھوپ کے اثر میں آئے۔ تازہ ہوا میں چہل قدمی کریں۔ اللہ سے دعا بھی کریں۔ ایک دن چھوڑ کر بالوں کو ہمارے والے شیمپو سے دھوئیں اور ہمارے والے فیس واش سے منہ 5 مرتبہ دھوئیں۔ دانوں کو کھجائیں نہ بلکہ کاٹن کے کپڑے سے ہلکے، ہلکے سہلایا



کریں۔ کھانے میں تیز مرچ مصالحوں اور مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں۔ شوربا چپاتی بہتر رہے گا۔ سبزیوں اور پھلوں کا زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ مرغی بالکل بھی استعمال نہیں کرنی خصوصاً فارم کی۔ کوئی کولڈ ڈرنک اور کسی بھی قسم کا کوئی شربت استعمال نہ کریں۔ ستو لسی اور تازہ پھلوں کا جوس لے سکتی ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال بتائیں۔ Calc.sulph-30،Belladona-30 اور Graphites-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

چربیلی گلٹیاں

فاطمہ...... مغل پورہ

میرے بہت سے مسئلے ہیں۔ چند ماہ پہلے میرے بائیں بازو پر گلٹی بن گئی تھی اب وہ آہستہ آہستہ اوپر کو ابھر آئی ہے۔ اب دائیں بازو میں بھی چھوٹی چھوٹی مزید گلٹیاں بن رہی ہیں۔ برائے کرم مجھے ان کے متعلق بتائیے۔ ان کے بننے کی وجہ آخر کیا ہے؟ مجھے لیکوریا کی شکایت ہے جو کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوجاتا ہے۔ تقریباً 5 سال سے ہے۔ میں گوشت بہت ہی کم کھاتی ہوں۔ صرف چکن وہ بھی کبھی کبھار۔ میرے ہاتھ اور پیر اور باقی جسم بہت جلدی سن ہوجاتا ہے۔ اگر ایک ہی پوزیشن میں بیٹھی رہوں تو۔ 2 سال پہلے تک میری جلد (Skin) بہت فریش ہوا کرتی تھی لیکن اب ہر وقت خشک رہتی ہے اور عجیب سی الرجی سی رہتی ہے چہرے پر۔ بال بھی بہت خشک رہتے ہیں اور خشکی کی وجہ سے گرتے بھی ہیں۔ برائے کرم مجھے تفصیلاً علاج بھی بتائیں اور غذا کے بارے میں بھی رہنمائی کریں۔

جواب: ہمارے جسم میں چربی بعض اوقات گٹھلیوں کی صورت میں جمع ہونے لگتی ہے جسے Adipose Tissue کہتے ہیں۔ اگر ان میں درد نہیں ہے تو ایک اچھی بات ہے۔ یہ سائز اور تعداد میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ چکن خصوصاً فارم کی نہ ہونے کے برابر استعمال کریں جبکہ گائے، بکرے اور مچھلی کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔ سبزیوں اور فروٹ کا استعمال زیادہ کریں۔ کھانے میں آئیوڈین والا نمک ضرور استعمال کریں۔ لیکوریا کے متعلق یہ نہیں لکھا کہ وہ کب زیادہ ہوتا ہے اور اس کی حالت کیسی ہوتی ہے؟ تفصیلات لکھیے تاکہ صحیح دوا تجویز کی جاسکے۔ فی الحال گلٹیوں کے لیے آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calclod-30 کے 5-5 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھے کپ پانی میں ڈال کر پئیں۔

ذہنی دباؤ

مسکان...... شیخوپورہ

حافظہ بہت کمزور ہوچکا ہے۔ بات کرتے ہوئے بھول جاتی ہوں۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی طالبہ ہوں، پڑھائی پر ٹھیک سے دھیان نہیں دے پاتی۔ جو یاد کرتی ہوں بھول جاتا ہے۔ گھٹنوں میں درد ہوتا ہے۔ نماز پڑھتے وقت ٹانگیں فولڈ کرکے دوبارہ سیدھی کرنے پر کڑاکے نکلتے ہیں۔ معدے میں تیزابیت بھی ہوجاتی ہے۔ اکثر سر سن ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی کانوں میں سیٹی کی سی آواز آتی ہے۔ بات کرتے کرتے بھول جاتی ہوں۔

جواب: ذہن پر بہت بوجھ ہے۔ گھر کا ماحول کیسا ہے؟ سہیلیاں کیسی ہیں؟ متوازن غذا لیں۔ غذا کو چبا کر کھائیں اور کھانے کے ڈھائی گھنٹے بعد تک پانی یا مشروب کا استعمال نہ کریں۔ دودھ دہی کا استعمال بڑھائیں۔ بالوں کے لیے ہمارا شیمپو استعمال کریں اور ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد دوبارہ کیفیت سے مطلع کریں۔ Kaliphos-30،Ancardium-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ اور Cratex کی ایک، ایک گولی صبح وشام

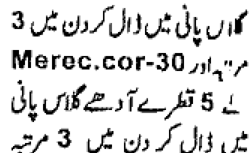
تھوڑے پانی [illegible]

گردے [illegible]

زاہدہ [illegible]

میں عرصہ [illegible] ہوں۔ آپ ہر ماہ [illegible] ہیں اور لوگ شفایاب بھی [illegible] بھی ضعیف ہیں۔ عمر ۷۲ سال [illegible] ہیں۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے چھوٹی تھیں مگر اب بڑی ہوگئی ہیں۔ ایلوپیتھی [illegible] علاج آپریشن ہی ہے۔ کئی دفعہ ہسپتالوں میں گئے ہیں مگر دل کی کمزوری کی وجہ سے آپریشن نہیں ہو [illegible]۔ یونانی علاج کرایا تھا مگر اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو ہومیوپیتھک علاج شروع کرایا ہے۔ دو سال سے ہومیو علاج کروا رہے ہیں۔ پتھریاں نہ نکلتی ہیں اور نہ رکتی ہیں، بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں لہٰذا بہت متفکر ہیں۔ کوئی ایسی دوا تجویز فرمائیں جس سے پتھریاں ریت بن کر نکل جائیں۔ اگر یہ نہ ہو تو رک جائیں زیادہ بڑی نہ ہوں۔ سردی میں تکالیف بڑھتی ہیں، گرمی میں ٹھیک رہتے ہیں۔ خوراک میں میٹھی اور نمکین دونوں غذائیں پسند کرتے ہیں۔ مہربانی فرما کر کوئی مناسب دوا تجویز کریں، عین نوازش ہوگی۔

جواب: تمام قارئین نوٹ کریں کہ رپورٹس ہسٹری کے ساتھ بھیجیں کیونکہ یہ تشخیص میں مددگار ہوتی ہیں۔ زاہدہ آپ نے صرف مثانے کی پتھریوں کا ذکر کیا تھا جبکہ رپورٹ کے مطابق انہیں جگر و گردے کا بھی مسئلہ ہے۔ پراسٹیٹ بھی بڑھا ہوا ہے اور صرف مثانے میں نہیں پتے و گردے میں بھی پتھریاں ہیں۔ علاج ان کا آپریشن قطعاً نہیں بلکہ ہو بھی نہیں سکتا۔ علاج کی ڈائریکشن بھی صحیح نہیں ہے۔ اب آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی ادویات ایک ماہ تک استعمال کریں پھر الٹراساؤنڈ اور Urine D/R کی رپورٹ کے ساتھ مریض کا حال تفصیل سے [illegible] بھیجیں۔ Berberis vulg-Ø، Cheldonium-Ø کے 10-10 قطرے [illegible]



گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ اور Merec.cor-30 کے 5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پلائیں۔ پانی کم از کم 12 گلاس بشمول دوا کے ساتھ پلائیں۔ پیشاب فوراً کریں۔ روکیں نہیں۔ پتھریوں کی وجہ سے گردے و مثانہ خراب ہو رہا ہے۔ یہ معاملہ کنٹرول ہو تو پھر پراسٹیٹ و جگر کو بھی دیکھیں گے۔

نظر کی کمزوری

ارمان...... حیدرآباد

گزشتہ دو سال سے نمبر 6 کے گلاسز استعمال کر رہی ہوں۔ ہومیوپیتھک علاج سے نمبر میں کمی یا عینک سے چھٹکارا ممکن ہے تو پلیز دوا تجویز کردیجیے۔ میرے ہونٹ سیاہی مائل ہیں اور کبھی تو بالکل کالے نظر آتے ہیں۔ [illegible] خوراک نارمل لیتی ہوں۔ پیٹ بھر کر کھانا میسر ہے مگر روزانہ پھل کھانا ممکن نہیں۔ رنگت گندمی اور چہرے پر دانے ہیں۔ میرا بنیادی مسئلہ چہرے پر اضافی بالوں کا ہونا ہے۔ ہونٹوں کے اوپر مونچھوں کی طرح زیادہ اور موٹے بال ہیں۔ اس کے ساتھ، ساتھ ٹھوڑی پر بھی موٹے بال ہیں اور قلمیں لمبی ہیں اور سر میں کچھ سفید بال ہیں جن میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے۔ اپر لپس کے لیے اسکن اسپیشلسٹ کے پاس گئی تھی۔ انہوں نے رپورٹ کروانے کے بعد لیزر ٹریٹمنٹ کے لیے کہا تھا جو کہ نہیں کروایا اور انہوں نے کوئی دوا نہیں دی تھی۔ رپورٹس بھیج رہی ہوں۔ میری صحت مجموعی طور پر اچھی ہے مگر قبض رہتا ہے۔

جواب: متوازن غذا کا استعمال کریں، ورزش کیا کریں، [illegible] سے نجات حاصل کریں، خون کا ٹیسٹ Blood HB% کرائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی [illegible] ادویات ایک ماہ استعمال کے بعد دوبارہ حال [illegible]۔ Natr mur-30، Calc phos-30، Calc flour-30، Physostigma 30 کے 7-7 قطرے آدھے

گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

پیٹ بڑھ رہا ہے

رابعہ نورین......کریم آباد کراچی

میرا پیٹ بڑھ رہا ہے اس کے لیے بھی کوئی دوا تجویز کریں۔ میری عمر 50 سال ہے۔

جواب: آپ کے پیٹ بڑھنے کی کئی وجوہات ہوسکتی ہیں۔ وزن، قد بھی آپ نے نہیں لکھا۔ اپنے بارے میں تفصیل سے لکھیں۔ جواب دے دیا جائے گا۔

چربی کی گلٹیاں

افشاں......لسبیلہ

میری امی کا ایک مسئلہ ہے۔ ان کو تقریباً 12 یا 13 سال پہلے اپنے بازوؤں میں گلٹیاں سی محسوس ہوئیں۔ گلٹیاں گوشت کے اندر ہیں۔ مطلب ہڈیوں میں نہیں ہیں۔ پہلے وہ صرف بازوؤں میں تھیں پھر تقریباً سارے جسم میں بن گئیں اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑی ہوتی گئیں۔ ان کو دبانے پر کوئی درد محسوس نہیں ہوتا لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ برائے مہربانی یہ بتا دیجئے کہ ان کے بننے کی کیا وجہ ہے؟ اور اس کے لیے کوئی علاج بھی بتائیں۔

جواب: ہمارے جسم میں چربی بعض اوقات گٹھلیوں کی صورت میں جمع ہونے لگتی ہے جسے Adipose Tissue کہتے ہیں۔ ان میں درد نہیں ہے تو ایک اچھی بات ہے۔ یہ سائز اور تعداد میں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں۔ چکن خصوصاً فارم کی نہ ہونے کے برابر استعمال کریں جبکہ گائے، بکرے اور مچھلی کا گوشت کھایا جاسکتا ہے۔ سبزیوں اور فروٹ کا استعمال زیادہ کریں۔ کھانے میں آئیوڈین والا نمک ضرور ...... استعمال کرا کریں۔ گلٹیوں کے لیے آپ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی Calc Iod-30 کے 5-5 قطرے دن میں 3 مرتبہ آدھے کپ پانی میں ڈال کر پئیں۔

بیماریوں کا مجموعہ

راحت اکرم......ضلع خانیوال

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے 12 سال کی عمر سے سر کے درد کی بیماری لاحق ہے۔ نظر کمزور ہے لیکن اس کے لیے (1.75) پونے دو نمبر کا چشمہ لگاتی ہوں۔ مسلسل دوائیاں کھا کھا کر معدہ خراب ہو چکا ہے۔ کھانے کے بعد اپھارا ہو جاتا ہے۔ پیٹ میں، آنتوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ پیٹ اور کولہے بڑھتے جا رہے ہیں۔ چہرے اور پورے جسم پر کالے موٹے بال آ گئے ہیں اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ یادداشت بہت کمزور ہے جو بھی یاد کرتی ہوں پیپر میں سب بھول جاتی ہوں۔ سر کے بال جڑ سے نکل رہے ہیں۔ چہرے پر پھنسیاں بنتی ہیں اور رنگ روز بروز کالا ہوتا جا رہا ہے۔ دونوں گردوں میں درد رہتا ہے اور ہلکا کھنچاؤ تو ہر وقت ہوتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ماہواری کا نظام بھی خراب ہے۔ ٹانگوں میں درد رہتا ہے۔ ہر وقت سستی، گھبراہٹ ہوتی رہتی ہے۔ ہڈیوں میں درد ...اچانک کرنٹ کی طرح دوڑتا ہے۔

جواب: مرغن غذاؤں سے پرہیز کریں، صبح کی تازہ ہوا اور دھوپ لیں، متوازن غذا لیں، ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Spigelia Pentarkan Ptk 81 10 قطرے سادہ پانی میں دن میں 3 مرتبہ، Magnesium phos Pentarkan Ptk 60 ,Bismutum Pentarkan Ptk 16 کی ایک، ایک گولی سادہ پانی کے ساتھ دن میں 3 مرتبہ لیں۔ ایک ماہ بعد کیفیت بتائیں۔